GHĀLIB
AND
A STUDY OF GHĀLIB

Dr. EBADAT BRELVI *M.A., Ph. D. ; F.R.A.S. ;*

Professor of Urdu, and Head of the Department of Urdu
UNIVERSITY OF THE PUNJAB, LAHORE.

WRITER'S ACEDEMY
9 - Cooper Road, LAHORE.

فہرست

پیش لفظ
حیات غالب پر چند خیالات ۱
غالب کے حالات زندگی اور شخصیت ۱۷
غالب کا ماحول ۶۸
غالب کی تصانیف ۱۴۹
غالب کی شاعرانہ عظمت ۱۹۹
غالب کی شاعری کا آفاقی پہلو ۲۱۵
غالب کی شاعری کے نئے زاویے ۲۳۱
غالب کی شاعری میں شوخی اور شگفتگی کے عناصر ۲۴۳
غالب کی شاعری میں اجتماعی شعور ۲۵۵
غالب کی شاعری میں غم دوراں ۲۶۷
غالب کی عشقیہ شاعری ۲۹۱
غالب کی شاعری کا جمالیاتی پہلو ۳۳۳
غالب کی تصویر کاری ۳،۵
غالب کے فنی اضافے ۳۶۳
غالب اور ان کے خطوط ۳۷۵
غالب کے خطوط کی ادبی اہمیت ۳۹۷
غالب کا ایک اہم خط —— نامۂ غالب ! ۴۰۷
غالب کے اہم نقاد ۴۲۰
مطالعۂ غالب کے سو سال ۴۵۱
کتابیات غالب ۴۸۶
اشاریہ

پیش لفظ

غالب ایک عظیم شاعر ہیں اور ان کی اس شاعرانہ عظمت کو اُردو ،عروں، تذکرہ نگاروں، ادبی مؤرخوں اور قدیم و جدید نقادوں ، سب نے تسلیم کیا ہے۔ گذشتہ سو سال میں اُن کی اس عظمت کے مختلف پہلوؤں ساحت ان بے شمار کتابوں اور مقالوں میں ہوتی رہی ہے، جو وقتاً فوقتاً کر شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت اور ی پر اچھا خاصا تحقیقی اور تنقیدی مواد جمع ہو گیا ہے۔ لیکن ان کی شخصیت اور شاعری دونوں میں کچھ ایسی پہلودار کیفیت ہے کہ ہر میں اُس کے مختلف پہلوؤں پر کچھ نئی باتیں کہنے اور نئے خیالات کو کرنے کی گنجائش ہمیشہ باقی رہے گی۔

یہ کتاب 'غالب اور مطالعہ' غالب' بھی اسی صورت حال کی پیداوار ۔ اس کی تیاری میں غالب کے متعلق تقریباً تمام تحقیقی اور تنقیدی مواد پیش نظر رکھا گیا ہے اور اُس سے حسب ضرورت استفادہ کرکے غالب خصیت اور شاعری کے بعض نئے گوشوں کو تلاش کرنے کی کوشش ئی ہے۔

اس کتاب کا لکھنے والا گذشتہ تیس سال سے غالب کی شخصیت اور ری کے تحقیقی اور تنقیدی مطالعے میں مصروف رہا ہے۔ اس مطالعے کے نتائج نکلے ہیں، وہ سب اس کتاب میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ چونکہ لعے کا سلسلہ ابھی جاری ہے ، اس لیے ان نتائج کو حرف آخر نہیں کہا ا سکتا۔ آئندہ جو نتائج سامنے آئیں گے ، اُن کو یا تو اس کتاب کے آئندہ یڈیشنوں میں پیش کر دیا جائے گا یا ایک نئی کتاب مرتب کر کے کر دی جائے گی۔

یہ کتاب اُردو شاعروں کے تحقیقی اور تنقیدی مطالعے کے ایک باقاعدہ بڑے منصوبے کے سلسلے کی دوسری کڑی ہے۔ اس سلسلے کی کوشش اور کاوش 'مومن اور مطالعہ' مومن' کے نام سے ۱۹۶۱ء میں ہو چکی ہے۔ اس منصوبے کے مطابق غالب کے اس مطالعے کو ن اور مطالعہ' مومن' ، کی اشاعت کے دو تین سال بعد شائع ہو جانا ے تھا۔ لیکن ۱۹۶۲ء میں راقم انگلستان چلا گیا اور پانچ سال تک

لندن یونیورسٹی میں تدریس کے ساتھ مطالعے اور ادبی تحقیق میں مصروف رہا ۔ اس لیے اس کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی ۔

لیکن حسن اتفاق سے اس تاخیر کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ اب یہ کتاب غالب کے جشن صد سالہ کے موقع پر شائع ہو رہی ہے ۔ شاید اس کی اشاعت میں یہ تاخیر اسی وجہ سے ہوئی تھی کہ اس عظیم شاعر کے جشن صد سالہ کے موقع پر یہ بھی اس خراج عقیدت میں شریک ہو ، جو اس سال اُس کو دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں پیش کیا جا رہا ہے ۔

شفیق مکرم مصوّر مشرق عبدالرحمٰن چغتائی صاحب نے اس کتاب کا نہایت ہی حسین و دلآویز سرورق بنایا ہے ، عزیز گرامی ڈاکٹر ناظرحسن زیدی صاحب نے بڑی محنت سے اس کا اشاریہ تیار کیا ہے اور سید ظفر الحسن رضوی صاحب نے اس کو بڑے ذوق و شوق سے چھاپا ہے ۔

ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے راقم کے پاس الفاظ نہیں ہیں ۔

اورینٹل کالج لاہور

۲۵ جنوری ۱۹۶۹ء

عبادت

حیات غالب
پر
چند خیالات

غالب کی زندگی بڑی ہی پہلودار تھی ۔ وہ شروع سے آخر تک تہہ در تہہ نظر آتی ہے ۔ اس میں بے شمار نشیب و فراز دکھائی دیتے ہیں ۔ وہ تو ایک حسین اور دل آویز پہاڑی سلسلے کی طرح حسین اور دل آویز ، پرشکوہ اور شان دار ہے ۔ جلال و جمال دونوں اس میں گلے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ رومان و حقیقت کا اس میں ایک نہایت ہی دل کش اور دل موہ لینے والا امتزاج ملتا ہے ۔ وہ سیدھی ، سادا اور سپاٹ نہیں ہے ۔ اس میں تو ایک مد و جزر کی سی کیفیت ہے ۔ وہ حادثات سے بھرپور ہے ۔ وہ جہد مسلسل کی ایک داستان ہے ۔ وہ ایک بے چین روح کی کہانی ہے ۔ اس میں تو ایک ڈرامائی شان ہے ، اور یہ ڈرامائی شان غالب کی زندگی کے ہر واقعے اور ہر سانحے میں اپنے شباب پر نظر آتی ہے ۔ اس میں چونکانے کا بڑا سامان ہے ۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ قدم قدم پر انسان کو اس طرح چونکاتی ہے کہ وہ ایک عالم تحیر میں پہنچ کر اپنے آپ کو اس میں گم کر دیتا ہے اور اس پر ایک خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔

مرزا غالب کا خاندانی سلسلہ آل سلجوق تک پہنچتا ہے ۔ یہ لوگ ترک ہیں اور انھوں نے صدیوں تک وسط ایشیا میں حکمرانی کی تھی ۔ غالب نے اسی نسبت سے ، اپنے آپ کو ''ترک سلجوق'' کہا ہے ۔ آل سلجوق تقریباً تین سو سال تک حکمران رہے لیکن بالآخر خوارزمیوں نے ان کی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور وہ ایسے منتشر ہوئے کہ پھر کبھی بھی اپنی طاقت کو سمیٹ کر یک جا نہ کر سکے ۔ ان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا ۔ جب حکومت ہاتھ سے نکل گئی تو زمانے نے انھیں

ادھر ادھر بھٹکنے پر مجبور کیا ۔ چنانچہ ان میں سے بعضوں نے تو راہزنی کو اپنا شعار بنایا اور بعضوں نے سپہ گری اختیار ، کی غالب نے اپنے آبا و اجداد کی اس سپہ گری پر فخر کیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ شاعری ان کے لیے ذریعۂ عزت نہیں ہے :

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزّت نہیں مجھے

آل سلجوق کے اس بکھرے ہوئے قافلے میں ایک بزرگ ترسم خاں تھے۔ جو سلجوقیوں کے انتشار کے بعد سمرقند میں آباد ہوئے ۔ یہ ترسم خاں غالب کے بردادا تھے ۔ انھوں نے سپہ گری کا پیشہ اختیار کیا اور ان کی اولاد سمرقند ہی میں پھلی پھولی ۔ لیکن بالآخر ان کے بیٹوں میں غالب کے دادا مرزا قوقان بیگ خاں نے اپنے والد ترسم خاں سے ناراض ہو کر ترک وطن کیا اور ہندوستان آ کر اقامت اختیار کی ۔ پہلے کچھ عرصے ان کا قیام لاہور میں رہا ۔ یہاں وہ نواب معین الملک میر متو کی سرکار میں ملازم ہوئے ۔ لیکن جب ان کے انتقال کے بعد پنجاب میں بھی انتشار کا دور دورہ ہوا تو دلی چلے گئے ۔ یہ شاہ عالم کا زمانہ تھا ۔ شاہ عالم کے بادشاہ ہونے کے بعد جب ذوالفقار الدولہ نجف خاں نے حکومت میں اپنا اثر قائم کر لیا تو غالب کے دادا کو ان کے توسط سے معقول ملازمت مل گئی اور وہ دلی میں آباد ہو گئے ۔ پہاسو کا پرگنہ انھیں جاگیر میں ملا اور اس طرح وہ اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے ۔

مرزا قوقان بیگ خاں کے ایک بیٹے مرزا عبداللہ بیگ خاں تھے۔ عبداللہ بیگ خاں دہلی میں پیدا ہوئے اور اسی سر زمین پر انھوں نے ہوش سنبھالا ۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد انھوں نے بھی سپہ گری کا پیشہ اختیار کیا ۔ پہلے لکھنئو میں نواب آصف الدولہ کی سرکار میں ملازمت کی ۔ پھر حیدرآباد میں نظام علی خاں کی سرکار میں کئی سال ملازم رہے ۔ جب بقول غالب ان کی نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی تو انھوں نے گھبرا کر الور کا قصد کیا ۔ راجا بختاور سنگھ کے نوکر ہوئے لیکن وہاں کسی لڑائی میں مارے گئے۔ الور جانے سے قبل وہ آگرے میں آ گئے تھے اور وہاں ان کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی صاحب زادی عزت النساء بیگم سے ہو گئی تھی ۔ غالب انھیں عبداللہ بیگ خاں اور

عزت النساء بیگم کے فرزند ارجمند تھے ۔

غالب کی ولادت ۸ رجب المرجب یعنی ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرے میں ہوئی ۔ غالب تین بھائی بہن تھے ۔ بہن چھوٹی خانم غالب سے بڑی تھیں اور بھائی مرزا یوسف ان سے چھوٹے تھے ، غالب کی عمر ابھی پانچ برس ہی کی تھی کہ ان کے والد عبداللہ بیگ خاں کا انتقال ہو گیا ۔ والد کے انتقال کے بعد ان کی پرورش عبداللہ بیگ خاں کے چھوٹے بھائی یعنی غالب کے چچا مرزا نصراللہ بیگ خاں نے اپنے ذمے لے لی ۔ یہ مرہٹوں کے ملازم تھے اور اکبر آباد کی صوبہ داری کا منصب ان کے سپرد تھا ۔ لیکن وہ بھی زیادہ عرصے نہ جیے ۔ غالب مشکل سے آٹھ سال چند ماہ کے ہوں گے کہ ان کا بھی انتقال ہو گیا ۔

اب ان کے سر پر کوئی ایسا بزرگ نہ رہا جو ان کی پرورش کرتا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں بچپن سے عنفوان شباب تک کا زمانہ اپنی ننھیال میں گزارنا پڑا ۔ یہاں ان کے سر پر کسی ایسے بزرگ کا سایہ نہ تھا جو ان کی دیکھ بھال کرتا اور جس کی نگرانی میں ان کی پرورش ہوتی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے راہ روی کے راستے پر چل نکلے اور بالکل لا ابالی ہوگئے ۔ اس زمانے میں وہ پتنگ اڑاتے ، شطرنج کھیلتے اور دوستوں کے ساتھ مل کر طرح طرح کے ہنگامے برپا کرتے۔ والد اور چچا کے انتقال کے بعد دس ہزار روپے کی رقم ان کے خاندان کی کفالت کے لیے مقرر ہو چکی تھی ۔ اس میں سے نواب احمد بخش خاں نے صرف تین ہزار روپے سالانہ کی رقم مقرر کی۔ اس رقم میں سے غالب کا حصہ صرف ساڑھے سات سو روپیہ تھا۔اس زمانے کے حساب سے یہ رقم ایک بچے کے اخراجات کے لیے خاصی تھی ۔ اس کے علاوہ ان کی ننھیال کے لوگ بھی کھاتے پیتے تھے۔ اس لیے مالی اعتبار سے غالب کو اس وقت اطمینان تھا ۔ اس صورت حال نے ان کی بے راہ روی اور لا ابالی پن کو کچھ اور بھی ہوا دی ۔

غالب کی تعلیم کے بارے میں تفصیل نہیں ملتی ۔ لیکن جن حالات میں ان کا بچپن گزرا ہے، اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کی تعلیم میں وہ باقاعدگی نہیں ہوگی جو عام حالات میں ایک ایسے بچے کو نصیب ہوتی ہے جس کے سر پر والدین کا سایہ ہوتا ہے ۔ پھر بھی یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کی ننھیال کے لوگوں نے ان کی ابتدائی تعلیم کا

ضرور کوئی انتظام کیا ہوگا ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ شاعری ، ادب ، نجوم اور ہیئت وغیرہ کے ایسے علوم سے دلچسپی نہ لے سکتے ۔ بعضوں کا خیال ہے کہ انھوں نے نظیر اکبر آبادی کے مکتب میں بھی ابتدائی تعلیم حاصل کی ۔ لیکن وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ واقعی نظیر کے مکتب میں پڑھنے کے لیے گئے ۔ کیونکہ اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا ۔ البتہ اس بات پر سب متفق ہیں کہ انھوں نے ابتدائی زمانے میں فارسی زبان کی تعلیم مولوی محمد معظم سے حاصل کی ۔ اس کے بعد ملا عبدالصمد کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ۔ ملا عبدالصمد پارسی تھے اور ان کا نام ہرمزد تھا ۔ لیکن وہ مسلمان ہوگئے تھے اور ان کا اسلامی نام عبدالصمد رکھا گیا تھا ۔ وہ سیر و سیاحت کی غرض سے ہندوستان آئے اور چند سال آگرے میں قیام کیا ۔ غالب کی عمر اس وقت چودہ سال سے زیادہ نہیں تھی ۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فارسی زبان سے انھیں اس وقت تک اتنی دلچسپی پیدا ہو چکی تھی کہ اس کے قواعد کو سمجھنے کے لیے انھوں نے ملا عبدالصمد کی موجودگی کو نعمت غیر مترقبہ تصوّر کیا ۔ کہا جاتا ہے کہ ملا عبدالصمد غالب کے یہاں ٹھہرے ۔ اور غالب نے ان سے استفادہ کیا ۔ عبدالصمد سے استفادے کا یہ نتیجہ ہوا کہ فارسی زبان کے اسرار و رموز ان کے سامنے بے نقاب ہو گئے اور قدیم ایرانی تہذیب کے مزاج دانی بھی ان کے مزاج میں داخل ہوگئی ۔

غالب کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا ۔ گیارہ سال کی عمر میں شاعری شروع کی ۔ شروع شروع اُردو میں طبع آزمائی کرتے رہے ۔ اس زمانے میں ان پر بیدل ، اسیر اور شوکت وغیرہ کا اثر تھا ۔ اور وہ انھی کے انداز کے شعر کہتے تھے ۔ اس زمانے میں لہو و لعب ان کا شعار تھا۔ زندگی کے اس انداز نے شاعری سے ان کی دلچسپی کو بڑھایا اور شعر گوئی کی آتش شوق کو بھڑکایا ۔ چنانچہ وقت کے ساتھ ساتھ شاعری کے ذوق و شوق میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی ۔

ابھی غالب تیرہ سال کے تھے کہ ۱۲۲۵ھ میں الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی اُمراؤ بیگم سے ان کی شادی ہو گئی ۔ اس نسبت سے وہ آگرے سے دلی منتقل ہو گئے اور انھوں نے اس شہر میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی ۔ دلی اس زمانے میں بقول حالی عہد اکبری اور

عہد شاہجہانی کی یاد تازہ کرتی تھی ۔ علم و ادب کے بڑے بڑے ماہر اس سر زمین پر جمع تھے ۔ اس ماحول کا اثر غالب پر بہت گہرا ہوا ۔ دلی میں ان کی ملاقات مولانا فضل حق خیر آبادی سے ہوئی جو اس زمانے کے بہت بڑے عالم تھے اور شعر و شاعری کا بھی اچھا ذوق رکھتے تھے ۔ ان کے اثر سے علمی معاملات میں بھی انھوں نے دلچسپی لی ۔ دلی کے قیام نے ان کی زندگی کو اس انداز کو بڑی حد تک بدلا جس میں بے راہ روی اور لا ابالی پن کے پہلو نمایاں تھے ۔ اب ان کے مزاج میں بڑی حد تک ٹھہراؤ پیدا ہوا اور زندگی کے عام انداز میں اعتدال کی کیفیت رونما ہوئی ۔ اس صورت حال نے نہ صرف زندگی کو بسر کرنے میں صحت مندی پیدا کی بلکہ اُس کے بنیادی معاملات و مسائل کو سمجھنے کا شعور بھی ان کے اندر پیدا کیا ۔ اچھی صحبتوں کے اثر سے انھوں نے علم و ادب دونوں کی طرف باقاعدگی سے توجہ کی اور شاعری میں تو وہ رنگ روپ نکلا کہ تمام رنگ اس کے سامنے ماند پڑ گئے ۔

دلی کے قیام کے زمانے میں غالب کو مالی مشکلات کا سامنا یقیناً کرنا پڑا ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سیاسی ، معاشی اور معاشرتی اعتبار سے اس وقت دلی کی حالت اچھی نہیں تھی۔ شاہی خاندان تک کا حال دگرگوں تھا ۔ غالب بھی ان حالات سے متاثر ہوئے ۔ آگرے میں جو فراغت انھیں نصیب تھی وہ اب خواب و خیال ہوگئی۔ وہ پنشن جو انھیں ملتی تھی اس کو حاصل کرنے میں طرح طرح کی الجھنیں پیش آنے لگیں ۔ اور ۱۸۳۱ء میں تو یہ پنشن بالکل ہی بند ہوگئی ۔ ان حالات میں گزر بسر کے لیے انھیں قرض کا سہارا لینا پڑا ۔ قرض خواہوں کے تقاضے بھی انھیں پریشان کرنے لگے ۔ اسی زمانے میں ان کے چھوٹے بھائی یوسف مرزا دیوانے ہو گئے ۔ غالب کے لیے یہ بڑی پریشانی اور ابتلا کا زمانہ تھا ۔ انھوں نے خود اس کا اظہار اس طرح کیا ہے :

ہے اب اس معمورے میں قحط غم الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

اسی پریشانی کے عالم میں غالب نے حالات کی ناسازگاری سے تنگ آکر پنشن کی بحالی کے لیے کلکتے کا سفر کیا ۔ چنانچہ ۱۸۲۶ء میں دلی سے نکلے ۔ کان پور ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے ۔ تقریباً ڈیڑھ سال ان کا قیام

کلکتے میں رہا۔ حکام اچھی طرح پیش آئے۔ شہر کے سبزہ زار ہائے مطرا اور نازنین بتان خود آرا نے بھی ان کا دل لبھایا۔ لیکن پنشن کا قضیہ خاطر خواہ طے نہ ہو سکا۔ مجبوراً وہ ۱۸۲۹ء میں دلی واپس پہنچے۔ ۱۸۳۵ء میں نواب شمس الدین احمد خاں کو ولیم فریزر کے قتل کے الزام میں پھانسی ہوگئی۔ ان کے مرنے کے بعد فیروز پور جھرکہ کی ریاست بحق سرکار ضبط کرلی گئی۔ اس لیے غالب کو ساڑھے سات سو روپے سالانہ کی پنشن دہلی کے کلکٹر کی طرف سے ملنے لگی۔ لیکن انھیں اس سے زیادہ کا حق دار نہیں سمجھا گیا۔ انھوں نے اس فیصلے کے خلاف اپیل بھی کی لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ پھر بھی وہ چین سے نہیں بیٹھے۔ سولہ سال تک مقدمات کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ اور بات ہے کہ انھیں کامیابی نہ ہوسکی۔

۱۸۴۲ء میں غالب کو دہلی کالج میں فارسی کی مدرسی پیش کی گئی مسٹر ٹامسن، جو ان دنوں حکومت ہند کے سکریٹری تھے، انھوں نے یہ دیکھ کرکہ فارسی پڑھانے کا خاطر خواہ انتظام کالج میں نہیں ہے، یہ حکم دیا کہ عربی کی طرح فارسی کا ایک مدرس بھی کالج میں ہونا چاہیے۔ مفتی صدرالدین آزردہ نے اس کام کے لیے غالب، مومن اور صہبائی کے نام تجویز کیے۔ ٹامسن نے مرزا غالب کو دعوت دی—غالب ان کے پاس پہنچے۔ لیکن چونکہ وہ ملازمت کی غرض سے آئے تھے۔ اس لیے ان کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی۔ غالب کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ اس وقت ان کی مالی حالت اچھی نہیں تھی، انھوں نے ملازمت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد یہ جگہ مومن کو پیش کی گئی۔ انھوں نے بھی اس کو اپنی شان کے خلاف سمجھا۔ چنانچہ صہبائی فارسی کے استاد مقرر کیے گئے۔

غالب کی زندگی کا سب سے الم ناک واقعہ غالباً ان کی اسیری ہے۔ ۱۸۴۷ء میں وہ قمار بازی کے الزام میں گرفتار کیے گئے اور عدالت نے انھیں چھ ماہ قید بامشقت کی سزا دے دی—حالی نے لکھا ہے ''کوتوال شہر سے غالب کی دشمنی تھی۔ اس لیے جھوٹا مقدمہ ان کے خلاف بنایا۔''[۱]

۱۔ حالی: یادگار غالب۔

ہوسکتا ہے یہ بات صحیح ہو ۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ غالب کو چوسر اور شطرنج کھیلنے کا شوق تھا ۔ اور وہ کچھ بازی بدکر یہ کھیل کھیلتے تھے۔ اس زمانے میں بہت سے لوگ ان کے مکان پر اسی غرض سے آتے تھے اور اس بہانے سے جوا کھیلتے تھے۔ مرزا خاں کوتوال کے بعد جب فیض الحسن کوتوال ہوئے تو انھوں نے سختی کی اور قمر بازی کے اڈوں کو ختم کرنا چاہا ، زد غالب پر بھی پڑی ۔ ان کو عدالت میں پیش کیا گیا ۔ چھ مہینے کی سزا ہوئی ۔ تین مہینے قید رہے ۔ لیکن بالآخر ڈاکٹر راس سول سرجن کی سفارش پر ان کو رہا کر دیا گیا ۔ اس واقعے سے غالب کے وقار کو بھی ٹھیس لگی اور ان کی طبیعت پر بھی اس کا بہت برا اثر ہوا ۔

اس واقعے کے بعد زیست اور بھی مشکل ہوگئی اور پچھن سال سے غالب جن مالی پریشانیوں کے شکار تھے، ان میں کچھ اور بھی اضافہ ہوگیا ۔

ان حالات میں مجبور ہو کر انھوں نے قلعے سے تعلق پیدا کیا اور میاں کالے خاں صاحب اور حکیم احسن اللہ خاں کی سفارش پر ان کی رسائی بہادر شاہ تک ہوئی اور انھوں نے تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے کا کام ان کے سپرد کیا ۔ اس طرح وہ قلعے میں باقاعدہ ملازم ہو گئے اور حکیم احسن اللہ خاں کی مدد سے انھوں نے 'مہر نیم روز' لکھنے کا کام شروع کر دیا ۔ پچاس روپے تنخواہ مقرر ہوئی ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب قلعے میں ذوق کا طوطی بولتا تھا اور وہ بادشاہ کے استاد تھے ۔ ۱۸۵۴ء تک وہ اس منصب پر مامور رہے ۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد یہ منصب غالب کے سپرد ہوا اور وہ ۱۸۵۷ء تک اس خدمت پر مامور رہے ۔ اسی سال غدر ہوا ۔ مسلمانوں کو شکست ہوئی ۔ انگریزوں کا اقتدار قائم ہوا ۔ بہادر شاہ رنگون بھیج دیے گئے ۔ اور غالب کو داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی شمع کی طرح اجڑی ہوئی دلی میں رہنا پڑا ۔

غدر اور اس کے بعد کا زمانہ غالب کے لیے بڑی پریشانی کا زمانہ تھا ۔ غالب نے اپنی ذاتی پریشانیوں کے علاوہ اس زمانے میں ایک حکومت، ایک تہذیب، ایک معاشرت اور ایک نظام فکر کو اجڑتے ہوئے دیکھا ۔ 'دستنبو' کے علاوہ اپنے خطوط میں بھی انھوں نے ان حالات کا ماتم کیا ہے ۔

اس ہنگامے نے زندگی کے سارے نظام کو درہم برہم کر دیا تھا ۔ چنانچہ غالب کی آمدنی کے تمام ذرائع بند ہو گئے ۔ امراؤ بیگم کا کچھ وظیفہ

ضیاء الدین احمد خاں نے اپنی کوشش سے مقرر کروا دیا تھا ۔ اسی سے گذر بسر ہوتی تھی ۔ کچھ رام پور سے مل جاتا تھا ۔ غدر کے بعد رام پور کا دربار غالب کا سب سے بڑا سہارا ثابت ہوا ۔ نواب یوسف علی خاں نے انہیں بار بار رام پور آنے کی دعوت دی ۔ بالآخر وہ جنوری ۱۸۶۰ء میں رام پورگئے اور وہاں مارچ تک قیام بھی کیا ۔ اسی سال ان کی پنشن ، جو غدر کی وجہ سے بند ہوگئی تھی، بحال ہوئی اور ۱۸۶۳ء میں دربار و خلعت بھی جاری ہو گیا ۔

لیکن اب ان کی صحت جواب دے چکی تھی ۔ عرصے سے بیمار تھے ۔ پریشانیوں اور غموں نے اور بھی صحت کو خراب کر دیا ۔ عمر بھی خاصی ہو چکی تھی ۔ چنانچہ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو انتقال کیا ۔

حیات غالب کے ان واقعات کی تفصیل ، ان کے بارے میں لکھی ہوئی ہر کتاب میں مل جاتی ہے ۔ حالی کی 'یادگار غالب' پہلی کتاب ہے جس میں نہ صرف ان کی زندگی کے واقعات کو سلیقے سے یک جا کیا گیا ہے بلکہ ان کی شخصیت کی بھی زندگی سے بڑی ہی بھر پور تصویر کھینچی گئی ہے ۔ حالی کی 'یادگار غالب' کے بعد اگرچہ کچھ اور کتابیں بھی غالب کی حیات اور شخصیت پر لکھی گئی ہیں لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ 'یادگار غالب' ان سب میں منفرد نظر آتی ہے ۔ بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ حالی کے بعد جن لکھنے والوں نے غالب کی شخصیت اور شاعری پر قلم اٹھایا ہے ، انھوں نے ضرور حالی کی خوشہ چینی کی ہے اور اسی چراغ سے اپنا چراغ جلایا ہے ۔ یا پھر خود غالب کی تحریروں کو اپنے پیش نظر رکھا ہے ۔ جہاں تک حالی کی 'یادگار غالب' کے منفرد ہونے کا معاملہ ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ حالی نے غالب کو بہت قریب سے دیکھا تھا ۔ وہ ان کے ساتھ بیٹھے تھے ۔ ان کے ساتھ وقت گذارا تھا ۔ وہ ان کے ہم مشرب نہ سہی لیکن ان کے پرستار ضرور تھے ۔ وہ غالب کے ہم نوا نہ سہی لیکن ان کی باتوں سے انہیں دل چسپی ضرور تھی ۔ غالب کے ساتھ ان کا زاویہ' نظر ہمدردانہ تھا ۔ اسی لیے حالی نے اس کتاب میں جو سواد جمع کیا ہے ، اس تک دوسروں کی رسائی ناممکن تھی ۔ اور جو تفصیلات انھوں نے غالب کی حیات ، شخصیت اور شاعری کے بارے میں پیش کی ہیں ، ان کو پیش کرنے کا کسی دوسرے

شخص کو خیال بھی نہیں آ سکتا ۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود حالی کی اس کتاب کو غالب کی شخصیت پر حرف آخر کی حیثیت نہیں دی جاسکتی ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ غالب اور حالی کے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق تھا ۔ ایک رند شاہد باز و بادہ خوار کی باتیں ایک زاہد خشک کی سمجھ میں کس طرح آسکتی ہیں ؟ اور اگر سمجھ میں آ بھی جائیں تو وہ ان کو بیان کس طرح کر سکتا ہے ؟ یہی وجہ ہے کہ حالی نے غالب کی جو تصویر پیش کی ہے وہ مکمل نہیں ہے ، ادھوری اور نامکمل ہے ۔ غالب کے اندر جو طوفان موجزن تھا حالی کو اس کی خبر نہیں تھی۔ بس یہی کمی 'یادگار غالب' میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے ۔

حالی کے بعد غالب کی حیات پر تین اہم کتابیں شائع ہوئیں ۔ ایک تو مولانا غلام رسول مہر کی 'غالب' ، دوسری شیخ محمد اکرام کی 'غالب' جو اب 'آثار غالب' کے نام سے بھی شائع ہوئی ہے اور تیسری مالک رام کی 'ذکر غالب' ۔ یہ تینوں کتابیں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں ۔ مہر صاحب نے بڑی محنت اور سلیقے سے غالب کے خطوط اور دوسری تحریروں کو سامنے رکھ کر ان کی زندگی کے واقعات کو مرتب کیا ہے ۔ اکرام صاحب نے بڑی تحقیق اور تلاش و جستجو کے بعد ان کی زندگی کے واقعات کو بیان کیا ہے ۔ لیکن ان میں سے کسی ایک کو بھی غالب کی باقاعدہ سوانح عمری نہیں کہا جا سکتا ۔ 'یادگار غالب' بے شک کسی حد تک ان کی سوانح عمری معلوم ہوتی ہے لیکن سوانح عمری کی حیثیت سے اس میں بنیادی خامی یہی ہے کہ حالی بے تکلفی کے ساتھ کھل کر غالب کی حیات اور شخصیت کے بارے میں جو کچھ کہنا چاہیے تھے ، نہیں کہہ سکے ہیں ۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ حالی کے مزاج کی ثقاہت اس کی اجازت نہیں دیتی تھی ۔ دوسرے ان کے تعلقات غالب سے برابری کے نہیں تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بہت سی ایسی باتوں کو نظر انداز کر گئے ہیں جن کے بغیر غالب کی شخصیت کی تصویر مکمل نہیں ہو سکتی ۔ پھر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس میں اپنے آپ کو پابند کر لیا ہے اور حد درجہ محتاط رہنے کی کوشش کی ہے ۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ غالب کی حیات اور شخصیت کے بہت سے پہلو اس کتاب میں بھی دب کر رہ جاتے ہیں ۔

غالب کی زندگی کے واقعات کو مختلف لکھنے والوں نے بیان کردیا ہے ۔

لیکن ابھی ان میں سے بیشتر واقعات پر مزید تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے - تاکہ ان کی تفصیل سامنے آئے۔ اب تک غالب پر جو کام ہوا ہے ، اس کا ماخذ یا تو غالب کے خطوط ہیں یا ان کے بعض معاصرین کے بیانات - ضرورت اس بات کی ہے کہ غالب کے بارے میں ، جہاں جہاں بھی جو ریکارڈ موجود ہے ، اس کو ایک منصوبے کے تحت کھنگالا جائے اور اس میں سے ضروری مواد نکال کر غالب کی زندگی کے حالات کو ایک مربوط صورت میں مرتب کیا جائے تاکہ ان کی صحیح تصویر سامنے آسکے - اس وقت تک غالب کی زندگی اور شخصیت پر جو کام ہوا ہے اس میں بیشتر باتیں ایک دوسرے سے لے کر دہرائی گئی ہیں - جستہ جستہ کچھ لوگوں نے بعض نئی باتوں کا سراغ ضرور لگایا ہے لیکن یہ نئی باتیں کسی مربوط صورت میں یک جا نہیں ملتیں - یہ مواد تو مضامین و مقالات کی صورت میں جگہ جگہ بکھرا ہوا ہے اور موجودہ ناساز گار حالات میں بہت سے افراد کی دسترس سے باہر ہے - اس نئے مواد کو ایک تو یک جا کرنے کی ضرورت ہے ، دوسرے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کو سامنے رکھ کر حیات غالب کے مختلف واقعات کو ایک لڑی میں پرویا جائے اور ان کی بنیاد پر ان کی زندگی کے بارے میں ایک ایسی مبسوط کتاب مرتب کی جائے جس میں حیات غالب کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ہو -

حیات غالب کے جن معاملات و مسائل پر تحقیق کی ضرورت ہے ان میں سب سے پہلے تو ان کے حسب نسب اور خاندان کا مسئلہ ہے - اب تک اس موضوع پر جن لوگوں نے لکھا ہے ، انھوں نے اس سلسلے میں غالب کی کہی ہوئی باتوں کو تسلیم کر لیا ہے - حالانکہ سب جانتے ہیں کہ غالب ایک طرح کے احساس برتری میں مبتلا تھے - یہ احساس برتری اس انحطاط و زوال کی پیداوار تھا ، جس میں سے ہو کر غالب کی زندگی کا قافلہ گزرا تھا - وہ سیاسی اعتبار سے ایک زوال آمادہ معاشرے کی پیداوار تھے - ایک ایسے معاشرے میں افراد کا اس احساس برتری کا شکار ہونا ضروری ہے - خاص طور پر ایسے افراد کا جن کی نسلی وجاہت اور خاندانی شرافت ناساز گار معاشی حالات کے باعث آندھیوں کی زد پر ہو - اسی صورت حال نے غالب کو نرگسیت کا شکار کر دیا - اس لیے انھوں نے جو کچھ اپنی نسل اور خاندان کے بارے میں کہا ہے

اس کو تسلیم کر لینا علمی اور تحقیقی اعتبار سے کسی طرح مناسب نہیں ہے ۔ وسط ایشیا میں ترکوں کی تاریخ اور ان کے مختلف خاندانوں کے مآخذ کو سامنے رکھا جائے اور اس نسل کے جو لوگ ہندوستان آئے ان کی تفصیل کا سراغ لگایا جائے تو اس سلسلے میں بعض بڑی ہی دلچسپ اور قابل قدر معلومات کا سرمایہ فراہم ہو سکتا ہے اور غالب کی نسل اور خاندان کے بارے میں بعض اہم پہلو سامنے آ سکتے ہیں ۔

غالب کے دادا قوقان بیگ خاں ہندوستان آئے لیکن اس معاملے میں اختلاف ہے کہ وہ شاہ عالم کے عہد میں اس سرزمین پر پہنچے یا محمد شاہ کے زمانے میں ۔ پھر ان کی زندگی کے حالات کی تفصیل بھی کہیں نہیں ملتی ۔ صرف اتنی معلومات فراہم ہوتی ہے کہ وہ پہلے پنجاب میں ٹھہرے ۔ یہاں معقول ملازمت ملی ۔ پھر دلی چلے گئے ۔ لیکن دلی میں ان کے دن کیسے گزرے ؟ انھوں نے شادی کہاں کی ؟ ان کی ازدواجی زندگی کیسی تھی ؟ ان باتوں کے متعلق پوری طرح علم نہیں ہوتا ۔ ان کی ملازمتوں کے بارے میں تو تھوڑا بہت علم ہو جاتا ہے لیکن ان کی خاندانی اور نجی زندگی کے بارے میں ابھی بہت کچھ بردۂ خفا میں ہے ۔ غالب کے چچا نصراللہ بیگ خاں کے حالات بھی صرف چند سطروں میں ملتے ہیں ۔ ان کے بارے میں بھی تفصیلات کا علم نہیں ہوتا ۔ یہی حال غالب کے نانا غلام حسین خاں کمیدان اور دوسرے عزیزوں کا ہے ۔ ان کے متعلق بھی ہماری معلومات بہت محدود ہے ۔ غالب کی زندگی میں ان بزرگوں کی جو اہمیت ہے وہ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کی جائے ۔ کیونکہ غالب کی زندگی اور شخصیت پر ان سب کے اثرات بہت گہرے ہیں ۔

غالب نے بچپن کا جو زمانہ اکبر آباد میں گزارا ہے وہ اُن کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے لیکن اس زمانے کے بارے میں جو معلومات اب تک لکھنے والوں نے فراہم کی ہے وہ ناکافی ہے ۔ اس زمانے میں وہ پتنگ اڑاتے ، چوسر اور شطرنج کھیلتے اور نوجوان دوستوں کے ساتھ اچھا وقت گزارتے تھے ۔ یہ لوگ کون تھے ؟ غالب پر اس زمانے میں کن لوگوں کے اثرات گہرے ہوئے ؟ ان کی تعلیم کہاں کہاں اور کس طرح ہوئی ؟ وہ واقعی نظیر اکبر آبادی کے مکتب میں تعلیم حاصل کرنے

کے لیے گئے؟ مولوی معظم ، جن کے سامنے انھوں نے زانوئے ادب تہہ کیا ، وہ کون بزرگ تھے ؟ اور ان کی علمی استعداد کیا تھی ؟ ہرمزد یا عبدالصمد کون تھا ؟ کہاں گیا ؟ اور اس کی زندگی کس طرح گزری ؟ یہ سب باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں ہم ابھی زیادہ نہیں جانتے ۔ جو حالات ہم تک پہنچے ہیں ظاہر ہے ، کہ ہمیں ان کے مقابلے میں زیادہ تفصیل کی ضرورت ہے ۔

اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ جس زمانے میں غالب نے اکبر آباد کی سر زمین پر ہوش سنبھالا اور ان کا ذہنی نشو و نما ہوا اس وقت وہاں کا علمی اور ادبی ماحول کیسا تھا۔ نظیر اکبر آبادی تو وہاں موجود تھے لیکن ان کے علاوہ اور کون کون سے شاعر تھے جن سے غالب نے اثر قبول کیا ؟ وہ کس کے شاگرد ہوئے ؟ اور اگر شاگرد نہیں ہوئے تو کیوں نہیں ہوئے ؟ ان تمام پہلوؤں پر بھی اچھا تحقیقی کام ہونا چاہیے ۔ پھر شاعری کے علاوہ اکبر آباد میں اس آسان اور سادہ نثر نگاری کی بھی ایک روایت موجود تھی ۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۰۲ع میں اکبر آباد کے ایک لکھنے والے حکیم الٰہی بخش شوق اکبر آبادی نے ایک داستان 'افسانۂ عشق' کے نام سے لکھی اور اس میں نل و من کے قصے کو آسان ، سادہ اور بامحاورہ اردو میں بیان کیا ۔ اس داستان کا قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن کے کتب خانے میں موجود ہے ۔

غالب کی زندگی کے حالات سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ مالی پریشانیوں میں گزرا ہے اور وہ ہمیشہ غم دوراں کا شکار رہے ہیں ۔ ان حالات کے سائے میں انھوں نے کس طرح زندگی گزاری ہے اور اس کے کیا اثرات ان پر ہوئے ہیں ؟ قرض انھوں نے کس کس طرح کن لوگوں سے لیا ہے ؟ اور اس قرض کی ادائیگی کس طرح کی ہے ؟ یہ بھی تحقیق کا ایک اہم موضوع ہے ۔ ابھی تک اس موضوع پر بھی کوئی خاص کام نہیں ہوا ۔

اس کے علاوہ پنشن کا معاملہ بہ ذات خود بھی تحقیق کا ایک اہم مسئلہ ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے کلکتہ کا جو سفر کیا ہے ، اس کے بارے میں بھی ابھی تک مکمل معلومات فراہم نہیں ہوسکی ہے ۔ یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دلی سے کان پور ہوتے ہوئے لکھنؤگئے تھے ، وہاں

ان کی آؤبھگت ہوئی تھی لیکن آغا میر سے ان کی ملاقات نہیں ہوسکی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لکھنؤ میں ناسخ اور آتش کا طوطی بولتا تھا۔ ناممکن ہے کہ غالب سے لکھنؤ میں ان کی ملاقات نہ ہوئی ہو۔ لیکن غالب کے متعلق ہر لکھنے والے نے اس موضوع پر کوئی ایسی بات نہیں کہی جس کی بنیاد تحقیق پر استوار ہو۔ پھر بنارس میں غالب کا وقت کس طرح گزرا؟ کلکتہ میں انھوں نے کس طرح دن گزارے؟۔ ان کی مخالفت کیوں ہوئی؟ اور نتائج کیا نکلے؟۔ یہ تمام باتیں بھی مزید تحقیق کا تقاضا کرتی ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ غالب کی دلی کی زندگی کے بارے میں لکھنے والوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن اس زمانے کی سیاسی اور مذہبی ہنگامہ آرائیوں میں ان کا کیا حصہ تھا؟۔ مولانا سید احمد بریلوی کی تحریک کی مخالفت اور مولانا فضل حق خیر آبادی کی حمایت میں انھوں نے کیا کیا کچھ کیا؟ ذوق، مومن، شیفتہ اور بہادر شاہ سے ان کے جو روابط تھے اس کے بارے میں بھی ابھی بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہے۔

پھر ان کے قید ہونے کا واقعہ، ان کا مقدمہ، قلعے میں ان کی باریابی غدر کے بعد ان کا زندگی اور اس کے معاملات و مسائل یہ تمام پہلو غالب کی زندگی میں خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے بارے میں بھی اب تک جو معلومات فراہم کی گئی ہے، اس کو دیکھ کر بھی خاصی تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

غرض غالب کی زندگی کے بے شمار پہلو ابھی ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک تحقیق کا ایک اہم موضوع بن سکتا ہے۔ جب تک ان موضوعات پر تحقیق کے بعد تفصیلی معلومات فراہم نہیں ہوتی، غالب کی زندگی کا مطالعہ نامکمل رہےگا اور ان کی صحیح تصویر ہمارے سامنے نہیں آ سکے گی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب پر اب تک جو کام ہوا ہے وہ اپنی جگہ اہم ہے اور غالب اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ ان پر اس وقت تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اس میں تحقیقی وزن بہت کم ہے اور اس کا بیشتر حصہ غیر مربوط، تشنہ اور نامکمل ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ غالب پر ابھی تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی جس کو ان کی مکمل اور مستند سوانح حیات کہا جائے۔ بات یہ ہے کہ مکمل اور مستند سوانح حیات حالات و واقعات کی تحقیق کے

بغیر نہیں لکھی جا سکتی ۔ لیکن ظاہر ہے کہ صرف حالات اور واقعات کا جمع کر دینا ہی سوانح حیات نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے ۔

غالب کا مطالعہ آج ایک ایسی ہی سوانح حیات کے لیے چشم براہ ہے جس میں ان کی زندگی کے حالات و واقعات کی تحقیق اور تفصیل کے علاوہ بھی بہت کچھ ہو !

غالب کے
حالات زندگی
اور شخصیت

غالب ایبک ترک تھے اور انھوں نے اپنے ایبک ترک ہونے پر فخر کیا ہے۔ کلیات فارسی میں ان کے کئی قطعات ایسے ملتے ہیں، جن میں انھوں نے اپنے ترک ہونے کی وضاحت کی ہے اور اپنی نسل اور خاندان کے بیان میں جو فخریہ لہجہ اختیار کیا ہے اس سے ان کے مزاج اور افتاد طبع پر روشنی پڑتی ہے۔

کہتے ہیں:

غالب از خاک پاک تورانیم — لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمی — بسترگان قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعۂ اتراک — در تمامی زماہ دہ چندیم
فن آبائے ما کشاورزی ست — مرزبان زادۂ سمرقندیم
ور زمعنی سخن گزار دۂ — خود چہ گوئیم تا چہ و چندیم
فیض حق را کمینہ شاگردیم — عقل کل را بھینہ فرزندیم
ہم بہ تابش ببرق ہم نفسیم — ہم بہ بخشش بابر مانندیم
بہ تلاشے کہ ہست فیروزیم — بہ معاشے کہ نیست خرمندیم
ہم بر خویشتن ہمی گریم — ہمہ بر روزگار می خندیم[1]

ساقی چو من پشنگی و افراسیابیم
دانی کہ اصل گوہرم از دودۂ جم ست
میراث جم کہ می بود اینک بہ من سپار
زاں پس رسد بہشت کہ میراث آدم ست[2]

۱ - غالب: کلیات فارسی - نول کشور: صفحہ ۱۲ -
۲ - ایضاً: صفحہ ۱۲ -

اس کے علاوہ غالب نے اپنے خودنوشت حالات جو ریڈیگن کے 'تذکرۂ مظہر العجائب' کے لیے لکھے تھے، اس میں بھی اپنی نسل اور خاندان کی تفصیل اس طرح پیش کی ہے :

''اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ، غالب تخلص، قوم کا ترک سلجوق سلطان برکیارق سلجوقی کے اولاد میں سے - اس کا دادا قوقان بیگ خاں شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے دلی میں آیا۔ پچاس گھوڑے اور نقارہ و نشان سے بادشاہ کا نوکر ہوا - پہاسو کا پرگنہ جو اب سمرو کی بیگم کو سرکار سے ملا تھا وہ اس کی جاداد میں مقرر تھا - باپ اسد اللہ خاں مذکور کا دلی کی ریاست چھوڑ کر اکبر آباد میں جا رہا - اسد اللہ خاں اکبر آباد میں پیدا ہوا - عبداللہ بیگ خاں الور میں راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا اور وہاں ایک لڑائی میں بڑی بہادری سے مارا گیا - جس حال میں کہ اسد اللہ خاں مذکور کو پانچ چھ برس کا تھا اس کا حقیقی چچا نصراللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا - ۱۸۰۳ء میں جب جرنیل لیک صاحب اکبرآباد میں آئے تو نصراللہ بیگ خاں نے شہر سپرد کر دیا اور اطاعت کی - جرنیل صاحب نے چار سو سوار کا بریگیڈیر کیا، اور ایک ہزار سات سو کی تنخواہ مقرر کی - پھر جب اس نے اپنے زور بازو سے سونک سونسا دو پرگنے بھرت پور کے قریب ہولکر کے سواروں سے چھین لیے تو جرنیل صاحب نے وہ دونوں پرگنے بہادر موصوف کو بہ طریق استمرار عطا فرمائے - مگر خان موصوف جاگیر مقرر ہونے کے دس مہینے کے بعد بہ مرگ ناگاہ ہاتھی پر سے گر کے مر گیا - جاگیر سرکاری بھی بازیافت ہوئی اور اس کے عوض نقدی مقرر ہوگئی۔ اور شرکا کو دے دلا کر ساڑھے سات سو روپیہ سال اس شخص کی ذات کو اسی زومعاش سے ملتے ہیں''۔

خواجہ قمرالدین راقم نے غالب کے نسب اور خاندان کی جو تفصیل بیان کی ہے - وہ بھی ہر اعتبار سے نہایت دلچسپ ہے - لکھتے ہیں :

۱ - غالب : خود نوشت حالات ، احوالِ غالب : صفحہ ۲۸ -

"واضح ہو کہ ہماری اور غالب کی اصل نژاد سلاطین توران میں ہے۔ جس زمانے میں تورانی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا، بیخ بنیاد بھی نہ رہی تو ہمارے خاندان کے لوگ اس طوائف الملوکی میں جا بجا منتشر ہوگئے اور جس نے جہاں امن پائی جا بسا۔ چنانچہ کوئی سو پچاس پشت کے بعد اس خاندان میں دو برادران حقیقی جن کا نام راقم کو یاد نہیں ان کی اولاد میں دو فرزند تولد ہوئے۔ بڑے بھائی کا بیٹا ترسم خاں اور چھوٹے بھائی کا بیٹا رستم خاں۔ ہنوز یہ دونوں بھائی عمر شباب کو نہ پہنچے تھے کہ ان کے والدین فوت ہوگئے۔ یہ دونوں کسی حالت میں اضلاع سمرقند میں آکر آباد ہوئے۔ پھر ایک مدت کے بعد بدخشاں میں آکر رہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ سر زمین ترکستان میں نور اسلام مثل پرتو خورشید منور ہو رہا ہے۔ یہ دونوں بھائی بھی شرف اسلام سے فیض یاب ہوئے اور ترسم خاں نے بدخشاں کے کسی شریف خاندان میں اپنا نکاح بیاہ کر لیا۔ ترسم خاں کی اولاد میں تین دختر اور دو فرزند پیدا ہوئے۔ یعنی ایک فرزند کا نام نصراللہ بیگ خاں دوسرے کا عبداللہ بیگ خاں تھا۔ پھر ایک عرصے کے بعد ترسم خاں نے وفات پائی۔ ان کی اولاد مدت تک بدخشاں میں رہی۔ مگر رستم خاں بھائی کے رنج میں بدخشاں میں نہ رہے۔ بخارا میں آ گئے۔ یہاں آکر تھوڑے عرصے کے بعد رستم خاں بھی ایک دولت مند گھر خواجگان چشت میں، جو خواجہ عبیداللہ احراری کی نسل میں تھے، بیاہے گئے۔ ان کے ہاں قطب الدین خاں فرزند پیدا ہوئے۔ ہنوز قطب الدین خاں سن بلوغ کو نہ پہنچے تھے کہ ان کے والدین گزر گئے۔ اب قطب الدین خاں لفظ خواجگی سے ممتاز ہوئے۔ یہاں سلسلۂ ذات ہمارا اور غالب کا جدا ہوگیا۔ رستم خاں کے بعد خواجہ قطب الدین کا اسی خاندان میں عقد ہوا۔ ان کے ہاں ایک فرزند خواجہ حاجی خاں تولد ہوئے۔ ان کی عمر قریب بلوغ کے پہنچی تھی کہ والدین کا انتقال ہوگیا۔ یہ خبر سن کر نصر اللہ بیگ خاں اور عبداللہ بیگ خاں مع اپنی بہنوں کے بھتیجے کے پاس بخارا میں آئے۔ کچھ

دن بھتیجے کے شریک حال رہے۔ پھر بھتیجے سے راز دل بیان کیا اور مشورہ لیا کہ ہمارا قصد ہے کہ ہم ہندوستان جائیں اور سرکار شاہی میں ملازمت کریں۔ تم کیا صلاح دیتے ہو؟ خواجہ حاجی خاں جوکہ نوجوان سپاہی پیشہ تھے، ہندوستان کے شوق میں چچا کی رائے کے شریک ہو گئے کہ اچھا میں آپ کے ہمراہ چلوں گا۔ غرض یہ کہ چچا بھتیجے مع متعلقین، کسی قدر جمعیت ذاتی ہمراہ لے کر، بخارا سے روانہ ہوئے۔ اول سمرقند میں آئے۔ وہاں ایک امیر زادے شریف قوم مرزا جیون بیگ خاں چنتا سے ملاقات ہوئی۔ اثنائے گفتگو میں سفر کا ذکر آ گیا۔ مرزا جیون بیگ خان بھی چلنے کو تیار ہوگئے اور مع اپنی زوجہ امیر النساء کے ہمراہ ہوگئے۔ غرض یہ ولایتی قافلہ زن و مرد ہندوستان میں آیا اور شہر شاہجہان آباد میں مقیم ہوا۔ یہ زمانہ شاہ عالم بادشاہ کا تھا اور ملک کی حالت ابتر تھی''—بنگالہ کا ملک انگریزوں کے قبضے میں تھا۔ اور اودھ کا ملک صوبہ دار اودھ نے دبا لیا تھا۔ ادھر قوم مرہٹہ ہر طرف ملک کو تاراج کر رہی تھی۔ نواب نجف خاں ذوالفقار الدولہ وزیر سلطنت تھے۔ مگر بد نظمی رفع نہ ہوئی تھی۔ یہ تازہ وارد قافلہ وزیر اعظم سے ملا۔ وزیر ان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ اور ان سب کو نوکر رکھ لیا۔ اور ان کی بسر اوقات کے لیے ایک پرگنہ پھانسو، جو علی گڑھ کے ضلع میں ہے، جاگیر میں دیا۔ اور کسی قدر شاہی فوج بھی مقرر کر دی کہ مرہٹوں کی روک تھام بھی کرتے رہو۔ کئی برس یہ قافلہ شاہی ملازم رہا۔ ہنوز کوئی کار نمایاں ان سے ظہور میں نہ آیا تھا کہ نواب نجف خاں کا وزیر اعظم سے کسی بات پر بگاڑ ہوگیا۔ یہ سب مغل زادے نوکری چھوڑ کر آکبر آباد چلے آئے، وہاں رہنے لگے۔ اتفاق سے بھاؤ راؤ سندھیا نے ان کا حال سن کر اپنے پاس بلا لیا اور نوکر رکھ لیا۔ نصراللہ بیگ خاں کو پورے کمپو کا افسر مقرر کیا اور خواجہ حاجی خاں کو ایک رسالہ کا رسالدار کیا اور ایک پوری پلٹن کی کمیدانی مرزا جیون بیگ خان

کو ملی - نصراللہ بیگ خاں نے اپنے چھوٹے بھائی مرزا عبد اللہ بیگ خاں کو گھر پر چھوڑا تھا کہ متعلقوں کی نگرانی کریں - دوسرے مرزا عبداللہ بیگ خاں نہایت متقی عبادت گزار تھے - خود بھی گھر پر رہ گئے ـــــــان مغلوں نے اکبر آباد میں سکونت اختیار کی تھی - ایک عرصے کے بعد نصراللہ بیگ خاں نے دہلی میں آ کر اپنا عقد نواب احمد بخش خاں کی بہن سے کیا - اور پھر اکبر آباد میں آ گئے - مگر ان کی زوجہ تھوڑی مدت جی کر مر گئیں - پھر نصراللہ بیگ خاں نے اپنے چھوٹے بھائی کا عقد مرزا غلام حسین بیگ اکبر آبادی کی بیٹی سے کیا - اس کے شکم سے دو فرزند ایک اسد اللہ خاں دوسرے یوسف بیگ خاں پیدا ہوئے - یہ دونوں اس وقت اپنے نانا کے گھر میں پرورش پاتے تھے - اس اثنا میں مرزا عبداللہ بیگ پر ایک ناگہانی واقعہ گزرا اور وہ فوت ہوگئے''

ان اقتباسات سے غالب کی نسل ، اُن کے خاندان اور آبا و اجداد کے متعلق اچھی خاصی معلومات فراہم ہو جاتی ہے - لیکن ان میں سے ہر بیان مزید تحقیق کا تقاضا کرتا ہے - کیونکہ جو تفصیل یہاں بیان کی گئی ہے - اس کی بنیاد تاریخی حقائق پر استوار نہیں ہے - بقول مولانا غلام رسول مہر :

''ان بیانات کی تاریخی حیثیت کے متعلق وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے - اس لیے کہ محققین کے نزدیک تو یہ بھی ثابت شدہ بات نہیں کہ سلجوق انھی تورانیوں کی نسل سے تھے جن کی عظمت و برتری کا افسانہ 'شاہ نامہ' نے سنایا ہے - یہ نسب نامہ غالباً اُس وقت بنایا گیا جب سنجر نے خلیفۂ بغداد کی لڑکی سے نکاح کی خواہش کی تھی اور مقصد یہ تھا کہ سلجوقیوں کے خاندان کو قدیم و باجبروت پادشاہوں کا خاندان دکھلایا جائے بہر حال

۱- خواجہ قمر الدین راقم : مرزا غالب کا نسب نامہ - احوال غالب : صفحہ ۳۰-۳۲ -

غالب کے یہ دعاوی ہر لحاظ سے درست ہوں یا نہ ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ اونچے درجے کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اُن کے آبا و اجداد کا محبوب ترین مشغلہ تیغ زنی و سپہ گری تھا۔"۱

غالب نے اپنی نسل ، خاندان اور آبا و اجداد پر جو فخر کیا ہے ۔ اُس کا سبب یہی ہے کہ اُن کا تعلق ایک اونچے درجے کے خاندان سے تھا ، اور اُن کے آبا و اجداد اہم شخصیتوں کے مالک تھے ۔ اُن کے پردادا قوقان بیگ خاں جب اس سر زمین پر آئے تو انہیں اُس وقت حکمرانوں نے معقول ملازمت دی اور بلند منصب عطا کیا ۔ پھر اُن کے والد عبداللہ بیگ خاں بھی ہمیشہ اچھے عہدوں پر فائز رہے اور انہیں بھی مختلف حکمرانوں کی طرف سے اعلیٰ منصب ملا اور جاگیریں بھی دی گئیں ۔ اگرچہ حوادث زمانہ نے ان چراغوں کو جلد ہی بجھا دیا لیکن اُن کی یاد ہمیشہ غالب کے دل میں روشنی اور گرمی پیدا کرتی رہی ۔ پھر اُن کے دادا ، والد اور چچا کی شادیاں جن خاندانوں میں ہوئیں ، وہ بھی اونچے درجے کے تھے ۔ اس لیے غالب کے یہاں خاندانی عظمت اور ریاست و امارت کا احساس کچھ اور بھی شدید ہوا ۔ لیکن اس احساس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ غالب نے جس زمانے میں آنکھ کھولی ، وہ سیاسی ، معاشرتی اور تہذیبی اعتبار سے ایک انحطاط و زوال کا زمانہ تھا ۔ اس انحطاط و زوال کی وجہ سے خاندانی عظمتوں کے چراغ آندھیوں کی زد پر تھے اور ریاست اور امارت کی شمعیں بھی جھلملا رہی تھیں ۔

اس صورت حال نے افراد میں نسلی برتری اور خاندانی عظمت کے احساس کو بڑھایا اور ریاست و امارت کے خیال میں اضافہ کیا ۔ چنانچہ انھوں نے ان تمام باتوں پر فخر کرنے کو اپنا شعار بنا لیا ۔ انحطاط و زوال کے زمانے میں افراد کی انفرادی اور اجتماعی نفسیات یہی صورت اختیار کرتی ہے ۔

غالب کے یہاں نسلی برتری اور خاندانی عظمت کا احساس بھی اسی صورت حال کا مظہر ہے !

---

۱ ۔ مولانا غلام رسول مہر : غالب صفحہ ۹—۱۰ ۔

۲

غالب ۸ رجب ۱۲۱۲ھ یعنی ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام، مرزا عبداللہ بیگ خاں تھا، اور اُن کی والدہ کا نام عزت النسا بیگم تھا۔ غالب نے انھیں کے سائے میں پرورش پائی لیکن ابھی وہ پانچ سال ہی کے تھے کہ اُن کے والد کا انتقال ہو گیا۔ وہ ایک لڑائی میں مارے گئے۔ والد کی وفات کے بعد غالب کی پرورش اُن کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں نے کی۔ وہ اس زمانے میں مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد میں صوبہ دار تھے۔ پھر اُن کے خسر نواب احمد بخش خاں کی سفارش پر لارڈ لیک نے انگریزی فوج میں رسالداری کے عہدے پر ان کا تقرر کرا دیا۔ لیکن وہ بھی ۱۸۰۶ء میں ایک لڑائی میں مارے گئے۔ غالب کی عمر اس وقت صرف نو سال تھی۔ اس طرح غالب نے اس چھوٹی سی عمر میں دو گہرے صدمے اُٹھائے۔ ایک تو پانچ سال کی عمر میں اپنے والد عبداللہ بیگ خاں کی وفات پر یتیمی کا صدمہ اور پھر اپنے چچا نصر اللہ بیگ خاں کی وفات پر نو سال کی عمر میں ایک دوسرا صدمہ جو یتیمی کے صدمے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ کیونکہ چچا کی حیثیت بھی اس وقت اُن کے لیے باپ ہی کی تھی۔ غالب کی شخصیت پر ان واقعات کا زندگی بھر گہرا اثر رہا ہے۔ چنانچہ اپنی تحریروں میں جگہ جگہ ان واقعات کو حسرت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ باپ اور چچا کے انتقال کے بعد انھیں والی الور کی طرف سے پنشن ملتی تھی۔ چنانچہ راجہ شیو دھیان سنگھ والی الور کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے۔ اس میں یتیمی کے واقعے کا ذکر اس طرح کیا ہے:

زاں پس کہ گست گوہر من در جہاں یتیم
زاں پس کہ کشتہ شد پدر من بہ کارزار

در پنج سالگی شدہ ام چاکر حضور
رنگیں سخن طرازم و دیریں وظیفہ خوار

دارم بہ گوش حلقۂ زنجاہ و ہشت سال
اکنوں کہ عمر شصت و سہ سال است در شمار

باید شنید راز زاعیان بارگاہ
باید شنفت قصہ زپیران آں دیار

کافی بود مشاہدہ، شاہد ضرور نیست
در خاک راج گڑھ پدرم را بود مزار

چند خطوں میں بھی ان واقعات کا ذکر نہایت حسرت آمیز لہجے میں ملتا ہے ۔ لکھتے ہیں :

''باپ میرا عبد اللہ بیگ خاں لکھنؤ جا کر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا ۔ بعد چند روز حیدر آباد جا کر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا ۔ تین سو سواروں کی جمعیت سے ملازم تھا ۔ کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑےمیں جاتی رہی ۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا ۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا ۔ وہاں کی لڑائی میں مارا گیا ۔

نصر اللہ بیگ خاں میرا حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبے دار تھا ۔ اُس نے مجھے پالا ۔ ۱۸۰٦ء میں جرنیل لیک کا عمل ہوا صوبہ داری کمشنری ہو گئی اور صاحب کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا ۔ میرے چچا کو جرنیل لیک نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا ۔ چار سو سوار کا برگیڈیر مقرر ہوا ۔ ایک ہزار روپیہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر حین حیات ۔ علاوہ مرزبانی کے تھی کہ بہ مرگ ناگاہ مر گیا ۔ رسالہ برطرف ہو گیا ۔ ملک کے عوض نقدی ہو گئی وہ اب تک پاتا ہوں ۔''

(خط بہ نام منشی حبیب اللہ ذکا)

''میں پانچ برس کا تھا کہ باپ مرا ۔ نو برس کا تھا کہ چچا مرا ۔ اس کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکاء حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں مرحوم دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے ۔ انھوں نے نہ دے مگر تین ہزار روپے سال ۔

(خط بہ نام چودھری عبدالغفور خاں سرور)

''پنج سال از عمر من گزشت کہ پدر از سرم سایہ بر گرفت ۔ عم من نصراللہ بیگ خاں چوں خواست کہ مرا بہ ناز پرورد ، گاہ مرگش فراز آمد ۔ کیا بیش پنج سال بعد گزشتن برادر مہیں پے بردار بر داشت و مرا دریں خرابہ تنہا گذاشت و ایں حادثہ کہ مرا نشان جاں گدازی و گردوں را کمینہ بازی بود در سال ہزار و ہشت و شش عیسوی ۱۸۰٦ بہ ہنگام صد و شش لشکر آمدنی و کشور کشائی

صمصام الدولہ جرنیل لارڈ لیک صاحب بہادر بروے کار آمد۔ چون عم مرحوم از دولتیان دولت اہل فرنگ بود و با انبوہے چہار صد سوار بہ رکاب صمصام الدولہ (لارڈ لیک) و با سرکشان سرگرم جنگ و ہم از بخشش ہائے سرکار انگریزی دو پرگنہ سیر حاصل از مضافات اکبر آباد در جاگیر داشت ۔ سرکار انگلشیہ بہ خون بہائے آفتاب کیسۂ تار گدایاں را چراغ و ما و نوریاں را بہ عوض جاگیر بہ مشاہرہ از خار خار جستجوئے وجہ معاش فراغ بخشید و ما امروز کہ شمارۂ نفس شماری زندگانی چہل و چار رسد براں رائیہ خرسندیم و براں مایہ قانع ۔''

(خط بہ نام مولوی سراج الدین احمد خاں)

''نصر اللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبے دار تھا۔ ۱۸۰۳ع میں جب جرنیل لیک صاحب اکبر آباد پر آئے تو نصر اللہ بیگ خاں نے شہر سپرد کر دیا اور اطاعت کی ۔ جرنیل صاحب نے چار سو سوار کا بریگیڈیر کیا اور ایک ہزار سات سو تنخواہ مقرر کی ۔ پھر جب اُس نے اپنے زور بازو سے سونک سونسا ہر گنے بہادر موصوف کو بہ طریق استمرار عطا فرمائے۔ مگر خان موصوف جاگیر مقرر ہونے کے دس مہینے بعد بہ مرگ نا گاہ ہاتھی پر سے گر کر مر گیا ۔ جاگیر سرکار میں بازیافت ہوئی اور اُس کے عوض نقدی مقرر ہو گئی ۔''[۱]

غرض غالب نے اپنی ابتدائی زندگی کے صدمات کو جگہ جگہ تفصیل سے بیان کیا ہے ۔ جیسا کہ ان بیانات سے ظاہر ہے یہ تفصیلات پوری طرح صحیح نہیں ہیں ۔ ان میں تحقیق کی بہت گنجائش ہے ۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غالب نے ان واقعات کے گہرے اثرات قبول کیے ہیں ۔ زندگی بھر وہ ان صدمات کو فراموش نہ کر سکے اور یہ صدمات مختلف صورتیں اختیار کر کے اُن کی شخصیت میں اپنے آپ کو نمایاں کرتے رہے ۔ اُن کے بہت سے تجربات ، جذبات و احساسات اور افکار و خیالات کے پیچھے ابتدائی زندگی کے انھیں صدمات کا ہاتھ نظر آتا ہے ۔

۱- مولانا غلام رسول مہر: غالب : صفحہ ۱۷-۱۹ -

اس میں شبہ نہیں کہ والد اور چچا کے انتقال کے بعد غالب کو مالی اعتبار سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی ۔ کیونکہ نواب احمد بخش خاں نے لارڈ لیک سے سفارش کی اور انھوں نے غالب اور اُن کے بھائی بہنوں کے لیے پنشن کا انتظام کر دیا ۔ مالک رام صاحب نے اس کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے :

"نواب احمد بخش خاں کو مرزا نصر اللہ بیگ خاں کی جواں مرگی کا سخت افسوس ہوا ۔ انھیں ان چھوٹے چھوٹے بچوں پر خاص طور پر رحم آیا جو چچا کی وفات کے بعد بالکل بےکس ہو کر رہ گئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے لارڈ لیک سے سفارش کی اور وہاں سے پنشن کا انتظام ہو گیا ۔ نواب احمد بخش خاں کو اپنی گوناگوں خدمات کے لیے سرکار انگریزی کی طرف سے میوات میں فیروز پور جھرکہ اور مضافات ہوڈل (تحصیل فیروز پور جھرکہ) میں نگینہ اور پونانانا وغیرہ کی جاگیر بہ طور استمرار عطا ہوئی تھی ۔ اور چونکہ وہ ریاست الور کے وکیل تھے۔ اس لیے مہاراجہ بختاور سنگھ والیؑ الور نے اپنی طرف سے انھیں لوہارو کا پرگنہ دے دیا تھا جو اس سے پہلے الور ہی کا ایک حصہ تھا ۔ فیروز پور جھرکہ کی استمراری جاگیر سے متعلق یہ طے پایا تھا کہ اس کے لیے نواب احمد بخش خاں سرکار انگریزی کو پچیس ہزار روپیہ سالانہ ادا کرتے رہیں گے ۔

میرزا نصراللہ بیگ خاں کی وفات پر ان کی حین حیات جاگیر سونکھ اور سونسا سرکار انگریزی نے واپس لے لی اور چار سو سواروں کا رسالہ بھی توڑ دیا ۔ البتہ ان میں سے پچاس سواروں کا ایک دستہ نواب احمد بخش خاں بہادر اور نواب نجابت علی خاں بہادر والی جھجر کو دے دیا گیا کہ وہ اسے برقرار رکھیں ۔ سرکار کو جب ضرورت ہوگی وہ ان سے مدد طلب کرے گی ۔ اب اس دستے کے اخراجات اور مرزا نصراللہ بیگ خاں کے بس ماندگان کی پنشن کے لیے ۴ مئی ۱۸۰۶ء کو حکم جاری کیا گیا کہ نواب احمد بخش خاں اپنی جاگیر کے لیے جو پچیس ہزار روپے سالانہ دیتے تھے، وہ اس شرط پر معاف کیے جاتے ہیں کہ آئندہ پندرہ ہزار وہ اسی دستے کی غور و پرداخت پر خرچ کریں اور باقی دس ہزار مرزا مرحوم کے خاندان کو

بہ طور پنشن دیں—— نہ معلوم کیسے مگر اس فیصلے کے ایک ہی مہینے بعد ۲ جون ۱۸۰۶ء کو نواب احمد بخش خاں نے ایک شقہ حاصل کر لیا جس میں درج تھا کہ مرزا نصراللہ بیگ خاں مرحوم کے متعلقین کو پانچ ہزار روپیہ سالانہ حسب ذیل تفصیل سے ادا کیا جائے :

۱ ۔ خواجہ حاجی—دو ہزار روپیہ سالانہ ۔

۲ ۔ مرزا نصراللہ بیگ خاں کی والدہ اور تین بہنیں ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ ۔

۳ ۔ مرزا نوشہ اور مرزا یوسف برادر زادگان مرزا نصراللہ بیگ خاں مرحوم ڈیڑھ ہزار سالانہ ۔

گویا پہلے تو دس ہزار سالانہ کے ہوئے پانچ ہزار اور پھر اس تقسیم کی رو سے ان پانچ ہزار میں سے بھی صرف ساڑھے سات سو مرزا غالب کو ملے اور ساڑھے سات سو ان کے بھائی مرزا یوسف کو ملے ۔

غرض اس طرح غالب اور ان کے خاندان کے لیے گزر بسر کا اچھا خاصا سامان ہو گیا ۔ اور وہ بچپن میں اطمینان بلکہ آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنے لگے ۔

غالب نے اس زمانے میں اپنے نانا خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کے زیر سایہ آگرے میں زندگی بسر کی ، غالب کے نانا اس وقت کے مشہور رئیسوں میں تھے اور آگرے میں آرام و اطمینان سے زندگی بسر کرتے تھے۔ غالب کو بچپن اور عنفوان شباب کے زمانے میں جب امارت اور ریاست کا یہ ماحول ملا اور ان کے دن آرام و اطمینان سے گزرنے لگے تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے لہو و لعب کو اپنا شعار بنا لیا ۔ باپ اور چچا کا تو انتقال ہو ہی چکا تھا ۔ کوئی سر پر ہاتھ رکھنے والا نہ تھا ۔ اسی لیے ان کے مزاج میں ایک طرح کی بے راہ روی پیدا ہوگئی اور وہ نوجوان دوستوں کی صحبتوں میں رنگ رلیاں منانے لگے ۔ غالب نے منشی سیو نرائن کو ایک خط لکھا ہے جس میں اس زمانے کی تفصیل بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں :

"برخوردار نورچشم منشی شیو نرائن کو معلوم ہو کہ میں کیا

---

۱ ۔ مالک رام : ذکر غالب ۔ صفحہ ۲۲ - ۲۳ ۔

جانتا تھاکہ تم کون ہو ۔ جب یہ جانا کہ تم ناظر بنسی دھر کے پوتے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزند دلبند ہو ۔ اب تم کو مشفق و مکرم لکھوں تو گنہگار ۔ تم کو ہمارے خاندان اور اپنے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم ہے ۔ مجھ سے سنو ! تمھارے دادا کے والد عہد نجف خاں ہمدانی میں میرے نانا صاحب مرحوم خواجہ غلام حسین خاں کے رفیق کار تھے ۔ جب میرے نانا نے نوکری ترک کی اور گھر بیٹھے تو تمھارے پردادا نے بھی کمر کھولی اور پھر کہیں نوکری نہ کی ۔ یہ باتیں میرے ہوش کے پہلے کی ہیں ۔ مگر جب میں جوان ہوا تو میں نے یہ دیکھا کہ منشی بنسی دھر ، خاں صاحب کے ساتھ ہیں ۔ اور انھوں نے کیتھم کلاں اپنی جاگیر کا سرکار میں دعویٰ کیا تو منشی بنسی دھر اس امر کے منصرم ہیں ۔ وکالت اور مختاری کرتے ہیں ۔ میں اور وہ ہم عمر تھے ۔ شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں ۔ اُنیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر ان کی ۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور صحبت ۔ آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی ۔ چونکہ گھر ان کا بہت دور نہ تھا ۔ اس واسطے جب چاہتے تھے چلے جاتے تھے ۔ بس ان کے اور ہمارے مکان میں مچھیا رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹرے درمیان تھے ۔ ہماری حویلی وہ ہے جو اب سیٹھ لکھی چند نے مول لی ہے ۔ اس کے دروازے کے سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی ۔ اور پاس اس کے ایک کٹھیا والی حویلی اور سلیم شاہ کے تکیے کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس کے آگے بڑھ کر ایک اور کٹرہ کہ وہ گڈریوں والا مشہور تھا اور ایک کٹرہ کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا ۔ اس کٹرے سے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اُڑاتا تھا ۔ اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے ۔ واصل خاں نامی ایک سپاہی تمھارے دادا کا پیش دست رہتا تھا ۔ وہ کٹروں کا کرایہ اُگاہ کر ان کے پاس جمع کراتا تھا ۔ سنو تو سہی ! تمھارا دادا بہت کچھ پیدا کر گیا ہے ۔

علاقے مول لیے تھے اور زمینداوہ اپنا کر لیا تھا ۔ دس بارہ ہزار روپے کی سرکاری مال گزاری ادا کرتا تھا ۔ وہ سب کارخانے تمھارے ہاتھ آئے یا نہیں ؟ اس کا حال از روئے تفصیل جلد مجھ کو لکھو ۔"۱

اس خط سے اُن کے بچپن اور عنفوان شباب کی زندگی کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے نانا غلام حسین خاں کمیدان اپنے زمانے کے ایک اہم اور وضع دار رئیس تھے اور اس زمانے کے امرا و رؤسا سے اُن کے گھرے تعلقات تھے ۔ آگرے میں اُن کی خاصی جائداد بھی تھی ۔ آمدنی بھی اچھی خاصی تھی ۔ غالب کا ابتدائی زمانہ اُن کے ساتھ آرام اور اطمینان سے گذرا ۔ اس زمانے میں وہ احباب کی صحبتوں میں اچھا وقت گذارتے ۔ ان کے ساتھ مل کر رات رات بھر شطرنج اور چوسر کھیلتے ۔ بارہ دری میں احباب کے ساتھ اُن کی نشست رہتی ۔ کوٹھوں پر چڑھتے ، پتنگ اُڑاتے اور پینچ لڑاتے ۔ ان مشاغل کے ساتھ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں ان کے ایسے مشاغل بھی رہتے ہوں گے جن کا ذکر کرنا ضروری نہیں ہوتا ۔

غالب نے کچھ تو ماحول کے اثر سے بچپن اور عنفوان شباب کے زمانے میں زندگی کے اس انداز کو اختیار کیا - کچھ اُس غم کو غلط کرنے کے لیے جو باپ اور چچا کی بے وقت موت سے انھیں اُٹھانا پڑا تھا ۔ غالب شطرنج کھیل کر اور پتنگ اُڑا کر در حقیقت اُسی غم کو بھلانا چاہتے تھے جو اُس زمانے میں ان پر مسلط تھا ۔ اس لیے اُن کی یہ راہ روی، زندگی اور اس کے حقائق سے کسی حد تک ایک فرار کی حیثیت بھی رکھتی ہے ۔

اسی صورت حال نے غالب کی شخصیت میں رومانیت کا رنگ بھرا اور یہ رومانیت زندگی بھر سائے کی طرح ان کے دم کے ساتھ رہی ۔ اس رومانیت نے غالب کی شخصیت میں عجب عجب گل کھلائے !

اکرام صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ :

"مرزا کا عنفوان شباب رنگ رلیوں سے بھرا ہوا تھا ۔ اور ان کی

۱- انتخاب خطوط غالب : صفحہ ۳۵ - ۳۶

یاد بھی ایک لحاظ سے نشاط انگیز تھی - لیکن مرزا کو اُن کا خمیازہ بڑا سخت اُٹھانا پڑا - اور جب وہ ٹھنڈے دل سے اُن ایّام کی بے حاصلی اور اوقات عزیز کی تلفی پر غور کرتے تو دل میں رنج و کرب اور مایوسی کی لہر دوڑ جاتی - ہم 'مہر نیم روز' سے وہ اقتباس درج کر چکے ہیں جس میں انھوں نے اپنی بے راہ روی پر اور اُن قیمتی لمحوں کی یاد میں جو بے نتیجہ بلکہ مفرد دلچسپیوں میں تلف ہوئے، آنسو بہائے ہیں - ان احساسات کا اظہار اشعار میں بھی کئی جگہ ہے - ایک فارسی مثنوی جو مرزا کی باطنی کشمکش کا آئینہ ہے اور جو کسی ایسے زمانے میں لکھی گئی، جب وہ کوشش اور ہمت سے اپنے آپ کو انحطاط اور مایوسی کے گڑھے میں سے نکال رہے تھے اور اپنی پراگندہ قوتوں کو جمع کر کے اپنے آپ کو ایک بلند تر مطمح نظر کے قابل بنا رہے تھے - وہ اسی زمانے کی نسبت لکھتے ہیں :

گرمیٔ خونت کہ ازیں پیش بود
صرف بر انداختن خویش بود

آتش ہنگامہ بہ جاں داشتی
داغ مغاں شیوہ بتاں داشتی

بود بہ پیچ و خم سودائے کار
کار تو چوں زلف بتاں تار و مار

بس کہ ہمی تیرہ تر از شام بود
روز تو داغ دل ایام بود

چشم پریشاں نظرے داشتی
جلوہ بہ ہر رہ گذرے داشتی

بس کہ بلا بر اثر انداختی
دیدہ بصد جا سپر انداختی

زاں ہمہ اجزاء زمانی کہ رفت
واں ہمہ خوں نابہ فشانی کہ رفت

ہر چہ کنوں می رسدم در نظر
شاہد و شعر است و شراب و شکر

چرخ بسا روز بہ گشت ایں چنیں
آہ زعمرے کہ گذشت ایں چنیں!

۳

غالب نے اپنی زندگی کا ابتدائی زمانہ جس ماحول میں بسر کیا ہے اُس سے ظاہر ہے کہ اُن کی تعلیم و تربیت معقول طریقے پر ، باقاعدگی کے ساتھ نہیں ہو سکتی تھی ۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کی تعلیم کی طرف اس زمانے میں کسی نے توجہ کی ہی نہیں ۔ کیونکہ ننھیال میں یقیناً اُن کی تعلیم کا خیال رکھا گیا ہو گا اور انھوں نے اس زمانے کے روایتی انداز میں تعلیم حاصل کرنی شروع کی ہو گی ۔ یہ اور بات ہے کہ صحیح ماحول نہ ملنے کی وجہ سے تعلیم میں ان کا دل نہ لگا ہو—اور وہ لہو و لعب کی زندگی کی وجہ سے اُس کی طرف پوری طرح توجہ نہ کر سکے ہوں ۔

حالی نے اُن کی تعلیم کے بارے میں صرف اتنی معلومات فراہم کی ہے کہ :

"شادی کے بعد تک اُن کی مستقل سکونت آگرے ہی میں رہی اور شیخ معظم جو اُس زمانے میں آگرے کے نامی معلموں میں سے تھے ، اُن سے تعلیم پاتے رہے ۔ اُس کے بعد ایک شخص پارسی نژاد جس کا نام آتش پرستی کے زمانے میں ہرمزد تھا اور بعد میں مسلمان ہونے کے عبدالصمد رکھا گیا غالباً آگرے میں سیاحانہ وارد ہوا جوکہ دو برس تک مرزا کے پاس اول آگرے میں اور پھر دلی میں مقیم رہا ۔ مرزا نے اُس سے فارسی زبان میں کسی قدر بصیرت پیدا کی ۔ اگرچہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے ، اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے ۔ چونکہ مجھ کو لوگ بے اُستادا کہتے تھے ، اُن کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک

۱- شیخ محمد اکرام : "غالب" (آثار غالب) : صفحہ ۲۵ - ۲۶

فرضی اُستاد گھڑ لیا ہے ۔ مگر اس میں شک نہیں کہ عبد الصمد فی الواقع ایک پارسی نژاد آدمی تھا ، اور مرزا نے اُس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی۔ چنانچہ مرزا نے جابجا اُس کے تلمذ پر اپنی تحریروں میں فخر کیا ہے اور اُس کو بہ لفظ تیمسار جو پارسیوں کے ہاں نہایت تعظیم کا لفظ ہے ؛ یاد کیا ہے ۔ لیکن جیسا کہ مرزا نے اپنی بعض تحریروں میں تصریح کی ہے ، مرزا کی چودہ برس کی عمر تھی جب عبدالصمد اُن کے مکان پر وارد ہوا ہے اور کل دو برس اُس نے وہاں قیام کیا ۔ پس جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا کو کس عمر میں اُس کی صحبت میسر آئی اور کس قدر قلیل مدت اُس کی صحبت میں گذری تو عبدالصمد اور اُس کی تعلیم کا عدم وجود برابر ہو جاتا ہے ۔ اس لیے مرزا کا یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ مجھ کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے'' ۔[1]

مولوی محمد معظم کے بارے میں کوئی خاص معلومات کسی لکھنے والے نے فراہم نہیں کی ۔ حالی نے جو کچھ لکھا ہے ، اُسی کو مختلف لکھنے والوں نے دہرایا ہے ۔ مالک رام نے لکھا ہے :

''اس زمانے میں مولوی محمد معظم کی ذات آگرہ میں مرجع خاص و عام تھی ۔ مرزا غالب نے بھی ابتدائی فارسی تعلیم انہیں سے حاصل کی ۔ مولانا حالی نے ایک دلچسپ واقعہ اُس زمانے کا لکھا ہے کہ مرزا غالب نے ایک فارسی غزل میں ''چہ'' کے معنوں میں ''کہ چہ'' ردیف لکھی اور اپنے اُستاد کو دکھائی ۔ مولوی معظم نے ردیف کو مہمل کہہ دیا ۔ مگر جب تھوڑے دن بعد مرزا نے ظہوری کے کلام سے اُس کی سند پیش کی تو اپنے ہونہار شاگرد کی خدا داد ذہانت اور جدت کے قائل ہو گئے'' ۔[2]

اگرچہ وثوق سے کوئی بات نہیں کہی جا سکتی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگرے میں اُس وقت کسی مکتب میں مولوی محمد معظم بچوں کو تعلیم دیتے ہوں گے ۔ غالب کو بھی اُن کی ننھیال والوں نے اسی مکتب میں

۱- حالی : یادگار غالب : صفحہ ۱۳ - ۱۴

۲- مالک رام : ذکر غالب : صفحہ ۲۵

ابتدائی تعلیم کے لیے بھیج دیا ہوگا اور اُنھوں نے ابتدائی تعلیم ان سے حاصل کی ہوگی ۔

ہرمزد یا عبدالصمد کے بارے میں یقیناً بعض لکھنے والوں نے اچھی خاصی معلومات فراہم کی ہے ۔ مالک رام نے خود غالب کی تحریروں 'لطائف غیبی'، 'درفش کاویانی' اور 'تیغ تیز' وغیرہ کو سامنے رکھ کر عبدالصمد کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ خاصی اہمیت رکھتا ہے وہ لکھتے ہیں:

''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مرزا غالب کو فارسی زبان سے قدرتی لگاؤ تھا مگر اس ذوق کو چمکایا عبدالصمد ایرانی نے۔ جیسا کہ مرزا نے خود لکھا ہے 'ملا عبدالصمد ساسان پنجم کی نسل سے ایک امیر زادۂ جلیل القدر تھے ۔ وہ یزد کے رہنے والے اور نسلاً زردشتی تھے ۔ اور اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر اسلام پر ایمان لے آئے تھے ۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے اُن کا نام ہرمزد تھا ۔ وہ ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ع) میں سیر و سیاحت کرتے ہوئے ہندوستان آئے اور آکبر آباد وارد ہوئے۔' مرزا غالب کی عمر اس وقت چودہ برس کی تھی ۔ مرزا نے انھیں اپنے ہاں ٹھہرایا اور دو برس تک ان سے تعلیم حاصل کی ۔ ملا عبدالصمد کی مادری زبان فارسی تھی ۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے وہ زردشتی مذہب کے موید تھے اور زردشتیوں کا تمام مذہبی سرمایہ قدیم فارسی میں ہے ۔ اس لیے اُن کا فارسی زبان کا فاضل ہونا چنداں تعجب کا مقام نہیں ۔ اس کے علاوہ وہ عربی کے بھی عالم تھے ۔ اور انھوں نے سال ہا سال تک علمائے عرب و بغداد سے علوم عربیہ حاصل کیے تھے ۔ پس گو یہ سچ ہے کہ مرزا کی فارسی دانی کا سنگ بنیاد مولوی محمد معظم کے ہاتھوں رکھا گیا تھا لیکن اس عمارت کی تکمیل ملا عبد الصمد کے جابک دست اور ماہر ہاتھوں سے ایسے شاندار طریقے پر ہوئی کہ وہ آسمان سے باتیں کرنے لگی ۔ ملا عبدالصمد نے ہندوستان سے واپس چلے جانے کے بعد بھی مرزا غالب سے خط و کتابت جاری رکھی''[۱] ۔

لیکن قاضی عبدالودود صاحب نے 'ہرمزد ثم عبدالصمد' کے عنوان

۱- مالک رام : ذکر غالب : صفحہ ۲۶

سے جو مقالہ لکھا ہے اُس میں طویل بحث کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے :

''عبدالصمد غالب کا زائیدۂ طبع ہے ۔ بہت سی باتوں میں اپنے آفریدگار سے مشابہ ہے ۔ غالب افراسیابی ہیں تو عبدالصمد دارابی ، غالب دہلی کے رئیس زادے ہیں تو وہ یزد کا امیر زادہ ۔ تصوف سے دونوں کو لگاؤ ہے اور توحید وجودی کے دونوں قائل ہیں ۔ معلمی کسی کا پیشہ نہیں۔ لیکن جوہر قابل ملے تو اس کی تربیت کے لیے دونوں آمادہ ہیں ۔ منطق و فلسفہ اور علوم عربیہ میں عبدالصمد کا تبحر اُسے غالب سے ممیز کرتا ہے ۔ یہ وہ علوم ہیں جن سے اپنی ناواقفیت کا احساس غالب کو بہ شدت تھا ۔ یہ کمی عبدالصمد میں پوری ہوئی ۔ ایک بات میں غالب کو بھی عبدالصمد پر فوقیت ہے ۔ عبدالصمد راز داں تو ہے مگر راز گوئی کا شوق نہیں رکھتا ۔ غالب میں دونوں باتیں جمع ہیں ۔ اس لیے غالب نے ساسان ششم کا لقب اپنے لیے محفوظ رکھا''[۱]

مالک رام صاحب کا خیال زیادہ قرین قیاس ہے ۔ لیکن بہر حال اس موضوع پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے ۔

یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ غالب نے نظیر اکبر آبادی کے مکتب میں بھی تعلیم حاصل کی تھی ۔ لیکن اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا ۔ غالباً یہ غلط فہمی اس وجہ سے پیدا ہو گئی کہ قطب الدین باطن نے جو تذکرہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے جواب میں لکھا تھا ، اس میں غالب کو نظیر کا شاگرد لکھ دیا ۔ لیکن باطن نے جس انداز میں اس شاگردی کا ذکر کیا ہے ، اُس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے اور انھوں نے صرف شیفتہ پر وار کرنے کی غرض سے یہ سب کچھ لکھا اور یہ بات بعض حلقوں میں پھیل گئی ۔ مالک رام نے لکھا ہے :

''باطن کے آخری الفاظ' 'اب خواہ شاگردی سے انکار کریں یا شاید اقرار کریں' خاص طور پر قابل غور ہیں ۔ یہ باطن کے دل کا چور ہے جو چھپ نہ سکا ۔ صاف ظاہر ہے کہ انھیں خود

---

۱ ۔ قاضی عبدالودود : ہرمزد ثم عبدالصمد : (احوال غالب) : صفحہ ۲۵۶

اپنے کبھی کا یقین نہیں ۔ اگر نظیر کی شاگردی مسلم تھی تو غالب انکار کیوں کرنے لگے تھے ۔"[1]

غالب کو بچپن میں جو اُستاد ملے انھوں نے اُن کے دل میں فارسی زبان سے دلچسپی کی شمع فروزاں کر دی اور انھوں نے اس کی روشنی میں زندگی بھر اس زبان کا مطالعہ کیا اور اس میں پوری طرح مہارت حاصل کی ۔ اُن کی فارسی تحریریں اس بات کو صحیح ثابت کرتی ہیں بقول مولانا غلام رسول مہر :

"غالب کی مختلف تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں فارسی زبان کے قواعد اور تاریخ پر کامل عبور حاصل تھا ۔ اساتذہ کے دواوین نظم و نثر نظر سے گذر چکے تھے ۔ حافظہ غیر معمولی تھا ۔ جو کتاب ایک مرتبہ دیکھ لیتے اُس کے تمام ضروری حصے یاد ہوجاتے ۔ سرعت فہم کا یہ عالم تھا کہ مشکل سے مشکل مسائل کو صرف سرسری طور پر دیکھ کر حل کر لیتے ۔"[2]

غالب نے اپنی تعلیم اور خاص طور پر فارسی زبان کی تعلیم اور اس سے دل چسپی کی وضاحت اپنے بعض خطوط میں کی ہے ۔ لکھتے ہیں :

"میں نے ایّام دبستان نشینی میں 'شرح مائۃ عامل' تک پڑھا ۔ بعد اس کے لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور و عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا ۔ فارسی زبان سے لگاؤ اور سعر و سخن کا ذوق فطری و طبعی تھا ۔ ناگاہ ایک شخص ساسان پنجم کی نسل میں سے معہذا منطق و فلسفہ میں مولوی فضل حق مرحوم کا نظیر اور مومن موحد صوفی صافی تھا ، میرے شہر (آگرہ) میں وارد ہوا ۔ اور لطائف فارسی بحث (خالص فارسی) و آمیزش عربی در غوامض فارسی آمیختہ بہ عربی) اس سے میرے حالی ہوئے ۔ سونا کسوٹی پر چڑھ گیا ۔ ذہن معوج نہ تھا ۔ زبان داری سے بے پیوند ازلی اور اُستاد مبالغہ جاماسپ عہد بزرچمہر عصر تھا ۔

---

۱ - مالک رام : ذکر غالب : صفحہ ۲۹

۲ - مولانا غلام رسول مہر : غالب : صفحہ ۲۹

حقیقت اس زبان کی دل نشین و خاطر نشان ہوگئی''۱ -

''بندہ پرور! مہربانی نامہ آیا - سر پر رکھا - آنکھوں سے لگایا - فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول مناسبت طبیعت کی ہے - پھر تتبع کلام اہل زبان لیکن نہ اشعار قتیل و واقف و شعرائے ہندوستان کہ یہ اشعار سوائے اس کے کہ ان کو موزونی طبع کا نتیجہ کہیے اور کسی تعریف کے شایاں نہیں ہیں - نہ ترکیب فارسی نہ معنی نازک ہاں الفاظ فرسودہ عامیانہ جو اطفال دبستان جانتے ہیں - جب رودکی ، عنصری و خاقانی و رشید و طواط اور اُن کے امثال و نظائر کا کلام بالاستیعاب دیکھا جائے اور اُن کی ترکیبوں سے آشنائی بہم پہنچے اور ذہن اعوجاج کی طرف نہ لے جائے تب آدمی جانتا ہے کہ ہاں فارسی یہ ہے -''۲

ان تحریروں سے صاف ظاہر ہے کہ ان کا لکھنے والا نہ صرف یہ کہ فارسی زبان سے گہری دل چسپی رکھتا ہے بلکہ اس بات کی وضاحت بھی ہوتی ہے کہ اُس کو اس زبان اور اُس کے ادب کے معاملات و مسائل پر پوری قدرت حاصل ہے -

اگرچہ اس بات کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا کہ غالب نے مختلف علوم کس طرح حاصل کیے لیکن اُن کی تحریروں سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ انھیں نجوم اور طب وغیرہ سے دل چسپی تھی اور وہ ان علوم کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو پیش کرنے پر قدرت رکھتے تھے - چودھری عبدالغفور کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

''چودھری صاحب شفیق مکرم کی خدمت میں بعد ارسال سلام مسنون عرض کرتا ہوں کہ آپ نے ذرہ پروری اور درویش نوازی کی ورنہ میں سزاوار ستائش نہیں ہوں - ایک سپاہی زادۂ ہیچ مداں اور پھر دل افسردہ و روح کاواں فرسودہ - ہاں ایک طبع موزوں فارسی زبان سے لگاؤ رکھتا ہوں ---- کیا آپ مجھ کو بے ہنری اور ہیچ میرزی میں صاحب کمال نہیں جانتے - اور اس عبارت فارسی کو میرا مصداق

۱- انتخاب خطوط غالب : صفحہ ۳۹ -

۲- ایضاً : صفحہ ۳۸ -

حال نہیں مانتے - 'بیش ملا طبیب و بیش طبیب ملا' - بیش ہیچ ہر دو بیش ہر دو ہیچ---آرایش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف کچھ نجوم لگا رکھا ہے - اور سوائے موزونیٔ طبع کے یہاں میں کیا رکھا ہے - بہر حال علم نجوم کے قاعدے کے موافق جب زمانے کے مزاج میں فساد کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں تب سطح پر یہ شکلیں دکھائی دیتی ہیں - جس طرح برج میں یہ نظر آئے اس کا درجہ و دقیقہ دیکھتے ہیں - پھر ذو ذنبہ کار اور طریقہ دیکھتے ہیں - ہزار طرح کی جال ڈالتے ہیں - تب ایک حکم نکالتے ہیں - شاہجہان آباد میں بعد غروب آفتاب اول میزان میں تھا تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ صورت عقرب میں ہے - درجہ و دقیقہ کی حقیقت نہ معلوم رہی- بہت دن شہر میں اس ستارے کی دھوم رہی- اب دس بارہ دن سے نظر نہیں آتا - وہاں شاید اب نظر آتا ہے جو آپ نے اس کا حال پوچھا ہے - بس میں جانتا ہوں کہ یہ صورتیں قہر آلٰہی کی ہیں - اور دلیلیں ملک کی تباہی کی -''[۱]

ایک خط میں نواب کلب علی خاں کو طب کے بعض معاملات کی طرف اس طرح توجہ دلاتے ہیں :

''میں طبیب نہیں مگر تجربہ کار ہوں - خدا جانے اور طبیب کیا سمجھتے ہوں گے کہ کیا تھا - میرے نزدیک بہ اشتراک معدہ و قلب یہ مرض طاری ہوا تھا - اب آپ کو حفظ صحت کے واسطے گاہ گاہ نارجیل دریائی اور جدوار کا استعمال ضروری ہے اور معجون طلائی عنبری تقویت قلب میں مجوزہ حکیم بو علی خاں مغفور سے ورق طلا عنبر الشہب ، عرق کیوڑہ ، قند ، کثرت اجزا اس ترکیب خاص میں نا پسند - کثر الاجزا اور معجونیں عنبری ہیں - مفرح بو علی سینا ، خمیرہ مروارید ، خمیرہ گاؤ زباں ، ماء اللحم غیر مشمسی جس میں طیور کے گوشت ادویہ مفرح و مقوی حرارت و برودت میں معتدل ڈالی جائیں - گاہ گاہ سکنجبین و گلاب پی لیا کیجیے- غذا اپنی گوشت طیور اکثر ، بیضۂ نیم برشت اکثر - لیکن

۱- انتخاب خطوط غالب : صفحہ ۳۰ -

یہ خیال رہے کہ بیضۂ مرغ و لحم طیورایک جلسہ میں تناول نہ فرمائیے ۔ بکری کے گوشت کے ساتھ بیضۂ مرغ جائز اور لذیذ اور مرغوب ۔ پودینے کا عرق ، چھوٹی الائچی کا عرق ہمیشہ دوا خانے میں موجود رہے ۔"[1]

غرض اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ غالب کی تعلیم اگرچہ بچپن میں باقاعدگی کے ساتھ نہ ہو سکی لیکن انھیں ایسے اُستاد ضرور ملے جن کی وجہ سے اُن کے دل میں فارسی زبان سے دل چسپی کی شمع فروزاں ہوئی اور انھوں نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنے ذوق و شوق کے سہارے اس زبان کے قواعد کو سمجھنے اور اُس کے ادبی معاملات و مسائل کو سلجھانے کا شعور پیدا کر لیا ۔ اور نہ صرف یہ بلکہ اپنی ادبی تحریروں کو فکری اعتبار سے وقیع اور ہمہ گیر بنانے کے لیے نجوم اور طب وغیرہ کا علم بھی حاصل کیا۔ اور ساتھ ہی دینی علوم میں بھی خاطر خواہ دل چسپی لی ۔ اور تصوف اور فلسفے کے معاملات و مسائل پر غور کرنے کا مذاق بھی پیدا کر لیا ۔

یہ تمام باتیں غالب کی شخصیت میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں !

۴

غالب کی عمر ابھی تیرہ سال کی تھی کہ ۱۲۲۵ھ میں ان کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی چھوٹی بیٹی اُمراؤ بیگم سے ہوگئی۔ امراؤ بیگم کی عمر اس وقت گیارہ سال تھی ۔ نواب الٰہی بخش خاں معروف نواب احمد بخش خاں والئی فیروز پور جھرکا رئیس لوہارو کے چھوٹے بھائی تھے ۔ معروف اپنے زمانے کے معروف شاعر تھے اور شاہ نصیر کے شاگرد تھے ۔ اس رشتے سے غالب کی زندگی میں بڑی حد تک اعتدال پیدا ہوا اور وہ جو کیفیت آ گرے میں تھی وہ خاصی حد تک کم ہوگئی ۔ کیونکہ شادی کے دو تین سال بعد انھوں نے مستقل طور پر دلی میں قیام کیا ۔ چنانچہ اب ان کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا ۔

۱- مکاتیب غالب : صفحہ ۶۲ - ۶۳ ۔

زندگی کی اس تبدیلی کے متعلق مرزا علاءالدین احمد خاں کو اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں :

''ہرچند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا - ۱۳ برس حوالات میں رہا - ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا - ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور شہر دلی کو زندان مقرر کیا ، اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا - کل نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد جیل خانے سے بھاگ‌ تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا - پایان کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی مجبس میں بٹھا دیا - جب یہ دیکھا کہ یہ قیدی گریزپا ہے دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں - پاؤں بیڑی سے فگار ، ہاتھ ہتکڑیوں سے زخم دار ، مشقت مقرری اور مشکل ہوگئی - طاقت یک قلم زائل ہوگئی - سال گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ ، مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑ آیا - اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا - بھاگوں کیا ، بھاگنے کی طاقت بھی نہ رہی۔''[1]

لیکن غالب کی اس قسم کی تحریریں ، بقول مولانا مہر : ''ان کی طبعی شوخی ، فطری مزاح اور بذلہ سنجی کا نتیجہ ہیں - جو کچھ جی میں آتا تھا ، بے تکلف کہہ دیتے تھے ــــــ واقعہ یہ ہے کہ غالب کو اپنی بیوی سے بڑی محبت تھی - بیوی بھی شوہر کی راحت و آسائش پر اپنی جان قربان کرتی تھی - اگرچہ دونوں کے طرز زندگی میں نمایاں فرق تھا - غالب فطرتاً رند تھے - بیگم بے حد پرہیزگار اور عبادت گزار خاتون تھیں - خواجہ حالی نے لکھا ہے کہ بیگم نے از رہ کمال اتقا اپنے کھانے پینے کے برتن الگ کر لیے تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ غالب کم از کم شرب و نوش کے باب میں متقی نہ تھے - اس کے باوجود طرفین میں گہری محبت آخری دم تک قائم رہی۔''[2]

۱ - غالب : اردوئے معلی ۱ : صفحہ ۳۰۱ -
۲ - غلام رسول مہر : غالب : صفحہ ۵۹--۶۰ -

حمید احمد خاں صاحب نے اپنے ایک مضمون میں غالب کی بیوی اور ان کی ازدواجی زندگی کے بعض پہلوؤں کی بڑی خوبصورت تصویر کھینچی ہے۔ لکھتے ہیں :

''یہ کہانی ۱۷۹۹ء سے شروع ہوتی ہے، جب دہلی کے ایک شریف با اقبال گھرانے میں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام امراؤ بیگم رکھا گیا ۔ امراؤ بیگم کے باپ مرزا الٰہی بخش خاں کو شہزادوں کا سا عیش و آرام میسر تھا ۔ جوانی میں مرزا الٰہی بخش خاں کی زندگی کا ڈھنگ ایسا تھا کہ ''وہ شہزادہ گل فام'' کے عرف سے مشہور تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی بیٹی کی پرورش کس ناز و نعمت کے عالم میں ہوئی ہوگی۔ جب امراؤ بیگم گیارہ برس کی ہوئی تو اس زمانے کے دستور کے مطابق اس کا بیاہ ہوگیا ۔ اس کا دولھا میرزا اسد اللہ بیگ خاں جو عمر میں اس سے صرف دو برس بڑا تھا ، آگرے کا ایک امیر زادہ تھا ؛ سفید فام ، خوش شکل ، خوش گفتار ۔ خیال یہ تھا کہ اسد اللہ بیگ جوان ہو کر باپ دادا کی طرح سپہ گری کی زندگی اختیار کرے گا اور امراؤ بیگم کو میکے کا امیرانہ ٹھاٹھ سسرال میں بھی حاصل رہے گا ۔ لیکن یہ اُمیدیں پوری نہ ہوئیں ۔ اسد اللہ بیگ خاں نے زر و مال کمانے کی کوئی سبیل نہ کی اور تمام عمر بیکاری میں ، یا بیکار قسم کے شعر لکھنے میں گزار دی ۔ چوبیس پچیس برس کی عمر کو پہنچنے کے بعد اُمراؤ بیگم نے پھر کبھی بے فکری کے دن نہ دیکھے ۔ بلکہ حالات بد سے بد تر ہوتے گئے ۔ شوہر کی طرف سے کوئی آرام اگر قسمت میں نہ تھا تو اولاد کی خوشی ہی نصیب ہوتی ۔ لیکن بچپن کے اچھے دنوں کے بعد تقدیر نے امراؤ بیگم سے نیک سلوک کرنے کی گویا قسم کھائی تھی ۔ سات بچے پیدا ہوئے مگر کسی کی عمر برس سوا برس سے زیادہ نہ ہوئی اور سبھی ایک ایک کرکے ماں کے دل کو دائمی جدائی کا داغ دے گئے ۔ شوہر جیسا بھی تھا نباہ تو کیے جا رہا تھا ۔ لیکن یہاں بھی آخر عمر میں قسمت نے بے وفائی کی ۔ شوہر کے ہاتھوں پیوند خاک ہونا اُمراؤ بیگم کو نصیب نہ ہوا ۔ بڑھاپے میں اسے

بیوگی کا صدمہ دیکھنا پڑا - اور اس کے ساتھ ہی شوہر کی مالی پریشانیاں خود اسے ورثے میں مل گئیں - اُمراؤ بیگم کا شوہر انتقال کے وقت آٹھ سو روپے کا مقروض تھا - اب بوڑھی بیوہ حیران تھی کہ یہ قرضہ کس طرح اور کہاں سے ادا کرے گی - سرکاروں ، درباروں میں استمداد کے لیے عرضیاں بھجوائی گئیں - ان عرضیوں کا مضمون پڑھنے والوں کو آج بھی درد ناک معلوم ہوتا ہے - لیکن سرکاروں درباروں میں کوئی اثر نہ ہوا - آخر ۱۸۷۰ء میں میرزا الٰہی بخش معروف کی ناز پروردہ بیٹی پریشان روزگار بے اولاد ، بے شوہر دنیا سے رخصت ہوئی''۔[1]

اس میں شبہ نہیں کہ ناسازگار معاشی حالات کی وجہ سے غالب کی ازدواجی زندگی نا خوش‌گوار ضرور رہی ، پھر اولاد کے زندہ نہ رہنے نے اس کو کچھ اور بھی نا خوش گوار بنا دیا ـــــــ یہی وجہ ہے کہ وہ شروع سے آخر تک ایک اندوہناک داستان نظر آتی ہے -

غالب کے سات بچے ہوئے لیکن ان میں سے ایک بھی پندرہ مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہا - یہ ایسا غم تھا جس کی وجہ سے غالب کی شخصیت میں ساری زندگی ایک سلگنے والی کیفیت رہی - ایک خط میں میاں داد خاں سیاح کو اُن کے بیٹے کی وفات پر خط لکھتے ہیں تو اُس میں بھی اپنے صدمے کا ذکر کرتے ہیں - لکھتے ہیں :

''تمہارے ہاں لڑکے کا پیدا ہونا اور اُس کا مر جانا معلوم ہو کر مجھ کو بہت غم ہوا - بھائی ! اس داغ کی حقیقت مجھ سے پوچھو کہ ۷۴ برس کی عمر میں ۷ بچے پیدا ہوئے - لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی - اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہ ہوئی - تم ابھی جوان ہو - حق تعالیٰ تمہیں صبر اور نعم‌البدل دے -''[2]

اس تحریر کے ایک ایک لفظ سے وہ حسرت ٹپکتی ہے جو زندگی بھر غالب کے دم کے ساتھ رہی اور اس غم کا اندازہ ہوتا ہے جو دوسرے

---

۱ - پروفیسر حمید احمد خاں : اُمراؤ بیگم : (احوال غالب) : صفحہ ۳۶۷-۳۶۸

۲ - غالب : اردوئے معلّٰی : صفحہ ۱۵

غموں کے ساتھ زندگی بھر سائے کی طرح ان کا پیچھا کرتا رہا ۔

غالب نے اپنے اس غم کو غلط کرنے کے لیے اپنے بھانجے زین العابدین خاں عارف کو گود لے لیا اور انھیں پالا لیکن عارف جوانی ہی میں چل بسے اور غالب کو ایک ایسا غم دے گئے جس کو وہ ساری زندگی نہ بھلا سکے ۔

عارف کے انتقال کے بعد غالب نے ان کے دو بیٹوں حسین علی خاں اور باقر علی خاں کو اپنے ساتھ رکھا اور بڑی محبت اور لاڈ پیار سے انھیں پالا ۔ یہاں تک کہ سفر تک میں انھیں ساتھ لے گئے۔ اپنے خطوں میں ان کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

''سنو صاحب ! یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں عارف مرحوم میرا فرزند تھا ۔ اب اُس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں ، میرے پاس آ رہے ہیں اور دم بہ دم مجھ کو ستاتے ہیں۔ میں تحمل کرتا ہوں ۔ خدا گواہ ہے کہ تم کو اپنا فرزند سمجھتا ہوں ۔ پس تمہارے نتائج طبع میرے معنوی پوتے ہوئے ۔ جب اس عالم کے پوتوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے ۔ مجھ کو دوپہر کو سونے نہیں دیتے ۔ ننگے ننگے پاؤں پلنگ پر رکھتے ہیں ۔ کبھی پانی لڑھکاتے ہیں ۔ کبھی خاک اُڑاتے ہیں ۔ میں تنگ نہیں آتا تو ان معنوی پوتوں سے کہ ان میں یہ باتیں نہیں ہیں ، کیوں گھبراؤں ؟''

(خط بہ نام منشی ہرگوپال تفتہ)

''اندر باہر سب روزہ دار ہیں ۔ یہاں تک کہ بڑا لڑکا باقر علی خاں بھی ۔ ایک میں اور میرا بیٹا حسین علی خاں روزہ خور ہیں ۔ وہی حسین علی خاں جس کا روزمرہ ہے کھلونے منگا دو ۔ میں بھی بجار جاؤں گا ۔''

(خط میر مہدی مجروح کے نام)

''لڑکے دونوں اچھی طرح ہیں ۔ کبھی میرا دل بہلاتے ہیں کبھی مجھ کو ستاتے ہیں ۔ بکریاں ، کبوتر ، بٹیریں ، تکل ، کنکوا سب سامان درست ہے ۔ فروری کے مہینے میں دو دو روپے دیے ، دس دن میں اُٹھا ڈالے ۔ پھر پرسوں چھوٹے صاحب آئے کہ

دادا جان ! کچھ ہم کو قرض حسنہ دو ۔ ایک روپیہ دونوں کو قرض حسنہ دیا گیا ۔ آج ۱۳ ہے ۔ دیکھیے کتنے بار قرض لیں گے۔''

''دونوں برخوردار گھوڑوں پر سوار چل دیے ۔ میں چار گھڑی دن رہے ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا ۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا ۔ گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا ۔ میں نے چھٹانک بھر گھی داغ دیا ۔ دو شامی کباب اُس میں ڈال دیے ۔ رات ہو گئی تھی ۔ شراب پی لی ۔ کباب کھا لیے ۔ لڑکوں نے اوپر کی کھچڑی پکوائی ۔ خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی ۔ بارے آج تک دونوں بھائیوں میں موافقت ہے ۔ آپس کی صلاح مشورے سے کام کرتے ہیں ۔ اتنی بات زائد ہے کہ حسین علی منزل پر اُتر کر پاپڑ اور مٹھائی کے کھلونے خرید لاتا ہے ۔''

(خط بنام نجف خاں)

''آج صبح کو سات بجے باقر علی خاں اور حسین علی خاں مع چودہ مرغ ، چھ بڑے ، آٹھ چھوٹے کے دلی کو روانہ ہوئے ۔ دو آدمی میرے اُن کے ساتھ تھے ۔''[۱] (خط بہ نام علاء الدین احمد خاں)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب میں کتنی انسانیت تھی ۔ وہ اپنے متعلقین کا کتنا خیال رکھتے تھے اور اُن سے کس درجہ محبت کرتے تھے ۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ اولاد کے زندہ نہ رہنے کی وجہ سے ان کی زندگی میں ایک خلا تھا ۔ وہ زندگی بھر اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کرتے رہے ۔ اور انھوں نے اس تنہائی کے زہر کو اس طرح زائل کرنے کی کوشش کی جو اولاد کے غم کی وجہ سے ان کی شخصیت میں بری طرح سرایت کر گیا تھا ۔

شادی کے بعد دلی کا قیام غالب کی زندگی میں کئی لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے ۔ اس زمانے میں ان کی زندگی میں اعتدال اور ٹھہراؤ پیدا ہوا ۔ جذباتی آسودگی نصیب ہوئی ۔ رفاقت اور محبت کا سہارا ملا ۔ تنہائی دور

۱۔ بحوالہ مولانا غلام رسول مہر ، غالب : صفحہ ٦٧

ہوئی ۔ خاندان کی زندگی کا تجربہ ہوا ــــ اور اس طرح وہ بے راہ روی جو ان کے مزاج کا جزو بن گئی تھی ، اُس کے اثرات بڑی حد تک چھٹ گئے۔ اگرچہ اس زمانے میں انھیں مختلف طرح کے غموں نے گھیرے رکھا لیکن انھوں نے ان غموں کو جھیلنا اور ان کو زندگی کے لیے گوارا بنانا سیکھا ۔ اور ایک بے چین روح ان کے اندر بیدار ہوئی ۔ اُنھوں نے زندگی کو بسر کرنا، اس کو برتنا اور اس کو بسر کرنے اور برتنے کے لیے نا سازگار حالات سے لڑنا اور ایک نئی زندگی کی تعمیر و تشکیل کے لیے جد و جہد کرنا سیکھا ۔

پھر سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ دلی کے دوران قیام میں انھیں اُس ماحول میں زندگی بسر کرنے کا موقع ملا جو بہ قول حالی عہد اکبری اور عہد شاہجہانی کی یاد دلاتا تھا ۔ اس زمانے میں ایک ایسے طبقے سے ان کا تعلق رہا ۔ جو صحیح معنوں میں اس وقت کی تہذیب و ثقافت دین و مذہب ، ادب و شعر اور فکر و فلسفہ کا علم بردار تھا ۔ یہاں اُنھوں نے اس ماحول میں وقت گذارا جس کو حکیم احسن اللہ خاں، حکیم غلام نجف خاں، حکیم محمود خاں، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ ، مولانا فضل حق خیر آبادی ، مومن ، شاہ نصیر ، ذوق ، نیر رخشاں ، ظہیر ، مجروح ، عارف اور صہبائی وغیرہ کی شخصیتوں نے ہر اعتبار سے وقیع اور ہمہ گیر ، رنگین اور پرکار بنا دیا تھا ۔

غالب کی زندگی اور شخصیت میں ذہنی انقلاب کی ایک لہر بھی اسی ماحول نے پیدا کی اور وہ اسی کی بدولت اُس نئے احساس و شعور کے سب سے بڑے علم بردار بن گئے ، جس کا ایک طوفان اُس زمانے کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں موج زن تھا ۔

غالب کی شاعری کا آغاز آگرے ہی میں ہو چکا تھا ۔ مالک رام صاحب نے 'کلیات نثر غالب' اور'یادگار غالب' کے حوالےسے لکھا ہےکہ

''ابھی وہ مولوی محمد معظم کے مکتب میں پڑھتے تھے ، اور اُن کی عمر دس گیارہ برس سے زیادہ نہیں تھی کہ اُنھوں نے شعر کہنا شروع کیا ۔ اس زمانے کی ایک فارسی غزل کا بھی پتہ چلتا ہےمگر شروع میں ان کی توجہ زیادہ تر اُردو کی طرف رہی اور وہ بھی بیدل، اسیر، شوکت کے رنگ میں ۔ پچیس برس کی عمر تک تقریباً دو ہزار شعر کا ایک دیوان تیار ہوگیا ۔ اگر یہی روش رہتی تو ان کی ادبی موت میں

کیسے شبہ ہوسکتا تھا۔ لیکن غنیمت ہے کہ اُن کی خدا داد صلاحیت نے ان کی رہنمائی کی۔ اُنھوں نے یہ راہ ترک کر دی اور اس دیوان کو بھی نظر کر دیا۔ اس طرح گویا انھوں نے میر تقی میر کی یہ پیشن گوئی پوری کر دی کہ اگر اس لڑکے کو کوئی کامل اُستاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا۔ ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔ یہ کامل اُستاد ان کی طبع سلیم تھی یا بعض مخلص سخن شناس دوست، ورنہ شاعری میں وہ صحیح معنوں میں تلمیذالرحمٰن تھے اور کسی کی شاگردی کا احسان اُن کے سر پر نہیں۔"[1]

یہ بات تحقیق طلب ہے کہ میر نے غالب کا کلام دیکھا یا نہیں۔ اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں ملتا۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ بچپن میں غالب نے، ماحول کے اثر سے، شاعری کی طرف توجہ کی اور طرز بیدل میں ریختہ لکھنا شروع کیا۔ اگرچہ اس زمانے میں اُنھوں نے اُردو کی طرف خاص طور پر توجہ کی اور فارسی میں شعر نہیں کہے لیکن اُن کے اُردو کلام میں اس وقت فارسی اثرات بہت گہرے تھے۔ حالی نے لکھا ہے:

"مرزا کے ابتدائی اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو طبعیت کی مناسبت سے اور زیادہ تر ملا عبدالصمد کی تعلیم کے سبب، فارسیت کا رنگ ابتدا ہی سے مرزا کی بول چال اور ان کی قوت متخیلہ پر چڑھ گیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر ذکی‌الطبع لڑکے ابتدا میں سیدھے سادے اشعار کی نسبت مشکل اور پیچیدہ اشعار کو، جو بغیر غور و فکر کے آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے، زیادہ شوق سے دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ مرزا نے لڑکپن میں بیدل کا کلام زیادہ دیکھا تھا۔ چنانچہ جو روش مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختیار کی تھی اُسی روش پر مرزا نے اُردو میں چلنا اختیار کیا۔"[2]

یہ باتیں ابھی تحقیق طلب ہیں کہ غالب نے کس کے اثر سے، کن

۱۔ مالک رام: ذکر غالب: صفحہ ۳۱۔

۲۔ حالی: یادگار غالب: صفحہ ۹۹۔

لوگوں کی صحبتوں میں شاعری شروع کی اور انھوں نے ابتدائی زمانے میں کس سے اصلاح لی ؟ ۔ اور یہ کہ بیدل کے اثرات اس زمانے کے کلام میں اتنے گہرے کیوں ہوئے ؟۔قیاس یہ کہتا ہے کہ بچپن میں لہو و لعب کی زندگی ہی کے زیر اثر اُنھوں نے شاعری سے دلچسپی لی ہوگی اور خود شعر کہنا بھی شروع کیا ہوگا ۔ پھر اُس زمانے میں آگرے کی سر زمین پر جو شعری اور ادبی ماحول تھا، اُس نے بھی اُنھیں متاثر کیا ہوگا۔ اس وقت آگرے میں شعر و شاعری کا اچھا خاصا ماحول موجود تھا ۔ نظیر اکبر آبادی کو اگرچہ اونچے طبقے کے افراد درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے ۔ لیکن بہر صورت آگرے میں ان کا ایک حلقہ موجود تھا ، اور اس حلقے نے اپنے محدود دائرے ہی میں سہی ، شاعری کی ایک فضا پیدا ضرور کر دی تھی ۔ اس کے اثرات براہ راست نہیں تو بالواسطہ طور پر غالب پر ضرور ہوئے ہوں گے ۔

جب غالب آگرے کو چھوڑ کر دلی پہنچے تو وہاں کے شعری اور علمی ماحول نے شاعری کی اس آتش شوق کو کچھ اور بھی بھڑکایا ۔ دلی میں اُس وقت ذوق ، شاہ نصیر ، مومن اور شیفتہ وغیرہ نے شاعری کی ایک فضا قائم کر دی تھی ۔ اور شاعروں کے علاوہ شعر و شاعری سے دلچسپی رکھنے والے عالم بھی خاصی تعداد میں اس سر زمین پر موجود تھے ۔ ان میں حکیم احسن اللہ خاں ، حکیم محمود خاں اور مولانا فضل حق خیر آبادی کے نام لیے جا سکتے ہیں ۔ غالب نے ، ظاہر ہے کہ ان سب سے اثر قبول کیا ہوگا ۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی ماحول کے اثر سے دلی میں اُن کی شاعری نے ایک نیا رنگ اختیار کیا اور اُس میں وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ رکھ رکھاؤ پیدا ہوتا گیا ۔ یہاں تک کہ وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے اور اہم شاعر ہو گئے ۔ اکرام صاحب نے لکھا ہے :

”قیام دہلی کا جو اثر ان کی شاعری پر ہوا وہ بہت واضح اور نمایاں ہے ۔ آگرے میں شعر اور شعر فہم حضرات کی وہ کثرت نہ تھی جو دہلی میں تھی ۔ اور غالب کے عجیب و غریب اشعار پر جب لوگ معترض ہوتے تو وہ انھیں خاطر میں نہ لاتے ـــــ لیکن جب مرزا دہلی آئے اور مولانا فضل حق اور دوسرے مسلمہ اُستادوں نے انھیں ان اشعار کے حسن و قبح سے آگاہ کیا تو مرزا کو اُن کے علم و فضل کے سامنے سر جھکانا پڑا ـــــ مرزا غالب کے منتخب

دیوان ریختہ کے بارے میں آزاد کا خیال ہے کہ یہ انتخاب مولانا فضل حق اور مرزا خانی کوتوال دہلی نے کیا ۔ مرزا کے بیانات اور معاصرانہ تذکروں سے خیال ہوتا ہے کہ انتخاب خود غالب نے کیا ۔ غالباً یہ خیال درست ہے ۔ لیکن مرزا کے ابتدائی اور بعد کے طرز شاعری میں اتنا فرق ہے کہ یہ بیان بعد از قیاس معلوم نہیں ہوتا کہ مرزا کی شاعری میں جو عظیم الشان تبدیلی ہوئی اُس میں کسی خارجی رہنمائی کو بھی دخل تھا اور بقول مرزا انھوں نے اپنا طرز خاص اس لیے ترک کیا کہ اُسے یاروں نے چلنے نہ دیا ۔"[1]

صحیح صورت حال جو کچھ بھی ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ، ماحول کے اثر سے ، غالب نے اپنی شاعری میں تبدیلیاں کیں اور اس میں ایک ارتقائی عمل جاری رہا ۔ اِس نے زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنے دامن میں جگہ دی اور جمالیاتی اعتبار سے بھی اپنے آپ کو دل نشیں بنایا ۔ اور اس طرح وہ بہت تھوڑے عرصے میں ایک عظیم شاعر تصوّر کیے جانے لگے ۔

لال قلعہ اس زمانے میں تہذیب و ثقافت اور شعر و ادب کا مرکز تھا ۔ لیکن ایک زمانے تک غالب کو ایک شاعر کی حیثیت سے قلعے میں باریابی حاصل نہیں ہوئی ۔ کیونکہ اس زمانے میں وہاں ذوق کا طوطی بولتا تھا ، اور وہ بہادر شاہ ظفر کے اُستاد تھے ۔ کبھی کبھی مشاعروں میں شرکت کے لیے تو غالب قلعے میں بلائے جاتے تھے لیکن اس سے زیادہ اُن کی رسائی نہیں تھی ۔ ۱۸۵۰ء تک وہ قلعے سے علیحدہ رہے ۔ اُس کے بعد ، ان کی ناسازگار مالی حالت کو دیکھ کر ، شیخ نصیر الدین کالے میاں اور حکیم احسن اللہ خاں نے ان کی سفارش کی اور وہ تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے پر مامور ہوئے ۔ مولانا مہر لکھتے ہیں :

"شاہ دہلی نے شیخ نصیر الدین عرف کالے میاں اور حکیم احسن اللہ خاں کی سفارش پر ۱۸۵۰ء میں غالب کو تیموری خاندان کی تاریخ لکھنے کے لیے مقرر کیا تھا ، اور نجم الدولہ ، دبیر الملک ، نظام جنگ کے خطابات کے علاوہ خلعت اور پچاس روپے ماہانہ تنخواہ مقرر کی تھی ۔ یہ تنخواہ آغاز جولائی ۱۸۵۰ء سے لے کر آخر اپریل

۱- اکرام : آثار غالب : صفحہ ۵۱-۵۲ ۔

۱۸۵۷ء تک ملتی رہی - حکیم احسن اللہ خان جمع و تحقیق حالات پر مامور تھے - جو کچھ لکھ کر دیتے ، غالب اس کو بہار آفرین نثر کا جامہ پہنا دیتے- ۱۸۵۲ء تک تاریخ کا پہلا حصہ ، جو ابتدائے آفرینش سے لے کر ہمایوں بادشاہ کی وفات تک کے حالات پر مشتمل تھا ، مکمل ہوا - اس کا نام 'مہر نیم روز' تھا - دوسرے حصے میں اکبر کی تخت نشینی سے لے کر بہادر شاہ ثانی تک کے حالات مدون کرنے کی تجویز تھی - اس کا نام غالب نے 'ماہ نیم ماہ' رکھا تھا - لیکن یہ حصہ شروع نہ ہوا اور غدر کی آگ بھڑک اٹھی جس نے تیموری خاندان کے رفت و وجود ہی کو راکھ بنا ڈالا -"[۱]

ذوق کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفر نے غالب سے با قاعدہ اصلاح بھی لی - مولانا حالی لکھتے ہیں :

"۱۲۷۱ھ میں جب کہ شیخ ابراہیم ذوق کا انتقال ہو گیا بادشاہ کے اشعار کی اصلاح بھی مرزا سے متعلق ہو گئی تھی - مگر معلوم ہوتا ہے کہ مرزا اس کام کو بادل نا خواستہ سر انجام کرتے تھے - ناظر حسین مرزا مرحوم کہتے تھے کہ ایک روز میں اور مرزا صاحب دیوان عام میں بیٹھے تھے کہ چوب دار آیا اور کہا کہ حضور نے غزلیں مانگی ہیں - مرزا نے کہا ذرا ٹھہر جاؤ - اور اپنے آدمی سے کہا کہ 'پالکی میں کچھ کاغذ رومال میں بندھے ہوئے رکھے ہیں ، وہ لے آؤ' وہ فوراً لے آیا - مرزا نے جو اُسے کھولا تو اُس میں سے آٹھ نو پرچے جن پر ایک ایک دو دو مصرعے لکھے ہوئے تھے ، نکالے - اور اسی وقت دوات قلم منگوا کر ان مصرعوں پر غزلیں لکھنی شروع کیں - اور وہیں بیٹھے بیٹھے آٹھ یا نو غزلیں تمام و کمال لکھ کر چوب دار کے حوالے کیا - ناظر جی مرحوم کہتے تھے کہ ان تمام غزلوں کے لکھنے میں اُن کو اس سے زیادہ دیر نہیں لگی کہ ایک مشّاق اُستاد چند غزلیں صرف کہیں کہیں اصلاح دے کر درست کر دے - جب چوب دار غزلیں لے کر چلا گیا تو مجھ سے کہا کہ 'حضور کی کبھی کبھی

۱- مولانا غلام رسول مہر : غالب : صفحہ ۲۰۱ -

کی فرمائشوں سے آج مدّت کے بعد سبک دوشی ہوئی ہے' ۔[۱]

دلی کی ادبی زندگی میں غالب کو نمایاں مقام حاصل تھا ۔ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ انھیں اپنے زمانے میں درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا ۔ اس وقت کے ادبی اور سعری ماحول کے علم بردار اُن کی عزت کرتے تھے اور وہ بھی اُن کو عزیز رکھتے تھے ۔ ذوق اور مومن کی شاعری کو اس زمانے میں بڑی اہمیت دی جاتی تھی ۔ اُن کے انتقال پر غالب نے جو کچھ لکھا ہے ، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان کو کتنا عزیز رکھتے تھے اور خود اُن کے دلوں میں غالب کی کتنی عزت تھی ۔

ذوق کے انتقال پر منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں :

''یہاں کا حال تازہ یہ ہے کہ میاں ذوق مر گئے ۔ حضور والا نے ذوق شعر و سخن ترک کیا ۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ شخص اپنی وضع کا ایک اور اس عصر میں غنیمت تھا ۔''[۲]

مومن کے انتقال پر ان تاثرات کا اظہار کرتے ہیں :

''سنا ہو گا تم نے کہ مومن خاں مر گئے ۔ آج اُن کو مرے ہوئے دسواں دن ہے ۔ دیکھو بھائی ! ہمارے بچے مرے جاتے ہیں ۔ ہمارے ہم عمر مرے جاتے ہیں ۔ قافلہ چلا جاتا ہے اور ہم پا در رکاب بیٹھے ہیں ۔ مومن خاں میرا ہم عصر تھا ، اور یار بھی تھا ۔ بیالیس تینتالیس برس ہوئے ، یعنی چودہ چودہ پندرہ پندرہ برس کی میری اور اس کی عمر تھی ، کہ مجھ میں اور اس میں ربط پیدا ہوا ۔ اس عرصے میں کبھی کسی طرح کا رنج و ملال درمیان نہیں آیا ۔ حضرت ! چالیس برس کا دشمن بھی نہیں پیدا ہوتا ۔ دوست تو کہاں ہاتھ آتا ہے ؟ یہ شخص بھی اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا ۔ طبیعت اُس کی معنی آفریں تھی ۔''[۳]

غالب کی ادبی زندگی کا سب سے اہم واقعہ 'برہان قاطع' اور 'قاطع برہان' کے ہنگامے کا ہے ۔ حالی لکھتے ہیں :

۱- حالی : یاد گار غالب : صفحہ ۳۲ ۔

۲- انتخاب خطوط غالب : صفحہ ۱۲۱ ۔

۳ ایضاً : صفحہ ۱۲۲ ۔

''جب مرزا 'دستنبو' کو ختم کر چکے ، اور اب بھی تنہائی اور سناٹے کا وہی عالم رہا ، اُس وقت سوا اس کے اور کیا چارہ تھا کہ دوات اور قلم کو مونس و رفیق سمجھیں ، اور کچھ لکھ پڑھ کر اپنا غم غلط کریں اور دل بہلائیں ۔ مرزا کے پاس اُس وقت سوائے 'برہان قاطع' اور 'دساتیر' کے کوئی کتاب موجود نہ تھی ۔ 'برہان' کو اُٹھا کر سرسری نظر سے دیکھنا شروع کیا ۔ پہلی ہی نگاہ میں کچھ بے ربطیاں سی معلوم ہوئیں ۔ پھر زیادہ غور سے دیکھا تو اکثر لغات کی تعریف غلط پائی ۔ ایک ایک لفظ مختلف صورتوں سے لکھا دیکھا ۔ شعرا نے جو الفاظ بہ طور مجاز و کنایہ کے استعمال کیے ہیں ، اُن کا ذکر بہ طور مستقل لغات کے دیکھا ۔ طریقۂ بیان اکثر بھونڈا ، اور اصول لغات نگاری کے خلاف پایا ۔ بہت سے لغات کی ایسی تفسیر بھی دیکھی جس کے معنی بالکل سمجھ میں نہ آئے ۔ مرزا نے یاد داشت کے طور پر ، جو مقام قابل اعتراض نظر آئے ، اُن کو ضبط کرنا شروع کیا ۔ شدہ شدہ وہ ایک کتاب بن گئی جس کا نام 'قاطع برہان' رکھا گیا ۔ اور ۱۲۷۶ھ میں چھپ کر شائع ہوئی ۔ پھر مرزا نے ۱۲۷۷ھ میں بہ اضافہ دیگر مضامین و فوائد اس کو دوسری بار چھپوایا ، اور اُس کا نام 'درفش کاویانی' رکھا ۔''[۱]

یہ کتاب چھپی تو غالب کے خلاف ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور لوگوں نے ان کی مخالفت شروع کر دی ۔ چنانچہ 'محرق قاطع' ، 'قاطع قاطع' 'موید برہان' ، 'ساطع برہان' کے نام سے کئی رسالے لکھے گئے ۔ اس مخالفت کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ غالب نے ان غلطیوں کی طرف اشارہ کرکے اپنے نئے مزاج کو ظاہر کیا تھا اور جو لوگ پرانی لکیر کے فقیر تھے ، وہ اس کو برداشت نہیں کر سکتے تھے ۔ دوسرے ایک بات یہ بھی تھی کہ غالب نے کہیں کہیں ایسا لہجہ اختیار کیا تھا جس میں شوخی کے عناصر نمایاں تھے ۔ اس لہجے کو لوگ برداشت نہ کر سکے ۔

غالب نے اس ہنگامے کا مقابلہ بڑی ہمت سے کیا ۔ جتنے لوگوں نے

۱- حالی : یادگار غالب : صفحہ ۳۸ ۔

ان کی مخالفت میں لکھا ، انھوں نے ان سب کے جواب دیے ، اور ان میں بھی اپنی شوخی اور ظرافت کے لہجے کو باقی رکھا ۔ اس سے ان کے ادبی مزاج ، ظرافت طبع اور احساس مزاح کا اندازہ ہوتا ہے ۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ غالب بنیادی طور پر ایک شاعرانہ اور ادبی مزاج رکھتے تھے ۔ انھوں نے زندگی ایک شاعر اور ادیب کی حیثیت سے بسر کی اور اپنی زندگی کا زیادہ زمانہ شعر و ادب کی تحقیق میں صرف کیا ۔ بچپن سے اس کام کا سلسلہ شروع ہوا اور مرتے دم تک جاری رہا ۔ اس کام کو وہ ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کے بغیر با قاعدگی اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے ۔ اُنھوں نے اپنے زمانے کے ثقافتی ، تہذیبی ، اور شعری و ادبی معاملات و مسائل سے دل چسپی لی ۔ اور اُن کے بارے میں نہ صرف اظہار خیال کیا ، بلکہ وہ ان سب کو آگے بڑھانے اور پروان چڑھانے میں پیش پیش رہے ۔ اپنے زمانے کی ادبی شخصیتوں سے وہ متأثر ہوئے اور انھوں نے خود ان شخصیتوں سے اثر قبول کیا ۔ اس زمانے کے مفکروں ، عالموں ، ادیبوں اور شاعروں سے اُن کے گہرے تعلقات رہے اور اُنھوں نے اُن کے ساتھ مل کر ادب و شعر کا صحیح ماحول پیدا کیا ۔

اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنے زمانے میں ادبی ہنگامے بھی برپا کرتے رہے اور ان ہنگامہ آرائیوں نے اُن کے زمانے کی ادبی اور شعری زندگی کو جولانی سے ہم کنار کیا ۔

غالب کی شخصیت اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے اور جو کام اُنھوں نے اپنے زمانے کی ادبی اور شعری زندگی میں انجام دیا ہے ، اُس میں ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا ۔

اس اعتبار سے وہ ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں ۔

۶

غالب کی زندگی مسلسل جد و جہد کی ایک نہایت ہی الم ناک اور خوں چکاں ، لیکن دلآویز اور دل‌نشیں داستان ہے ۔ الم‌ناک اور خوں چکاں اس وجہ سے کہ غالب کے ایسے عظیم شاعر کو فکر دنیا میں سر کھپانا پڑا اور غم روزگار کے ایسے ایسے تھپیڑے کھانے پڑے کہ زندگی کی کشتی

ڈولنے لگی اور دل‌آویز و دل‌نشیں اس وجہ سے کہ غالب کی قوت ارادی اور جہد مسلسل کے عزم مصمم نے اس کو ، خوں چکانی کے باوجود ایسا رنگین اور پروقار بنا دیا کہ وہ آج بھی دیکھنے والوں کے لیے زندگی اور جولانی سے قریب ہونے کا سامان فراہم کرتی ہے ۔

آگرے کا قیام غالب کے لیے مالی اعتبار سے غالباً اُن کی زندگی کا سب سے اچھا زمانہ ہے ۔ قیام دلی کا ابتدائی زمانہ بھی اس لحاظ سے برا نہیں ہے ۔ کیونکہ اس زمانے میں انھیں ساڑھے سات سو روپیہ نواب احمد بخش خاں کی طرف سے پنشن کے ملتے تھے ۔ الور سے بھی کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی والدہ بھی ان کو کچھ نہ کچھ دیتی رہتی تھیں— لیکن یہ صورت حال زیادہ عرصے تک باقی نہ رہی ۔

ہوا یہ کہ ۱۸۲۲ء میں نواب احمد بخش نے اپنی جائداد کا انتظام اس طرح کیا کہ فیروز پور جھرکہ کا علاقہ اُن کے بڑے بیٹے نواب شمس الدین احمد خاں کو ملا اور لوہارو کی جاگیر ان کے دو چھوٹے بیٹوں امین الدین خاں اور ضیاء الدین خاں کے حصے میں آئی—اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غالب کی پنشن نواب شمس الدین خاں کے پاس چلی گئی ۔ غالب کے تعلقات چونکہ امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں سے تھے۔ اس لیے اس کا اثر اُن کی پنشن پر پڑا ۔ کچھ عرصے تک تو اس کی ادائگی میں دشواریاں پیدا کی گئیں اور بالآخر ۱۸۳۱ء میں یہ پنشن بند کردی گئی ۔

ان حالات میں ظاہر ہے کہ غالب کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ۔ پھر سمند ناز پہ ایک اور تازیانہ یہ ہوا کہ ۱۸۲۶ء میں خواجہ حاجی کا انتقال ہو گیا ۔ غالب کا خیال یہ تھا کہ خواجہ حاجی کے انتقال کے بعد اُن کے حصے کے دو ہزار سالانہ کی رقم اُن کی طرف منتقل ہو جائے گی ۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا— جب اُن کے انتقال کے بعد یہ رقم اُن کے بیٹوں شمس الدین خاں عرف خواجہ جان اور بدرالدین عرف خواجہ امان کی طرف منتقل ہوئی تو غالب کو یہ بات ناگوار ہوئی اور انھوں نے اس فیصلے کو تبدیل کرانے کے لیے گورنر جنرل کے سامنے عرضداشت پیش کرنے کا ارادہ کیا ۔ اور اسی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کلکتے کے سفر کا منصوبہ بنایا ۔

مالک رام صاحب کے خیال میں غالب ۱۸۲۶ء میں اور مولانا مہر کے خیال کے مطابق اپریل ۱۸۲۷ء میں دہلی سے کلکتے روانہ ہوئے ۔ راستے میں

لکھنئو میں بھی اُن کا قیام رہا - حالی نے لکھا ہے کہ :

''چونکہ لکھنئو کے ذی اقتدار لوگ مدت سے چاہتے تھے کہ مرزا ایک بار لکھنئو آئیں، اس لیے کان پور پہنچ کر انھیں یہ خیال آیا کہ لکھنئو بھی دیکھتے چلیے -''[۱]

بہر حال ۱۲۴۲ھ میں لکھنئو پہنچے - وہاں اُن کا شان دار استقبال کیا گیا اور بڑی آؤ بھگت ہوئی - آغا میر اس زمانے میں نائب السلطنت تھے - اُن سے ملاقات کی صورت پیدا ہوئی - لیکن جلدی میں قصیدہ نہ لکھ سکے - صنعت تعطیل میں نثر لکھ لی لیکن ملاقات کی نوبت نہیں آئی - کیونکہ غالب نے دو شرطیں پیش کر دیں - ایک تو یہ کہ آغا میر ان کی تعظیم کریں اور دوسری یہ کہ انھیں نذر پیش کرنے کے لیے مجبور نہ کیا جائے - ان شرائط کو تسلیم نہیں کیا گیا - اس لیے وہ آغا میر سے نہ مل سکے - ناسخ اور آتش اس زمانے میں لکھنئو کی سر زمین پر موجود تھے لیکن یہ بات تحقیق طلب ہے کہ غالب کی ملاقات ان سے ہوئی یا نہیں - صرف اتنا علم ہوتا ہے کہ لکھنئو والوں نے اُن کے اعزاز میں ایک مشاعرہ کیا اور اُس میں غالب نے غزل بھی پڑھی - اورکوئی گیارہ مہینے کے قریب لکھنئو میں اُن کا قیام رہا - اس زمانے میں جو غزل اُنھوں نے کہی اُس کے چند اشعار میں قیام لکھنئو کے متعلق حذ تاثرات کا اظہار اس طرح کیا ہے :''

لکھنئو آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوس سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہم کو

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو

غالب لکھنئو سے کان پور ہوتے ہوئے باندہ گئے - باندہ سے الہ آباد اور الہ آباد سے بنارس پہنچے اور وہاں قیام کیا - اس شہر سے وہ بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے اس کی تعریف میں ایک مثنوی 'چراغ دیر' لکھی -

---

۱- حالی : یادگار غالب : صفحہ ۲۵

اس میں بنارس کی تعریف اس طرح کی ہے :

تعالے اللہ بنارس چشم بد دور
بہشت خرم و فردوس معمور

بنارس را کسے گفتہ کہ چیں است
ہنوز از گنگ چینش بر جبین است

بیا اے غافل ! از کیفیت ناز
نگاہے بر پری‌زادانش انداز

ہمہ جانہائے بے تن کن تماشا
ندارد آب و خاک ایں جلوہ حاشا

نہاد شاں چو بوئے گل گراں نیست
ہمہ جانند جسمے درمیاں نیست

بتانش را ہیولا شعلۂ طور
سراپا نور ایزد چشم بد دور

میانہا نازک و دلہا توانا
ز نادانی بہ کار خویش دانا

تبسم بس کہ در لبہا طبعی است
دہن ہا رشک گل ہائے ربیعی است

بہ لطف ازٖ موج گوہر نرم رو تر
بہ ناز از خون عاشق گرم دو تر

بہ ساماں دو عالم گلستاں رنگ
ز تاب رخ چراغاں لب گنگ

قیامت قامتاں مژگاں درازاں
ز مژگاں در صف دل نیزہ بازاں

بنارس سے پٹنہ ہوتے ہوئے فروری ۱۸۲۸ء میں کلکتے پہنچے ۔ وہاں ایک مکان کرایہ پر لیا اور اس میں قیام کیا ۔ کلکتے سے بہت متاثر ہوئے اور اس شہر کے قیام کی یاد ہمیشہ اُن کے دل میں تازہ رہی ۔ جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے :

کلکتہ کا جو ذکر کیا تونے ہم نشیں !
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے مطرّا کہ اُف غضب
وہ نازنیں بتانِ خودآرا کہ ہائے ہائے

صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ اُف غضب
طاقت ربا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے

وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ وا
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

کلکتے میں غالب کے دوست سراج الدین احمد موجود تھے۔ اُن کی وجہ سے بھی اس شہر میں ان کا دل لگا۔

کلکتہ کے دوران قیام میں وہ ادبی ہنگامہ بھی ہوا جس کے بارے میں انہوں نے اپنی مشہور فارسی مثنوی 'باد مخالف' لکھی۔ یہ ہنگامہ بقول مولانا غلام رسول مہر غالب کی علمی اور ادبی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ:

''وہ شروع ہی سے قتیل ، واقف اور اس قماش کے دوسرے شعراء کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ لیکن کلکتہ میں اس رائے کے اظہار پر جو معرکۂ تعریضات گرم ہوا ، اُس نے غالب کے جذبۂ مخالفت میں بہت تندی ، تیزی اور تلخی پیدا کر دی۔ یہی جذبۂ مخالفت انجام کار 'قاطع برہان' کی شکل میں ظاہر ہوا جو غالب کی طرف سے فارسی دانانِ ہند کے درجۂ اسناد و اعتماد کے خلاف ایک بڑا جہاد تھا۔ اُن کے کلام نظم و نثر میں جا بجا قتیل ، واقف ، عبدالواسع ، غیاث الدین رام پوری اور اس قبیل کے دوسرے فرومایگانِ ذوق ادب کے خلاف جو تحقیر آمیز کلمات ملتے ہیں ، ان سب کی تیزی اور تندی کا سر چشمہ یہی کلکتہ والا ہنگامہ تھا۔''[1]

کلکتے میں انہوں نے پنشن کا مقدمہ گورنر جنرل کی کونسل میں پیش کیا لیکن جواب یہ ملا کہ چونکہ یہ مقدمہ دلی میں ریذیڈنٹ کے سامنے پیش ہو چکا ہے ، اس لیے اس کی رپورٹ پر مناسب کارروائی کی جائے گی۔ اس طرح غالب نے مایوسی کے عالم میں واپسی کا ارادہ کیا اور فروری ۱۸۲۹ع میں دلی واپس پہنچے۔

غالب کے دلی واپس پہنچنے کے چند سال بعد ۱۸۳۵ع میں دلی کے ریذیڈنٹ ولیم فریزر کے قتل کا واقعہ پیش آیا۔ اور تفتیش سے یہ ثابت ہوا کہ اس

۱۔ مولانا غلام رسول مہر : غالب : صفحہ ۱۱۸

قتل میں نواب شمس الدین احمد خان کا ہاتھ ہے ۔ چنانچہ تحقیقات کے بعد فریزر کے قاتل کریم خاں اور اس کے ساتھ ہی شمس الدین احمد خاں کو پھانسی دے دی گئی اور اُن کی ریاست کو بہ حق سرکار ضبط کر لیا گیا ۔

اس واقعے کے بعد غالب کو ساڑھے سات سو روپیہ سالانہ کی پنشن دہلی کے کلکٹر کی طرف سے ملنے لگی، لیکن یہ فیصلہ ہوا کہ وہ اس سے زیادہ کے حق دار نہیں ہیں ۔ غالب اس مقدمہ کو گورنر جنرل تک لے گئے لیکن انہیں کامیابی نہیں ہوئی ۔ آخر ۱۸۴۳ع میں ایک عرض داشت ملکہ وکٹوریا کو بھی بھیجی لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا ۔

یہ زمانہ غالب پر مالی اعتبار سے بہت سخت تھا اور وہ بڑی پریشانیوں کے شکار تھے ۔ لیکن اس عالم میں بھی اُن کا یہ حال تھا کہ جب ۱۸۴۲ع میں انہیں دہلی کالج کی مدرسی پیش کی گئی تو انھوں نے صرف اسی بنا پر اُس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ مسٹر ٹامسن نے اُن کا خاطر خواہ استقبال نہیں کیا تھا ۔ اس سے غالب کے احساس برتری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔

۱۸۴۷ع میں غالب کو اپنی زندگی کے سب سے زیادہ افسوسناک واقعے سے دو چار ہونا پڑا یعنی وہ قمار بازی کے الزام میں گرفتار کیے گئے ، ان پر مقدمہ چلایا گیا اور انھیں چھ ماہ قید با مشقت کی سزا دی گئی ۔ لیکن صرف تین مہینے قید میں رہنے کے بعد ڈاکٹر راس کی سفارش پر انھیں رہا کردیا گیا ۔ اس واقعے سے اُن کی عزت کو ٹھیس لگی اور اس نے زندگی کو ان کے لیے ایک عذاب بنا دیا ۔ حالی نے 'یادگار غالب' میں غالب کے ایک فارسی خط کا ترجمہ درج کیا ہے جس سے اس ذہنی کیفیت کی وضاحت ہوتی ہے جو اس واقعے کے بعد غالب پر طاری ہوئی تھی ۔ لکھتے ہیں :

''کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف ، فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں ۔ باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے ، میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا اور میری قید کا حکم صادر کر دیا ۔ شش جج باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا ، اس نے بھی اغماز اور تغافل اختیار کیا ۔ صدر میں اپیل کیا گیا مگر کسی نے نہ سنا اور وہی حکم بحال رہا

پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گذر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی آ گیا۔ اور حکم صدر میں میری رہائی کی رپورٹ بھیجنے پر اُس کی بہت تعریف کی۔ اور میری خاکساری اور آزاد روی سے اُس کو مطلع کیا ۔ یہاں تک کہ اُس نے خود بخود میری رہائی کی رپورٹ بھیج دی ۔ اگرچہ میں اس وجہ سے کہ ہر کم کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا ۔ جو کچھ گزرا اُس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے، اُس پر راضی ہوں ۔ مگر آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں ہے ۔ میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں ۔ روم ہے ، مصر ہے ، ایران ہے ، بغداد ہے ۔ یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانۂ رحمتہ للعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے ۔ دیکھیے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گذری ہوئی قید سے زیادہ جاں فرسا ہے نجات پاؤں ، اور بغیر اس کے کوئی منزل مقصود قرار دوں، سر بصحرا نکل جاؤں، یہ ہے جو کچھ کہ مجھ پر گذرا اور یہ ہے جس کا میں آرزو مند ہوں ۔"[1]

غرض یہ کہ غالب کی زندگی کے یہ پچیس تیس سال اُن کے لیے بہت سخت تھے ۔ اس زمانے میں اُن کی زندگی ایک بے سروسامانی کے عالم میں گزری مالی مشکلات نے اُن کا زندہ رہنا مشکل کردیا ۔ پھر اُن کے پاؤں میں چکر رہا ۔ وہ لکھنئو ، بنارس ، الہ آباد اور کلکتے میں مارے مارے پھرے ۔ لیکن جس مقصد سے انھوں نے یہ سب کچھ کیا تھا ، اُس کا نتیجہ کچھ نہ نکلا اور ناکام دلی واپس آئے ۔ پھر رہی سہی کسر اسیری کے واقعے نے پوری کر دی اور اُنکی عزت و آبرو کو خاک میں ملا دیا ۔

غالب کی شخصیت کی بڑائی اس میں ہے کہ اُنھوں نے ان تمام ناسازگار حالات کا مقابلہ نہایت خندہ پیشانی اور جرأت سے کیا اور کبھی ہمت نہ ہاری ۔ جہد مسلسل اُن کا شعار رہا اور جینے، زندہ رہنے اور زیست کرنے کی

۱- حالی : یادگار غالب : صفحہ ۲۷ - ۲۸

آرزو اُن کا نصب العین !
اور یہ اُن کی شخصیت کا شاید سب سے اہم پہلو ہے !

۲

غالب پر زندگی میں جو مصیبتیں پڑیں اور حالات نے ان کے دل پر جو کاری زخم لگائے ، ان کی تلافی اگرچہ کسی حد تک اس سے ہوگئی تھی کہ ۱۸۵۰ء میں وہ نصیرالدین عرف میاں کالے صاحب اور حکیم احسن اللہ خاں کی سفارش پر قلعے کے ساتھ منسلک ہوگئے تھے ۔ بہادر شاہ ظفر نے نجم الدولہ ، دبیر الملک ، نظام جنگ ، کہہ کر انہیں مخاطب کیا تھا اور شاہان تیموری کی تاریخ "مہر نیم روز" لکھنے کی خدمت ان کے سپرد کی تھی ۔ پچاس روپے ماہانہ مشاہرہ مقرر کیا تھا ۔ اس کے علاوہ ولی عہد سلطنت میرزا فخرو بھی ان کے شاگرد ہوگئے تھے اور چار سو روپے سالانہ تنخواہ ان کی طرف سے بھی انہیں مل جاتی تھی۔ پھر نومبر ۱۸۵۴ء میں جب ذوق کا انتقال ہوا تھا تو غالب ، شاہ ظفر کے باقاعدہ استاد ہوگئے تھے ۔ واجد علی شاہ کی طرف سے بھی انہیں پانچ سو روپے سالانہ کی رقم مل جاتی تھی ۔ لیکن یہ سکون و اطمینان بالکل وقتی اور عارضی تھا ۔ کیونکہ ۱۸۵۶ء میں میرزا فخرو کا انتقال ہوگیا ، اسی سال واجد علی شاہ معزول کر دیے گئے اور انہیں مٹیا برج بھیج دیا گیا ۔ پھر قیامت یہ ہوئی کہ ۱۸۵۷ء میں ہنگامہ ہوگیا جس کو ہندوستان کی تاریخ میں غدر کا نام دیا جاتا ہے لیکن جو درحقیقت سیاسی طاقت کو ایک دفعہ پھر حاصل کرنے کے لیے ، مسلمانوں کی ایک اضطراری اور غیر منظم کوشش تھی ۔ وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکے، انہیں شکست ہوئی اور اس شکست کے نتیجے میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کا سارا نظام درہم برہم ہوگیا ۔ بہادر شاہ ظفر معزول کرکے رنگون میں جلا وطن کر دیے گئے ۔ سینکڑوں کو پھانسی دے دی گئی ۔ ہزاروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا ۔ یہ سب کچھ اس وقت کی زندگی کے لیے آشوب قیامت سے کسی طرح کم نہ تھا ۔

یہ تمام مناظر غالب نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور یہ موج خون ان کے سر سے بھی گزری ۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلے نہیں۔ یہ زمانہ غالب پر کچھ اور بھی سخت گزرا ۔ آمدنی کے ذرائع مسدود ہو گئے تھے ۔ ہرگوپال تفتہ ، شیوجی رام اور بال مکند نے اس زمانے میں ان کی مدد کی

لیکن دلی کے اجڑنے ، مسلمانوں کے تباہ ہونے ، احباب کے بچھڑنے ، ایک معاشرے کے بکھرنے اور ایک تہذیب کے منتشر ہو جانے کا جو صدمہ انھیں ہوا ، اس کی وجہ سے ان کی حیثیت داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی ایک شمع کی سی ہوگئی ۔

غالب نے اس رستخیز بے جا کے حالات اور اپنے تاثرات 'دستنبو' کے نام سے ایک رسالے میں قلم بند کیے ہیں ۔ اس میں مئی ۱۸۵۷ع سے لے کر جولائی ۱۸۵۸ع تک کے واقعات ، حالات اور تاثرات کی تفصیل ہے ۔ اس رسالے سے غالب کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے ۔ اس لیے اس کے چند اقتباسات کا اردو ترجمہ یہاں دے دینا نا مناسب نہ ہوگا ۔ لکھتے ہیں :

''اس سال جس کا مادۂ تاریخی بہ رعایت تخرجہ' 'رستخیز بے جا' ہے ۔ اور اگر صاف صاف پوچھو تو ۱۶ رمضان ۱۲۷۳ھ کو پیر کے دن دوپہر کے وقت مطابق ۱۱ مئی ۱۸۵۷ع اچانک دہلی کے قلعے اور فصیل کی دیواریں لرز اٹھیں ، جس کا اثر چاروں طرف پھیل گیا ۔ میں زلزلے کی بات نہیں کر رہا ہوں ۔ اس دن ، جو بہت منحوس تھا ، میرٹھ کی فوج کے بد نصیب اور شوریدہ سر سپاہی شہر میں آئے ۔ نہایت ظالم و مفسد ، انگریزوں کے خون کے پیاسے ، شہر کے مختلف دروازوں کے محافظ جو ان فسادیوں کے ہم پیشہ اور بھائی بند تھے ، بلکہ تعجب نہیں کہ پہلے ہی ان محافظوں اور فسادیوں میں سازش ہوگئی ہو ۔ شہر کی حفاظت کی ذمہ داری اور حق نمک ہر چیز کو بھول گئے ۔ ان بن بلائے یا مدعو کردہ مہمانوں کو خوش آمدید کہا ۔ ان مدہوش سواروں اور اکھڑ پیادوں نے جب دیکھا کہ شہر کے دروازے کھلے ہیں اور محافظ مہمان نواز ہی دیوانوں کی طرح ادھر ادھر دوڑ پڑے ۔ جدھر کسی افسر کو پایا اور جہاں ان قابل احترام انگریزوں کے مکانات دیکھے ، جب تک افسروں کو مار نہیں ڈالا اور ان مکانات کو بالکل تباہ نہیں کر دیا اُدھر سے رخ نہیں پھیرا ۔ ہر شخص غم گین و ماتم زدہ اپنے گھر میں بیٹھ رہا ۔ انھیں غم زدہ لوگوں میں سے ایک میں بھی ہوں ۔ میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ شور و غوغا سنا ۔ چاہتا تھا کہ معلوم کروں کہ اتنے

میں شور مچ گیا کہ اندرون قلعہ صاحب ایجنٹ بہادر اور قلعہ دار قتل کر دیے گئے ۔ ہر طرف سے پیادوں اور سواروں کے دوڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں ۔ زمین ہر طرف گل اندامون (یعنی انگریزوں) کے خون سے رنگین ہوگئی ۔ باغ کا ہر گوشہ ویرانی اور بربادی کے سبب سے بہادروں کا مدفن بن گیا ۔"[1]

جب ہنگامہ ختم ہوا اور انگریزوں کی فتح ہوئی تو بے شمار لوگ پھانسی پر چڑھا دیے گئے ۔ غالب نے اس کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے :

"اس قدر میں قید خانہ شہر سے باہر ہے اور حوالات اندرون شہر ۔ ان دونوں میں بے شمار لوگوں کو بھر دیا گیا ہے ۔ ان دونوں قید خانوں کے جن قیدیوں کو مختلف دنوں میں پھانسی دے دی گئی ہے ، ان کی تعداد فرشتہ؟ موت ہی جانتا ہے ۔ شہر میں ایک ہزار سے زیادہ مسلمان نہیں پاؤ گے ۔ میں بھی ان میں سے ایک ہوں ۔ جو لوگ شہر سے نکل کر چلے گئے ہیں ، ان میں سے کچھ لوگ اس قدر دور نکل گئے ہیں گویا وہ اس سر زمین (دہلی) کے باشندے تھے ہی نہیں ۔ بہت سے عالی مرتبہ لوگ شہر کے اردگرد دو دو چار چارکوس پر ٹیلوں، گڑھوں ، چھپروں اورکچے مکانوں میں اپنے نصیب کی طرح آنکھیں بند کیے ہوئے پڑے ہیں ۔"[2]

غالب نے 'دستنبو' میں اپنی نجی حالات بھی لکھے ہیں اور اس پُر آشوب زمانے میں جو کچھ پریشانیاں انھیں اُٹھانی پڑی ہیں ان کا ذکر بھی کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

"جس دن سے گورے مجھے پکڑ کر لے گئے تھے ، اُس دن کے علاوہ چوکھٹ پر قدم رکھنا ، گھر سے باہر نکلنا ، گلی یا بازار میں چلنا یا دور سے چوک کو دیکھ لینا نصیب نہیں ہوا ہے ۔"[3]

اسی زمانے میں ۲۹ صفر ۱۲۷۴ھ کی شب کو غالب کے چھوٹے بھائی یوسف مرزا کا انتقال ہوا ۔ مرنے سے قبل وہ کوئی تیس سال تک دیوانگی کی

١- غالب : دستنبو (ترجمہ) اُردو معلیٰ دہلی : صفحہ ۱۸۴

٢- ایضاً : صفحہ ۲۱۹

٣- ایضاً : صفحہ ۲۰۹

زندگی بسر کر چکے تھے ۔ غالب نے اُن کے مرنے کا حال اس طرح لکھا ہے :

"۱۹ اکتوبر کو پیر کے دن نے (جس کا نام ہفتے کے رجسٹر سے کاٹ دینا چاہیے) آتش فشاں اژدہے کی طرح دنیا کو نگل لیا ۔ اسی دن صبح کے وقت وہ کم بخت دربان بھائی کے مرنے کی خبر لایا ۔ کہتا تھا کہ وہ گرم رفتار راہ فنا (یوسف مرزا) پانچ دن تیز بخار میں مبتلا رہا اور آدھی رات کے قریب اس دنیا سے رخصت ہوگیا ۔ پانی ، رومال ، غسال ، گور کن ، اینٹ چونے ، گارے وغیرہ کا ذکر چھوڑو ۔ یہ بتاؤ میں کیسے جاؤں اور میت کو کہاں لے جاؤں ۔ کس قبرستان میں سپرد خاک کروں ۔ بازار میں اچھا برا کسی قسم کا کپڑا نہیں ملتا ۔ زمین کھودنے والے مزدور گویا کبھی شہر میں تھے ہی نہیں ۔ ہندو اپنے مردوں کو دریا کنارے لے جا کر جلا سکتے ہیں ۔ لیکن مسلمانوں کی کیا مجال ہے کہ دو تین شخص ساتھ ساتھ راستے سے گزریں ۔ چہ جائے کہ میت کو شہر سے باہر لے جائیں ۔ پڑوسیوں نے میری تنہائی پر رحم کیا اور اس کام کو انجام دینے کے لیے تیار ہوئے ، پٹیالے کے ایک سپاہی کو آگے کیا ، میرے دو نوکروں کو ساتھ لیا اور چل دیے ۔ میت کو غسل دیا ، دو تین سفید چادریں یہاں سے گھر لے گئے تھے ۔ ان میں لپیٹا اور مسجد میں جو مکان کے برابر تھی ، زمین کھودی میّت کو اس میں رکھ دیا اور اس گڑھے کو پاٹ کر لوٹ آئے ۔"[۱]

'دستنبو' میں غالب نے اس قسم کے بہت سے واقعات کو جمع کردیا ہے اور اس طرح یہ مختصر سی کتاب ان کی زندگی کے حالات اور اس زمانے کے واقعات کی ایک اچھی دستاویز بن گئی ہے ۔ اس میں شبہہ نہیں کہ اس میں غالب نے انگریزوں کا ذکر ہمدردی کے ساتھ کیا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اِس برعظیم کے حاکم بن چکے تھے ۔ لیکن اس سر زمین کے لوگوں پر جو تباہی آئی ، اس کا بیان بھی غالب نے بڑی شدت کے ساتھ کیا ہے ۔

جب غدر کا ہنگامہ ہوا ہے ، اس وقت غالب کی عمر باسٹھ سال تھی ۔ اس سے قبل بھی وہ اپنی زندگی کا بیشتر زمانہ پریشانیوں میں گزار چکے

۱ ۔ غالب : دستنبو : (ترجمہ) اردوئے معلٰی دہلی : صفحہ ۲۱۱

تھی ۔ اب غدر کی وجہ سے جو انتشار پیدا ہوا ، اس نے تو ان کی دنیا بالکل ہی اُجاڑ دی ۔ انھوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک حکومت کو دم توڑتے ہوئے اور ایک تہذیب کو انتشار کا شکار ہوتے ہوئے دیکھا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی بقیہ زندگی بڑی ہی ذہنی پریشانی اور کوفت کی حالت میں گزری ۔ زمانے کے غم نے انہیں کہیں کا نہ رکھا ۔

اس ہنگامے کے بعد غالب کا دربار رام پور سے تعلق گہرا ہو گیا ۔ ۱۸۵۹ء میں انھیں رام پور سے سو روپے مہینہ تنخواہ ملنا شروع ہوئی اور یہ سلسلہ انتقال کے وقت تک جاری رہا ۔ ۱۸۶۰ء میں وہ نواب یوسف علی خان کی دعوت پر رام پور گئے اور وہاں قیام کیا ۔ کچھ عرصے بعد دلی واپس آئے ۔ ۱۸۶۵ء میں نواب کلب علی خاں کی دعوت پر وہ پھر رام پور گئے اور کچھ عرصہ وہاں قیام کیا ۔

۱۸۷۰ء میں غالب کی پنشن بھی انگریزوں نے جاری کر دی اور دربار و خلعت کا بھی اجرا ہوا ۔ اس لیے مالی اعتبار سے یہ زمانہ غالب کے لیے کسی حد تک سازگار ثابت ہوا ۔

لیکن اب ان کے قویٰ نے جواب دے دیا تھا ۔ عمر بھی خاصی ہوچکی تھی ۔ زندگی میں صدمے بھی بہت اُٹھائے تھے ۔ پریشانیاں بھی بے شمار دیکھی تھیں ۔ دکھ بھی بہت جھیلے تھے ۔ جہد مسلسل نے بھی تھکا دیا تھا ۔ زمانے کے غم بھی بہت سہے تھے ۔ بیماریوں نے بھی آ گھیرا تھا ۔

زندگی کے اس دور کی صحیح تصویر ان کے آخری دور کے خطوں میں ملتی ہے ۔ میرزا تفتہ کو لکھتے ہیں :

"آؤ میرزا تفتہ ! میرے گلے لگ جاؤ ۔ بیٹھو اور میری حقیقت سنو ! سامعہ مرگیا تھا ۔ اب باصرہ بھی ضعیف ہوگیا ۔ جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں سب مضمحل ہیں ۔ حواس سراسر مختل ہیں ۔ حافظہ گویا کبھی نہ تھا ۔ شعر کے فن سے گویا کبھی مناسبت نہ تھی ۔"[1]

"بھائی ! وہ خط پہلا تم کو بھیج چکا ہوں کہ بیمار ہوگیا ۔ توقع زیست کی نہ رہی ۔ قولنج اور پھر کیسا شدید کہ پانچ پہر مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپا کیا ۔ آخر عصارۂ ریوند اور ارنڈی کا تیل پیا ۔ اس

---

۱ ۔ انتخاب خطوط غالب : صفحہ ۱۶۹ ۔

وقت تو بچ گیا۔ قصہ قطع نہ ہوا۔ مختصر کہتا ہوں میری غذا تم جانتے ہو کہ تندرستی میں کیا ہے۔ دس دن دو بار آدھی آدھی غذا کھائی۔ گویا دس دن میں ایک بار غذا تناول فرمائی۔ کل سے خوف مرگ کیا ہے اور صورت زیست کی نظر آتی ہے''۔[1]

یوسف مرزا کو لکھتے ہیں :

''یوسف مرزا! میرا حال سوائے میرے اور میرے خداوند کے کوئی اور نہیں جانتا۔ آدمی کثرت غم سے سودائی ہو جاتے ہیں۔ عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر اس ہجوم غم میں میری قوت متذکرہ میں فرق آ گیا ہو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ یوچھو کہ غم کیا ہے۔ غم مرگ، غم فراق، غم رزق، غم عزت، غم مرگ——''[2]

علاءالدین احمد خاں کو لکھتے ہیں :

''——میری حقیقت سنو! مہینہ بھر سے زیادہ کا عرصہ ہوا بائیں پاؤں میں ورم کف پا سے پشت پا کو گھیرتا ہوا پنڈلی تک آماس۔ کھڑا ہوتا ہوں تو پنڈلی کی رگیں پھٹنے لگتی ہیں۔ پیر نہ اٹھا۔ روٹی کھانے محل سرا نہ گیا۔ کھانا یہیں منگا لیا۔ اور حوائج کو کیا کروں۔ یہ سب موقع خیال میں لا کر سوچ لو کہ کیا گزرتی ہوگی——ع

پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند

اپنا یہ مصرع بار بار جبکے جبکے پڑھتا ہوں ع

اے مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

مرگ اب ناگہانی کہاں رہی۔ اسباب و آثار سب فراہم ہیں۔ ہائے الٰہی بخش خاں معروف کا کیا مصرع ہے : ع

آہ جی جاؤں نکل جائے اگر جان کہیں

زائیدہ بے فائدہ۔ مرگ کا طالب غالب جمعہ ۳ جولائی ۱۸۶۳ع۔

منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں :

''قبلہ! پیری و صد عیب ساتویں دہا کے مہینے گن رہا ہوں۔ قولنج

---

۱ - انتخاب خطوط غالب : صفحہ ۱۷۸

۲ - ایضاً : صفحہ ۲۸۰

آگے دوری تھا ۔ اب دائمی ہوگیا ہے ۔ غذا کم معدوم ند کہو تو بہ منزلۂ مفقود کہو ۔ بھرگرمی نے مار ڈالا ۔ ایک حرارت غریبہ جگر میں پاتا ہوں جس کی شدت سے بہنا جاتا ہوں''۔[1] (۱۸۶۶ع)

حکیم سید احمد حسن مودودی کو لکھتے ہیں :

''پیر و مرشد ! آپ کو میرے حال کی بھی خبر ہے ۔ ضعف نہایت کو پہنچ گیا ۔ رعشہ پیدا ہوگیا ۔ بینائی میں بڑا فتور پڑا ۔ حواس مختل ہوگئے ۔''[2] ۱۸۶۶ع

میر غلام بابا خان کو لکھتے ہیں :

''ــــــاگر میری اوقات شب روزی اور میرے حالات آپ دیکھیں تو تعجب کریں گے کہ یہ شخص جیتا کیوں کر ہے ۔ صبح سے شام تک پلنگ پر پڑا رہتا ہے ۔ اور پھر دم بدم پیشاب کو اُٹھنا ان مجموع مصائب میں سے ادنیٰ مصیبت یہ ہے کہ ۱۲۸۲ھ شروع ہوئے ۔ ۱۲۱۳ھ کی ولادت ہے ۔ اب کے رجب کے مہینے سے ستروان سال شروع ہوگا ۔ سترا بہترا بوڑھا اپاہج آدمی ہوںــــــ''۔[3] (۱۸۶۷ع)

امراض جسمانی کا بیان اور اخلاص ہم دگر کی شرح کے بعد ہجوم غم ہائے نہانی کا ذکر کیا کروں جیسا کہ ابر سیاہ چھا جاتا ہے یا ٹڈی دل آتا ہے ۔ بس اللہ ہی اللہ ہے ''۔ (٦ اپریل ۱۸٦۸ع)

ان بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے نا موافق حالات نے غالب کو آخر عمر میں داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی ایک شمع بنا دیا تھا ۔ ناسازگار حالات میں آخر یہ کب تک فروزاں رہ سکتی تھی۔ بالآخر یہ شمع ، اسی عالم میں ۱۵ فروری ۱۸٦۹ع کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی ۔

---

۱ - انتخاب خطوط غالب : صفحہ ۱۸۷
۲ - ایضاً : صفحہ ۱۸۹
۳ - ایضاً : صفحہ ۱۹۱

غالب
کا
ماحول

غالب اپنے ماحول کی پیداوار تھے اور اس ماحول کا مخصوص رنگ اُن کی شخصیت میں رچا ہوا نظر آتا ہے ۔ وہ اپنے زمانے کے سیاسی، معاشرتی، معاشی ، اقتصادی ، تہذیبی اور مذہبی خیالات سے متاثر تھے اور اُن کی ذہنی نشو و نما انھیں حالات کے سایے میں ہوئی ہے ۔ انھیں اپنے زمانے کی سیاست اور سیاسی حالات سے بظاہر کوئی خاص تعلق نہیں تھا ۔ اُنھوں نے اپنے زمانے کے معاشی، معاشرتی حالات سے بھی براہ راست کوئی خاص دلچسپی نہیں لی ، وہ مذہبی آدمی بھی نہیں تھے اور انھیں اپنے زمانے کی مذہبی زندگی سے بھی کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا ۔ لیکن چونکہ اُنھوں نے ان حالات کی آغوش میں آنکھ کھولی اور انھیں کے سایے میں ان کی نشو و نما ہوئی ، اس لیے وہ براہ راست نہیں تو بالواسطہ طور پر ان سے ضرور متاثر ہوئے ہیں ۔ اور ان کی شخصیت میں ان حالات کے اثرات بہت گہرے نظر آتے ہیں ۔ اُن کی حرکات و سکنات ، عادات و اطوار، افکار و خیالات ، نظریات و تصورات سب میں ان حالات کے مختلف اثرات کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں ۔ ان حالات نے جو مخصوص ماحول پیدا کیا ہے اور اُن کے ہاتھوں اُس زمانے کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جو مخصوص فضا قائم ہوئی ہے ، اُس کا نمایاں اثر غالب کی شخصیت میں نظر آتا ہے ۔ اس مخصوص ماحول میں جو معیار قائم ہوئے ہیں اور اس مخصوص فضا میں جن قدروں کی ترویج ہوئی ہے ۔ غالب کی شخصیت اُن کی صحیح آئینہ دار ہے ۔ بہ ظاہر وہ اپنے زمانے کی زندگی سے الگ تھلگ رہے ہیں ۔ اُنھوں نے اپنی محدود سی دنیا علیحدہ بنانے کی کوشش کی ہے ۔ ان کا عام انداز ان کے بیشتر ہم عصروں سے مختلف

معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اُس زمانے کی زندگی کا عام انداز اُن کی شخصیت میں اپنی جھلک دکھاتا ہے - اور جس ماحول نے اس انداز کو پیدا کیا ہے ، وہ اُس کے صحیح ترجمان اور عکاس نظر آتے ہیں -

یہ زمانہ سیاسی اعتبار سے ایک انتشار اور افراتفری کا زمانہ ہے - اس زمانے میں مرکزیت ختم ہوئی ہے - اقتدار کا خاتمہ ہوا ہے - طاقت نے دم توڑا ہے - حکومت وقت کی بنیادیں متزلزل ہوئی ہیں - نظام مملکت کی جان کے لالے پڑ گئے ہیں - نظم و نسق پر جاں کنی کا عالم طاری ہوا ہے - زندگی کی جڑیں کھوکھلی ہو گئی ہیں - اس کے نتیجے میں ، ہنگامے کھڑے ہوئے ہیں - کسی چیز کا کچھ ٹھیک نہیں رہا ہے - ہر چیز اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہے - زندگی میں کوئی نظم و ضبط باقی نہیں رہا ہے - بد نظمی زندگی کا قانون بن گئی ہے - شورشوں نے سر اُٹھایا ہے - فتنے بیدار ہوئے ہیں - بغاوتوں نے جڑ پکڑی ہے - سازشوں کا بازار گرم ہوا ہے - شاہان وقت صرف نام کے بادشاہ رہ گئے ہیں - تخریبی طاقتوں نے انھیں شاہ شطرنج سے زیادہ حیثیت نہیں دی ہے - جس کو بھی ذرا سا موقع ملا ہے اُس نے من مانی کی ہے اور جس کی لاٹھی اُس کی بھینس کے خیال پر عمل ہوتا رہا ہے - اپنوں کے ساتھ بیگانے بھی میدان میں آ گئے ہیں - سات سمندر پار سے آئے ہوئے لوگوں نے ملکی سیاست میں با قاعدگی سے حصہ لینا شروع کر دیا ہے ، اور طاقت کی ہوس نے انھیں جو خواب دکھائے انھیں عملی شکل دینے کی کوشش بھی اُنھوں نے با قاعدگی سے شروع کر دی ہے - وہ صحیح معنوں میں حکمران بن بیٹھے ہیں اور بادشاہوں کو اُٹھانے بٹھانے کا کاروبار اُنھوں نے شروع کر دیا ہے - چنانچہ آن کا اقتدار بڑھنے لگا ہے - اس بڑھتے ہوئے اقتدار کو دیکھ کر بہت سے لوگ اُن کے ساتھ ہو گئے ہیں - اور اُنھوں نے ان کے اقتدار کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھ لیا ہے - چنانچہ عجیب عجیب تماشے ہوتے رہے ہیں - اس زمانے کی زندگی ان تماشوں کو نہ صرف دیکھتی رہی ہے ، بلکہ ان تماشوں میں اُسے خود بھی شریک ہونا پڑا ہے - اور اس طرح وہ خود ایک تماشا بن گئی ہے -

ان حالات نے اُس زمانے کی زندگی کے ہر شعبے کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے - معاشرتی زندگی مسخ ہو کر رہ گئی ہے - جو معاشرتی روایات سینہ بہ سینہ منتقل ہو کر اُس وقت کے افراد تک پہنچی ہیں ، اُنھیں ان لوگوں نے

عزیز تو رکھا ہے لیکن وہ انھیں پوری طرح برقرار نہیں رکھ سکے ہیں ۔ معیار ڈانوا ڈول ہو گئے ہیں ۔ قدریں متزلزل ہو گئی ہیں ۔ صرف ان کا خیال باقی رہ گیا ہے ۔ اس لیے ان کی عملی شکل اس زمانے میں ذرا کم ہی دکھائی دیتی ہے ۔ افراد کا اخلاق بگڑا ہے ۔ لذت اور تعیش کے خیالات اخلاق معیاروں کو بہا لے گئے ہیں ۔ اس سیلاب کے سامنے بڑے بڑوں کا قدم جانا مشکل ہو گیا ہے اور وہ اس دھارے کے ساتھ بہہ نکلے ہیں ۔ مذہبی اور دینی ، ذہنی اور فکری تحریکیں بھی انھیں سہارا نہیں دے سکی ہیں ۔ رندی میں لوگوں نے پناہ ڈھونڈی ہے ۔ ذہنی تعیش کو افراد نے اپنا مزاج بنا لیا ہے ۔ فرار پسندی ان کی طبیعتوں میں داخل ہو گئی ہے ۔ غرض اس زمانے میں زندگی نے عجب عجب طوفانوں کو اُٹھایا ہے ۔ معاشی اور اقتصادی نظام میں رخنے پڑ گئے ہیں اور وہ درہم برہم ہو گیا ہے ۔ جب سیاسی زندگی میں سکون و اطمینان اور معاشرتی زندگی میں اعتدال و توازن نہ ہو تو اقتصادی اور معاشی نظام کی بنیادوں کا متزلزل ہو جانا یقینی ہے — چنانچہ اس زمانے میں معاشی اور اقتصادی نظام اقدار کے فشار نے زندگی میں کچھ عجب انتشار پیدا کر دیا ہے ۔ افلاس اور ناداری عام ہوئی ہے ۔ بڑے بڑوں کو اس انتشار کی وجہ سے مصیبتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے ۔ زرگری کی ہوس جاری رہی ہے اور اس ہوس نے اعلیٰ معیاروں کو پس منظر میں ڈال دیا ہے ۔ لوگ اپنی اپنی فکر میں پریشان اور سرگرداں رہنے لگے ہیں — غرض اس زمانے کی زندگی مجموعی طور پر ان حالات کی وجہ سے بڑے ہی انتشار اور افراتفری سے دو چار ہوئی ہے ۔

غالب نے اس آشوب قیامت کی آغوش میں آنکھ کھولی اور اسی سیاسی انتشار ، معاشی معاشرتی افراتفری اور ذہنی فشار کے سایے میں زندگی کے دن گزارے ۔ یہ سارا تماشا اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ۔ ناسازگار حالات کے تمام مناظر اُن کی آنکھوں کے سامنے سے گزرے ۔ اُنھوں نے ان کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی ۔ اُن کے نشیب و فراز کا انھیں علم ہوا ۔ چنانچہ اس زمانے کی زندگی کا سدّ و جزر اُن کی شخصیت میں بھی اپنا اثر دکھاتا ہے ۔ وہ اس سے متاثر ہوئے ہیں ۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے زمانے کی زندگی کا جزو معلوم ہوتے ہیں ۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ اس زندگی کی صحیح نمایندگی کرتے ہیں ۔ اور اس زمانے میں جو واقعات ظہور پذیر

ہوئے ہیں ، مجموعی طور پر اُن کا اثر اُن کی شخصیت میں کسی نہ کسی زاویے سے اپنی جھلک ضرور دکھاتا ہے ۔ اس لیے ان حالات و واقعات کی تفصیل و جزئیات کی تلاش و جستجو غالب کے مطالعے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے کیوں کہ اسی آئینے میں اُن کی زندگی اور شخصیت کے خط و خال صحیح طور پر نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں ۔

۲

وہ زمانہ جس کی آغوش میں غالب نے آنکھ کھولی اور جس ماحول میں اُنھوں نے زندگی کے دن گزارے، ہندوستانی مسلمانوں کے انحطاط و زوال کا زمانہ ہے ۔ مغلوں کی سلطنت اس زمانے میں زندگی اور موت کی کشمکش سے دو چار ہوئی ہے اور اُس پر عرصے تک نزع کا عالم طاری رہا ہے ۔ انحطاط و زوال کی وہ کیفیت جو اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد رو نما ہوئی ، اُس زمانے میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی ۔ عالمگیر کا انتقال ۱۷۰۷ع میں ہوا ۔ اُس کی آنکھ بند ہوتے ہی سلطنت سیاسی ہنگاموں سے دو چار ہوئی ۔ مرتے وقت اُس نے اپنے بیٹوں کو میل جول کے ساتھ رہنے کی جو وصیت کی تھی ، اُس کا کوئی اثر نہ ہوا ۔ ادھر اُس کی آنکھ بند ہوئی اُدھر آپس میں جھگڑے شروع ہو گئے ۔ تخت و تاج کے لیے لڑائیوں کا ایک سلسلہ جاری ہوا ۔ کبھی ایک بادشاہ تخت پر بیٹھا ، کبھی دوسرا ۔ اس ماحول نے سازشوں کو ہوا دی ۔ چنانچہ مغلوں کی حکومت میں دور دور تک سازشوں کے جال پھیلا دیے گئے ۔ ان سازش کرنے والوں نے کٹھ پتلیوں کی طرح بادشاہوں کو اپنی گرفت میں رکھا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کی ساری ساکھ ختم ہو گئی ۔ طاقت نے جواب دے دیا ۔ ہر چیز منتشر ہو گئی ۔ افراتفری کا دور دورہ ہوا ۔ اس صورت حال سے بعض باغیانہ قوتوں نے فائدہ اُٹھایا اور یہ لوگ ہندوستان پر حکومت کرنے کے خواب دیکھنے لگے ۔ چنانچہ لڑائیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو کم و بیش انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک جاری رہا ۔ ان طاقتوں میں مرہٹے ، سکھ اور انگریز خاص طور پر پیش پیش رہے ۔ ہندوستان کی تاریخ میں تقریباً تین چوتھائی صدی کا زمانہ انھیں ہنگاموں کی تاریخ ہے ۔

یہ ہنگامے کبھی بھی نہ ہوتے یا کم از کم یہ صورت اختیار نہ کرتے ۔ اگر مغلوں کی سلطنت میں داخلی طور پر مرکزیت اور استواری باقی رہتی لیکن مغلوں کی ہوس نے بھائی کو بھائی کے خون کا پیاسا بنا دیا ۔ وہ بات بات پر ایک دوسرے سے لڑنے لگے ۔ سلطنت کو حاصل کرنے کے لیے اُنھوں نے ایک دوسرے کے خون کو پانی کی طرح بہایا ، جیسے وہ اُن کے نزدیک بہت ہی معمولی سی بات تھی ۔ ان حالات نے جماعت بندیوں اور سازشوں کے لیے زمین ہموار کی ۔ چنانچہ مغلوں کے دور آخر میں یہ سازشیں اور جماعت بندیاں زندگی کا جزو بن گئیں ؛ اور اُس زمانے کی سیاسی تاریخ انھیں سازشوں اور جماعت بندیوں کی ایک داستان معلوم ہوتی ہے ۔ یہ سازشیں درباروں ہی تک محدود رہتیں تو صبر تھا ۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ اُنھوں نے اپنے حدود سے باہر نکل کر بیرونی طاقتوں سے ساز باز بھی شروع کر دی ۔ اور اس طرح ان کے علم بردار ان طاقتوں کے اشاروں پر رقص کرنے لگے ۔ اس زمانے میں مغلوں کا دربار دو جماعتوں کی سازشوں کا شکار رہا ۔ ان میں ایک تو ایرانی جماعت تھی اور دوسری تورانی ۔ ہندوستان کی سیاست میں اُس وقت انھیں کا عمل دخل تھا ۔ یہ لوگ آپس میں لڑتے رہتے تھے ، اور اس کا اثر اس زمانے کے سیاسی حالات پر پڑتا تھا ۔ سر جادو ناتھ سرکار نے 'تاریخ احمد شاہی' کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس زمانے کے تمام فتنہ و فساد ایرانی اور تورانی اُمراء کے آپس کے جھگڑوں کا نتیجہ تھا[۱] ۔ وہ شاہزادوں کو آپس میں لڑاتے تھے تاکہ اُن کی اپنی اہمیت محسوس کی جائے اور انھیں من مانی کرنے کے مواقع ملتے رہیں ۔ ان سازشوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے ملک میں ابتری پھیل گئی ۔ صوبے دار اپنے اپنے علاقوں میں خود مختار بن بیٹھے اور اس طرح مغلوں کی مرکزیت کا خاتمہ ہو گیا ۔ بنگال میں علی وردی خاں نے اپنی حکومت بنا لی ۔ اودھ میں سعادت علی خاں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا ۔ نظام الملک نے دکن میں ایک نئی حکومت کی بنیاد ڈال دی ۔ اس طرح ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ۔ اس کے نتیجے میں بعض نئی طاقتوں نے بھی سر اُٹھایا ۔ سکھ پنجاب میں حاکم بن بیٹھے اور مسلمانوں کے خلاف ہنگامے کرنے لگے ۔ مرہٹوں نے دکن میں

۱- Sarkar : *Fall of the Moghal Empire* : Vol. I. P. 439.

وہ اودھم مچایا کہ زیست مشکل ہو گئی - دلی اور اُس کے آس پاس کے علاقوں میں جاٹوں اور روہیلوں نے اپنے ہنگاموں سے قیامت برپا کر دی - اور پھر ان حالات کو دیکھ کر انگریز بھی ہندوستان کی سیاست میں پھاند پڑے - ساحلی علاقوں میں تو اُن کا اثر بہت پہلے سے موجود تھا - اب جو اُنھوں نے یہاں کی سیاسی زندگی کے عام انتشار کو دیکھا تو ان کے دل میں طاقت حاصل کرنے کی خواہش بیدار ہو گئی اور وہ بھی ان ہنگاموں میں شریک ہو گئے - غرض مغلوں کے انحطاط کے باعث ہندوستان میں سیاسی اعتبار سے بڑی ہی غیر یقینی کیفیت پیدا ہوئی - اور ساری زندگی میں انتشار اور ہنگاموں کا کچھ اس طرح دور دورہ ہوا کہ ہر چیز کی بنیادیں ہل گئیں ، اور زندگی کا ہر شعبہ اپنی جگہ کچھ اُکھڑا اُکھڑا سا نظر آنے لگا -

غالب نے جب آنکھ کھولی تو اپنے زمانے کی زندگی کو اسی صورت حال سے دو چار دیکھا - یہ شاہ عالم کا زمانہ تھا ، جس کی حکومت کچھ عرصے تک مرہٹوں کے رحم و کرم پر رہی لیکن بالآخر ۱۸۰۳ع میں انگریزوں نے مرہٹوں کو دلی سے نکال باہر کیا اور اس طرح شاہ عالم بادشاہ ایک صیاد کے چنگل سے نکل کر دوسرے صیاد کے چنگل میں پھنس گیا - یہ وہی بد قسمت اور تیرہ روزگار شاہ عالم تھا جس نے اس سے قبل زمانے کے ہاتھوں عجب عجب ستم اُٹھائے تھے - پورے پینتالیس برس تک اُس نے حکومت کی اور ان پینتالیس برسوں میں اس نے وہ کچھ دیکھا کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے - خاصے عرصے تک انگریزوں نے اُسے اپنا آلۂ کار بنائے رکھا - 'دو برس تک بادشاہ کو شجاع الدولہ ساتھ ساتھ لیے پھرا - کبھی بنارس لے گیا ، کبھی الہ آباد ، کبھی لکھنئو - ظاہر میں بادشاہ بادشاہ معلوم ہوتا تھا مگر در حقیقت وہ قیدی اعزاز کے ساتھ تھا' [۱] - پھر انگریزوں نے اس کی پنشن مقرر کر دی اور وہ الہ آباد میں رہنے لگا - اُدھر دلی میں احمد شاہ ابدالی نے جواں بخت کو نائب بادشاہ مقرر کیا تھا اور اس طرح دلی کی سلطنت چل رہی تھی - مرہٹوں اور جاٹوں کے ہنگامے جاری تھے - شاہ عالم کو الہ آباد میں رہتے ہوئے خاصا عرصہ گزر چکا تھا - اس لیے ۱۷۷۱ع میں اُس نے دلی جانے کا ارادہ کیا - اور بغیر کچھ سوچے سمجھے

۱- ذکا اللہ : تاریخ ہندوستان : جلد نہم : صفحہ ۳۲ -

چل دیا - میجر جنرل سر رویرٹ پا کر صاحب کچھ فوج لے کر کڑہ تک بادشاہ کے ساتھ گیا - یہاں ان جرنیل صاحب نے بادشاہ سے عرض کیا کہ آپ دلی نہ جائیے ، مگر بادشاہ نے نہ مانا جن اضلاع میں بادشاہ ہو کر چلا گیا پھر اس کی حکومت کا کوئی نشان ان میں نمودار نہ ہوا - اب اس بادشاہ کی سلطنت میں دو مخالف گروہ تھے - ایک مسلمان ، جو یہ چاہتے تھے کہ احمد شاہ ابدالی جس قدر ملک ہمارے لیے چھوڑ گیا ہے ، اُس کو اپنے قبضے میں رکھیں - دوسرے مرہٹے تھے ، جو یہ چاہتے تھے کہ پانی پت کی لڑائی میں جو نقصان ہمارا ہوا ہے اُسے پورا کریں - اُس کے سوا شجاع الدولہ تھا جو اس کی ناک میں رہتا تھا کہ جو گروہ ضعیف ہو اُسی سے کچھ لے مرے - انگریز بھی اپنی دانش مندی سے اعتدال کے ساتھ اس منصوبے کے درپے تھے - اب بادشاہ فتح گڑھ میں پہنچا - یہاں احمد بخش بنگش انہیں دنوں میں مرا تھا - اُس کے بیٹے مظفرالدولہ نے پانچ لاکھ روپیہ نذرانہ پیش کیا - بادشاہ نے یہاں برسات کے سبب سے قیام کیا - اس وقت تین ہزار مرہٹوں کی سپاہ دلی میں موجود تھی - مادھو جی سیندھیا پہلے فرخ آباد میں بادشاہ کے پاس آیا اور اپنے عہد و پیمان بادشاہ سے ٹھہرا گیا - اور ۲۵ دسمبر ۱۷۷۱ع کو بادشاہ قلعہ میں داخل ہوا - عبدالاحد خاں کشمیری بادشاہ کا مقرب ہوا - مجدالدولہ کا اُس کو خطاب ملا - وہ مدار المہام بادشاہ کے گھر کا ہوا - یہ ایک آدمی بڑا مکار اور فریبی تھا - اُس کے کاموں کا آگے حال معلوم ہوگا - مرزا نجف خاں نے سپاہیوں اور بہادروں کو تلاش کرکے اپنے تئیں لائق سپہ سالار بنایا - اب یہاں بادشاہ کو اُس کے دوستوں یعنی مرہٹوں نے چین نہیں لینے دیا[1] - دلی اور اُس کے آس پاس چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہیں - کبھی جاٹوں نے ہنگامہ کیا ، کبھی مرہٹے شورش برپا کرتے رہے ، کبھی سکھوں کی یورشیں جاری رہیں - بالآخر مادھو جی سیندھیا دلی پر قابض ہو گیا - بیشتر سردار اُس کے مطیع ہو گئے - شاہ عالم بادشاہ اُس وقت لال قلعے میں ایک معزز قیدی تھا[2] -

---

۱- ذکاءاللہ : تاریخ ہندوستان : جلد نہم ، صفحہ ۳۳۹

۲- W. Francklin : *The History of the the Reign of Shah Aulum* : P. 179.

اسی زمانے میں غلام قادر روہیلہ کو عروج حاصل ہوا اور اُس نے اپنے باپ کے کھوئے ہوئے جاہ و منصب کو حاصل کرنے کے خیال سے دلی پر حملہ کرنے کے منصوبے بنائے۔ کچھ لڑائیوں کے بعد دلی میں اُس کا تسلط ہوگیا۔ اسی زمانے میں وہ شاہ عالم بادشاہ سے ناراض ہوگیا۔ کیونکہ اُس نے سیندھیا سے ساز باز کر رکھی تھی۔ ''بادشاہ نے ایک خط سیندھیا کو لکھا تھا کہ امداد کے واسطے آؤ اور وہ غلام قادر کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس نے یہ خط بادشاہ کے آگے ڈالا۔ اور اُس کو اور اُس کے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ہتھیار ڈال دو۔ اُنھوں نے حکم کی اطاعت کی۔ اس کم بخت موذی نے بادشاہ کو قید میں ڈال دیا اور سلیم گڑھ میں سے کسی مزرق مرزا کو بلا کر بادشاہ کے تخت پر بٹھا دیا اور بیدار بخت اُس کا لقب رکھا۔ اور سب امیروں سے اُس کو بادشاہ منوایا۔ تین روز بادشاہ بر بے آب و دانہ گزرے۔ اب غلام قادر نے انتظام کے ساتھ قلعے کے لوٹنے کا ارادہ کیا۔ برابر کا دعوے دار اُس کا مرزا اسماعیل بیگ تھا۔ اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اپنے لشکر میں چلے جاؤ۔ وہ چلا تو گیا مگر بہت جلد اُس کو اپنی حماقت یہ معلوم ہوئی کہ بغیر لیے دیے چلا آیا۔ ایک آدمی غلام قادر کے پاس بھیجا کہ یاروں کا حصہ یاد رہے۔ سارے شہر کے دولت مند اور معزز اہل کاروں کو بلا کر کہہ دیا کہ ہوشیار رہو اور اپنی حفاظت کا بندوبست کرو۔ اور اپنے سپاہیوں اور نائبوں کو حکم دے دیا کہ اگر روہیلے لوٹیں تو تم بھی لوٹو۔ غلام قادر نے اول اپنے نئے بادشاہ سے کہا کہ تمام بیگمات سے جواہرات لے لو۔ جب اُس سے بھی پیٹ نہ بھرا تو شاہ عالم پر دولت بتانے کے لیے غضب توڑنا شروع کیا۔ اُسے یقین تھا کہ اس بوڑھے کو سارے خزانے دفینے معلوم ہوں گے۔ اب کوئی ظلم و ستم باقی نہ رہا جو اس ظالم نے اس ضعیف پیرانہ سال بادشاہ اور اُس کی اولاد پر نہیں کیا۔ اس کو بیدار بخت کے ہاتھوں پٹوایا اور طرح طرح کی جسمانی تکلیفیں دیں۔ ۳۰ جولائی کو بیگموں کے بدن پر مار مار کے نیل ڈال دیے اُن کے گلابی گال مارے تھپڑوں کے لال کر دیے اُن کے درد ناک آہ و نالے سے سارا محل تھراتا تھا مگر اس کم بخت کے دل میں ذرا رحم نہ آتا تھا۔ اسماعیل بیگ سے ذرا کنی دبتی تھی۔ اس کے پاس ۳۱ جولائی کو پانچ لاکھ روپیہ بھیج دیا اور پھر کئی روز بعد سات لاکھ روپیہ بھیجا۔ مہاجنوں سے بھی

انسانیت کے ساتھ روپیہ لیا۔ پہلی اگست کو پھر بادشاہ کو خزانہ بتانے کے لیے آڑے ہاتھوں لیا۔ اس پر بوڑھا بادشاہ چلایا کہ ’ارے کم بخت! خزانہ کہاں دھرا ہے۔ میرے پیٹ میں رکھا ہے۔ اسے چیر کر نکال لے۔‘‘ اب بوڑھی بوڑھی بیگموں کی کم بختی آئی—اب تک اُن کی تعظیم و تکریم ہو رہی تھی کہ اُن سے ساری دولت کا پتہ لگ جائے گا۔ جب اُن سے کام نہ چلا تو اُن پر غضب ڈھایا۔ ان سب بوڑھیوں میں ممتاز محل سب سے زیادہ ممتاز تھیں۔ انہیں کی سب سے زیادہ فضیحتی کی۔ سب مال و اسباب چھین، بے چاری کو قلعے سے نکال دیا۔ جس کو بادشاہ نے بنایا تھا اُس کی تعظیم و تکریم کو بھی اس نے سلام کیا۔ حقے کے دم اُس کے سامنے اُڑائے۔ دیوان خاص میں بادشاہ کے برابر جا بیٹھا۔ ۶ تاریخ کو تخت کو بھی آگ لگا کر سارا چاندی سونا اُس میں سے نکال لیا تین روز کے اندر سارا فرش اکھاڑ ڈالا کہ کہیں اُس کے نیچے دفینہ ہاتھ لگے۔ اب ۱۰ اگست ۱۷۷۸ء آئی۔ یہ وہ تاریخ ہے کہ جس کو ہمیشہ خاندان تیموریہ کی تاریخ میں یاد رکھنا چاہیے۔ غلام قادر نے یعقوب علی اور تین چار پٹھانوں کو ساتھ لیا اور شاہ عالم کو دیوان خاص میں بلایا اور پھر خزانہ کو پوچھا۔ اس نے کہا اگر خزانہ مجھے معلوم ہوتا تو میں کیوں کر اپنے ظروف نقرہ و طلائی کو بیچ کر اپنے نوکروں کی تنخواہ تقسیم کرتا۔ اگر کوئی دفینہ گڑا دبا ہوا ہوگا تو مجھے کیا اس کا علم ہے۔ اس پر غلام قادر نے کہا کہ ’اب تو کسی کام کا نہیں، تیرا دنیا میں رہنا بیکار ہے۔ آنکھیں تیری نکال لینی چاہئیں‘ اس پر آہ سرد بھر کر بادشاہ نے کہا کہ ’یہ وہ آنکھیں ہیں جو ساٹھ برس تک کلام اللہ پڑھتی رہی ہیں۔ ان پر رحم کر‘ یہ سن کر بادشاہ کے بیٹے پوتوں کو جو اس عالم میں اُس کے ہمراہ تھے بے تحاشا مارنا دھاڑنا شروع کیا۔ اس پر بادشاہ نے کہا کہ ’ان آنکھوں کے رکھنے کے لیے میں نے اس عذاب اور مصیبت کو دیکھنے کے واسطے نہیں کہا۔ تو ابھی انہیں نکال لے۔‘ غرض وہ سفاک تخت پر سے کودا اور بادشاہ کو نیچے لٹا، چھاتی پر چڑھ، ایک آنکھ اپنے خنجر سے نکال لی۔ دوسری آنکھ نکالنے کو یعقوب علی سے کہا۔ اُس نے انکار کیا تو فوراً اس کا تلوار سے سر اُڑا دیا۔ اس خوف سے اور پٹھانوں نے دوسری آنکھ نکال لی اور پھر بادشاہ کو سلیم گڑھ میں لے چلے۔ اُس وقت جو قلعے کی کیفیت تھی قلم سے بیان نہیں ہو سکتی۔

کوئی شاہ زادہ بے بس بے کس، غم کی تصویر بنا کھڑا تھا ۔ کوئی شاہ زادی سکتے کے عالم میں بے ہوش تھی ۔ کوئی ہائے شاہ عالم ، ہائے شاہ عالم کہہ کر سر پیٹ رہی تھی ۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو آنسو سے پر نہ تھی ۔ کوئی دل نہ تھا جو اس غم سے خالی تھا—جب شہر میں یہ خبریں پھیلیں تو خوف و ہراس کی وجہ سے لوگ شہر چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے— لیکن اسی عالم میں مرہٹے آ گئے ۔ لڑائی ہوئی ۔ غلام قادر زخمی ہوکر گرفتار ہوا ۔ متھرا میں اُسے سیندھیا کے سامنے پیش کیا گیا ۔ سیندھیا نے اس کی بڑی فضیحتی کی ۔ ایک گدھے پر اُلٹا سوار کیا ۔ اور ایک پہرا ساتھ کیا اور ہر ایک دکان سے ایک ایک کوڑی نواب باون محال کے نام سے منگوائی ۔ پھر اُس کی زبان کاٹ لی ، پھر اُس کی آنکھیں پھوڑ ڈالیں پھر ناک کان ، ہاتھ پیر کاٹ لیے ۔ اس طرح لوتھڑا بنا کر بادشاہ کی خدمت میں دلی بھیجا ۔ مگر راہ میں موت نے بڑی رفاقت کی ۔ کہتے ہیں ۳ مارچ ۱۷۸۹ع کو ایک درخت میں اُس کو لٹکا کر پھانسی دے دی ۔ یہ لاش قیمہ قیمہ اندھے بادشاہ کے رو برو دیوان خاص میں پیش کش ہوئی ۔ لوگ شاہ عالم کے استقلال اور صبر و تحمل کی بڑی تعریف کرتے ہیں کہ جس وقت آنکھیں اُس کی نکالی گئیں اُس نے اُف نہ کی ۔ اور خدا کو یاد کرتا رہا اور اس صدمے کے بعد بھی اتنے دنوں تک زندہ رہا ۔[1] شاہ عالم کی وفات ۱۸۰۶ع میں ہوئی ۔ زندگی میں زمانے نے اُس پر ایسے ستم ڈھائے کہ جن کے خیال سے کیجا منہ کو آتا ہے ۔ انگریزوں کی چال بازیاں ، مرہٹوں کی فریب کاریاں سکھوں کی ہنگامہ آرائیاں ، روہیلوں کی ستم شعاریاں ، اُس نے نہ صرف اپنی آنکھوں سے دیکھیں ، بلکہ اُسے براہ راست ان سب کا شکار ہونا پڑا ۔ اُس زمانے میں اس شاہ وقت سے زیادہ مظلوم اور پریشان حال کوئی اور شخص نظر نہیں آتا ۔

یہ ہنگامے غالب نے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھے لیکن کانوں سے سنے ضرور ۔ البتہ ان کی وجہ سے انتشار اور افراتفری کی جو فضا اُس زمانے میں پیدا ہوئی ، وہ اُنھوں نے نہ صرف دیکھی ، بلکہ اُن پر اس فضا کا اثر بھی ہوا ۔ وہ رجب ۱۲۱۲ھ/۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ع میں پیدا ہوئے ۔ یہ شاہ عالم

۱- ذکاء اللہ : تاریخ ہندوستان : جلد نہم : صفحہ ۳۳۲

ہی کا زمانہ تھا لیکن انھوں نے جب آنکھ کھول کر دیکھا تو انگریز آگرہ اور دلی پر حکمران ہو چکے تھے ۔ لارڈ لیک کی فوجیں ۱۸۰۳ء میں دلی میں داخل ہوئیں ۔ ان فوجوں نے مرہٹوں کا قلع قمع کر دیا ۔ اور انھیں مار کر دلی سے باہر نکال دیا ۔ بادشاہ اب تک مرہٹوں کے رحم و کرم پر تھا ۔ لیکن اب انگریزوں نے اسے پناہ دی ۔ اس کی بادشاہت کو برقرار رکھا ۔ اور ایک لاکھ روپیہ سالانہ اُس کی پنشن مقرر کی ۔ ۱۸۰۶ء میں جب شاہ عالم کا انتقال ہوا تو اس کا ولی عہد اکبر شاہ ثانی تخت پر بیٹھا اور ۱۸۳۷ء تک بادشاہ رہا ۔ اس کے زمانے میں ہنگامے تو ختم ہو گئے ۔ کیونکہ انگریزوں کی گرفت دلی پر خاصی مضبوط ہو چکی تھی ۔ البتہ دربار میں سازشوں کا سلسلہ جاری رہا ۔ انگریز ان سازشوں کو تشویش کی نظر سے دیکھتے رہے لیکن اُنھوں نے بادشاہت کو نہیں چھیڑا ۔ مغلوں کی نام نہاد حکومت برقرار رہی ۔ سکہ انگریزوں کا چلتا رہا ۔ اکبر شاہ ثانی کے بعد محمد سراج الدین ظفر بہادر شاہ تخت پر بیٹھے اور ۱۸۵۷ء تک حکمران رہے ۔ اُن کے زمانے میں غدر بڑا اور اُنھوں نے بھی عجب عجب ستم سہے ۔ جوان بیٹوں اور پوتوں کو اُن کی آنکھوں کے سامنے قتل کیا گیا خود جلا وطن کیے گئے ۔ اُن کے ساتھ ہی مغلوں کی حکومت ہندوستان سے ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی ۔

مغلوں کے دور آخر کے یہ سیاسی حالات اُس ماحول کو پوری طرح پیش کر دیتے ہیں جو غالب کے زمانے میں موجود تھا اور جس کے سائے میں اُنھوں نے زندگی بسر کی تھی ۔ ان حالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغلوں کی سلطنت کو گھن لگ گیا تھا ۔ اور انگریزوں کے باقاعدہ تسلط کے وقت تک وہ اسی عالم میں رہی ۔ اس زمانے میں سازشوں کا بازار گرم رہا ۔ مغل صرف نام کے بادشاہ رہ گئے ۔ اس حالت کو دیکھ کر بعض طاقتوں نے ہندوستان کی سیاسی زندگی میں حصہ لینا شروع کیا ۔ اور وہ طاقت حاصل کرنے کے خیال سے ہنگامے برپا کرتے رہے ۔ ان میں مرہٹے ، سکھ ، جاٹ ، روہیلے اور انگریز سب ہی شامل تھے ۔ اس زمانے کی سیاسی تاریخ انھیں طاقتوں کی ہنگامہ آرائیوں کی تاریخ ہے ۔ ان طاقتوں کے پیش نظر کوئی بڑا نصب العین نہیں تھا ۔ یہ سب کے سب ہندوستان میں کسی طرح اپنا اثر قائم رکھنا چاہتے تھے تاکہ انھیں دولت ملتی رہے — یہی وجہ ہے کہ مغلوں کو مٹا دینا اُن کے

پیش نظر نہیں تھا ۔ وہ تو اُن کو اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتے تھے ۔ اور اُن کی خواہش یہ تھی کہ مغل ان کے دست نگر رہیں ۔ اس صورت حال نے اُس انتشار میں کچھ اور بھی اضافہ کیا جو مغلوں کے سیاسی انحطاط کی وجہ سے پیدا ہوا تھا ۔

مرہٹے اس انتشار کو پیدا کرنے میں پیش پیش رہے ۔ اورنگ زیب عالمگیر ہی کے زمانے سے اُنھوں نے مسلمانوں کے خلاف ہنگامے شروع کر دیے تھے ۔ اورنگ زیب نے انہیں کچلنے کی کوشش کی ۔ ایک حد تک اُسے کامیابی بھی ہوئی لیکن اس کے مرتے ہی انھوں نے پھر سر اُٹھایا اور مغلوں کے خلاف اچھا خاصا محاذ قائم کر لیا ۔ اس زمانے میں ان کی طاقت بڑھنے لگی ۔ اس کی ایک وجہ شہزادوں اور صوبہ داروں کی آپس کی دشمنی بھی تھی ۔ مرہٹوں نے اس سے فائدہ اُٹھایا ۔ اٹھارویں صدی میں وہ شمالی ہندوستان کی طرف بڑھنے لگے ۔ اس وقت مغلوں کی حالت خراب تھی ، اور روز بروز بد سے بدتر ہوتی جاتی تھی ۔ اس لیے اُن کے مقابلے میں صف آرا ہونے کے بجائے مغلوں نے اُن کے ساتھ مصالحت کرنے اور انھیں مراعات دینے کی حکمت عملی کو اختیار کیا[1] ۔ اس حکمت عملی نے اُن کی ہمت اور بڑھا دی ۔ بعض مغل بادشاہوں اور سید برادران کی کشمکش نے مرہٹوں کو اور بھی حاوی کر دیا ۔ چنانچہ وہ دلی پر حملہ آور ہونے کی ہمت کرنے لگے ۔ سید حسین علی نے جب مرہٹوں کو دکھن میں چوتھ وغیرہ وصول کرنے کا حق دیا تو بادشاہ کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور اُس نے مرہٹوں کے اس حق کو تسلیم نہیں کیا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حسین علی نے مرہٹوں کی مدد سے دلی پر چڑھائی کی ۔ اس کے بعد اُن کے حوصلے بہت بڑھ گئے اور انھوں نے زیادہ طاقت حاصل کرنے کی باقاعدہ کوششیں شروع کر دیں ۔ چنانچہ وہ دلی اور دوسرے علاقوں پر حملے کرتے رہے ۔ لیکن اس وقت تک اُن کا مقصد صرف لوٹ مار تھا ۔ اس لوٹ مار اور غارت گری نے سارے ملک میں دہشت پھیلا دی ۔ بادشاہ تک اس خوف و دہشت کا شکار ہوئے ۔ مرہٹوں کے مظالم کی کوئی انتہا نہیں تھی ۔ لوگوں کو مار ڈالنا اور آبادیوں کو تباہ کر دینا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل

۱۔ Sarkar : *Fall of the Moghal Empire* : Vol I Page 67

تھا ۔ وہ صرف لوٹ مار اور قتل و غارت ہی میں پیش پیش نہیں تھے ، لوگوں کو تکلیف دے کر خوش بھی ہوتے تھے ۔ لوگوں کے ہاتھ پیر اور ناک کان کاٹ دینا ، عورتوں کو اٹھا لے جانا اور اُن کے ساتھ زنا کرنا اُن کے معمولات میں داخل تھا[1] ۔ آنند رام مخلص نے چند اشعار میں اُس آشوب قیامت کی تصویر کھینچی ہے جو مرہٹوں نے اٹھارویں صدی میں برپا کر رکھا تھا۔

بر دل ما تیرہ روزاں زاں صف مژگاں گزشت
آنچہ از فوج دکن بر ملک ہندوستاں گزشت
در چمن بر بـرگ گلہا نگـذرد صبح از نسیم
بر گـریباں انچہ از دستم شب ہجراں گزشت[2]

مرہٹوں کے ان ہنگاموں نے خلق خدا کو پریشان کر دیا ۔ اسی پریشانی کو دیکھکر شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آ کر جہاد کرنے کی دعوت دی ۔ اُس نے یہ دعوت قبول کی اور پانی پت کی تیسری لڑائی ہوئی جس میں مرہٹوں کی طاقت کا شیرازہ بکھر گیا ۔ اس کے بعد بھی وہ برابر اپنی قوتوں کو جمع کرنے کی کوشش کرتے رہے اور اُن کی سازشیں شمالی ہندوستان میں بھی جاری رہیں ۔ شاہ عالم کے زمانے میں ان کے رہنما سیندھیا نے اچھا خاصا اقتدار حاصل کر لیا ۔ انگریزوں کے سامنے اس کی کچھ پیش نہ گئی ۔ غرض سازشوں اور جھگڑوں کا سلسلہ برابر جاری رہا اور مرہٹے ایک زمانے تک اُس وقت کی زندگی کے لیے مصیبت بنے رہے ۔ ان کی وجہ سے سکون ناپید ہو گیا ۔ زندگی متزلزل ہو کر رہ گئی ۔ نظام اقدار کی بنیادیں ہل گئیں ۔ اور اگرچہ انیسویں صدی کے شروع میں انگریزوں نے اُن کا قلع قمع کر دیا لیکن اُن کی سیاسی دھاچوکڑی نے جو اثرات چھوڑے تھے ، وہ عرصے تک باقی رہے ۔ غالب نے آنکھ کھول کر دیکھا تو اپنے ماحول کو انھیں حالات سے دو چار پایا ۔!

اس سیاسی انتشار کو پیدا کرنے میں مرہٹوں کے ساتھ ساتھ سکھ بھی پیش پیش رہے ۔ مغلوں سے سکھوں کی دشمنی بہت پرانی تھی ۔ اس کا آغاز اُس وقت سے ہوا ، جب سکھوں نے اپنے آپ کو مذہبی تحریک کے بجائے

۱۔ Sarkar : *Fall of the Mughal Empire* : Vol. I Page 88

۲۔ تصانیف آنند رام مخلص : نسخہ انجمن ترقی اردو (ہند)

ایک فوجی طاقت میں تبدیل کرنا چاہا - اور وہ ہندوستان کی سیاست میں طاقت حاصل کرنے کے خواب دیکھنے لگے - گرو نانک نے جو روحانی تحریک شروع کی تھی، اُس کو گرو گوبند سنگھ نے خالص مادی اور دنیاوی بنا دیا - چنانچہ مغلوں سے سکھوں کے جھگڑے شروع ہو گئے اور وہ خوش گوار تعلقات جو بابر اور اکبر کے زمانے میں تھے، ان کا خاتمہ ہو گیا - اس کی بنیاد تمام تر سیاسی تھی - سکھوں کے گرو ارجن سنگھ نے تو ایک پورا سیاسی نظام تیار کر لیا تھا اور وہ اس کو عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے - چنانچہ وقت کے ساتھ ساتھ سکھوں میں ملک گیری اور حصول دولت کی ہوس بڑھتی گئی اور اسی صورت حال نے بقول ڈاکٹر تارا چند ایک مذہبی تحریک کو ایسی جماعت میں تبدیل کر دیا جس کو حکمرانی کی ہوس نے دیوانہ بنا دیا[1] - سکھوں کے ساتھ مسلمانوں کے جھگڑے جہانگیر ہی کے وقت سے شروع ہوگئے تھے، جب باغی شہزادے خسرو کو گرو ارجن نے پناہ دی تھی - اس پر بادشاہ نے گرو ارجن کو دربار میں طلب کیا اور انھیں سزا دی - سکھوں نے اپنی تنظیم کا کام جاری رکھا - اورنگ زیب عالم‌گیر کے زمانے میں سکھوں کے گرو تیغ بہادر نے کشمیر میں بغاوت کے شعلے بھڑکائے - نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگ زیب عالم‌گیر نے انھیں قتل کی سزا دی - غرض اس طرح مغلوں اور سکھوں کے درمیان اختلافات بڑھتے گئے اور دشمنی میں اضافہ ہوتا گیا - اورنگ زیب عالم‌گیر جب تک زندہ رہا وہ کچھ نہ کر سکے - اُس کے مرتے ہی جب اُس کے جانشینوں میں جھگڑے شروع ہوئے تو سکھوں نے اس موقع کو غنیمت جانا اور وہ مسلمانوں کے خلاف ہنگامے کرنے پر تل گئے - سکھوں کی نفرت صرف حکومت اور شاہان وقت ہی کے خلاف نہیں تھی، عام مسلمانوں کے بھی وہ جانی دشمن تھے - چنانچہ جب بھی انھوں نے کوئی حملہ کیا تو اُس میں عام مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگے اور انھیں تباہ و برباد کیا - ان کے ظلم و ستم کی کوئی انتہا نہیں تھی - بچوں اور عورتوں تک کو یہ لوگ مار ڈالتے تھے - حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر دیتے تھے - مسلمانوں کے دلوں میں اُن کے اس ظلم و ستم کی وجہ سے دہشت بیٹھ گئی تھی - مرد اُن کے ڈر کی وجہ سے ہندوؤں کے

---

[1] Dr, Tara Chand : *History of the Indian People* P. 269 .

گھروں میں چھپ جاتے تھے، اپنے نام بدل لیتے تھے اور عورتیں اپنی عزت اور ناموس کو بچانے کی غرض سے کنوؤں میں ڈوب کر جان دے دیتی تھیں[1]۔ ہندوستان میں اس وقت جو سیاسی انتشار تھا، اُس نے سکھوں کو من مانی کرنے کا موقع دیا اور وقت کے ساتھ ساتھ اُن کی طاقت بڑھتی گئی۔" ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کا حملہ ہوا، اس کے بعد سکھوں کی طاقت اور ہمت میں اضافہ ہو گیا۔ ۱۷۳۹ء سے ۱۷۶۵ء تک متعدد بیرونی حملوں کی وجہ سے حالات خراب ہو گئے اور سکھوں کو ہنگامہ آرائی کا موقع ملا۔ اُنھوں نے ۱۷۶۳ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا اور جہلم سے جمنا تک اپنا تسلط قائم کر لیا۔ ۱۷۶۵ء اور ۱۸۰۰ء کے درمیان اُن کا اقتدار اور بڑھا۔ اٹک سے کرنال تک اور ملتان سے جموں تک اُن کے قبضے میں آ گیا۔ اور اُنھوں نے دوآبے اور روھیل کھنڈ پر بھی حملے کرنے شروع کر دیے۔ انیسویں صدی کے شروع میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پنجاب میں اپنا اقتدار قائم کیا" اور سکھوں کی طاقت اپنے پورے عروج پر پہنچ گئی" یہ[2] اُس زمانے میں ان ہنگامہ آرائیوں کا سلسلہ کسی حد تک ختم ہوا جو اس سے قبل سکھوں نے برپا رکھے تھے۔ رنجیت سنگھ نے ۱۸۰۹ء میں انگریزوں کے ساتھ صلح کر لی جس کی رو سے اُس کی حکومت دریائے ستلج تک محدود کر دی گئی[3]۔ انگریزوں کے ساتھ اس صلح نامے نے دلی اور اطراف دلی میں تو سکھوں کے ہنگاموں کو ختم کر دیا لیکن پنجاب اور سرحد کے علاقوں میں اُن کی مسلمان دشمنی جاری رہی، اُنھوں نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ اور اسی کے نتیجے میں مولانا سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد عمل میں آئی۔

سکھوں کے ساتھ ساتھ اس زمانے میں جاٹوں کا بھی عروج ہوا اور مغلوں کے دور آخر میں اُنھوں نے بھی بڑے ہنگامے برپا کیے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد ان لوگوں نے بھی دلی اور اطراف دلی میں لوٹ مار شروع کر دی۔ یہ لوگ بھی مسلمانوں کے جانی دشمن تھے اور ان کے

۱۔ غلام حسین خاں: سیرالمتاخرین: صفحہ ۳۰۲

۲۔ خلیق احمد نظامی: تاریخ مشائخ چشت: صفحہ ۳۱۸

۳۔ Lyall: *Rise and Explanation of British Power in India* P. 309

پیش نظر بھی مسلمانوں کی بنیادوں کو متزلزل کرنا تھا ۔ دلی اور آگرے کے درمیان انھوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے قلعے بنا لیے تھے اور موقع پا کر مسلمانوں پر حملے کرتے رہتے تھے ۔ ان کا مقصد مسلمانوں کو پریشان کرنا اور لوٹ مار کرکے اپنی ہوس کو پورا کرنا تھا ۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے مکتوب میں ان جاٹوں کے بارے میں لکھا ہے :

''غیر مسلموں میں ایک قوم جاٹ ہے جس کی بود و باش دلی اور آگرہ کے درمیان ہے ۔ یہ دونوں شہر بادشاہوں کے لیے دو حویلیوں کی مانند رہے ہیں ۔ مغل بادشاہ کبھی آگرہ میں رہتے تھے تاکہ اُن کا دبدبہ اور رعب راجپوتانہ تک پڑے اور کبھی دہلی میں فروکش ہوتے تھے تاکہ اُن کی شوکت اور ہیبت سہرند اور نواحی سہرند تک اثر ڈالے ۔ دہلی اور آگرہ کے درمیان کے مواضعات میں قوم جاٹ کاشتکاری کرتے تھے ۔ زمانۂ شاہ جہاں میں اس قوم کو حکم تھا کہ گھوڑوں پر سوار نہ ہوں ، بندوق اپنے پاس نہ رکھیں اور اپنے گڑھی نہ بنائیں ۔ بعد کے بادشاہوں نے رفتہ رفتہ اُن کے حالات سے غفلت اختیار کرلی اور اس قوم نے فرصت کو غنیمت جان کر بہت سے قلعے تعمیر کر لیے اور اپنے پاس بندوق رکھ کر بٹ ماری کا طریقہ شروع کر دیا ۔ اورنگ زیب اُس وقت دکھن میں قلعۂ بیجاپور و حیدر آباد کو فتح کرنے میں مشغول تھا ۔ دکن ہی سے ایک فوج جاٹوں کی تادیب کے لیے اُس نے روانہ کی اور اپنے پوتے کو فوج کا سردار مقرر کیا ۔ رئیسان راجپوتانہ نے اس شہزادے سے مخالفت کرلی ۔ لشکر میں اختلاف واقع ہوا ۔ جاٹوں کی تھوڑی سی عاجزی پر اکتفا کرکے فوج پادشاہی واپس ہوگئی — محمد فرخ سیر کے زمانے میں اس جماعت کی شورش پھر جوش میں آئی — قطب الملک وزیر نے زبردست فوجیں اُن کی طرف بھیجیں ۔ چورامن جو اس قوم کا سردار تھا ، بعد جنگ صلح پر راضی ہوگیا ۔ اُس کو بادشاہ کے سامنے لائے اور تقصیرات کی معافی دلوائی ۔ یہ کام بھی خلاف مصلحت عمل میں آیا ۔ پھر عہد محمد شاہ میں اس قوم کی سرکشی حد سے تجاوز کرگئی اور چورامن کا چچازاد بھائی سورج مل اس جماعت کا سردار ہوگیا اور فساد کا راستہ اختیار کیا ۔ چنانچہ شہر بیانہ جو اسلام کا قدیم شہر تھا اور جہاں علماء و مشائخ سات سو سال سے اقامت پذیر تھے ، اُس شہر میں قہراً اور جبراً قبضہ کرکے مسلمانوں کو ذلت و خواری

کے ساتھ وہاں سے نکال دیا۔ اُس کے بعد سرکشی برابر بڑھتی گئی۔ بادشاہوں اور امیروں کے اختلافات اور غفلت کی بنا پرکوئی بھی اس جانب متوجہ نہ ہوا۔ اگر بالفرض ایک امیر اُس کی تنبیہ کا قصد کرے تو سورج مل کے کارکن دوسرے امراء کی جانب رجوع کرتے ہیں اور اس طرح بادشاہ کے مشورے کو پلٹ دیتے ہیں۔ پسر محمد شاہ کے عہد میں صفدر جنگ ایرانی نے خروج کیا اور سورج مل سے سازش کرکے پرانی دہلی پر حملہ کر دیا اور تمام باشندگانِ شہر کہنہ کو لوٹ لیا۔ پسر محمد شاہ نے شہر کے دروازوں کو بند کرکے جنگ توپ خانہ شروع کی۔ محض خدا کے فضل سے صفدر جنگ اور سورج مل دو تین ماہ کے بعد ناکامیاب واپس ہوئے اور صلح و موافقت کی داغ بیل ڈالی۔ چونکہ بادشاہ کے آدمی جنگ سے تھک چکے تھے، اس لیے انھوں نے صلح کو غنیمت شمار کیا۔ اُس کے بعد سے سورج مل کی شہرت ترقی پا گئی۔ دہلی سے دو کوس کے فاصلے سے لے کر آگرہ کے آخر تک طول میں اور میوات کے حدود سے فیروز آباد و شکوہ آباد تک عرض میں سورج مل قابض ہوگیا۔ کسی کی طاقت نہیں کہ وہاں اذان و نماز جاری کر سکے۔[۱]''

غرض جاٹوں نے مغلوں کے دور آخر میں ایسے ہنگامے برپا کیے کہ خلق خدا اُن کے ظلم و ستم سے تنگ آ گئی۔ مسلمانوں پر تو عرصۂ حیات تنگ ہو گیا۔ دلی اور اس کے اطراف کے باشندے اُس زمانے میں اُن کی وجہ سے خوف زدہ تھے۔ گھبراہٹ اور پریشانی اُن پر طاری تھی۔ خلیق احمد نظامی نے 'چہار گلشن شجاعی' کے مصنف کا ایک بیان نقل کیا ہے جس میں اُس نے جاٹوں کے ہنگاموں کی وجہ سے پیدا ہونے والی پریشانیوں کی وضاحت کی ہے—وہ لکھتا ہے کہ ''ایک مرتبہ جب جاٹوں نے لوٹ مار شروع کی تو دہلی کے باشندے گھبراہٹ اور پریشانی میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ وہ در بدر گلی گلی مارے مارے پھرتے تھے بلکہ اسی طرح جیسے کوئی ٹوٹا ہوا جہاز ظالم موجوں کے رحم و کرم پر ہو۔ پاگلوں کی طرح ہرشخص پریشان حال اور گھبرایا ہوا نظر آتا تھا[۲]'' شاہ ولی اللہ

۱- خلیق احمد نظامی : شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات : صفحہ ۱۰۱ - ۱۰۳

۲- ایضاً : صفحہ ۳۲۳

نے بھی حافظ جار اللہ کے نام ایک خط میں جاٹوں کے مظالم کا ذکر کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں ۔ ''دلی میں ایک حادثۂ عظیم واقع ہوا ۔ قوم جاٹ نے دلی کے شہر کہنہ کو لوٹا اور حکومت اس فساد و شرارت کو دفع کرنے سے عاجز رہی ۔ اُنھوں نے مال لوٹے عزت و ناموس کو برباد کیا اور مکانات کو آگ لگائی — اور یہ لوٹ مار کا حادثہ اوائل ۱۱۶۱ھ میں ہوا اور آخر شعبان تک جاری رہا[1] ۔'' جاٹ ایک جاہل قوم تھی ۔ وہ پڑھنا لکھنا تک نہیں جانتے تھے ۔ انھیں کسی چیز کا علم نہیں تھا[2] ۔ اس لیے وہ جنگلیوں اور وحشیوں کی طرح ہنگامے برپا کرتے تھے ۔ ان جاٹوں نے مغلوں کے دور آخر میں زیست مشکل کر دی تھی ۔ اُن کے ہنگاموں کا یہ سلسلہ انگریزوں کے تسلط کے وقت تک جاری رہا ۔ جب انگریز دلی پر حکمران ہوگئے تو سکھوں اور مرہٹوں کی شورشوں کے ساتھ ساتھ جاٹوں کی شورش بھی ختم ہوگئی ۔

غالب نے اپنی آنکھوں سے جاٹوں کے یہ ہنگامے تو نہیں دیکھے کیونکہ انھوں نے جب ہوش سنبھالا تو انگریز دلی میں داخل ہو چکے تھے ۔ لیکن جو اثرات ان جاٹوں نے دلی کی زندگی پر اپنی شورش سے چھوڑے تھے ، اُس کو انھوں نے ضرور دیکھا اور وہ اُن سے متاثر بھی ہوئے ۔ ان ہنگاموں نے دلی کی سیاسی ، معاشرتی اور معاشی زندگی کی بنیادیں ہلا دی تھیں ۔ انیسویں صدی کے شروع کی دلی میں بھی اس کا اثر باقی تھا ۔ اس لیے غالب ان اثرات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے ۔

اس میں شبہ نہیں کہ انیسویں صدی کے شروع میں انگریزوں نے فاتح کی حیثیت سے داخل ہوکر ان تمام ہنگاموں کو ختم کیا جو مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں نے اس سے قبل برپا کر رکھے تھے اور اس طرح اس سیاسی انتشار کا یقیناً خاتمہ ہوا جس کا سلسلہ تقریباً ایک صدی سے دلی اور اطراف دلی میں جاری تھا ۔ اب زندگی کی غیر یقینی کیفیت بڑی حد تک ختم ہوگئی اور لوگ وقتی طور پرکسی حد تک مطمئن بھی ہوگئے ۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ انگریز بہ ذات خود ایک ایسے سیاسی انتشار کا باعث بنے جس کا تصوّر

۱۔ خلیق احمد نظامی : تاریخ مشائخ چشت : صفحہ ۳۲۳

۲۔ Sarkar : *Fall of the Moughal Empire Vol III.* P. 110

بھی اس سے قبل کسی نے نہیں کیا تھا ۔ جب ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی فوجیں دلی میں داخل ہوئیں تو گویا صحیح معنوں میں مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور اس ملک کے باشندے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیے گئے ۔ سیاسی طاقت تو انھوں نے اس سے قبل بھی حاصل کرلی تھی ۔ وہ بادشاہوں کو لڑاتے اور اُن کے ساتھ خود بھی لڑتے تھے ۔ ہندوستان کے بعض علاقوں میں تو باقاعدہ اُن کی حکومت تھی اور اس حکومت کو انھوں نے اپنی حکمت عملی اور شمشیر کے زور سے حاصل کیا تھا ۔ وہ اس وقت تک اِتنے طاقت ور ہو چکے تھے کہ مغل بادشاہوں کی اُن کے سامنے کوئی حیثیت نہیں تھی ، وہ انھیں اپنا آلۂ کار بناتے تھے ۔ انھیں تخت سے اُتارنا اور تخت پر بٹھانا اُن کے لیے معمولی بات تھی ۔ وہ بادشاہ سے دیوانی لے سکتے تھے اور اُن کی طرف سے اسے پنشن مل سکتی تھی ۔ غرض اُنھوں نے ہندوستان کی سیاست میں بڑا عمل دخل پیدا کر لیا تھا ، اُن کی طاقت اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ ہندوستان کے حکمرانوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور پھر اُنھوں نے اس وقت تک جو کچھ حاصل کر لیا تھا ، وہ اسی پر قانع نہیں تھے ۔ اُن کی سیاسی ریشہ دوانیاں جاری تھیں ، اور وہ دلی میں بیٹھ کر سارے ہندوستان پر حکومت کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے ۔

۱۸۰۳ء کی لڑائی میں اُنھوں نے دلی کو فتح کر لیا تھا ۔ وہ چاہتے تو اس وقت مغلوں کی بادشاہت کو ختم کر سکتے تھے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا ۔ کیوں‌کہ اُن کے خیال میں مغل بادشاہ کو اپنا آلۂ کار بنا کر باقی رکھنا سیاسی اعتبار سے زیادہ مناسب تھا ۔ چنانچہ اُنھوں نے بوڑھے بادشاہ شاہ عالم کی بادشاہت کو قائم رکھا ۔ شاہ عالم کے ایما ہی پر اُنھوں نے دلی کی لڑائی لڑی اور وہ فاتح کی حیثیت سے اس شہر میں داخل ہوئے ۔ بادشاہ مرہٹوں ، جاٹوں اور روہیلوں کی شورشوں سے اتنا پریشان ہو چکا تھا کہ اُس نے انگریزوں کو اپنا نجات دہندہ تصوّر کیا اور ۱۶ ستمبر ۱۸۰۳ء کو لارڈ لیک سے دربار میں ملاقات کی ۔ حالانکہ اس سے قبل اُس نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ وہ انگریزوں کے خلاف ہتھیار اُٹھانے کے لیے تیار ہے ، کیونکہ اُس کے خیال میں یہ لوگ جس ملک میں جاتے ہیں وہاں نہایت خاموشی سے طاقت حاصل کرنے کی کوشش

کرتے ہیں—لیکن انگریزوں کی فتح نے اب اُس کے خیال کو بدل دیا اور اُس نے انگریزوں کی آمد کو ایک نعمت غیر مترقبہ تصور کیا^۱۔ لارڈ لیک کی بڑی آؤ بھگت ہوئی ۔ اُسے بادشاہ کی طرف سے خطاب دیا گیا ۔ وہی خطاب جو اس سے قبل سیندھیا کو دیا جا چکا تھا ۔ اور جس کا مطلب یہ تھا کہ بادشاہ کی طرف سے نظم و نسق کی تمام ذمہ داری اسے سونپ دی گئی ہے ۔ پہلے یہ کام سیندھیا کے سپرد ہوا تھا ۔ اب یہ دستار لارڈ لیک کے سر پر باندھی گئی ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز صحیح معنوں میں حکمران ہو گئے اور دلی میں اُن کے نام کا سکہ چلنے لگا ۔ چنانچہ ویلزلی نے بادشاہ کو یہ خط لکھا کہ انگریزوں کے زمانے میں اُسے کوئی تکلیف نہیں ہو گی ۔ اور وہ امن و اطمینان کے ساتھ بسر کر سکے گا[۲]۔ ظاہر ہے اس خط کا مطلب یہی تھا کہ انگریزوں کی سیاسی طاقت نے مختلف شورشوں کو ختم کر دیا ہے اور اب وہ بادشاہ کی حفاظت کریں گے اور اُسے زندہ رہنے کا موقع دیا جائے گا ۔ انھوں نے یقیناً بوڑھے بادشاہ شاہ عالم کو زندہ رہنے کا موقع دیا اور اس طرح مطمئن ہو کر اپنی سیاسی طاقت کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے کام میں مصروف ہو گئے ۔

اس وقت صرف لال قلعے میں بادشاہ کی حکومت تھی ۔ اس کی چہار دیواری کے باہر انگریزوں کا سکہ چلتا تھا ۔ انگریز لال قلعے کے اندر بادشاہ کی حکومت کو تسلیم کرتے تھے ۔ جو لوگ قلعے میں آباد تھے اُن کا شمار بادشاہ کی رعایا میں ہوتا تھا اور شاہی خاندان کے افراد کی شہزادوں کی طرح عزت کی جاتی تھی ۔ شاہی دربار کے آداب کا خیال رکھا جاتا تھا ۔ دربار باقاعدگی سے منعقد ہوتے تھے ۔ خطابات کا سلسلہ قائم تھا ۔ دربار کی مخصوص زبان بھی باقی تھی ۔ انگریز دوسرے درباریوں کی طرح دربار میں حاضر ہوتے تھے ۔ انگریز ریذیڈینٹ دیوان خاص میں باقاعدگی کے ساتھ حاضر ہوتا تھا ۔ دوسرے درباریوں کی طرح وہ نقار خانے کے سامنے اپنی سواری سے اُترتا تھا اور پیدل چل کر لال پردے کے پیچھے سے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور عام درباریوں اور امراء کی طرح سامنے کھڑا رہتا تھا ۔

۱- Percival Spear : *Twilight of Mughals* P. 35.

۲- ایضاً : صفحہ ۳۸

اگرچہ سارے ہندوستان میں اب مغل بادشاہ کی کوئی حیثیت نہیں رہی تھی ۔ وہ انگریزوں کا پنشن یافتہ سمجھا جاتا تھا ۔ لیکن لال قلعے کے اندر اس کی حکومت تھی اور اُسے پورا اقتدار اور شان و شکوہ حاصل تھا'' ۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس اقتدار اور شان و شکوہ کی کوئی حقیقت نہیں تھی ۔ کیونکہ مغلوں کی حکومت کا تو خاتمہ ہو چکا تھا ۔ انگریز صحیح معنوں میں حکمران ہو چکے تھے اور بادشاہ کی حیثیت محض شاہ شطرنج کی رہ گئی تھی ۔

شاہ عالم بادشاہ اسی عالم میں ۱۸۰۶ع تک زندہ رہا ۔ وہ مغل بادشاہ جس نے بچپن میں نادر شاہ کا حملہ دیکھا ، مرہٹوں اور روہیلوں ۔ سکھوں اور جاٹوں کی شورشیں جس کی آنکھوں کے سامنے اٹھی تھیں ، پانی پت کی تیسری لڑائی جس کے سامنے ہوئی تھی اور جو انگریزوں کے مقابلے میں بکسر کے مقام پر صف آرا ہوا تھا ۔ جس نے کلایو کے زمانے میں انگریزوں سے آلہ آباد کے مقام پر صلح کی تھی جو ہیسٹنگز کی پروا کیے بغیر انگریزوں کو چھوڑ کر دلی چلا آیا تھا ۔ تقریباً تین چوتھائی صدی کے ان سیاسی ہنگاموں سے دو چار رہ کر ۱۸۰۶ع میں اس دنیا سے رخصت ہوا ۔ اس کے بعد کئی بادشاہ تخت پر بیٹھے لیکن انگریزوں کے سیاسی اقتدار پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا ۔ وہ جس طرح چاہتے تھے ، ان بادشاہوں کے ساتھ برتاؤ کرتے تھے ۔ ان کے سیاسی اقتدار اور عسکری طاقت نے ان بادشاہوں کو اُن کا دست نگر بنا دیا تھا ۔ مغلوں کے آخری تاج دار بہادر شاہ ظفر تک یہ صورت حال باقی رہی ۔ بالآخر ۱۸۵۷ع میں مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی ۔ یہ انگریزوں کی سیاسی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی آخری کوشش تھی ، جس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کی سلطنت ختم ہو گئی ۔ انگریز حکمران ہو گئے اور اس سر زمین پر سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے ۔

یہ سیاسی ماحول تھا جس کے سائے میں غالب نے آنکھ کھولی ۔ ان میں سے بعض واقعات تو اُن کی آنکھوں کے سامنے ہوئے ۔ بعض واقعات اُن سے قبل ہو چکے تھے ۔ لیکن ان واقعات نے اُن کے ماحول پر جو اثر کیا تھا ، اُس کو اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے ضرور دیکھا ۔ مرہٹوں کی یورشیں ،

---

۱ ۔ Percival Spear : *Twilight of Mughals : P.* 38.

جاٹوں اور سکھوں کے ہنگامے اور انگریزوں کی ہوس ملک گیری کے سارے تماشے انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اور ان سب کے نتیجے میں اُن کا ماحول جس انتشار اور افراتفری سے دو چار ہوا تھا، اُس کو اُنھوں نے شدت سے محسوس کیا ۔ وہ جب پیدا ہوئے تو یقیناً بہت سے ہنگامے ختم ہو چکے تھے ۔ انگریزوں نے مرہٹوں کی طاقت کو ختم کر دیا تھا ۔ لیکن وہ خود صحیح معنوں میں حکمراں بن بیٹھے تھے اور مغلوں کی حکومت صرف لال قلعے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی ۔ اس صورت حال نے بہت سے فتنوں کو جگایا ۔ ماحول میں سازشیں ہی سازشیں تھیں ۔ انگریزوں نے ان سازشوں کو ہوا دی تاکہ اُن کا اقتدار باقی رہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس سر زمین پر اُن کی بنیادیں زیادہ سے زیادہ مضبوط ہوتی جائیں ۔

غرض غالب کے سیاسی ماحول میں بڑا انتشار تھا ، زندگی کی بنیادیں متزلزل ہو گئی تھیں اور ہر چیز اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی ۔

۳

اس سیاسی صورت حال نے اس زمانے کے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا ۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان کی تاریخ مسلمانوں کے درد و الم کی ایک طویل داستان ہے - ۱۷۳۲ع میں نادر شاہ کا حملہ ہوا اور مسلمانوں کی پریشانیوں کا ایک ایسا باب کھل گیا جو ۱۸۵۷ع کے بعد تک جاری رہا ۔ ہر صبح اُن کے لیے ایک نئے فتنے کا پیغام لاتی تھی — مرہٹے ، جاٹ ، سکھ ، تینوں کی ہنگامہ آرائی نے زندگی کو ایک مصیبت بنا دیا تھا ۔ پھر افغانوں کے حملوں نے تو جان ہی نکال دی — سکھوں، مرہٹوں اور جاٹوں کے حملوں سے نجات ملی تو غیر ملکی حکومت کا تسلط سر پر پایا ۔ مسلمان پانچ سو سال سے زیادہ تک حکمرانی کرچکے تھے اور اُن ہی سے سیاسی اقتدار بھی چھینا گیا تھا ۔ اس بنا پر انگریزی حکومت نے اُن پر سختی کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی - ۱۸۵۷ع کے ہنگامے میں مسلمانوں کے جان ، مال اور آبرو سب پر مصیبت آئی اور پوری قوم پر نکبت اور افسردگی کا عالم طاری ہو گیا[۱] ۔ ان حالات میں معاشی بد حالی اور

۱- خلیق احمد نظامی : تاریخ مشائخ چشت : صفحہ ۳۰ ۔

معاشرتی انحطاط نے پرورش پائی - جینے کے لالے پڑ گئے - زندگی دوبھر ہو گئی - زندہ رہنے کے لیے افراد نے عیش کوشی اور تعیش پسندی کا سہارا لیا ، جس نے ساری معاشرتی زندگی کی صورت مسخ کر دی - اخلاق معیار بدل گئے اور زندگی کے حقائق سے فرار اور اُس کی اعلیٰ قدروں سے انحراف اُن کا مزاج بن گیا - انیسویں صدی کی دلی میں یہ معاشی بد حالی اور اُس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی معاشرتی افراتفری زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتی ہے ، اور تقریباً ہر طبقے کے افراد اُس کے شکار دکھائی دیتے ہیں - جس سر زمین پر کم و بیش ایک صدی تک سیاسی اقتدار کو حاصل کرنے کے لیے یہ ہنگامے ہوتے رہیں ، جہاں مرکز کم زور ہو گیا ہو ، جہاں بادشاہ صرف نام کے بادشاہ رہ گئے ہوں ، جہاں داخلی شورشوں نے سارے نظام کو درہم برہم کر دیا ہو ، جہاں بیرونی طاقتوں نے سیاست میں اپنا اثر قائم کر لیا ہو اور جہاں داخلی انتشار سے تنگ آکر لوگ بیرونی حملہ آوروں کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھنے کے لیے تیار ہو جائیں ، وہاں اس صورت حال کا پیدا ہو جانا ایسا کچھ عجیب نہیں ہے -

اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد مغلوں کی حکومت روز بروز سیاسی اعتبار سے کم زور ہوتی گئی تو اس کا اثر معاشی ، اقتصادی اور معاشرتی زندگی پر بھی ہوا - دور آخر کے مغل بادشاہ اس صورت حال سے بالکل بے خبر رہے - سیاسی انتشار نے انھیں اپنی دنیا الگ بنانے کے لیے مجبور کر دیا تھا - اس محدود دنیا میں رہ کر وہ اپنی زندگی کے دن گزارنا چاہتے تھے - انھیں اس کا علم نہیں تھا کہ ان کے آس پاس کی زندگی میں اندر ہی اندر کس طرح کے طوفان اُٹھ رہے ہیں اور اُن پر ان طوفانوں کا نتیجہ کیا ہونے والا ہے - دولت کو بڑھانے اور اُس کے نظام کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے جس سکون کی ضرورت ہوتی ہے ، وہ انھیں نصیب ہی نہیں تھا - یہی وجہ ہے کہ وہ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا خیال تک دل میں نہیں لاتے تھے - زندگی میں اُن کی دلچسپیاں ایسی چیزوں سے بڑھ گئی تھیں جن کے لیے دولت درکار ہوتی ہے اور جن کو حاصل کرنے کے لیے قارون کے خزانے بھی ہوں تو خالی ہو جاتے ہیں - سیاسی انتشار نے دولت کی پیداوار کو کم کر دیا تھا - مرکز کی کم زوری نے دولت کی فراہمی کے ذرائع اور وسائل محدود کر دیے تھے لیکن دولت کو صرف کرنے

کی ہوس بڑھ گئی تھی ۔ اخراجات میں اضافہ ہو گیا تھا اور اس کی وجہ ہوا و ہوس اور ذہنی تعیش اور عیش کوشی کے وہ میلانات تھے جن کو ان بادشاہوں نے اپنے مزاجوں میں داخل کر لیا تھا ۔ اورنگ زیب کے بعد جتنے بھی بادشاہ ہوئے کم و بیش سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے ۔ دولت کو پانی کی طرح بہانا اُن کے معمولات میں داخل تھا ۔ اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ کی فیاضی مشہور ہے ۔ اُس نے اپنی دولت کو اس طرح لٹایا کہ مالی اعتبار سے اُس کی حکومت تباہی کے قریب پہنچ گئی ۔ اس کے بعد جہاں دار شاہ کے زمانے میں اس کا حال کچھ اور بھی خراب ہو گیا ۔ اُس کی عیاشی نے خزانے خالی کر دیے ۔ اُس نے بھی دولت بری طرح لٹائی ۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کی محبوبہ لال کنور پر دو کروڑ روپیہ سالانہ خرچ ہوتا تھا[۱]۔ دربار میں عیش و عشرت کی فضا تھی ۔ اس پر بری طرح روپیہ خرچ ہوتا تھا ۔ فرخ سیر کو گھوڑے پالنے کا شوق تھا ۔ اُس نے بے شمار گھوڑے پال رکھے تھے اور ان گھوڑوں پر ہزاروں روپیہ خرچ ہوتا تھا ۔ شاہ عالم کے اخراجات زیادہ نہیں تھے ۔ آخر وقت میں تو جو رقم اُسے انگریزوں سے ملتی تھی ، اُس میں سے وہ خاصا بچا لیتا تھا ۔ کیونکہ بڑھاپے میں اُس کے اخراجات محدود ہو کر رہ گئے تھے[۲] ۔ لیکن اُس کے جانشین اکبر شاہ ثانی نے تخت نشین ہونے کے بعد انگریزوں سے زیادہ رقم طلب کرنے کی خواہش ظاہر کی کیونکہ اس کے اخراجات بڑھ گئے تھے ۔ اس وقت دلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور وہ سیاہ و سفید کے مالک بن چکے تھے ۔ اس لیے مغلوں کی دولت اُن کے ہاتھ میں تھی ۔ ملک کی معاشی اور اقتصادی زندگی کو اُنھوں نے اپنے قبضے میں کر لیا تھا ۔ غرض انگریزوں سے قبل مغل بادشاہوں کی زندگی کے عام انداز نے ملک کی معاشی اور اقتصادی زندگی کی بنیادیں ہلا دیں ۔ اُن کے بعد جو رہی سہی کسر تھی وہ انگریزوں نے پوری کر دی ۔

یہ انگریز دولت کے بھوکے تھے ۔ ہندوستان کی دولت نے اُن کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا ۔ وہ اسی دولت کو حاصل کرنے اور اس کے ذرائع

۱۔ Irvine : *Latermughals* Vol. I P. 194

۲۔ Percival Spear : *Twilight of the Mughals* : P. 38

اور وسائل پر قبضہ جمانے ہی کے لیے اس ملک کی سیاست میں داخل ہوئے تھے ۔ شروع شروع میں حکومت کرنا اُن کا مقصد نہیں تھا ۔ وہ سلطنت بنانے کے خواب کم دیکھتے تھے ۔ صرف دولت حاصل کرنا اُن کے پیش نظر تھا ۔ چنانچہ اُنھوں نے اس ملک کی دولت کو خوب خوب لوٹا ۔ اٹھارویں صدی میں دولت کو لوٹنے کا یہ سلسلہ براہ راست جاری رہا ۔ بے شمار دولت وہ انگلستان لے گئے ۔ خزانے کے خزانے اُنھوں نے خالی کر دیے ۔ یہ کمپنی کے زمانے کی بات ہے ۔ کمپنی کی بنیاد تجارت ضرور تھی ، لیکن حالات نے تجارت سے زیادہ لوٹ مار کو اُس کا نصب العین بنا دیا تھا ۔ وہ بادشاہوں سے دولت حاصل کرتے تھے ۔ عوام کو لوٹتے تھے ۔ اس ملک کی معاشی اور اقتصادی زندگی کو سنوارنا اُن کے پیش نظر نہیں تھا ۔ اُنھیں صرف اپنے آپ سے اور اپنی ہوس سے ہمدردی تھی ۔ اسی لیے حکمران ہونے کے بعد بھی وہ یہاں کی معاشی اور اقتصادی حالت کو سنوارنے کی طرف متوجہ نہیں ہوئے ۔ لوٹ مار کا سلسلہ اب بھی اسی طرح جاری رہا ۔ اُنھوں نے اس ملک میں اپنا زرعی نظام قائم کیا جس نے نئی جاگیرداریاں پیدا کیں ۔ اس کا مقصد بھی اپنے شکم کو بھرنا تھا[1] ۔ اس زمانے میں رشوتیں لینے اور تحفے قبول کرنے میں بھی وہ پیش پیش رہے ۔ یہاں کے سیاسی انتشار نے اُن کی طاقت میں اضافہ کر دیا تھا ۔ اس طاقت سے اُنھوں نے غلط فائدہ اُٹھایا ، انفرادی اور اجتماعی طور پر اُنھوں نے یہاں کی دولت سے خوب خوب اپنی جھولیاں بھریں اور ساری دولت کو سمیٹ کر سات سمندر پار لے گئے ۔ اس صورت حال نے یہاں کی معاشی اور اقتصادی زندگی کو جو نقصان پہنچایا ، اُس کی مثال تاریخ میں کہیں اور نہیں مل سکتی ۔ داخلی لڑائیوں ، بیرونی حملوں اور سیاسی سازشوں نے بھی اُس زمانے کی معاشی اور اقتصادی زندگی کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا کہ انگریزوں کی اس ہوا و ہوس نے پہنچایا ۔

مختصر یہ کہ کمپنی نے اپنی تجارت اور حکومت کے مخلوط عہد میں حکومت کے پردے میں خوب زرکشی کی اور اس طرح ہندوستان کی صنعت و حرفت اور تجارت کو برباد کیا ۔ انھیں بڑے عہدوں سے خارج کیا ۔ عدالتوں کو ذریعۂ آمدنی قرار دینے کے ساتھ ہندوستانیوں سے حقیر کا برتاؤ کیا ۔ ان

۱۔ R. Palme Dutt : *India to day* : P. 76

شکایات اور دیگر وجوہ کی بنا پر پارلیمنٹ نے ۱۸۳۳ء میں کمپنی سے تجارت کرنے کا حق چھین لیا[1]۔۔۔لیکن اس کے بعد تو مختلف طریقوں سے اور بھی لوٹ مار شروع ہوئی ۔ 'پہلے دن سے ہندوستان کی تجارت ، ملک گیری اور ملک داری میں جو روپیہ ہندوستان سے کما کما کر لگایا تھا ، اُس کا منافع تو ہمیشہ کمپنی کے حصہ داروں میں تقسیم ہوتا رہتا تھا اور جو خسارہ ہوتا وہ ہندوستان پر قرضہ قرار دیا جاتا ۔ اب کمپنی سے حق تجارت سلب کرتے وقت سلطنت برطانیہ نے طے کر دیا کہ اُس نام نہاد قرضے کی رقم پر ، جو کروڑوں کی تعداد میں تھا ، ہندوستان کے خزانے سے ساڑھے دس فی صدی سالانہ سود کمپنی کو دیا جایا کرے اور چالیس سال آئندہ تک قرضہ کی اصل رقم کمپنی کو ادا نہ کی جائے ، بلکہ صرف اُس کا سالانہ سود ادا ہوتا رہے اور باوجود سال بہ سال ادا ہونے کے چالیس سال کی میعاد گزر جانے پر کمپنی کو سو فی صدی کی ایک مزید رقم دی جائے تب اُس کے قرضے سے سبک دوشی ہو سکے گی[2]۔' غرض اس طرح مختلف طریقوں سے دولت کی نوچ کھسوٹ اور لوٹ مار کا سلسلہ اُس وقت تک جاری رہا جس وقت تک انگریز اس سر زمین پر حکمران رہے ۔

ہندوستان کا معاشی اور اقتصادی نظام ان حالات کی وجہ سے تقریباً ڈیڑھ سو سال تک ایک کرب مسلسل کے عالم میں رہا اور انیسویں صدی میں تو اُس پر نزع کی سی کیفیت طاری ہو گئی ۔ افلاس یہاں کے لوگوں کا مقدر بن گیا ۔ نہ صرف عوام بلکہ بادشاہ اور امراء تک اس کے شکار ہوئے ۔ خلیق احمد نظامی نے 'تاریخ مشائخ چشت' میں مختلف لکھنے والوں کے حوالے سے اٹھارویں صدی کی معاشی اور اقتصادی حالت کی جو تصویر کھینچی ہے ، تھوڑے سے فرق کے ساتھ کم و بیش یہی کیفیت انیسویں صدی کی بھی تھی ۔ وہ لکھتے ہیں : ''احمد شاہ کے زمانے میں شاہی خزانے کی یہ حالت تھی کہ دو دو ڈھائی ڈھائی سال تک محلات کے ملازمین کو تنخواہیں نہیں ملتی تھیں ۔ بادشاہ کی ساکھ اس قدر گر گئی تھی کہ مہاجن اور ساہوکار بھی قرض

۱- مولانا طفیل احمد منگلوری: مسلمانوں کا روشن مستقبل : صفحہ ۷۸

۲- ایضاً : صفحہ ۹

دینے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے ۔ اس زمانے میں شہزادیوں کو تین تین دن کے فاقے کرنے پڑتے تھے ــــ" سرسید احمد خاں لکھتے ہیں : "اکبر شاہ اگرچہ تخت نشیں ہوئے مگر اخراجات کی تنگی کا وہی عالم تھا جو شاہ عالم کے وقت میں تھا ۔ شاہ عالم ہی کے وقت میں اخراجات کی نہایت تنگی تھی ۔ تمام کار خانے ابتر ہوگئے تھے ۔ شاہزادوں کو جو قلعے کے نو محلے میں رہتے تھے ماہواری روپیہ نہیں ملتا تھا اور وہ چھتوں پر چڑھ کر چلاتے تھے کہ بھوکوں مرتے ہیں ، بھوکوں مرتے ہیں[۱] ۔" اسپیر (Spear) نے اپنی عالمانہ تصنیف Twilight of the Mughals میں مغل شہزادوں کے درد ناک مصائب کا نقشہ کھینچا ہے اور بتایا ہے کہ "ان شہزادوں کو بھوک سے مر جانے دیا جاتا تھا ، لیکن مزدوری یا ملازمت کرنے کی اجازت محض اس وجہ سے نہ ملتی تھی کہ یہ اُن کے دون مرتبت تھا ۔ اُن کی حالت جانوروں سے بد تر تھی[۲] ۔" غرض اس طرح اُس زمانے کی معاشی و اقتصادی بد حالی نے ہر طبقے کے افراد کو زبوں حال کر دیا تھا اور اُن میں سے ہر ایک کی حالت ایسی تھی کہ اُس کو دیکھ کر کلیجا منہ کو آتا تھا ۔ لیکن حالات اس درجہ خراب ہو چکے تھے کہ اُن کو درست کرنا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں تھی ۔ لوگوں کو اس زبوں حالی کا احساس ضرور تھا ۔ لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے یہاں زندگی سے ذہنی طور پر ایک بیزاری پیدا ہو گئی جس نے اُنھیں ہر عمل بنا کر ایک فراری ذہنیت کا شکار کر دیا ۔ زندگی کی حقیقتوں سے منہ موڑ لینے کے خیالات اُن کے یہاں پیدا ہونے لگے اور ایک غیر متوازن زندگی بسر کرنا اُن کا مزاج بن گیا ۔ اس کی جھلک زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتی ہے ۔ خصوصیت کے ساتھ اُس زمانے کی معاشرتی زندگی کو اس صورت حال نے بہت متاثر کیا ہے ۔

مغل عظیم معاشرتی روایات کے علم بردار تھے اور دور آخر تک آتے آتے تو اُن کی ان معاشرتی روایات نے ایک ترشے ہوئے ہیرے کی صورت

۱۔ سرسید احمد خاں : سیرت فریدیہ : صفحہ ۲۳ - ۲۴

۲۔ خلیق احمد نظامی : تاریخ مشائخ چشت : صفحہ ۳۳۵

اختیار کر لی تھی ۔ ان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا ۔ دولت و ثروت خاک میں مل گئی ۔ شان و شکوہ پر ادبار کے بادل چھا گئے ۔ معاشی اعتبار سے افلاس کی تاریکیوں نے اُنھیں اپنی گرفت میں لے لیا ۔ وہ پیسے پیسے کو محتاج ہو گئے لیکن معاشرتی آن بان کو اُنھوں نے حتی المقدور باقی رکھا ۔ بلکہ اس زمانے میں تو معاشرتی روایات کو برقرار رکھنے اور اُن کو فروغ دینے کا خیال تو اُن کے یہاں کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا ۔ چنانچہ اس معاشی بد حالی کے باوجود ، جو اُس زمانے میں سیاسی انتشار اور زوال کی وجہ سے اُن کا مقدر بن گئی تھی ، اُنھوں نے اپنی زندگی کے معاشرتی تقاضوں کو پورا کیا اور اُن سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ۔ اُنھوں نے اپنی روایات کو عظیم سمجھا اور اپنی محدود دنیا میں رہ کر ان روایات کو برتنے اور اُن کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی ، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان روایات کو برتنے کے خیال ہی نے اُن کے لیے اس میں زیست کا کچھ سامان پیدا کر دیا ۔ ورنہ تو سیاسی انتشار اور معاشی انحطاط و زوال نے اُن کے لیے زندگی دوبھر کر دی تھی اور ماحول کو جہنم بنا دیا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ اُس زمانے میں اُنھوں نے رہن سہن میں زیادہ نفاست پیدا کی ۔ زندگی کے لطیف پہلوؤں سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا ۔ عیش و عشرت کی طرف وہ زیادہ راغب ہوئے ۔ لہو و لعب اور تفریح کو اُنھوں نے اپنی زندگی میں زیادہ اہمیت دی ۔ اُنھوں نے لذت پسندی اور تعیش پرستی کا ماحول پیدا کیا ۔ محفلیں منعقد کیں ۔ مجلسوں کو آراستہ کیا ۔ اپنے آس پاس اور گرد و پیش ، رقص و سرود ، موسیقی و مصوری ، شعر و شاعری اور دوسرے فنون لطیفہ سے دلچسپی لینے کی ایک فضا قائم کی جس کے نتیجے میں عوام اور خواص سب ہی اُن سے لطف لینے لگے ۔ غرض اس طرح لطیف چیزوں سے دلچسپی لے کر زندگی کو زیادہ سے زیادہ لطیف بنانے کی طرف خاص طور پر توجہ کی گئی ۔ چنانچہ اس زمانے میں یہ رجحان عام ملتا ہے اور ہر شخص کی زندگی اسی رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے ۔ اس کے نتیجے میں لذت پرستی کے خیالات ضرور پھیلے ہیں ۔ تعیش پسندی کا ماحول ضرور پیدا ہوا ہے ۔ لہو و لعب میں زندگی بسر کرنے کی ایک فضا ضرور قائم ہوئی ہے ۔ لیکن ان سب کی تہہ میں زندگی کو ایک فن بنانے کا احساس ضرور کار فرما ملتا ہے ۔ یہ معاشرت اور معاشرتی روایات مغلوں کے دور آخر میں لال قلعے کے

اندر محدود ہو کر رہ گئی ہے اور اُس کے باہر لوگوں نے قلعے کو اس معاشرت اور معاشرتی روایات کی علامت سمجھا ہے ۔ چنانچہ لال قلعے کے اندر زندگی کو بسر کرنے کے جو معیار قائم ہوئے ہیں اور وہاں سلاطین اور امراء نے اپنے آپ کو جس رنگ میں رنگا اور اپنی زندگی کو جس سانچے میں ڈھالا ہے ، اسی کو قلعے سے باہر لوگوں نے معیار بنایا ہے اور وہ خود بھی اسی رنگ میں رنگ گئے ہیں ۔ چنانچہ ساری دلی اس زمانے میں معاشرتی اعتبار سے اسی سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے جس کی تشکیل و تعمیر لال قلعے کے اندر ہوتی تھی ۔ قلعے کے باہر بھی اس زمانے میں لوگ اپنے آپ کو امیر سمجھتے اور اس امارت و ریاست کو برقرار رکھنے کے لیے زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں ۔ زندگی کے لطیف پہلوؤں سے لگاؤ اور نفیس چیزوں سے دل چسپی اُن کے مزاجوں میں داخل ہو گئی ہے اور اسی کو انھوں نے زندگی کا معیار سمجھا ہے ۔ لہو و لعب اور عیش و عشرت کے خیالات اُن کے یہاں بھی بیدار ہوئے ہیں اور اُنھوں نے ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی میں رنگینیوں کا دور دورہ نظر آتا ہے اور ہر شخص اپنے اپنے فکر اور معیار کے مطابق زندگی کو ان رنگینیوں سے روشناس کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ گھر گھر محفلیں منعقد ہوتی ہیں اور محفلوں کو آراستہ کیا جاتا ہے ۔ رقص و سرود کے بازار گرم ہوتے ہیں اور زندگی کو ایک دلہن کی طرح سجانے کی کوشش کی جاتی ہے اور شمشیر و سناں کی بجائے طاؤس و رباب کی اولیت کے خیالات دلوں میں گھر کر لیتے ہیں ۔

اس کا سلسلہ اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد ہی سے شروع ہو گیا تھا ۔ محمد شاہ اور فرخ سیر کے زمانے سے لے کر شاہ عالم ، اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر تک نہ صرف یہ سلسلہ جاری رہا بلکہ اس میں وقت کے ساتھ ساتھ کچھ شدت ہی پیدا ہوتی گئی ۔ محمد شاہ کے زمانے میں تو اُس میں ہوس پرستی اور تعیش پسندی کو زیادہ دخل رہا تھا لیکن آخری بادشاہوں کے یہاں یہ رجحان نسبتاً کم نمایاں نظر آتا ہے ، برخلاف اس کے وہ معاشرت اور معاشرتی روایات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اُنھیں باقی رکھنے کا خیال انھیں زندگی کے ان پہلوؤں کی طرف زیادہ متوجہ کرتا ہے جن میں عیش و عشرت اور تعیش پسندی کے رجحانات بھی نمایاں ہو جاتے ہیں ۔ دوسرے

لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ باوجود سیاسی انحطاط و زوال کے اس زمانے کے بادشاہوں کے پاس ایک معاشرتی شعور تھا اور وہ ہر اُس چیز سے دلچسپی لیتے اور اُسے برقرار رکھنے کی کوشش کرتے تھے جس کا تعلق اُن کی معاشرت اور معاشرتی روایات سے تھا ۔ وہ صرف ہوس کے بندے ہی نہیں تھے ۔ اُن کی زندگی کا مقصد صرف تعیش ہی نہیں تھا ۔ اُن کے پیش نظر معاشرت اور معاشرتی زندگی بھی تھی ۔ ان دونوں کو اُنھوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کر دیا تھا کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے ۔

لال قلعہ ، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ، اس زمانے میں معاشرتی زندگی کا مرکز تھا اور دلی شہر کے تمام رہنے والے اُسے اپنی معاشرت کی ایک علامت سمجھتے تھے ۔ بادشاہوں کو بھی اس بات کا احساس تھا ۔ اس لیے اُنھوں نے اُن تمام ہنگموں کے باوجود ، جن سے وہ دوچار ہوتے رہے لال قلعے کی مرکزیت اور اس کی معاشرتی اہمیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ۔ حالات بھی ایسا کرنے کے لیے کچھ سازگار رہے ۔ اگرچہ اس زمانے میں بہت سی جنگیں ہوتی رہیں ۔ مرہٹوں ، جاٹوں ، سکھوں اور روہیلوں کی یورشوں کا سلسلہ جاری رہا لیکن لال قلعہ اس کے باوجود تباہ نہ ہوا ۔ اس پر کبھی زبردست گولہ باری نہیں ہوئی ۔ کہیں کہیں سنگ سرخ اور سنگ مرمر کی دیواروں کو نقصان ضرور پہنچا لیکن یہ نقصان بہت معمولی تھا ۔ البتہ محل بالکل تباہ ہوگیا ۔ نادر شاہ تخت طاؤس اور جواہرات کے خزانے اپنے ساتھ لے گیا ۔ اس کے بعد ایرانیوں اور سورج مل جاٹ نے رنگ محل کی چاندی کی چھتیں اتار لیں اور قیمتی جواہرات وغیرہ لوٹ کر لے گئے ، پھر غلام قادر روہیلے نے قلعے میں ہنگامہ برپا کیا لیکن وہ بھی اُسے تباہ نہ کر سکا ، صرف جواہرات وغیرہ نکالنے کی غرض سے فرش کھود ڈالے ، اور شاہی کتب خانے کو بہت سی قیمتی چیزوں سے محروم کر دیا ۔ ان میں سے کچھ تو لکھنؤ چلے گئے جنھیں نواب وزیر اودھ نے خرید لیا ۔ مرہٹوں کے زمانے میں قلعے کو اصل حالت میں برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی لیکن رقم نہ ہونے کی وجہ سے مرمت وغیرہ نہ ہو سکی ۔ شاہ عالم کا نابینا ہونا اُن کے لیے مفید ثابت ہوا ۔ کیونکہ ایک طرف تو اُس کا دل بجھ گیا تھا ۔ اُس کے اخراجات محدود ہو گئے تھے ۔ اُسے زیادہ روپے کی

ضرورت نہیں تھی - دوسرے اُسے قلعے کی تباہی کا احساس ہی نہیں تھا ، کیونکہ نابینا ہونے کی وجہ سے تباہی اور بربادی کے وہ مناظر اُس کے سامنے نہیں تھے ، جن سے قلعہ' معلوں دوچار ہو چکا تھا - اس لیے قلعے کی مرمت کی طرف شاہ عالم نے کوئی خاص توجہ نہیں کی - اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس کام سے کہیں زیادہ اہم اُس کے نزدیک اپنے بڑے خاندان کی پرورش اور دیکھ بھال تھی - اُس کے جانشین اکبر شاہ نے بے شک تخت نشین ہونے کے بعد قلعے کی مرمت کی طرف توجہ کی - لیڈی نوجنٹ (Leady Nugent) نے ۱۸۱۲ع میں یہ لکھا ہے کہ قلعے کے دیوان خاص کی چھت درست ہو چکی ہے اور خاصی مرصع ہے - قیمتی جواہرات کی جگہ اب نقلی جواہرات لگا دیے ہیں اور تقریباً تمام جواہرات نقلی ہیں لیکن ان کا اثر دیکھنے والے پر اچھا ہوتا ہے - لیکن یہ سلسلہ غالباً جاری نہ رہ سکا - کیونکہ ۱۸۲۵ع میں بشپ ہیبر (Bishop Heber) نے لکھا ہے کہ محل کا حال خراب ہے اور اس میں ہر طرف ویرانی برستی ہے - شاہ برج میں گندگی ہے اور وہ ویران ہے - غسل خانے اور فوارے سوکھے پڑے ہیں ، اندر کوڑے کے ڈھیر لگے رہتے ہیں اور پرندے گندگی پھیلاتے رہتے ہیں - لیکن یہ صورت ہمیشہ باقی نہیں رہی - بہادر شاہ ظفر کے تخت نشین ہونے کے بعد پھر قلعے کی طرف توجہ کی گئی اور ۱۸۳۸ع میں رزیڈنٹ نے یہ لکھا ہے کہ قلعے کی حالت بہت بہتر ہے اور اُس کی طرف خاص توجہ کی جا رہی ہے لیکن یہ سلسلہ بھی جلد ہی ختم ہو گیا کیونکہ بہادر شاہ اُس وقت تک خاصے ضعیف ہوگئے اور اُنھوں نے قلعے کے ظاہری پہلوؤں کی طرف توجہ نہیں دی¹ - اس کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ بہادر شاہ ظاہری پہلوؤں سے زیادہ داخلی اور باطنی پہلوؤں کی طرف توجہ دیتے تھے اور اُن کے نزدیک ذہنی اور روحانی معاملات کی اہمیت زیادہ تھی - بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ مغلوں کے دور آخر میں قلعے کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کی کوشش کی گئی - بعض بادشاہ اس کام کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہوئے لیکن اُنھوں نے قلعے کو مغلوں کی معاشرتی زندگی کی ایک علامت ضرور سمجھا اور اُس کو زیادہ سے زیادہ نکھارنے اور سنوارنے کی کوشش کی اُنھوں

۱- Percival Spear : *Twilight of the Mughals*: P. 60

نے اس شان و شوکت اپنی محدود آمدنی میں بھی حتی الامکان برقرار رکھا جو انہیں اپنے آباؤ اجداد سے ورثے میں ملی تھی -

لیکن اپنی روایات کو برقرار رکھنے کی یہ کوشش اور کاوش کوئی مستقل صورت اختیار نہ کر سکی - کیونکہ سیاسی انحطاط و زوال کے باعث پیدا ہونے والی معاشی بد حالی نے قلعۂ معلیٰ میں بھی اپنے قدم جما لیے تھے - بادشاہ تک اس زمانے میں پہلے مرہٹوں اور پھر انگریزوں کے رحم و کرم پر رہا ، یہ لوگ سیاہ و سفید کے مالک تھے - اس لیے ان کی مقرر کی ہوئی پنشن پر بادشاہ اور اُس کے خاندان کی زندگی کا دار و مدار تھا - یہ لوگ تعداد میں بھی بہت تھے - شاہی خاندان کے سیکڑوں آدمی قلعے میں رہتے تھے لیکن اُن میں بیشتر کی معاشی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ معاشرتی زندگی کی بلند سطح کو قائم نہیں رکھ سکتے تھے - اس زمانے میں میجر جارج کننگھم (Major George Cunningham) نے لکھا ہے کہ جو لوگ سلاطین کہلاتے ہیں وہ اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے رہتے ہیں - ان دیواروں کے اندر بے شمار چٹائیوں کے بنے ہوئے جھونپڑے ہیں جن میں یہ پامال اور پریشان حال مخلوق آباد ہے - انہیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس نہ تو کھانے کے لیے کچھ ہے اور نہ پہننے کے لیے — ان میں سے بعض بادشاہ کے قریبی عزیز ہیں - ان کی زندگی کا دار و مدار بادشاہ کی سخاوت اور ریذیڈنٹ سیٹن کے رحم دلی پر ہے - ان میں بعض رشتے میں بادشاہ کے بھائی اوز چچا ہوتے ہیں - ان کی کوئی معاشرتی حیثیت نہیں ہے - انہیں دربار تک میں حاضر ہونے کی اجازت نہیں ہے - انگریزوں نے ۱۸۰۳ء میں ان کی حالت زار پر ترس کھا کر کچھ مراعات ضرور دیں ، لیکن ظاہر ہے کہ ان سے اُن کی قسمتیں نہیں بدل سکتی تھیں"[۱] - وہ جہاں تھے وہیں رہے اور اُن کی معاشرتی حیثیت بلند نہ ہو سکی -

ان کے مقابلے میں بادشاہ کے بیٹوں کا معاشرتی مرتبہ کسی قدر بلند تھا - انہیں نسبتاً زیادہ آزادی حاصل تھی - انہیں روپیہ بھی کچھ زیادہ ملتا تھا - دربار میں بھی انہیں جگہ دی جاتی تھی لیکن اُنھوں نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا تھا - اکبر شاہ کے بیٹے مرزا جہانگیر کا حال بعض

۱- Percival Spear : *Twilight of the Mughals*: P. 62

لوگوں نے تفصیل سے لکھا ہے۔ اس سے اُس زمانے کے شہزادوں اور اُن کی معاشرتی زندگی پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ کرنل سلیمن (Col. Sleeman) نے ۱۸۱۶ع میں اُس سے ایک ملاقات کا حال بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''وہ برانڈی کی بڑی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ انگریزوں نے اس سے بہتر شراب نہیں بنائی۔ لیکن اس میں صرف ایک ہی خرابی ہے کہ اُس سے بہت جلد نشہ ہو جاتا ہے۔ وہ اس شراب سے لطف حاصل کرنے کے لیے ہر گھنٹے کے بعد ایک بڑا گلاس پیتا رہتا تھا، یہاں تک کہ اس پر بد مستی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ناچنے اور گانے والیاں مستقل اس کے سامنے ناچتی اور گاتی رہتی تھیں۔ وہ بہت چھوٹی عمر میں مر گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی زندگی بسر کرنے والا آدمی زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتا تھا۱''۔ ''میرزا جہانگیر کے بھائی میرزا بابر کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ اُس نے تو قلعے میں انگریزی طرز کی عمارت تعمیر کرلی تھی۔ اسی میں رہتا تھا، انگریزی لباس پہنتا تھا اور شہر میں مستقل طور سے گھومنا اُس کا محبوب مشغلہ تھا۲''۔ یہ لوگ ایک زوال آثار معاشرتی ماحول کی نمایندگی کرتے ہیں۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ زوال و انحطاط اُس زمانے کی معاشرت میں موجود تھا اور تھوڑے سے فرق کے ساتھ تقریباً تمام لوگ اس میں پا بہ زنجیر تھے۔

پھر بھی اس زمانے میں اُن معاشرتی روایات کی جھلکیاں بعض لوگوں میں ضرور نظر آتی ہیں جو مغلوں کے ساتھ مخصوص تھیں۔ بعض لوگوں نے اکبر شاہ کی بڑی تعریف کی ہے۔ بہادر شاہ بھی اس اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے زمانے میں ان معاشرتی روایات کو زندہ رکھنے کی کوشش کی جو اُنھیں ورثے میں ملی تھیں اور جنھیں وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان دونوں بادشاہوں کے زمانے میں درباروں کی شان و شوکت قائم رہی اور انگریزوں کے حکمراں ہونے کے باوجود شاہانِ مغلیہ کے جاہ و جلال میں فرق نہیں آیا تھا۔ وہ روایتی شان و شکوہ کے ساتھ درباروں میں بیٹھتے تھے اور سائل اُن کے سامنے پیش کیے جاتے تھے۔

۱۔ W. H. Sleeman : *Rambles and Recollections*: P. 509

۲۔ Major Archer : *Tours in Upper India* : P. 383

بشپ ہیبر (Bishop Hebber) نے اکبر شاہ کے دربار کی حقیقت سے بڑی ہی بھر پور تصویر کھینچی ہے ۔ اُس نے لکھا ہے کہ کس طرح وہ قلعے کے مختلف حصّوں کو طے کرکے بادشاہ کے دربار میں پہنچا ۔ کتنی بار اسے نذر پیش کرنی پڑی، کس طرح اُسے خلعت پہنایا گیا ۔ کس انداز میں اُس کی آؤ بھگت ہوئی۔ بہادر شاہ ظفر کو بھی بعض لوگوں نے بہت سراہا ہے ۔ وہ فطرتاً نیک ، شریف اور سادہ مزاج بادشاہ تھے ۔ دن بھر لکھنا پڑھنا ، قرآن مجید کا مطالعہ کرنا اور فکر سخن میں محو رہنا اُن کا محبوب مشغلہ تھا ۔ انھیں ادب اور جالیات سے دلچسپی تھی ۔ روزانہ وہ جمنا کی سیر کرتے تھے ۔ برسات میں مہرولی جاکر رہنا اور برسات کی دل چسپیوں میں حصہ لینا اُن کے معمولات میں داخل تھا ۔ انھیں مختلف تہواروں سے دلچسپی تھی اور وہ اُن میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ عرسوں میں شریک ہونا بھی اُن کے معمولات میں داخل تھا ، اور اُن کے زمانے میں عرس بڑے اہتمام سے منائے جاتے تھے ۔ غرض ان دونوں بادشاہوں کا انداز اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف تھا ۔ ایک میں درباری شان و شکوہ تھا اور دوسرے میں سادگی اور درویشی تھی لیکن دونوں کا زمانہ معاشرتی اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے ۔ ان کے عہد میں مغلوں کی معاشرتی روایات کو نہ صرف برقرار رکھا گیا بلکہ معاشرتی زندگی میں بعض نئی دلچسپیاں پیدا کی گئیں ، جنھوں نے وقت کے ساتھ ساتھ نئی معاشرتی روایات کا روپ اختیار کر لیا ۔ منشی فیاض الدین نے اپنی کتاب 'بزم آخر' میں اس زمانے کی معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ۔ اُنھوں نے دہلی کے آخری دو بادشاہوں اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ کے طریق معاشرت کی تصویر پیش کی ہے ۔ اس پوری تصویر میں صرف آسائش اور عیش کا رنگ بھرا ہوا ہے ۔ رات اور دن جشن میں گزرتے تھے۔ کبھی تورے بندی ہے ، کبھی رت جگا کبھی نو روز ، کبھی آخری چہار شنبہ ، کبھی خواجہ صاحب کی چھڑیاں ، کبھی سلونو، کبھی پھول والوں کی سیر——غرض بزم ہی بزم ہے ، رزم کا کہیں نام نہیں ۔ قلعۂ معلیٰ کے باہر جو طوفان برپا ہے ، اُس سے بے خبر فکر فردا سے بے نیاز——ایسا معلوم ہوتا ہے رقص پری پیکراں اور

Bishop Hebber's Narrative: 1 P. 304 -۱

'غوغائے رامش گران' میں ساری دنیا سمٹ کر آ گئی ہے''۔ اس بیان میں کسی قدر مبالغہ آرائی ضرور ہے لیکن ویسے یہ حقیقت ہے کہ اس زمانے میں معاشرتی زندگی انھیں دل چسپیوں میں محدود ہو کر رہ گئی تھی ۔ اور چونکہ بادشاہ انھیں بہت اہمیت دیتے تھے اس لیے اُن کی دیکھا دیکھی عوام نے بھی انھیں اپنے معمولات میں داخل کر لیا تھا ۔ امراء اور عوام بھی ان میں دلچسپی لیتے تھے اور اُس زمانے کے مخصوص حالات نے ان باتوں کو اُن کی زندگیوں کا جزو بنا دیا تھا ۔ وہ بھی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے خواب دیکھتے رہتے تھے ۔ خوش وقتی اُن کے نزدیک بھی معیار بن گئی تھی ۔ بقول غالب ہزاروں خواہشیں ایسی تھیں کہ ہر خواہش پر اُن کا دم نکلتا تھا ۔ اُن کا دل غم کھانے میں بودا تھا اور مے گلفام کے کم ہونے کا رنج بھی اُن کے لیے بہت تھا ۔

ان حالات نے ایک ایسی معاشرت کو پیدا کیا جس میں زندگی کی حقیقتوں کی طرف توجہ کم تھی ۔ ان سے چشم پوشی کرنے اور انھیں بھلا دینے کا خیال زیادہ تھا ۔ تعیش پسندی اور لذت پرستی اس معاشرتی زندگی کی بنیاد تھی اور زندگی کے اس انداز کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا ۔ مذہب اور دین داری کے ساتھ ساتھ بھی لذت اور تعیش کے یہ سلسلے قائم رہ سکتے تھے ۔ چنانچہ اُس زمانے میں یہی ہوا ہے ۔ لوگ اسی اکتساب لذت اور حصول تعیش کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں ۔ بعض جگہ تو اس صورت حال نے لطافت اور رنگینی کی صورت اختیار کی ہے لیکن بعض جگہ اس میں انتہا پسندی نے ابتذال کا رنگ پیدا کر دیا ہے ۔ درگاہ قلی خان نے اپنی دل چسپ کتاب 'مرقع دہلی' اگرچہ محمد شاہی عہد میں لکھی ہے لیکن اُس سے شاہ عالم ، اکبر شاہ اور بہادر شاہ کے عہد کی معاشرتی زندگی پر بھی خاصی روشنی پڑتی ہے کیونکہ اس وقت بھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ زندگی کا عام انداز وہی تھا ۔ محمد شاہ کے زمانے کی سی شدت تو اس زمانے میں باقی نہیں رہی تھی لیکن اس زندگی کے لیل و نہار کم و بیش وہی تھے ۔ اس زمانے کے بازاروں ، محفلوں ، مجلسوں اور دوسری دلچسپیوں کا جو حال اُنھوں نے لکھا ہے ، وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے ۔ قلعے کے باہر

۱۔ خلیق احمد نظامی : تاریخ مشائخ چشت : صفحہ ۳۴۲

جو چوک سعد اللہ خاں کے نام سے مشہور ہے ، اس کی کیفیت اُنھوں نے اس طرح بیان کی ہے :

"ہنگامہ اش محاذی دروازۂ قلعہ است و مجمعش در فضائے پیش گاہ جلوہ خانہ - سبحان اللہ کثرتے می شود کہ نظر از ملاحظہ محسوسات رنگا رنگ دست و پا گم می کند و نگاہ بہ مشاہدہ تجدّد و امثال در تماشا و تعداد تمثال ، مواد تمنا در آئینہ خانہ حیرت می نشیند ، ہر طرف رقص امارد خوش رو قیامت آباد و ہر سو شور افسانہ سنجال محشر بنیاد"[۱] -

---

"یہ چوک قلعہ شاہی کے دروازے سے شروع ہوتا ہے - یہ دہلی کا بہت ہی خوبصورت بازار ہے - یہاں صبح و شام اس قدر مجمع رہتا ہے اور اس قدر رنگا رنگ جلوے نظر آتے ہیں کہ پہلی دفعہ دیکھنے والا دیکھ کر حیرت زدہ سا ہو جاتا ہے اور ایک اجنبی شخص کے لیے یہ بازار نگار خانۂ چین معلوم ہوتا ہے - کیونکہ یہاں حیرت اور دلچسپی اور تعجب کی بہت سی چیزیں ہیں - نیا شخص کس کس کو دیکھے - بازار کے ایک طرف خوبصورت اور اور طرحدار مردوں کا ناچ ہوتا ہے - یہ ناچ اس قدر دلچسپ ہوتا ہے کہ آدمی بس کھڑا دیکھا ہی کرے - ناچ دیکھنے والوں کی ایک بھیڑ لگی رہتی ہے ، جو صدائے تحسین و مرحبا سے آسمان سر پر اُٹھا لیتی ہے ، جس کو سن کر ہر گزرنے والے کا دل زبردستی ناچ کی طرف کھنچ جاتا ہے"[۲] -

اور دہلی کے بعض اُمراء کی دلچسپیوں اور مزاج کی رنگینیوں کا ذکر اس طرح کیا ہے :

"اعظم خاں پسر فدوی خاں برادر زادہ خان جہاں بہادر عالمگیری از امرائے عظیم الشان بمقتضائے رنگینیٔ مزاج و مہارت راگ ممدوح مطربان ہندوستان طبیعتش امارد پسند است و مزاجش بہ محبت

۱- درگاہ قلی خاں : مرقع دہلی : صفحہ ۱۴

۲- حسن نظامی: پرانی دہلی کے حالات (ترجمہ مرقع دہلی) : صفحہ ۲۳

ساده رویان در بند مداخل جاگیرتش صرف اخراجات این فرقه است و محاصل روزگارش خرج ہا انداز مقدم ۔ طبقه ہر جا از امروے رنگیں محیر می یابد بروایت دل خواه در کمند رفاقت خود می اندازد از ہر طرف از ساده روئے پیامش می رسد بہ دام احسانش می کشد جمعے ازیں گروه بحسن سعیش بمنصب مناسب امیتاز یافته انیس بساط اند و برخے بمراعات خانگیش اکتفا کرده رنگ افروز محفل نشاط در سواری بتمان تمام و تجمل مالا کلام بر اسپان باد پا سواری شوند غرض ہر جا سبزه رنگے نظر می آید منسوب بہ آعظم خاں است و ہرکجا نو خطے جلوه کند از وابستہائے آں عظیم الشان بہ پرتو خال ابی گل رخاں صبح پیری را خضاب می کند و بواہمہ کم فرصتی ہائے زماں فرصت حیات در استجلاب و حظوظ نفسانی در شتاب"[۱]

"خان جہاں بہادر عالم گیری کا بھائی اور فدوی خاں کا لڑکا ہے ۔ دہلی کے بڑے امیروں میں ہے ۔ رنگین مزاج اور بذلہ سنج ہے ۔ فن موسیقی کا ماہر ہے ، ہندوستان کے مطرب اور موسیقی داں اعظم خاں کی بہت عزت کرتے ہیں ۔ حسن پرست ہے خوب صورت لڑکوں ، نو خط مردوں اور ماہ رو حسینوں کی محبت میں گرفتار رہتا ہے ۔ اس کی جاگیر کی آمدنی کا اکثر حصہ حسن پرستی کی نذر ہو جاتا ہے ۔ جہاں کہیں کسی خوب صورت لڑکے کی خبر سنتا ہے ، فوراً اُس کو حاصل کرنے یا اُس سے ملنے کی کوشش شروع کر دیتا ہے ۔ یہاں تک کہ اُس کو اپنا بنا لیتا ہے ۔ ایسے ہی اگر کسی خوش جمال عورت کا حال سنتا ہے تو اُس کو بھی قبضے میں لانے کی کوشش کرتا ہے اور کسی نہ کسی طرح اس کو حاصل کر لیتا ہے ۔ عشق بازی اور حسن پرستی کے سلسلے میں نڈر اور بے خوف ہے ۔ اس سلسلے میں بے شمار روپیہ خرچ کر ڈالتا ہے ۔ عیاشی اُس کی زندگی ، امرد پرستی اُس کا شعار اور زن پرستی

۱- درگاہ قلی خاں : مرقع دہلی : صفحہ ۲۷

اُس کی عادت ہے ۔ اس کی محفل نشاط میں منتخب حسینان جہاں کا جمگھٹا رہتا ہے[1] ۔''

''میرزا منو کہ از امیر زادہائے زمانہ است و دریں فن سحرکاریہا یگانہ ۔ اکثر از امرا زادہ ہائے احکام ضروری ایں علم ازو یاد می گیرند و بشاگردیش فخر می کنند شیرازہ ایں محفل است و باعث انتظام ایں بزم غلمان مشاکل ۔ خانہ اش بہشت شداد است و کاشانہاش آشیان مجمع پری زاد ہر نو خط رنگیں کہ با ایں محفل ربط نہ دارد فرد باطل است و ہر ملیح کہ بایں مجمع مربوط نیست از حلیہؑ اعتبار عاطل مجلسش دارالعیار شاہدان است و بزمش محک امتحان گل رخاں نقد قراضہ حسن تابہ دارالضرب بزمش رجوع نہ کند کامل عیار نیست چہ شدکہ مثل طلائے دست افشار است وسیم جال تا در کوزہ مجمعش گداز نیابد چاندی نیست چہ شد کہ اگر نقرہ خالص است[2] ۔''

''یہ حضرت بھی مشہور امیر زادے ہیں اور حسن پرستی اور امرد نوازی کے فن میں یگانہؑ روزگار سمجھے جاتے ہیں ۔ بڑے بڑے نواب زادے دولت مند ہیں اور میرزا منو کے اس فن خاص کو سیکھتے ہیں اور میرزا کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں ۔ میرزا منو کی محفل رندانہ تک اچھے اچھوں کی رسائی نہیں ہوتی اور وہ میرزا کی صحبت کے لیے ترستے ہیں ۔ میرزا کی محفل بہشت شداد کا نمونہ ہے ۔ جہاں پری زاد غلمان ، جادو نگاہ لڑکے اور خوب صورت مطربوں اور معشوقوں کا مجمع رہتا ہے ، مشہور ہے کہ میرزا کی بزم جمال حسن و خوب صورتی کی امتحان گاہ ہے کیونکہ میرزا عشق بازی اور حسن پرستی کے فن میں اتنا کامل ہے کہ کسی حسین کا اُس کے چنگل سے نکل جانا یا میرزا کا کسی حسین سے

۱- حسن نظامی : پرانی دہلی کے حالات : (ترجمہ مرقع دہلی) : صفحہ ۳۸ ، ۳۹

۲- درگاہ قلی خاں : مرقع دہلی : صفحہ ۲۷ - ۲۸

محبت نہ کرنا اُس حسین کے نقص کی علامت ہے ۔ دہلی کی ہر حسین لڑکی اور ہر حسین لڑکے کا میرزا کے تعلق میں ہونا لازمی ہے ۔ یہ مثل مشہور ہے کہ جو امرد میرزا منو کی محفل کی زینت نہیں وہ عیار کامل نہیں ہے اور اُس کو معشوقیت کی تمیز نہیں ہے'۔''

ان بیانات سے مغلوں کے دور آخر کی دلی ، اُس کی معاشرت اور اس معاشرت کے علم برداروں پر خاصی روشنی پڑتی ہے ۔ کم و بیش یہی حال امراء ورؤساء کا بہادر شاہ ظفر کے وقت تک رہا ۔ ان میلانات کے اثرات اس زمانے کی معاشرتی زندگی پر ایسے گہرے ہوئے کہ عوام تک نے اپنے آپ کو اسی رنگ میں رنگ لیا اور اس طرح ہر طرف ایک عیش و عشرت ، لذت پسندی اور ہوا و ہوس کی فضا قائم ہو گئی ۔ اس زمانے کا ہر فرد اسی فضا میں سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے افکار و خیالات ، عقائد و توہمات اور عادات و اطوار سب میں اس کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں ۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان لوگوں نے زندگی کے اسی انداز کو اپنا نصب العین بنا لیا ہے اور اُس کو عملی جامہ پہنانے کے خیال میں وہ سب کے سب سرگرداں نظر آتے ہیں ۔ اس زمانے کے مخصوص حالات نے ان میں سے ہر ایک کو انتہا پسند بنا دیا ہے اور اُن کی انتہا پسندی نے مجموعی طور پر معاشرتی زندگی میں عجب عجب گل کھلائے ہیں ۔

بظاہر یہ زندگی بڑی رنگین اور پرکار نظر آتی ہے ۔ اس کے ہر شعبے پر رنگین پردے پڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ اس میں بڑی دلکشی ہے ۔ یہ رعنائی سے بھرپور ہے ۔ اس میں دلچسپی کا بڑا سامان ہے ۔ یہ آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس رنگینی اور پرکاری کے بے بنیاد اور بے اساس ہونے کا احساس ہوتا ہے ۔ یہ ایک خواب و خیال کی دنیا معلوم ہوتی ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو انحطاط و زوال کے غیر شعوری احساس نے پیدا کیا تھا ۔ اب آگے بڑھنے کے راستے بند ہو گئے تھے ۔ شمشیر و سناں کی جگہ طاؤس و رباب نے لے لی تھی ۔ رزم کی جگہ

۱- حسن نظامی : پرانی دہلی کے حالات : ۲۹ - ۳۰

بزم کا دور دورہ تھا ۔ اس لیے لوگ زندگی کے حقائق کو بھلا دینا چاہتے تھے۔ اُس کے سنگین معاملات سے چشم پوشی کرنا اُن کے مزاجوں میں داخل ہو گیا تھا ۔ اس لیے اُن کی زندگی متوازن نہیں رہی تھی ۔ اُس زمانے کے لوگ عظیم معاشرتی روایات کے علم بردار تھے لیکن اب سیاسی انتشار اور اُس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی معاشی بد حالی نے ان روایات کی بنیادیں ہلا دی تھیں ۔ اس لیے وہ ان روایات کو سینے سے لگائے رکھنا چاہتے تھے لیکن روایات کو اصل صورت میں باقی رکھنے کے لیے سیاسی اقتدار اور معاشی انضباط کی ضرورت تھی اور یہ دونوں چیزیں عنقا ہو چکی تھیں ۔ اس لیے ان معاشرتی روایات کو برقرار رکھنے کے خیالات افراد سے عجیب عجیب حرکتیں سرزد کراتے تھے ۔ معاشرتی زندگی میں لذت پسندی کا خیال انھیں ورثے میں ملا لیکن اب اس خیال نے عجیب و غریب صورتیں اختیار کرلی تھیں ۔ اس میں فراری ذہنیت نمایاں تھی ۔ اس لیے ابتذال کا رنگ رونما ہونے لگا تھا ۔ تاج محل اور لال قلعے کی تعمیر کے لیے اس زمانے میں وسائل موجود نہیں تھے ۔ اس لیے تخلیقی صلاحیتیں ان بزم آرائیوں کی نذر ہو گئی تھیں جن کا مقصد صرف ذہنی تعیش تھا ۔ اس زمانے کی زندگی کے مختلف شعبوں میں افراد کی حرکات و سکنات اسی صورت حال کی آئینہ داری کرتی ہیں ۔

۴

یہ صورت اُس ذہنی پستی کا نتیجہ تھی جس کو سیاسی انتشار اور معاشی پراگندگی کے ہاتھوں وجود میں آنے والے انحطاط و زوال نے پیدا کیا تھا ۔ مغلوں کے دور آخر کا تقریباً ڈیڑھ سو سال کا زمانہ اسی ذہنی پستی اور انحطاط و زوال کی نشان دہی کرتا ہے ۔ اورنگ زیب عالم گیر کی وفات سے لےکر بہادر شاہ ظفر کے معزول ہونے تک ہندوستان کی زندگی اسی صورت حال سے دو چار رہی ۔ مسلمانوں پر اس کا نسبتاً زیادہ اثر ہوا ۔ کیونکہ وہ براہ راست ان حالات سے دو چار ہوئے ۔ اس آشوب قیامت نے اُن پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جو اس زمانے میں سیاسی اقتدار کی کمی اور مرکز کی کم زوری کی وجہ سے سکھوں اور جاٹوں کی شورشوں نے برپا کیا تھا ۔ معاشی بد حالی نے اُن کے لیے زیست دشوار کر دی اور وہ جو کچھ کر سکتے تھے

وہ نہ کر سکے بے بسی اُن کی راہوں میں حائل رہی ۔ چنانچہ اُنھیں میدان چھوڑنا پڑا اور وہ عملی زندگی سے منہ موڑ لینے پر مجبور ہو گئے ۔ اُنھوں نے خیال کی دنیا میں محفلیں سجائیں اور اُن کا وہی حال ہوا جو عام طور پر ان حالات میں رومانی مزاج لوگوں کا ہوتا ہے ۔ وہ معاشرتی روایات کو برقرار تو رکھتے ہیں ۔ اُن کی زندگی میں نفاست اور لطافت بھی نظر آتی ہے ۔ اُن کی مجلسوں میں رونقوں کا احساس بھی ہوتا ہے لیکن اس ذہنی پستی اور اخلاقی انحطاط کے اثرات بھی اُن کے یہاں نمایاں ہیں جن کو عام طور پر وہ بے اعتدالی پیدا کرتی ہے جو رومانیت کی بنیاد ہے ۔ یہ بے اعتدالی اس زمانے کی زندگی میں بہت عام ہے اور اس نے معاشرتی زندگی کے شیرازے کو منتشر کرکے رکھ دیا ہے ۔ چنانچہ ہر چیز اس زمانے میں نمود و نمائش کا ذریعہ بن گئی ہے ۔ ہر شعبے میں ہوا و ہوس کے خیالات نے گھر کر لیا ہے اور اس کی تکمیل ہی کو لوگ زندگی کا مقصد سمجھنے لگے ہیں ۔

ان حالات میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی ذہنی اور فکری تحریک چلتی ہے جس کا مقصد زندگی کو راہ راست پر لانا ہوتا ہے ۔ اس زمانے میں بھی بعض اہم ذہنی اور فکری تحریکیں ملتی ہیں جن کا شباب مغلوں کے انحطاط و زوال کا یہی زمانہ ہے ۔ اس تحریک کی ابتدا شاہ ولی اللہ دہلوی سے ہوتی ہے ۔ اُنھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کے سیاسی انحطاط ، معاشی انتشار اور معاشرتی پراگندگی کو محسوس کیا اور انھیں اس سے باہر نکالنے کی کوشش کی ۔ یہ کام آسان نہیں تھا کیونکہ اُس زمانے میں ایک عام افراتفری کا دور دورہ تھا ۔ سکھوں کے ہنگاموں ، جاٹوں کی یورشوں اور مرہٹوں کے حملوں نے نہ صرف سلطنت مغلیہ کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا تھا ، بلکہ عام مسلمانوں کے لیے بھی زندگی دشوار کر دی تھی ۔ بادشاہ اور امراء ان حالات کی تاب نہ لا کر عیش و عشرت میں گم ہو گئے تھے ۔ اُنھوں نے اپنے آس پاس اور گرد و پیش کو بھلا دیا تھا اور زندگی کے حقائق سے اس طرح اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں جیسے انھیں ان حالات سے کوئی سروکار نہیں ہے ۔ اس صورت حال نے سازشوں کا ماحول پیدا کیا ۔ ہوس ملک گیری بڑھ گئی ۔ لوگ دولت کے پیچھے بھاگنے لگے ۔ کسی کے سامنے کوئی بڑا نصب العین نہ رہا ۔ فوجی طاقت کم زور ہو گئی ۔ بغاوتوں نے سر اُٹھایا ۔ سازشوں کے فتنے بیدار ہوئے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کی حکومت

ختم ہو گئی - معاشی اور اقتصادی حالات بد سے بدتر ہوتے گئے - معاشرتی زندگی میں فراری ذہنیت کا عکس نظر آنے لگا - غرض ایک عام پراگندگی پھیل گئی -

شاہ ولی اللہ نے ان حالات کو بغور دیکھا ، اُن کے نشیب و فراز پر نظر ڈالی - سیاسی معاشی ، معاشرتی اور تہذیبی معاملات کا غور سے مطالعہ کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کے انحطاط و زوال ، اُن کے قومی انتشار اور ملی پراگندگی کا سبب دین اور مذہب سے علیحدگی اور اسلام کے صحیح اصولوں سے بیگانگی ہے - اسی نے اُن کے یہاں ڈھیلا ڈھالا پن پیدا کیا ہے اور وہ صحیح زندگی کے راستے سے ہٹ گئے ہیں - نتیجہ یہ ہوا ہے کہ زندگی کا سارا نظام بگڑ گیا ہے - معاشی نظام اقدار میں ناہمواری پیدا ہوگئی ہے - معاشرتی مذموعات عام ہو گئے ہیں - لہو و لعب زندگی کا جزو بن گیا ہے - تعیش پرستی مزاجوں میں داخل ہوگئی ہے - لذت پسندی کے خیالات عام ہو گئے ہیں - اپنی کتاب 'تفہیمات' میں اُنھوں نے ان تمام پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے اور مسلمانوں کے تمام طبقوں کو ان حالات سے باہر نکلنے کی طرف متوجہ کیا ہے - اس زمانے کے مسلمان امراء کو مخاطب کرکے کہتے ہیں :

"اے امیرو ! یہ دیکھو ! کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے ؟ دنیا کی فانی لذتوں میں تم ڈوبے جا رہے ہو اور جن لوگوں کی نگرانی تمھارے سپرد ہوئی ہے اُن کو تم نے چھوڑ دیا ہے تاکہ اُن میں بعض بعض کو کھاتے اور نگلتے رہیں ، چاہیے کہ تم اپنی شہوانی خواہشوں کو نکاح کے ذریعے پورا کرو - خواہ تمھیں ایک سے زیادہ ہی نکاح کیوں نہ کرنا پڑیں - لیکن تمھاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو اور نرم و گداز جسم والی عورتوں سے لطف اُٹھاتے رہو - اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمھاری توجہ کسی طرف منعطف نہیں ہوتی[1] -"

۱- شاہ ولی اللہ : تفہیمات (بہ حوالہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات) : مرتبہ خلیق احمد نظامی : صفحہ ۶ ، ۸

اور عوام کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں :

''اپنا مصارف وضع قطع میں تکلف سے کام نہ لیا کرو ۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارے نفوس بالآخر فسق کے حدود تک پہنچ جائیں گے ۔ اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتا ہے کہ اس کے بندے اُس کی آسانیوں سے فائدہ اُٹھائیں ــــ اتنا کمانے کی کوشش کرو جس سے تمہاری ضرورتیں پوری ہو جائیں ۔ دوسرے کے سینے کے بوجھ بننے کی کوشش نہ کرو کہ اُن سے مانگ مانگ کر کھایا کرو یا تم اُن سے مانگو اور وہ نہ دیں ۔ اس طرح بے چارے بادشاہ اور حکام کے لیے بوجھ نہ بن جاؤ ۔ تمہارے لیے یہی پسندیدہ ہے کہ تم خود کما کر کھایا کرو ۔ اگر تم ایسا کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمھیں معاش کی بھی رائے سجھائے گا جو تمہارے لیے کافی ہو گی ــ اے آدم کے بچو! جسے خدا نے ایک جائے سکونت دے رکھی ہو ۔ جس میں وہ آرام کرے ۔ اتنا پانی جس سے سیراب ہو ۔ اتنا کھانا جس سے بسر ہو جائے ۔ اتنا کپڑا جس سے تن ڈھک جائے ۔ ایسی بیوی جو اُس کی رہن سہن کی جد و جہد میں مدد دے سکتی ہو تو یاد رکھو کہ دنیا کامل طور سے اُس شخص کو مل چکی ہے ۔ چاہیے کہ اس پر خدا کا شکر ادا کرے'[1] ۔''

اسی طرح جو لوگ بری رسموں کو معاشرتی زندگی کا اہم حصہ سمجھنے لگے تھے ۔ اُن کے بارے میں لکھا ہے :

''تم نے ایسی فاسد رسمیں اختیار کر لی ہیں جن سے دین متغیر ہو گیا ہے ۔ مثلاً یوم عاشورہ کو تم باطل حرکات کرتے ہو ۔ ایک جماعت نے اُس دن کو ماتم کا دن بنا رکھا ہے ۔ کچھ لوگوں نے اس دن کو کھیل تماشوں کا دن بنا لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اُسے مذہبی مناسک کا دن بنا رکھا ہے ۔ پھر تم شب برات میں جاہل قوموں کی طرح کھیل تماشے کرتے ہو اور

۱۔ شاہ ولی‌اللہ : تفہیمات (بہ حوالہ شاہ ولی‌اللہ کے سیاسی مکتوبات) : مرتبہ خلیق احمد نظامی : صفحہ ۶، ۸

تم میں سے ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ اس روز مردوں کو کثرت سے کھانا بھیجنا چاہیے'۔"

اور جو لوگ معاشرتی زندگی میں بعض رسموں کو پورا کرنے کے لیے فضول خرچی کرتے ہیں انہیں مخاطب کر کے کہا ہے :

"پھر تم نے ایسی رسمیں بنا رکھی ہیں جن سے تمہاری زندگی تنگ ہو رہی ہے مثلاً شادیوں میں فضول خرچی ، طلاق کا ممنوع بنا لینا ، بیوہ عورت کو بٹھا رکھنا ۔ تم نے موت اور غمی کو عید بنا رکھا ہے[۲] ۔"

غرض شاہ ولی اللہ نے اس وقت کی ساری زندگی کو بدلنے کی کوشش کی ہے ۔ اُس کو نئی راہوں پر گامزن کرنا چاہا ہے ۔ اُس کے مختلف شعبوں میں نیا خون دوڑانے کے سلسلے میں وہ پیش پیش رہے ہیں ۔ اُن کی تحریک اُس وقت کی اہم تحریک تھی ۔ اس تحریک کی نوعیت بہ یک وقت دینی بھی تھی ، سیاسی بھی ، معاشی بھی تھی معاشرتی بھی ۔ اُنھوں نے زندگی کے ان تمام شعبوں میں ایک نئی روح پھونکی ہے اور انہیں صحت مندی سے ہم کنار کرنے کا اہم کام انجام دیا ہے—بقول شیخ محمد اکرام "شاہ ولی اللہ قومی زندگی کے ایک بڑے نازک دور میں پیدا ہوئے ۔ اُن کا ظہور اُس زمانے میں ہوا جب اسلامی حکومت کی بنیادیں اُکھڑ رہی تھیں اور اس ملک میں صدیوں جاہ و جلال سے حکومت کرنے کے بعد اس قدر آرام طلب اور کم زور ہو گئے تھے کہ وہ مرہٹوں اور سکھوں کے مقابلے میں تساہل اختیار کرتے تھے ۔ شاہ صاحب کو اس صورت حال کا افسوس ہوتا ہوگا ۔ لیکن جو شخص عملی کام کرنا چاہے اُسے اپنا دائرۂ عمل محدود اور معین کرنا پڑتا ہے ۔ شاہ صاحب اپنے آپ کو اس کام کے لیے موزوں نہیں سمجھتے تھے کہ وہ عملی زندگی میں دخل انداز ہوکر واقعات کی رو کو روکیں ۔ لیکن جس کام کے لیے وہ موزوں تھے اور جو کچھ کم ضروری نہ تھا (یعنی رسول اکرم کی خلافت باطنیہ) اس کے لیے اُنھوں نے اپنی زندگی وقف کر دی ۔ وہ ان عیوب اور کوتاہیوں سے پوری طرح واقف تھے جو مسلمانوں کی انفرادی اور

۱- بہ حوالہ تاریخ مشائخ چشت : صفحہ ۳۶۲
۲- ایضاً : صفحہ ۳۷۳

اجتماعی زندگی میں گھر کر گئی تھیں اور جن کی وجہ سے انھیں یہ روز بد دیکھنا نصیب ہو رہا تھا ۔ شاہ صاحب نے انھیں پوری طرح بے نقاب کرنے کی کوشش کی تاکہ ان کا ازالہ ہو جائے۔"۱ یہ بہت ہی اہم کام تھا کیونکہ اُس وقت کی زندگی حد نظر تک پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں بھٹک رہی تھی ۔ آیسے راستہ نظر نہیں آتا تھا ۔ منزل کی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی ۔ شاہ ولی اللہ کے افکار و خیالات نے اُس کے لیے شمع راہ کا کام کیا جس کی روشنی میں اُس زمانے کے مختلف شعبوں نے ارتقائی سفر جاری رکھا ۔

یہ تحریک بنیادی طور پر ذہنی اور فکری تحریک تھی ۔ اس میں عمل کا پہلو نمایاں نہیں تھا ۔ اس وقت حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اسی تحریک نے آگے بڑھ کر عملی صورت بھی اختیار کی ۔ شاہ اسماعیل شہید اور مولانا سید احمد بریلوی اسی تحریک کے چشم و چراغ ہیں ۔ لیکن اُن کے یہاں عمل کا جذبہ تحریک جہاد کی صورت اختیار کرتا ہے ۔ اور یہ مردان حق آگاہ باطل کے مقابلے میں حق کی قوتوں کو صف آرا کرتے ہیں اور راہ حق میں لڑتے ہوئے شہید ہو جاتے ہیں ۔ ان بزرگوں نے شاہ ولی اللہ اور اُن کے صاحب زادوں سے فیض حاصل کیا ۔ شاہ ولی اللہ کے صاحب زادوں میں شاہ عبد العزیز ، شاہ رفیع الدین ، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی تھے ۔ اُنھوں نے اپنے والد کی وفات کے بعد اُن کی ذہنی اور فکری تحریک کو جاری رکھا اور مسلمانوں کی دینی زندگی کو سدھارنے ، معاشرتی معاملات کو سنوارنے اور تہذیبی حالات کو نکھارنے میں پیش پیش رہے ۔

شاہ عبدالعزیز ۱۱۵۹ھ ۱۷۴۶ء میں پیدا ہوئے ۔ اپنے والد شاہ ولی اللہ سے علم حاصل کیا اور پندرہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے ۔ جب شاہ ولی اللہ صاحب کا انتقال ہوا تو اُن کی عمر سترہ سال تھی ۔ وفات کے بعد یہ شاہ صاحب کے خلیفہ مقرر ہوئے اور ساٹھ سال تک اپنے والد کے کام کو جاری رکھا ۔ علم حدیث کے درس کی طرف اُنھوں نے خاص طور پر توجہ کی ۔ چنانچہ ہندوستان کے اکثر محدثین کا سلسلہ آپ سے ملتا ہے ۔ اپنے والد کی طرح وہ تصنیف و تالیف کی طرف توجہ نہ

۱۔ شیخ محمد اکرام : رود کوثر : صفحہ ۳۸۷ ، ۳۸۸

کر سکے ۔ کیونکہ اُن کا زیادہ وقت درس و تدریس میں صرف ہوتا تھا اور وہ ارشاد و ہدایت کے کام میں مصروف رہتے تھے ۔ اُس زمانے کے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے جو اہم کام شروع کر رکھا تھا ، اُس کو اُس زمانے کے لوگ کتنی اہمیت دیتے تھے اور اُن کے دلوں میں شاہ صاحب کی کتنی عزت تھی ۔ جن نامور ہستیوں نے اُن سے فیض حاصل کیا اُن میں شاہ رفیع الدین ، شاہ محمد اسحاق ، شاہ غلام علی ، مفتی صدر الدین آزردہ ، مولوی مخصوص اللہ ، مولوی عبدالحیٔ ، مولانا میر محبوب علی ، مولانا فضل حق خیر آبادی ، مفتی الٰہی بخش کاندھلوی اور مولانا سید احمد بریلوی وغیرہ کے نام خاص طور پر مشہور ہیں[۱] ۔ شاہ عبدالعزیز نہ صرف اسلامی علوم کے ماہر تھے بلکہ دوسرے علوم و فنون پر بھی اُن کی نظر بہت گہری تھی ۔ زبان و ادب کے بھی وہ بہت ماہر تھے ۔ چنانچہ اس زمانے کے بعض شاعروں نے بھی اُن سے فیض حاصل کیا ہے ۔ مومن بچپن ہی میں اُن کے مدرسے سے منسلک ہو گئے تھے ۔ اُنہوں نے ابتدائی تعلیم بھی وہاں حاصل کی اور اُن کے وعظ بھی سنے[۲] ۔ ذوق نے بھی اُن کی شاگردی اختیار کی اور اپنی غزلیں اُنہیں دکھائیں ۔ ناصر نذیر فراق نے 'لال قلعے کی ایک جھلک' میں اس کی تفصیل بیان کی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

> "کون نہیں جانتا کہ حضرت شاہ نصیر صاحب دہلوی اکبر شاہ ثانی اور ابو ظفر بہادر شاہ اور شیخ ابراہیم ذوق کے اُستاد تھے ۔ جب شاہ صاحب کا ذوق سے دل کھٹا ہو گیا اور اصلاح موقوف ہوئی تو ذوق ہر جمعہ کو مولانا عبدالعزیز صاحب کے وعظ میں جانے لگے اور وعظ بہت غور سے سننے لگے ۔ کسی دوست نے اس کا سبب پوچھا تو ذوق نے کہا "اُستاد مجھ سے کسی بات پر ناخوش ہوگئے ۔ شعر و سخن میں اصلاح ملتی نہیں ۔ اس کا بدل میں نے یہ نکالا ہے کیونکہ شاہ عبدالعزیز صاحب اُردو زبان دانی میں شاہ نصیر صاحب سے کسی طرح کم نہیں ۔ اُن کے بیان اور گفتگو کو سنتا ہوں اور اُردو کے محاورے روز مرہ یاد کرتا ہوں ۔

۱- شیخ محمد اکرام : رود کوثر : صفحہ ۳۹۰
۲- آزاد : آبِ حیات :

اس لیے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب اپنے والد ماجد کے حکم کے بموجب اُردو زبان سیکھنے کے لیے خواجہ میر درد صاحب کی خدمت میں جھٹپن سے حاضر ہوتے تھے اور چپ چاپ بیٹھے ہوئے آپ کی تقریر سنا کرتے تھے اور محاورات کو دل ہی دل میں چنا کرتے تھے ۔ مولانا ولی اللہ صاحب اپنے بچوں سے کہا کرتے تھے جس طرح اصول حدیث اور اصول فقہ فن ہے اسی طرح حصول زبان بھی فن ہے اور اُردو زبان کے موجد و مجتہد خواجہ میر درد صاحب ہیں ۔ آپ کی صحبت کو اس فن کے واسطے غنیمت سمجھو ، خواجہ صاحب پکے یاں ہیں ۔ چنانچہ شاہ عبد القادر صاحب خاص طور پر میر درد صاحب کے شاگرد تھے''۔

غرض شاہ عبدالعزیز سے نہ صرف علماء نے بلکہ شعراء نے بھی استفادہ کیا کیونکہ وہ جامع کمالات تھے ۔ ہر علم اور فن میں انھیں ملکہ حاصل تھا ۔ بقول سر سید : 'ذات فیض سمات ان حضرت با برکت کی فنون کسبی و وہبی اور مجموعہٗ فیض ظاہری و باطنی تھی ۔ اگرچہ جمیع علوم مثل منطق و حکمت و ہندسہ و ہئیت کو خادم علوم دینی کا کرکر تمام ہمت و سراسر سعی کو تحقیق غوامض حدیث نبوی و تفسیر کلام الٰہی اور اعلائے اعلام شریعت مقدسہٗ حضرت رسالت پناہی میں مصروف فرماتے تھے اور سوا اس کے جوکہ جلائے آئینہ باطن صیقل عرفان و ایقان سے کمال کو پہنچی تھی ، طالبان صافی نہاد کی ارشاد و تلقین کی طرف توجہ عام تھی ۔ اس پر بھی علوم عقلیہ میں سے کون سا علم تھا کہ اُس میں یکتائی اور ایک فنی نہ تھی'' ۔ غرض وہ بہت بڑے عالم تھے ، اور علمی حیثیت سے اُن کے بلند مرتبے کو ہر ایک نے تسلیم کیا ہے ۔ اس علم سے اُنھوں نے اس زمانے کے مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونکی ۔ اُنھیں زندگی بسر کرنے کا گر بتایا اور جینے کے صحیح آداب سکھائے ۔ اور اس طرح اُن میں زندگی اور جولانی کی ایک لہر دوڑائی ۔ اُنھوں نے اپنے زمانے کے حالات کا جائزہ لیا اور اس زمانے میں مختلف قوتوں کے زیر اثر زندگی جن نئے رجحانات سے آشنا ہو رہی تھی ،

۱- ناصر نذیر فراق : لال قلعے کی ایک جھلک : صفحہ ٦٣

۲- سرسید احمد خاں : تذکرہ اہل دہلی : صفحہ ٥٢

اُن کا خیر مقدم کیا اور اُن کے قبول کرنے کی طرف لوگوں کو بھی توجہ دلائی ۔ شاہ عبدالعزیز کا انتقال ۷ شوال ۱۲۲۸ھ یعنی ۱۷ جولائی ۱۸۲۳ء کو ہوا ۔ مومن نے جو اپنے اصلی نام حبیب اللہ سے نہیں بلکہ شاہ صاحب کے دیے ہوئے نام مومن خاں سے زیادہ مشہور ہوئے ، تاریخ کہی[1]

دست بیداد اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دیں ، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل

اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ فقر و دیں ، فضل و ہنر ، لطف و کرم اور علم و عمل کا مجسمہ تھے ۔ اُنھوں نے اپنے زمانے میں اُنہیں عام کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں اُن کے ذوق و شوق اور انہاک نے انھیں بہ ذات خود ایک ادارہ اور ایک تحریک بنا دیا ۔

شاہ عبدالعزیز کے ساتھ ساتھ اُن کے بھائی شاہ رفیع الدین ، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی بھی اس کام میں پیش پیش رہے جس کا آغاز اُن کے والد شاہ ولی اللہ نے کیا تھا ۔ اُنھوں نے بھی اپنے علم و فضل اور درس و تدریس سے اس وقت کے مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ شاہ رفیع الدین ۱۱٦۳ھ مطابق ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوئے ۔ اپنے والد شاہ ولی اللہ سے علوم حاصل کیے ۔ جب شاہ عبدالعزیز آخر عمر میں درس و تدریس کا کام نہ کر سکے تو یہ کام شاہ رفیع الدین نے سنبھالا ۔ اُن کا سب سے اہم کارنامہ قران مجید کا تحت اللفظ ترجمہ ہے ۔ ساری زندگی انھوں نے دین اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کی ۔ ۱۲۳۳ھ ۱۸۱۹ء میں انتقال کیا ۔ شاہ عبدالقادر بھی شاہ ولی اللہ کے ناسور فرزند تھے ۔ اُنھوں نے بھی ساری زندگی درس و تدریس میں گزاری۔ علم سے فارغ ہوکر اکبر آبادی مسجد میں گوشہ نشیں رہے ۔ قرآن کا با محاورہ ترجمہ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اس ترجمہ نے مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا کی کیونکہ انھیں دین کو براہ راست سمجھنے کا موقع ملا ۔ علم فقہ ، حدیث اور تفسیر کے بھی وہ زبردست عالم تھے اور اُنھوں نے مسلمانوں میں ان علوم کے ذریعہ سے بھی دین اور دنیا دونوں کو سمجھنے کا شعور پیدا کیا ۔ آپ کے علم و فضل کا بیان کرنا ایسا ہے کہ کوئی آفتاب کی تعریف اور فلک کی

۱- شیخ محمد اکرام : رود کوثر : صفحہ ۳۹۵

مدح بلندی کے ساتھ کرے ۔ زبان کو کیا طاقت کہ ایک حرف حضرت کی صفات سے لکھ سکے اور قلم کی کیا مجال کہ آپ کی مداحُ سے ایک ذرہ لکھ سکے ۔ کسب فیض باطن سوائے والد ماجد کے اور بزرگوں کی خدمت سے بھی اتفاق ہوا ہے ۔ بار ہا ثقات کی زبان سے سنا گیا کہ جس امر میں کچھ فرمایا ویسا ہی بے کم و کاست ظہور میں آیا ، باوجود اس کے کہ بسبب کثرت اخلاق کے کسی کے حق میں کچھ ارشاد نہ کرتے اور کسی کو نہ فرماتے کہ ادھر بیٹھ یا اُدھر لیکن من جانب اللہ لوگوں کے دل میں آپ کا ایسا رعب چھایا ہوا تھا کہ روسائے شہر جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ، بسبب ادب کے دور دور خاموش بیٹھتے اور بدون آپ کی تحریک کے مجال سخن نہ پاتے اور ایک دو بات سوا بارا نہ دیکھتے کہ کچھ اور کلام کریں''۔ غرض شاہ عبدالقادر بڑے پائے کے بزرگ اور بڑے ہی متبحر عالم تھے ۔ اُن کا فیض اُس زمانے میں عام تھا ۔ باقاعدگی سے درس دیتے تھے ۔ وعظ کا سلسلہ بھی جاری کر رکھا تھا ۔ ان میں اچھے اچھے لوگ شرکت کرتے تھے ۔ مومن نے بھی اُن سے استفادہ کیا ۔ بچپن کی معمولی تعلیم کے بعد جب ذرا ہوش سنبھالا تو والد نے شاہ عبدالقادر صاحب کی خدمت میں پہنچایا ، اُن سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھتے رہے ۔ حافظے کا یہ حال تھا کہ جوکچھ شاہ صاحب سے سنتے تھے فوراً یاد کر لیتے تھے''۔ غرض شاہ عبدالقادر کا فیض عام تھا ۔ اُنھوں نے اُس زمانے میں دین کے اُصولوں کو عام کرنے اور اُن کی روشنی میں صحیح زندگی بسر کرنے کی فضا قائم کی ۔ ۱۲۴۲ھ میں اُن کا انتقال ہوا ۔ شاہ عبدالقادر کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالغنی تھے ۔ اگرچہ وہ اپنے بڑے بھائیوں کی طرح مشہور و معروف نہیں لیکن جس دینی اور اصلاحی تحریک کی داغ بیل شاہ ولی اللہ نے ڈالی تھی اور جس کو اُن کے بڑے بھائیوں نے زندہ رکھا تھا ، اُس میں اُن کا بھی خاصا حصہ ہے ۔ شاہ اسماعیل شہید انھیں کے بیٹے تھے جنھوں نے اسلامی علوم کو عوام میں پھیلایا ، اور پھر مولانا سید احمد بریلوی کے ساتھ جام شہادت پی کر اپنے آپ کو ایک بہت بڑا عالم باعمل ثابت کر دکھایا ۔

۱۔ سرسید احمد خاں : تذکرہ اہل دہلی : صفحہ ۷۵
۲۔ آزاد : آب حیات : صفحہ ۴۳۲

یہ تحریک اپنے شباب پر اُس وقت پہنچی ، جب اُس زمانے کے سب سے بڑے عالم با عمل مولانا سید احمد بریلوی جہاد کے خیال سے میدان میں آئے اور جنھوں نے مسلمانوں کو منظم کرنے اور کفار کے مقابلے میں صف آرا ہونے کی تحریک شروع کی کہ اُن کے خیال میں اسی طرح اسلام کا بول بالا ہو سکتا تھا اور مسلمان اس قعر مذلت سے باہر نکل سکتے تھے جس میں وہ تقریباً ایک صدی سے پڑے ہوئے تھے ۔ مولانا سید احمد بریلوی نے شاہ عبدالعزیز کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا تھا اور شاہ عبدالقادر سے بھی انھیں نسبت خاص رہی تھی ۔ یہی سبب ہے کہ شاہ ولی اللہ کی تحریک کا اُن پر گہرا اثر نظر آتا ہے ۔ ہرچند کہ اُنھوں نے مصلح یا مجدد ہونے کا کوئی بلند بانگ دعویٰ نہ کیا تھا لیکن تجدید اصلاح کا پورا سامان مہیا کر دیا تھا ۔ قوم کی اخلاقی اور روحانی قباحتوں کو اُنھوں نے اپنی تصانیف میں بے نقاب کیا ۔ ملک میں قرآن فہمی اور درس حدیث کے چشمے لگا دیے جن کی وجہ سے غیر اسلامی عناصر آسانی سے نمایاں ہونے لگے۔ اس سے بڑھ کر وہ ایک ایسی جماعت کی بنیاد ڈال گئے تھے جو اُن کی اصلاحی تجاویز کو پایہٗ تکمیل تک پہنچا سکتی تھی ۔ حضرت امام الہند کے جانشین شاہ عبدالعزیز نے اس کام کو جاری رکھا ۔ لیکن ان کی اصلاحی کوششوں میں اُن کی طبعی میانہ روی نمایاں تھی ۔ اور مرض اس قدر عام اور پرانا ہوگیا تھا کہ اُس کے ازالے کے لیے معمولی عرق موتف اور نمک سلیمانی کافی نہ تھے بلکہ کسی بہت تیز اور کڑوی دوا کی ضرورت تھی ۔ یہ معالجہ شاہ صاحب کے خلیفہ مولانا سید احمد بریلوی اور اُن کے رفقائے کار نے تجویز کیا۱؎“ ۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مولانا سید احمد بریلوی نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور مسلمانوں کی اس ذہنی اور اصلاحی تحریک کو معراج کمال تک پہنچانے میں اُن کا بہت بڑا حصہ ہے ۔

مولانا سید احمد بریلوی یکم محرم ۱۲۰۱ھ یعنی ۲۴ اکتوبر ۱۷۸۶ع کو ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے ۔ ابتدا میں انھیں علم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ مکتب میں داخل ہوئے لیکن پڑھنے لکھنے میں جی نہ لگا ۔ جب سن شعور کو پہنچے تو لکھنئو گئے ۔ وہاں کسی

۱- شیخ محمد اکرام : موج کوثر صفحہ : ۹ ، ۱۰

امیر کی ملازمت کر لی ۔ اس زمانے میں شاہ عبدالعزیز کے درس و تدریس کا شہرہ تھا ۔ مولانا سید احمد بریلوی کے دل میں اُن سے ملنے اور فیض حاصل کرنے کی خواہش بیدار ہوئی ۔ چنانچہ وہ اسی مقصد سے دلی روانہ ہوئے ۔ دلی پہنچے ۔ شاہ عبدالعزیز نے انھیں اپنے بھائی شاہ عبدالقادر کے پاس بھیجا جو ان دنوں اکبر آبادی مسجد میں مقیم تھے ۔ شاہ صاحب سے اُنھوں نے مختلف علوم پڑھے ۔ قرآن کا مطالعہ بھی کیا ۔ بائیس سال کی عمر میں وہ شاہ عبدالعزیز کے مرید ہوئے اور نقشبندیہ سلسلے میں اُن سے بیعت کی لیکن زیادہ عرصے تک دلی میں نہ ٹھہر سکے ۔ انھیں بعض مجبوریوں کی بنا پر رائے بریلی واپس جانا پڑا ۔ وہاں کچھ عرصے قیام کرنے کے بعد وہ نواب امیر خاں فرمانروائے ٹونک کے پاس چلے گئے اور فوج میں ملازمت کرلی ۔ چھ سات سال وہاں رہے اور انھیں سپہ گری کے فن کو سیکھنے کا موقع ملا ۔ جہاد کا شوق انھیں ہمیشہ سے تھا ۔ یہاں اس شوق کو عملی جامہ پہنانے کے مواقع زیادہ فراہم ہوئے چنانچہ سات سال تک وہ یہاں جہاد کی ترغیب دیتے رہے ۔ لیکن فوج میں ان کی حیثیت محض ایک سپاہی ہی کی نہیں تھی وہ متعدد لڑائیوں میں ایک دستے کے امیر اور نواب کے مشیر خاص کی حیثیت سے بھی شریک رہے ۔ لیکن جب وہاں کی فضا سازگار نہ رہی تو اُنھوں نے دلی کا رخ کیا ۔ اُن کا خیال تھا کہ نواب کی مدد سے ہندوستان میں حقیقی جہاد کے لیے زمین ہموار ہو سکے گی ۔ لیکن جب نواب نے انگریزوں سے صلح کرلی تو یہ توقع ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی چنانچہ دلی واپس آکر اُنھوں نے علیحدہ جہاد کی اس جد و جہد کو جاری رکھا ۔ اس زمانے میں شاہ عبدالعزیز کے داماد مولانا عبدالحئی اور ان کے بھتیجے شاہ اسماعیل شہید نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی ۔ اس سے مولانا سید احمد کو بڑا سہارا ملا ۔ انھیں ساتھ لے کر وہ دورے پر نکلے اور شمالی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کی ۔ ان کے مواعظ سے بہت اصلاح و انقلاب ہوا ۔ اس ایک سفر نے وہ کام کیا جو بڑے بڑے مشائخ کا تزکیۂ باطن اور بڑے بڑے علماء و مصلحین

۱۔ مسعود عالم ندوی : ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک : صفحہ ۳۳ ، ۳۴

کی برسوں کی تربیت ظاہر کرتی ہے - ہر ہر جگہ سیکڑوں آدمی متقی ، متورع عابد ، متبع سنت اور ربانی بن گئے - ہزاروں فاسق و فاجر صالح اور اولیا اللہ ہو گئے - بیسیوں آدمی قتل کے ارادے سے آئے اور جاں نثار بن گئے اور گھر بار چھوڑ کر آپ کے ساتھ ہو گئے یہاں تک کے میدان جنگ میں شہید ہوئے - جس نے ایک دفعہ زیارت کرلی وہ آپ کے رنگ میں رنگ گیا''[1]

اسی زمانے میں شاہ اسماعیل شہید اور مولانا عبدالحئی نے ان کے اقوال و خیالات کو 'صراط مستقیم' کے نام سے یک جا کیا ہے - اس میں مختلف دینی معاملات پر خیالات کا اظہار ہے اور ان سے مولانا سید احمد بریلوی کی طبیعت کے اصلاحی بلکہ انقلابی میلان پر روشنی پڑتی ہے -

یہ وہ زمانہ تھا جب پنجاب میں سکھوں نے قیامت برپا کر رکھی تھی اور مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا - اس کی خبریں دلی تک پہنچتی تھیں - مولانا سید احمد بریلوی کو بھی اس کا علم ہوا - واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ جب مولانا وعظ کے لیے رام پور گئے تو وہاں بعض افغانوں نے اپنی روداد سنائی کہ جس طرح وہ پنجاب کے ایک علاقے میں ایک کنوئیں پر پانی پینے گئے - وہاں کچھ عورتیں پانی بھر رہی تھیں - انھیں پنجابی زبان نہیں آتی تھی - اس لیے انھوں نے اشارے سے پانی پلانے کو کہا - تب ان عورتوں نے ادھر ادھر دیکھ کر پشتو زبان میں کہا کہ وہ مسلمان افغانوں کی بیٹیاں ہیں - سکھ انھیں یہاں زبردستی پکڑ کر لائے ہیں اور سکھ بنا کر جبراً یہاں رہنے پر مجبور کیا ہے - یہ سن کر مولانا کو بہت بڑا صدمہ ہوا اور انھوں نے یہ عہد کیا کہ وہ عنقریب سکھوں سے جہاد کریں گے''[2]- اگرچہ فوراً یہ خیال عملی جامہ نہ پہن سکا - کیونکہ اس واقعے کے بعد وہ مکۂ معظمہ چلے گئے- واپسی پر انھوں نے جہاد کی تحریک باقاعدہ طور پر شروع کی - سارے ہندوستان میں یہ تحریک اس طرح پھیلی جیسے جنگل میں آگ لگ جاتی ہے - اس کا مقصد مسلمانوں کو سکھوں کے پنجوں سے نجات دلانا تھا- وہ ۱۸۲۶ء میں جہاد کے لیے روانہ ہوئے - پہلے کابل گئے اور پھر کابل سے پشاور آئے - نوشہرہ اور اکوڑہ کے مقام پر

۱- سید ابوالحسن ندوی : سیرت سید احمد شہید : صفحہ ۸۵

۲- مولوی محمد جعفر : سوانح احمدی : صفحہ ۲۰

کئی لڑائیاں ہوئیں جن میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی ۔ لیکن اس کے بعد سیدو کے مقام پر جو لڑائی ہوئی اس میں مسلمان ناکام رہے ۔ اس کا سبب موسم کی خرابی، سکھوں کی منظم فوجی طاقت اور بعض مسلمان سرداروں کی غداری بھی ۔ اس کے بعد بھی کئی لڑائیاں ہوئیں ۔ بالا کوٹ کی لڑائی آخری تھی ۔ اس میں اُن کا لشکر ایک ساتھی کی غداری سے محصور ہوگیا ۔ اس معرکے میں پہلے شاہ اسماعیل شہید ہوئے اور بالآخر ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ یعنی ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو مولانا کو بھی جام شہادت پینا پڑا ۔ اس کی اصل وجہ افغان سرداروں کی غداری تھی جو بقول سرسید: ''بندۂ زر اور نہایت طامع ہیں ۔ سکھوں کے اغوا سے آپ سے منحرف ہوگئے اور عین معرکۂ جنگ میں آپ سے دغا کی از بسکہ مشیت الٰہی میں دولت شہادت آپ کے نصیب میں تھی''[1]۔

ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں مولانا سید احمد بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید کے نام ہمیشہ سنہرے حروف میں لکھے جائیں گے ۔ یہ دونوں عالم با عمل تھے اور انھوں نے انیسویں صدی کے مسلمانوں میں اپنے افکار و خیالات سے زندگی اور جولانی کی لہر دوڑائی ۔ انھیں خواب غفلت سے بیدار کیا، دین کے اسرار و رموز ان پر روشن کیے حق و صداقت کی اہمیت واضح کی ۔ اخوت اور آزادی کا تصور عام کیا اور اس کے لیے جان کی بازی لگا دینے کی امنگ اور آرزو دلوں میں بیدار کی ۔ حوصلوں کے چراغ جلائے اور ولولوں کی شمعیں فروزاں کیں اور اس طرح اس زمانے کے مسلمانوں کی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہوگیا ۔ مولانا سید احمد بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید دونوں اس کام میں پیش پیش رہے اور شاہ ولی اللہ کی تحریک کو عمل سے ہم کنار کرنے کا سہرا انھیں دونوں کے سر ہے ۔ یہ دونوں شاہ صاحب کی تحریک کے سلسلے کی بنیادی کڑی ہیں ۔ ان کے افکار و خیالات میں شاہ ولی اللہ کی آواز صاف سنائی دیتی ہے [بقول مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی : شاہ صاحب (شاہ ولی اللہ صاحب) کی وفات پر پوری نصف صدی بھی نہ گزری تھی جو شاہ صاحب نگاہوں کے سامنے روشن کرکے رکھ گئے تھے] سید صاحب (مولانا سید احمد بریلوی) کے خطوط اور ملفوظات اور شاہ شہید کی 'منصب امامت'، 'طبقات'، 'تقویت الایمان'

۱- سر سید احمد خاں : تذکرہ اہل دہلی : صفحہ ۳۷

اور دوسری تحریریں دیکھیے ۔ دونوں جگہ وہی شاہ صاحب کی زبان بولتی ہوئی نظر آئے گی ۔ شاہ صاحب نے عملاً جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ حدیث اور قرآن کی تعلیم اور اپنی شخصیت کی تاثیر سے صحیح الخیال اور صالح لوگوں کی ایک کثرت تعداد پیدا کر دی اور پھر اُن کے بعد چاروں صاحب زادوں نے ، خصوصاً شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس حلقے کو بہت زیادہ وسیع کر دیا یہاں تک کہ ہزارہا ایسے آدمی ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئے جن کے اندر شاہ صاحب کے خیالات نفوذ کیے ہوئے تھے جن کے دماغوں میں اسلام کی صحیح تصویر اتر چکی تھی ۔ اور اپنے علم و فضل اور اپنی عمدہ سیرت کی وجہ سے عام لوگوں میں شاہ صاحب اور ان کے حلقے کا اثر قائم ہونے کا ذریعہ بن گئے تھے ۔ اس چیز نے اس تحریک کے لیے گویا زمین ہموار کر دی جو بالآخر شاہ صاحب ہی کے حلقے ، بلکہ یوں کہیے کہ ان کے گھر سے اٹھنے والی تھی ۔ سید صاحب بریلوی اور شاہ صاحب شہید دونوں روحاً و معناً ایک وجود رکھتے تھے اور اس وجود متحد کو مستقل بالذات مجدد نہیں سمجھتا ، بلکہ شاہ ولی اللہ صاحب کی تجدید کا تتمہ سمجھتا ہوں"[۱] ۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ مولانا سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید کی اسی تحریک کا سلسلہ تھی جس کی داغ بیل شاہ ولی اللہ نے ڈالی تھی اور جسے شاہ عبدالعزیز ، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے پروان چڑھایا تھا ۔

یہ بہ یک وقت ایک ذہنی اور عملی تحریک تھی ، جس نے مذہب ، دین ، سیاست ، معاشرت اور ثقافت سب ہی کو متاثر کیا ۔ وہ مسلمان جو اورنگ زیب عالمگیر کے وقت سے انحطاط و زوال کی اندھیاریوں میں بھٹک رہے تھے ، انھیں اس تحریک نے روشنی عطا کی ۔ دین اور مذہب کا صحیح احساس ان کے یہاں پیدا ہوا اور انھوں نے اسے ایک نظام عمل کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کی ۔ مذہب کے جو غلط تصورات عام ہو گئے تھے ان کا خاتمہ ہوا ، بدعتوں کی بیخ کنی ہوئی اور راہ حق میں جانْ دے دینے کے خیالات عام ہوئے ۔ سیاسی زندگی میں آزادی حاصل کرنے اور جبر و استبداد کے مقابلے میں صف آرا ہونے کا خیال اس نے پھیلایا ۔ معاشرتی

۱- مولانا مودودی : بحوالہ موج کوثر : صفحہ ۳۲ ، ۳۳

زندگی میں صحیح معیار اس نے قائم کیے۔ معاشرتی زندگی کے نظام اقدار کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کی طرف توجہ دلائی اور ثقافت کو ارتقاء کی راہ پر گامزن کرنے کی ایک فضا قائم کی ۔ غرض یہ تحریک ایک وسیع اور ہمہ گیر تحریک تھی ، جس میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مسلمانوں کو ایک نئی زندگی سے آشنا کرکے ان کی کایا پلٹ دی ۔ یہی سبب ہے کہ اس کا اثر اس زمانے کے ہر شعبے میں اپنی جھلک دکھاتا ہے ۔

۵

اس تحریک کے اثرات سب سے زیادہ اُس زمانے کی تہذیبی ، تمدنی اور ثقافتی زندگی پر نظر آتے ہیں ۔ یہ محفل اس سے قبل ایک زمانے سے سونی پڑی تھی ۔ اس تحریک کے اثر سے اُس میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑی اور صدیوں کے بعد اب یہ محفل از سر نو جم گئی ۔ ہرچند کہ اُس محفل میں وہ عہد اکبری اور عہد شاہجہانی جیسی بات تو نہیں رہی تھی لیکن جہاں تک تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا تعلق ہے ، اُس میں اُس زمانے کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی ایک جھلک ضرور نظر آتی ہے ۔ بقول حالی 'تیرھویں صدی ہجری میں جب کہ مسلمانوں کا تنزل درجۂ غایت کو پہنچ چکا تھا اور اُن کی دولت ، عزت اور حکومت کے ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ہو چکے تھے ، حسن اتفاق سے دارالخلافہ دہلی میں چند اہل کمال ایسے جمع ہو گئے جن کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کی یاد دلاتی تھیں'[۱] انحطاط و زوال کے باوجود ان محفلوں کا جمنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اب اُس زمانے کی تہذیبی زندگی نئی ذہنی تحریکوں کے زیر اثر ایک نئی زندگی سے آشنا ہو رہی تھی اور اس سے قبل انتشار اور پراگندگی کے جو بادل تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے افق پر چھائے ہوئے تھے ، وہ اب چھٹنا شروع ہو گئے تھے اور تہذیب کا آفتاب ایک دفعہ پھر زندگی کے افق پر طلوع ہونے لگا تھا ۔

مغلوں کی سیاسی طاقت تو یقیناً اس زمانے میں ختم ہو چکی تھی لیکن بعض طاقتوں کی دخل در اندازی کے باعث ، ایک زمانے کے انتشار اور

۱۔ حالی : یادگار غالب : صفحہ ۱

پراگندگی کے بعد اب زندگی کسی حد تک سکون اور اطمینان سے آشنا ضرور ہو گئی تھی ۔ انگریزوں کے دلی میں داخل ہونے سے قبل تو مرہٹوں اور جاٹوں نے وہ ہنگامے برپا کیے تھے کہ لوگوں کا زندہ رہنا مشکل ہو گیا تھا ۔ ظاہر ہے ان حالات میں تہذیبی معاملات کی طرف توجہ ممکن نہیں تھی ۔ اگرچہ دلی میں انگریزوں کے داخل ہونے اور برسر اقتدار آ جانے کو لوگوں نے اچھا نہیں سمجھا تھا ، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس کے بعد حالات کسی حد تک معمول پر ضرور آ گئے اور لوگوں کو ایک جگہ جم کر بیٹھنے ، غور کرنے ، سوچنے ، اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے ، کچھ لکھنے پڑھنے اور علمی کام کرنے کے مواقع ضرور ملے ۔ اس ماحول میں وہ ذہنی اور فکری تحریکیں جن کی نوعیت نیم سیاسی اور نیم مذہبی تھی فروغ پاتی رہیں ۔ اس تحریک کے علم برداروں نے اس زمانے کی مذہبی ، معاشرتی اور تہذیبی زندگی پر گہرے نقوش چھوڑے ۔ ان میں سے بیشتر نہ صرف مذہبی علوم کے عالم تھے بلکہ سیاست اور تاریخ ، معاشرت اور عمرانیات سے بھی انھیں واقفیت تھی ۔ انھیں اس زمانے کی زندگی کے نشیب و فراز کا پوری طرح علم تھا اور اُنھوں نے اس کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال بھی کیا ہے ۔ ان میں سے بیشتر صاحب تصنیف بھی گزرے ہیں اور مختلف موضوعات پر اُن کی باقاعدہ کتابیں موجود ہیں — اُنھوں نے زبان و ادب کے لیے بھی بڑا کام کیا ہے ۔ اُن کے اثر سے اُس زمانے کی شاعری میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑی ہے اور اُس نے اس وقت کی سیاسی ، تہذیبی ، ذہنی اور جذباتی زندگی کے ان گنت پہلوؤں کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے — پھر اس زمانے میں انگریزوں کے اثر سے ایک نئی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا آغاز بھی ہوا ہے جس میں مشرق و مغرب کی تہذیبی روایات نے آپس میں مل کر قوس قزح کی صورت اختیار کی ہے ۔

اس زمانے کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کو دیکھا جائے تو سب سے پہلے اُن علماء پر نظر پڑتی ہے جنھوں نے دین اور مذہب کے مختلف پہلوؤں کو مفکرانہ انداز میں پیش کیا اور اپنی تحریر و تقریر دونوں میں ایک اجتہادی شان پیدا کی ۔ شاہ ولی اللہ سے لے کر مولانا سید احمد بریلوی اور شاہ اسمعیل شہید تک اس کا سلسلہ جاری رہا ہے ۔ ان علماء دین کے کارناموں پر سرسید نے 'تذکرہ اہل دہلی' میں روشنی ڈالی ہے ۔ اس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ

اس زمانے میں کیسے بڑے بڑے عالم دلی کی سرزمین پر موجود تھے اور اُنھوں نے دینی معاملات و مسائل کو سمجھنے سمجھانے میں کیسا اجتہاد پیدا کیا تھا ۔ اس تذکرے میں مولوی رشید الدین خاں ، مولانا محمد اسحق ، مولوی محمد یعقوب ، مولانا قطب الدین خان ، مولوی عبدالخالق ، مولوی نذیر حسین ، مولوی محبوب علی ، مولوی نصیر الدین ، مولوی کریم اللہ ، مولانا فضل امام ، مولانا فضل حق ، مولوی نور الحسن ، مولوی کرامت علی ، مولوی مملوک العلی ، مفتی سید رحمت علی ، اخون شیر محمد ، مولوی امام علی ، مولوی امان علی ، مولوی محمد جان ، مولوی نوازش علی ، مولوی رستم علی ، مولوی حاجی محمد اور ملا سرفراز کے حالات بیان کیے ہیں اور اُن کے علمی اور دینی کارناموں کا جائزہ لیا ہے ۔ ان علمائے دین میں نظریاتی اختلافات بھی تھے ۔ اُنھوں نے اپنے اپنے خیالات و افکار کو اپنے مخصوص حدود میں رہ کر پیش کیا ہے لیکن ان میں سے ہر ایک کی انفرادیت اپنی جگہ مسلم ہے ۔ ان سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کے کارناموں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ۔ مجموعی طور پر یہ سب کے سب اُس زمانے کو علم و عمل کی ایک فضا سے آشنا کرنے میں پیش پیش نظر آتے ہیں ۔ اُنھوں نے دینی معاملات و مسائل پر غور و فکر کیا ہے اور مفکرانہ انداز میں اپنے خیالات عوام تک پہنچائے ہیں جن کی بدولت صحیح دینی فضا قائم ہوئی ہے ۔

شاہ ولی اللہ کے بعد اُن کی دینی خدمت کو اس زمانے میں اُن کے صاحب زادے شاہ عبدالعزیز نے جاری رکھا ۔ وہ چودہ پندرہ برس کی عمر میں اپنے والد ماجد اشرف الاماجد عمدۂ علمائے حقیقت آگاہ شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی خدمت میں تحصیل علوم نقلی و عقلی اور تکمیل کمالات باطنی سے فارغ ہوئے ۔ اس کے چند مدت بعد حضرت شاہ موصوف نے وفات پائی اور آپ کی ذات فائض البرکات سے مسند خلافت نے زینت و بہا اور وہادۂ ارشاد و ہدایت نے رونق بے منتہا حاصل کی ـــ تمام علوم و فیوض کو انھی حضرت کی خدمت میں کسب کیا ۔ علم حدیث و تفسیر بعد آپ کے تمام ہندوستان سے مفقود ہو گیا ۔ علمائے ہندوستان کے خوشہ چیں اسی سرگروہ علماء کے خرمن کمال کے ہیں اور جمیع کملاء اس دیار کے چاشنی گرفتہ اسی زبدۂ ارباب حقیقت کے مائدۂ فضل و افضال کے[1] ۔'' اُن کے ساتھ

۱۔ سر سید احمد خاں : تذکرہ اہل دہلی : صفحہ ۵۲

شاہ رفیع الدین بھی اس کام میں پیش پیش نظر آتے ہیں اور اس زمانے میں دینی معاملات پر اُنھوں نے بھی غور و فکر سے کام لیا اور اپنے خیالات و نظریات درس و تدریس کے ذریعے سے عام کیے ۔ ''چونکہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب مرحوم بسبب کبرسنی اور ضعف مزاج و کثرت امراض کے دماغ تعلیم و تدریس طلبا نہ رکھتے تھے ۔ سلسلہ تدریس کا حضرت کی ذات با برکات سے جاری تھا ۔ فضلائے نامی ہر دیار کے ارباب کمال سے منشور یکتائی حاصل کرچکے تھے۔ جب آپ کی خدمت میں پہنچتے اپنے تئیں طفل ابجد خواں اور مبتدی محض سمجھ کر ابتدا سے انتہا تک پھر تحصیل پر کمر باندھتے۔ اسی واسطے دیار ہندوستان کے جمیع فضلائے نامی اُنھیں حضرت فیض موہبت کے مستفیضوں میں سے ہیں ۔ ہر فن کے ساتھ ایسی مناسبت تھی کہ ایک وقت میں فنون متباینہ اور علوم مختلفہ درس فرماتے تھے ۔ جب ایک کی تعلیم سے دوسرے کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوتے ، حضار خدمت کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسی فن میں جامۂ یکتائی اُن کے قامت استعداد پر قطع ہوا ہے'' [1]۔ کم و بیش یہی حال شاہ رفیع الدین کے بھائی شاہ عبدالقادر کا تھا ۔ وہ اپنے زمانے کے محقق مسائل دین ، موسس معنی شرع متین ، ہادی شریعت اور ہیر طریقت سمجھے جاتے تھے ، آپ کے علم و فضل کا بیان کرنا ایسا ہے کہ کوئی آفتاب کی تعریف فروغ اور فلک کی مدح بلندی کے ساتھ کرے ـــــ صاحب کشف تھے اور ایسا مکاشف صحیح کم کسی اہل سے اتفاق ہوا ہے [2] ۔'' گوشہ نشینی اُن کے مزاج میں داخل تھی ۔ اکبر آبادی مسجد میں ساری زندگی گزاری ۔ درس و تدریس اور وعظ کے ذریعے سے دین کے نکات کو عوام تک پہنچانا اُن کی زندگی کا بنیادی مقصد تھا ۔ اُس زمانے کے بڑے بڑے لوگوں نے اُن کے سامنے فخر کے ساتھ زانوئے ادب تہہ کیا ۔ علماء میں مولانا سید احمد بریلوی اور شاہ اسمعیل شہید اور شعراء میں مومن خاں نے اُن سے فیض حاصل کیا ۔ مولانا سید احمد بریلوی تو اُس زمانے کے ایسے زبردست عالم با عمل تھے کہ علم و عمل میں اُن کی مثال نہیں مل سکتی ـــــ اوائل حال میں شوق طالب علمی وطن سے وارد

۱- سر سید احمد خاں : تذکرہ اہل دہلی : صفحہ ۷۲

۲- ایضاً : صفحہ ۷۵

شاہجہاں آباد ہوکر حضرت با برکت مولانا عبدالقادر علیہ الرحمة کی خدمت سراسر افادت میں حاضر ہو کر مسجد اکبر آبادی میں فروکش ہوئے اور صرف و نحو میں فی الجملہ سواد حاصل کیا ۔ از بسکہ ذوق درویشی اور مسکینی طینت میں پڑی ہوئی تھی ۔ اکثر خدمت اور اس مقام کے واردوں، خصوصاً درویشان پاک طینت جو دور دراز سے تحصیل علم باطنی کے شوق میں جناب عبدالقادر صاحب موصوف کی خدمت میں حاضر رہتے ۔ خاطر داری اور سر انجام مہام میں ایسے بہ دل سرگرم ہوتے، گویا اس امر کو اہم مہام سمجھے ہوئے تھے اور اُس زمانے میں بھی اپنی اوقات کو طاعات و عبادات میں ایسا مصروف کیا تھا کہ جو لوگ صرف اسی امر کے واسطے کنج نشین اور گوشہ نشین تھے، اُن سے بھی اس طرح مجموع اور حضور قلب سے ظہور میں نہ آتے تھے ۔ اکثر مولانائے مغفور رحمة اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اس بزرگ کے احوال سے آثار کمال ظاہر ہوتے ہیں اور مادہ اس سعادت منش کا ترقی مدارج علیا کے قابل نظر آتا ہے' ۔[1] ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ وہ تحریک جہاد ہے جس نے ہندوستانی مسلمانوں کے جسد مردہ میں جان ڈال دی ۔ ہر طرف اسلام کے نام پر جان دے دینے کےخیالات عام ہونے لگے۔

''تیرھویں صدی میں جب ایک طرف مسلمانوں کی سیاسی طاقت فنا ہو رہی تھی اور دوسری طرف ان میں مشرکانہ رسوم اور بدعات کا زور تھا مولانا اسمٰعیل شہید اور حضرت سید احمد بریلوی کی مجاہدانہ کوششوں نے تجدید دین کی نئی تحریک شروع کی ۔ وہ وقت تھا جب سارے پنجاب پر سکھوں کا اور باقی ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ تھا ۔ ان دونوں بزرگوں نے اپنی بلند ہمتی سے اسلام کا علم اٹھایا اور مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی جس کی آواز ہمالیہ کی چوٹیوں اور نیپال کی ترائیوں سے لے کر خلیج بنگال کے کناروں تک یکساں پھیل گئی اور لوگ جوق جوق اس علم کے نیچے جمع ہونے لگے ـــــ سید صاحب کے خلفاء ہر صوبہ اور ولایت میں پہنچ چکے تھے اور اپنے دائرہ میں تجدید، اصلاح اور تنظیم کا کام انجام دے رہے تھے ۔ مشرکانہ رسوم مٹائے جا رہے تھے، بدعتیں چھوڑی جا رہی تھیں ۔ نام کے مسلمان کام کے مسلمان بن رہے تھے، جو مسلمان نہ تھے وہ

۱- سر سید احمد خاں : تذکرہ اہل دہلی : صفحہ ۳۴

بھی اسلام کا کلمہ پڑھ رہے تھے - شراب کی بوتلیں توڑی جا رہی تھیں - تاڑی اور سیندھی کے خم لنڈھائے جا رہے تھے - بازاری فواحش کے بازار سرد ہو رہے تھے اور حق و صداقت کی بلندی کے لیے علماء حجروں سے ، امراء ایوانوں سے نکل نکل کر میدان میں آ رہے تھے اور ہر قسم کی ناچاری ، مفلسی اور غربت کے باوجود تمام ملک میں اس تحریک کے سپاہی پھیلے تھے اور مجاہد تبلیغ اور دعوت میں لگے تھے[۲] -" مولانا اسمعیل شہید کا بھی اس تحریک میں بڑا ہاتھ تھا اور وہ بھی اس تحریک کے بہت بڑے علم بردار تھے۔ انھیں مولانا سید احمد کے دست راست ہونے کا شرف حاصل تھا - اگرچہ وہ ان کے مرید تھے - لیکن دینی علوم میں ان کا پایہ بہت بلند تھا - وہ وعظ کہنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے اور دینی معاملات ایسی قابلیت سے ذہن نشین کراتے تھے کہ ہر بات آئینے کی طرح روشن ہو جاتی تھی - معقولات اور منقولات دونوں میں ان کا پایہ بہت بلند تھا - دہلی میں ان کے وعظ کا اثر یہ ہوا کہ جامع شاہجہانی سے لے کر فسق و معصیت کے مرکزوں تک خدا کا پیغام پہنچایا - شریعت کے احکام سنائے - اپنی مخصوص اور شہرۂ آفاق جرأت و شجاعت سے شرک و بدعت کا رد کیا ، توحید و سنت کی منادی کی - چند ہی دنوں میں لال قلعے سے لے کر جھونپڑوں تک زبانوں پر آپ کا نام تھا - گھر گھر آپ کے مواعظ اور نئے عقاید کا چرچا تھا[۱] -" سرسید نے انھیں شاہ کشور شریعت گستری ، ملک الملوک دیار دین پروری ، قامع بنیان شرک و طغیان حاد موجبات علم و ایقان ، موسس اساس کمال ، مہذب اوضاع حالؔ و قال ، سالک مسالک ہدایت و ارشاد ، مجلیٔ آئینہ صافی اعتقاد ، دائرۂ علوم ، منطقۂ آسمان فہوم ، مرتقی مدارج درجات عالی ، پیشوائے ادانی و اعالی ، مرجع و مآب فضائل ، کام روائے طبائع فاضل ، رموز فہم سوائر تفسیر قرآنی ، دقیقہ یاب معالم تقدیرات ربانی کہا ہے ، جامع کمالات صوری و معنوی ، نکتہ سنج کلام الٰہی و حدیث نبوی ، قدوۂ اہالی پیش گاہ قبول ، جلال غوامض معقول و منقول ، بانی مبانی فضل و افضال ، مہد قواعد تکمیل و اکمال ، جاہد حق و یقین ، مثبت دلائل دین کہا ہے اور

۱- سید ابوالحسن علی ندوی : سیرت سید احمد شہید : صفحہ ۱۳، ۱۵
۲- ایضاً : صفحہ ۳۸۳

اس میں شبہ نہیں کہ ان کی شخصیت ان تمام خصوصیات کی حامل تھی۔۔۔ کم و بیش یہی حال مولانا عبدالحئی، مولانا محمد اسحق، مولانا محمد یعقوب وغیرہ کا تھا۔ یہ سب کے سب اپنے زمانے کے بڑے علمائے دین میں شمار ہوتے تھے اور علمی اعتبار سے ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔

ان کے علاوہ اس زمانے میں بعض ایسے عالم بھی تھے جو پوری طرح ان علماء کے ساتھ نہیں تھے اور جنھوں نے ان کی نظریاتی مخالفت بھی کی ہے لیکن علمی اعتبار سے اُن کا پایہ بھی بہت بلند ہے۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں نام مولانا فضل حق خیر آبادی کا ہے۔ اس زمانے کی دلی میں وہ بھی موجود تھے اور اُس وقت کے علمی مباحث میں بڑی گرم جوشی سے حصہ لیتے تھے۔ غالب کو اُن سے بڑی عقیدت تھی۔ چنانچہ اُنھیں کی تحریک پر غالب نے اپنے اُردو کلام میں سے دو ثلث کے قریب نکال ڈالا[1]۔ سرسید نے ان کو مستجمع کمالات صوری و معنوی، جامع فضائل ظاہری و باطنی کہا ہے اور لکھا ہے کہ "جمیع علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق و حکمت کی تو گویا انھیں کی فکر عالی نے بنا ڈالی ہے۔ علمائے عصر بل فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس سرگروہ اہل کمال کے حضور میں بساط مناظرہ آراستہ کر سکیں۔ بارہا دیکھا کہ جو لوگ آپ کو یگانۂ فن سمجھتے تھے، جب اُن کی زبان سے ایک حرف سنا دعویٔ کمال کو فراموش کرکے نسبت شاگردی کو اپنا فخر سمجھے۔ بایں ہمہ کمالات علم و ادب میں ایسا علم سرفرازی بلند کیا ہے کہ فصاحت کے واسطے ان کی عبارت شستہ محضر عروج معارج ہے اور بلاغت کے واسطے اُن کی طبع رسا دست آویز بلندی مدارج ہے[2]۔" غدر میں اُن پر مقدمہ چلایا گیا اور کالے پانی کی سزا ہوئی، وہیں اُنھوں نے ۱۸۶۱ء میں انتقال کیا۔ مولانا فضل حق کے مشہور شاگرد مولانا نور الحسن تھے۔ اُن کا شمار بھی اس زمانے کے عالموں میں ہوتا تھا۔ اُن کے مزاج میں خلق ایسا تھا کہ بندگانِ الٰہی کی دل شکنی آپ کے اعتقاد میں خانۂ خدا کی بنیاد گرانے سے کم جرم نہیں اور علم ایسا کہ اس کو ایک جگہ فراہم لا کر فرق تہم پر رکھ دیں تو بہ سبب گرانی بار کے

۱۔ حالی: یادگار غالب: صفحہ ۱۰۲۔

۲۔ سرسید احمد خاں: تذکرۂ اہل دہلی: صفحہ ۸۷۔

طبقات کرات کو اس طرح توڑتا ہوا پستی کو مائل ہو اور محیط کے دوسری طرف سے گزر جائے کہ اوج سے حضیض تک نگاہ کو ایک جادۂ مستقیم محسوس ہو اور وقار اس درجہ میں کہ فلک دوار کی ہزار گردشیں ان کی تمکین کی ایک نشست میں سر مو تفاوت پیدا نہیں کر سکتیں[۱] ۔" اسی طرح مولانا فضل امام خیر آبادی کی بھی سرسید نے بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ علوم عقلیہ میں اُن کی طبع دقاق سے اعتبار تھا اور علوم ادبیہ میں اُن کی زبان دانی سے افتخار[۲] ۔" غرض ایسے بے شمار بلند پایہ عالم اُس زمانے میں موجود تھے ، جنھوں نے اپنے علم و فضل اور حسن اخلاق سے اُس ماحول میں بڑی عالمانہ شان پیدا کر دی تھی ۔

یہ علمائے دین جو اس زمانے کی دلی میں موجود تھے ، بہت بلند مرتبے کے مالک ہیں ۔ ان کی کوششوں سے نہ صرف دین داری کی فضا قائم ہوئی بلکہ دینی مسائل کو عالمانہ اور مفکرانہ زاویۂ نظر سے دیکھنے کا ایک رجحان عام ہوا ۔ ان کے افکار و خیالات نے افراد میں ایک ذہنی تہذیب پیدا کی اور ان قدروں کا احساس و شعور ان کے یہاں عام ہوا ، جو تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی بنیاد ہوا کرتا ہے ۔ انھوں نے ایک علمی فضا بھی قائم کی جس میں غور و فکر کا صحیح سامان پیدا ہوا ۔ اور ان کی تدریس اور مواعظ کی بدولت افراد تزکیۂ نفس کی طرف راغب ہوئے ، اور انھوں نے اپنے آپ کو ذہنی ، روحانی اور اخلاقی اعتبار سے زیادہ مہذب بنایا ۔ ان میں بیشتر صاحب تصنیف و تالیف بھی گزرے ہیں ۔ شاہ ولی اللہ نے اس سے قبل تصنیف و تالیف کی ایک عظیم روایت قائم کی تھی ۔ اور ان کی تصانیف 'حجۃ اللہ البالغۃ' 'تفہیمات الٰہیہ' ، 'الفوز الکبیر' ، 'لمعات' ، 'الطاف القدس' ، 'خیر کثیر' ، 'انصاف فی بیان سبب الاختلاف' 'انفاس العارفین' وغیرہ بہت بلند مقام رکھتی ہیں ۔ اس کے بعد اگرچہ اس طرح تو تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری نہیں رہا ۔ کیونکہ ان کے جانشین درس و تدریس اور مواعظ کی طرف زیادہ متوجہ رہے پھر بھی ان کے صاحب زادوں میں سے بعض نے اہم تصنیفی کارنامے انجام دیے ۔ یہ تصانیف ، عربی ، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں موجود ہیں ۔

۱۔ سرسید احمد خاں : تذکرۂ اہل دہلی : صفحہ ۹۷

۲۔ ایضاً : صفحہ ۸۶

شاہ عبدالعزیز کے زمانے میں شیعہ سنی اختلافات زوروں پر تھے ۔ آپ نے ان مسائل پر عربی زبان میں کتابیں لکھیں ۔ ان میں سے 'تحفۂ اثنا عشریہ' ایک مناظرہ کی کتاب ہے لیکن مخالفین بھی اس کی متانت تہذیب اور شائستگی کے مداح ہیں ۔ اس کے علاوہ 'تفسیر عزیزی' میں آپ نے قرآن مجید کے پہلے سوا پارے اور آخری دو پاروں کی تفسیر فارسی میں کی ہے ۔ اصول حدیث میں 'عجالہ نافعہ' اور تاریخ حدیث میں 'بستان المحدثین' اور چند حواشی اور شرح کی کتابیں آپ سے یادگار ہیں ۔ آپ کے فتووں کا مجموعہ بھی چھپ چکا ہے' شاہ عبدالعزیز کے چھوٹے بھائی کا زیادہ وقت درس و تدریس میں صرف ہوا لیکن آپ سے چند نظمیں اور کچھ نثر بھی یادگار ہے ۔ آپ کا سب سے اہم کام کلام مجید کا تحت اللفظ اردو ترجمہ ہے جو آج تک مقبول انام ہے[۲] شاہ عبدالقادر صاحب کے مزاج میں ترک زیادہ تھا ، اور وہ گوشہ نشین آدمی تھے ۔ انہوں نے ساری زندگی اکبر آبادی مسجد میں گزار دی ۔ درس و تدریس اور وعظ ان کے محبوب مشاغل تھے[۳] ۔ اس سبب سے تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ نہ کی لیکن قرآن شریف کا با محاورہ ترجمہ جو 'موضح القرآن' (۱۹۰۵ع) آپ سے یادگار ہے جس پر بلا مبالغہ ہزاروں کتابیں نثار ہیں[۳] ۔ شاہ عبدالقادر کے شاگرد خاص مولانا سید احمد بریلوی بنیادی طور پر ایک مجاہد تھے ۔ ان کی زندگی جہاد کے منصوبے بنانے اور کافروں سے لڑنے میں گزر گئی ۔ اس لیے تصنیف و تالیف کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کر سکے ۔ البتہ ان کے دست راست مولانا عبد الحئی اور شاہ اسماعیل شہید باوجود جہاد کے کاموں سے دلچسپی لینے کے تصنیف و تالیف کی طرف بھی متوجہ ہوئے ۔ ان دونوں نے مل کر مولانا سید احمد کے اقوال و ارشادات کو جمع کیا ہے اور یہ کتاب 'صراط مستقیم' کے نام سے مشہور ہے ۔ یہ کتاب ایک مقدمہ اور چار ابواب پر مشتمل ہے ۔ پہلا اور چوتھا باب مولانا اسمٰعیل نے ترتیب دیا ہے اور اس میں طریق ولایت اور طریق نبوت کے اختلاف کا ذکر ہے اور چوتھے باب میں طریق سلوک راہ نبوت یعنی طریقہ محمدیہ کا

۱- شیخ محمد اکرام : رود کوثر : صفحہ ۳۹۳ -
۲- ایضاً : صفحہ ۳۹۶ -
۳- ایضاً : صفحہ ۳۹۶ -

بیان ہے دوسرا اور تیسرا باب مولانا عبدالحئی کا لکھا ہوا ہے جس میں ہندوستان کے مشہور سلسلہ ہائے تصوف کے اشغال و وظائف کو عام فہم زبان میں جمع کیا ہے اور بتایا ہے کہ چشتیہ، قادریہ ، نقشبندیہ اور دوسرے طریقوں کے بزرگ اپنے مریدوں کو کس طرح تعلیم دیتے تھے اور صفائی قلب اور ترقی درجات کے لیے انھیں کون سے مراقبے اور عمل سکھاتے تھے[1] اس کے علاوہ شاہ اسماعیل شہید نے ایک مستقل کتاب 'تقویت الایمان' کے نام سے اردو زبان میں لکھی ہے ۔ اس کتاب میں ایمان کے جزو یعنی خدا اور رسول پر بحث ہے ۔ اُن کی بعض اور کتابیں بھی اہم ہیں ان میں 'یک روزی' جسے آپ نے مسئلہ امتناع نظیر خاتم النبیئین پر مولانا فضل حق خیر آبادی کے جواب میں ایک دن میں لکھا ۔ 'رسالہ اصول فقہ' ، 'منصب امامت'، 'طبقات' 'ایضاح الحق الصریح الاحکام المیت و الفریح '،'مثنوی سلک نور' اور 'تنویرا لعینین فی اثبات رفع الیدین' بھی اُن کی مشہور تصانیف ہیں[2]۔ مولانا سید احمد بریلوی کے ساتھیوں میں مولوی کرامت علی جون پوری کی شخصیت بھی خاصی اہم ہے ۔ یہ بھی صاحب تصنیف تھے اور ان کی تصانیف'الردالبدعت'،'دافع الوسواس'،'ترجمہ شائل ترمذی' 'ترجمہ مشکواۃ جلد اول'، 'مفتاح الجنت' وغیرہ مشہور ہیں[3] ۔ ان علمائے دین کے علاوہ اس زمانے میں بعض دوسرے عالموں نے بھی تصنیف و تالیف کا کام کیا ہے ۔ نواب صدر الدین خاں آزردہ سے بہت سی نظم و نثر یادگار ہے ۔ مولانا نواب قطب الدین خاں نے اپنی منصبی مصروفیتوں کے باوجود ''اکثر رسائل زبان ریختہ میں واسطے فوائد عوام کے تحریر کیے اور اس میں مسائل ضروریہ ہر طرح کے مندرج فرمائے اور حق یہ ہے کہ ان رسالوں سے خلق کو بہت فائدہ ہوا کہ ضروریات دین سے ہر شخص مطلع اور آگاہ ہو گیا ۔ کتب حدیث سے 'مشکواۃ' کا ترجمہ زبان اردو میں بہت صاف و شستہ و فائدہ مند کیا ہے اور اکثر فوائد کتب متداولہ و غیر متداولہ سے اُس پر بڑھایا[4]۔'' مولانا فضل حق خیر آبادی بھی نظم و نثر پر پوری قدرت رکھتے تھے اور اُن

۱- شیخ محمد اکرام : موج کوثر : صفحہ ۱۲ ۔
۲- ایضاً : صفحہ ۳۷ - ۳۸ ۔
۳- ایضاً : صفحہ ۳۰ ۔
۴- ایضاً : صفحہ ۸۳ ۔

سے بھی بہت سی تحریریں یادگار ہیں ۔ غرض اس زمانے میں ان علمائے دین نے خاصا علمی ماحول پیدا کر دیا تھا اور اس طرح تصنیف و تالیف کی اچھی خاصی فضا قائم ہو گئی تھی ۔ اس زمانے کی ثقافتی زندگی میں اس علمی ماحول اور تصنیفی فضانے ذہنی اور روحانی اعتبار سے بڑے اہم کارنامے انجام دیے ہیں ۔

ان علمائے دین کے ساتھ ساتھ اس زمانے کی زندگی میں بڑے بڑے اولیاء اللہ بھی موجود تھے اور انھوں نے بھی اس وقت کی ثقافتی زندگی پر گہرے نقوش ثبت کیے ہیں ۔ ان بزرگوں نے صرف ریاضت اور عبادت ہی میں کمال حاصل نہیں کیا ہے ۔ اخوت اور انسانی محبت کے خیالات بھی عام کیے ہیں اور اپنے ان خیالات کو درس و تدریس ، کشف و کرامات اور تصنیف و تالیف کے ذریعے سے عوام تک پہنچایا ہے ۔ یہی سبب ہے کہ خلق خدا ان سے متاثر ہوئی ہے اور افراد نے ان کے اثر سے اپنے آپ کو مہذب بنایا ہے اور اس طرح اُن کے فکر و عمل نے اُس زمانے کی ثقافتی زندگی کو بہت متاثر کیا ہے ۔ ان مشائخین اور اولیاء اللہ میں حضرت شیخ الشیوخ مولانا شاہ غلام علی ، حضرت مولانا ابو سعید ، حضرت مولانا شاہ عبدالغنی ، شاہ محمد آفاق ، حاجی علاؤ الدین احمد ، مولانا فخر الدین ، مولانا قطب الدین، حاجی غلام نصیر الدین عرف کالے صاحب ، خواجہ محمد نصیر رنج ، مولوی یوسف علی ، حضرت شاہ غیاث الدین ، شاہ صابر بخش ۔ جناب میر مہدی صاحب میران شاہ مانو ، شاہ جلال اور مولانا محمد حیات کے نام خاص طور پر مشہور ہیں ۔ ان میں سے اکثر صاحب کشف و کرامات تھے ۔ اکثر نے اپنے فیض کو عام کر رکھا تھا ۔ اکثر معرفت و حقیقت کے اسرار و رموز کی درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے ۔ ان میں بعض صاحب تصنیف و تالیف بھی گزرے ہیں اور بعضوں نے شعر و شاعری سے بھی دلچسپی لی ہے ۔

حضرت شاہ غلام علی اس زمانے کے بہت بڑے بزرگ تھے ۔ ”علم اور عمل اور فضل و کمال اور تجرید و تجرد اور حلم و کرم اور سخاوت اتم اور ایثار و انکسار آپ کی ذات پر ختم تھے ۔ دن رات اللہ اور اللہ کے رسول کے ذکر میں بسر کی اور دنیا و مافیہا کی خبر نہ رکھی—آپ کی ذات فیض‌آیات سے تمام جہان میں فیض پھیلا اور ملکوں ملکوں کے لوگوں نے اُن کی بیعت اختیار کی ۔ میں نے حضرت کی خانقاہ میں روم اور شام اور بغداد اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا کہ حاضر ہو کر بیعت کی

اور خدمات خانقاہ کو سعادت ابدی سمجھا اور قریب قریب کے شہروں کا مثل ہندوستان ، پنجاب اور افغانستان کا تو کچھ ذکر نہیں کہ ٹڈی دل کی طرح امنڈتے تھے[1] ۔'' شاہ غلام علی خلیفہ شاہ ابو سعید تھے ۔ ان میں صفات ذاتی اور کمالات ظاہری اور باطنی ایسے تھے کہ جن کا کچھ حد و حساب نہیں ۔ حافظ کلام اللہ اور عاشق رسول اللہ اور علوم دینی آپ کو بہت مستحضر تھے اور دن رات انہیں کے درس میں گزرتے تھے ۔ علم قرأت میں یکتائے روزگار تھے ۔ کلام اللہ ایسی خوش آواز اور قرأت سے پڑھتے تھے کہ لوگ دور دور سے سننے آتے تھے[2] ۔'' ان کے بڑے بیٹے مولانا شاہ سعید احمد تھے ۔ انہیں علم حدیث و فقہ و تفسیر میں کمال حاصل تھا ۔ دن رات مشغلہ درس و تدریس جاری رہتا تھا ۔ مسائل دینی آپ کے فیض سے حل ہوتے اور فتویٰ شرع شریف آپ کی مہر سے مسجل کیے جاتے ۔ قدم بہ قدم اپنے بزرگوں کے طریقے پر چلتے اور اپنے پیروں کا طریقہ برتتے تھے ۔ نسبت باطنی بہت مستحکم تھا[3] ۔ کم و بیش یہی حال حضرت مولانا عبدالغنی ، شاہ محمد آفاق اور حاجی علاء الدین احمد کا تھا ۔ مولانا محمد فخر الدین بھی اس دور کے ایک اہم بزرگ تھے ۔ مقبول خدائے لایزال تھے ۔ خلق اللہ میں بھی ایسا قبول خاطر بہم پہنچایا کہ گروہا گروہ حصول نجات اور تحصیل ہدایت کے واسطے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور آپ کے ارشاد کو مانند حکم وحی کے راست اور درست جانتے تھے ۔ جتنے امرائے ذوی الاقتدار اور سلطان عہد تھے ، آپ کی بیعت سے مشرف ہو کر آپ ہی کی خاک در کو وسیلہ ، آبرو اور آپ ہی کے غبار آستان کو تاج عزت و اعتبار سمجھتے تھے ـــــ کتاب 'نظام العقائد' اور 'رسالہ مرجیہ' اور 'فخر الحسن' حضرت ہی کی تالیفات میں سے ہیں[4] ۔'' خواجہ محمد نصیر رنج بھی اس عہد کے بزرگوں میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں ۔ خواجہ میر درد کے نواسے تھے ۔ آپ کو خصوصاً ریاضیات میں بہت دخل تھا ۔ علم موسیقی بہت خوب جانتے تھے اور تال اور لے سے ایسے

۱۔ سرسید احمد خاں : تذکرہ اہل دہلی : صفحہ ۱۲ - ۱۳
۲۔ ایضاً : صفحہ ۱۸
۳۔ ایضاً : صفحہ ۱۹ - ۲۰
۴۔ ایضاً : صفحہ ۲۳ - ۲۵

واقف تھے کہ بڑے بڑے اُستاد اُن کے سامنے کان پکڑتے تھے اور خاک چاٹ کر نام لیتے تھے - علم حساب کو اُس سے زائد جانتے تھے اور مسائل حساب میں وہ مہارت بہم پہنچائی کہ مسائل لاینحل بہ آسانی حل فرماتے تھے - چنانچہ تال اور حساب میں اُن کی تصنیفات موجود ہیں - یہ تو صفات ظاہری تھیں اور کمالات باطنی میں ان سب سے رتبہ بڑا تھا اور وہ مقام ہی اور تھا - بین سے دلچسپی تھی اور ہر مہینے کی دوسری اور چوبیسویں کو مجلس بین نوازی کی آپ کے روبرو ہوا کرتی تھی - کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے ، رنج تخلص تھا'۔'' میر محمدی بھی اُس زمانے کے بزرگ تھے - مقبولان بارگاہ کبریائے الٰہی سے تھے - قبول خاطر خاص و عام میں بھی یہاں تک حاصل تھا کہ اُمراء و سلاطین آپ کے دیدار فیض انوار کو نعمت کبریٰ اور آپ کی خدمت میں حاضر رہنے کو ایک موہبت سمجھتے تھے ، از بس کہ جذب باطن کی تاثیر سے ساکنین شہر کے ، خوصاً صادقین قلعۂ مبارک کے ، علی الخصوص شہزادگان جلیل القدر آپ سے بہت رجوع کرتے تھے'——غرض یہ بزرگ بے شمار خصوصیات کے مالک تھے اور انھوں نے اس زمانے کی ثقافتی زندگی میں بڑے کار ہائے نمایاں انجام دیے ہیں - انھوں نے عوام سے رشتہ استوار کیا اور اُن کی ذہنی اور روحانی تہذیب کی ، امراء و رؤسا بھی اُن کے زیر اثر آئے اور اُن کی تہذیب میں بھی انھوں نے نمایاں حصہ لیا - انھوں نے زندگی کے اعلیٰ معیار قائم کیے - علم کے دریا بہائے ، درس و تدریس میں مصروف رہے ، تصنیف و تالیف کا کام کیا - مختلف فنون ، خاص طور پر موسیقی اور شاعری سے دلچسپی لی اور انھیں فروغ دینے کے سامان فراہم کیے - اس لیے اس زمانے کی ثقافتی زندگی کی بنیادوں کو استوار کرنے میں ان بزرگوں کا بڑا حصہ ہے -

علمائے دین اور مشائخین کے علاوہ اس عہد کی دلی میں دوسرے علوم و فنون کے ماہر بھی بڑی تعداد میں موجود تھے ، ان میں سے ہر ایک اپنے علم اور فن پر پوری قدرت رکھتا تھا اور اس زمانے کی ثقافتی زندگی پر ان کے نقوش بھی نمایاں نظر آتے ہیں - طب کے علم اور فن کو ان لوگوں نے خاص طور پر ترقی دی اور اس کو معراج کمال پر پہنچا دیا -

---

۱- سرسید احمد خاں : تذکرہ اہل دہلی : صفحہ ۲۸ -

حکیم احسن اللہ خاں کا نام اس سلسلے میں بہت نمایاں ہے ۔ وہ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم فاضل تھے ۔ مختلف علوم پر ان کی گہری نظر تھی ۔ بہت قابل اور سمجھ دار سمجھے جاتے تھے ۔ لوگوں کو ان سے بڑی عقیدت تھی ۔ انھوں نے فنون حکمت و ہندسہ و ہیئت خدمت فضلائے عصر سے حاصل کر کر فن طبابت کو اپنے والد ماجد (حکیم محمد عزیز اللہ خاں) سے حاصل کیا اور از بس کہ حافظہ پارۂ لوح محفوظ تھا اور طبیعت جزو تقدیر تھی ۔ چند مدت سے مدارج کمال سے کوئی باقی نہ رہا کہ طے نہ کیا ہو اور شفائے مرضاء داد الہیٰ ہے جس کی زندگی سے مسیحا نے ہاتھ دھوئے ان کے نسخے سے جی گیا ۔ اسی واسطے ساکنین شہر اور قاطبین دہر سوائے اس زبدۂ اہل کمال کے اور کسی طرف رجوع نہ کرتے——ان کی شہرت اور مقبولیت کی وجہ سے حضرت معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی عرش آرام گاہ نے اپنے پاس بلا کر عطائے خلعت اور عنایت خطاب عمدۃ الملک حاذق الزماں سے مشرف فرما کر خاص اپنے معالجے کے واسطے معین کیا اور تا دم زیست یہ سمجھے کہ اگر یہ سلالۂ کرام ایک دم الگ ہو تو زندگی اس بادشاہ گردوں جاہ کی محال ہے اور ان کے انتقال کے بعد بندگان گردوں نواماں حضرت ظل الہیٰ فلک بارگہی ابو ظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ ، و سلطانہ و افاض علیٰ العالمین برہ و احسانہ نے کمال قدردانی و رتبہ شناسی سے اپنے سنہ جلوس میں طلب کیا اور سعادت نبض گری سے مستعد فرما کر احترام الدولہ اور ثابت جنگ کے خطاب سابق پر زیادہ کیا ۔ اور از بس کہ حضور فیض گنجور حضرت ظل اللہ کے مزاج اقدس میں ان کے کمالات جائے گیر ہوئے ۔ روز بروز ترقی، مدارج اور ارتفاع مناسب ظہور میں آنے لگا ۔ چنانچہ رفتہ رفتہ یہاں تک بادشاہ جم جاہ کی طبیعت پر تصرف ہوا کہ کوئی امر جزوی و کلی بے مشورہ صلاح اس صاحب تدبیر صائب کے وقوع میں نہیں آ سکتا ۔'' غرض حکیم احسن اللہ خاں بڑے پائے کے عالم ، طبیب ، حکیم اور مدبر تھے ۔ ان کے علاوہ اس زمانے میں حکیم غلام نجف خاں کی بھی خاصی شہرت تھی ۔ یہ حکیم احسن اللہ خاں اور حکیم شریف خاں کے شاگرد تھے ۔ حکیم احسن اللہ خاں سے قرابت قریبہ بھی

۱- سرسید احمد خاں : تذکرہ اہل دہلی : صفحہ ۴۶ - ۴۷ -

تھی - اس لیے انھوں نے ان کی تعلیم میں انہاک کا اظہار کیا اور بہت تھوڑے عرصے میں وہ اپنے وقت کے اہم عالم اور طبیب ہو گئے - بہادر شاہ ظفر نے عضدالدولہ کا خطاب دیا - ایک زمانے تک طبیب کی حیثیت سے سرکار کمپنی کے ملازم رہے[۱] -'' حکیم غلام حیدر خاں اور حکیم غلام حسن خاں کا شمار بھی اس زمانے کے اہم طبیبوں میں ہوتا تھا - حکیم غلام حیدر خاں کے بارے میں سرسید نے لکھا ہے کہ ''شفائے کامل اُن کے دست حق پرست میں ودیعت ہے - راقم کو حضرت موصوف کی خدمت میں نسبت شاگردی حاصل ہے[۲] -'' اور حکیم غلام حسن خاں کے بارے میں لکھا ہے کہ ''کتب طبیہ میں مہارت اور علاج معالجہ میں دست گاہ تمام رکھتے تھے[۳] -''
ان کے علاوہ حکیم نصر اللہ خاں ، حکیم صادق علی ، حکیم امام الدین ، حکیم فتح اللہ خاں ، حکیم پیر بخش ، حکیم حسن بخش خاں ، حکیم محمد یوسف خاں وغیرہ کو بھی اس زمانے میں بڑی شہرت حاصل ہوئی تھی - یہ سب کے سب نہ صرف فن طب کے ماہر اور علاج معالجے میں اعلیٰ درجے کے طبیب تھے بلکہ دوسرے علوم کے ماہرین کی حیثیت سے بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا - اُنھوں نے اپنے زمانے میں علمی ، فنی اور انسانی فضا قائم کی ، خلق خدا کو فائدہ پہنچایا - اس لیے اُس زمانے کی ثقافتی زندگی میں ان کا مرتبہ بھی بہت بلند ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اُس کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے اور نکھارنے سنوارنے میں اُنھوں نے بڑا کام کیا ہے -

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُس زمانے میں اعلیٰ درجے کے ادیب اور شاعر پیدا ہوئے ہیں اور اُنھوں نے صحیح ادبی اور شاعرانہ ماحول پیدا کیا ہے - اس شاعرانہ ماحول کے اثرات قلعے اور شہر دونوں میں نظر آتے ہیں - قلعہ اُس زمانے میں تہذیب و ثقافت کا بڑا مرکز تھا - اور لوگ اُسے دلی کی تہذیب و ثقافت کی علامت سمجھتے تھے - اس کی وجہ جذباتی نہیں تھی - حقیقت یہ ہے کہ اُس زمانے کے بادشاہوں نے باوجود اُن ناسازگار حالات کے جن سے انھیں اس وقت دوچار ہونا پڑا ، حتی الامکان تہذیب اور ثقافت کی

۱- سرسید احمد خاں : تذکرہ اہل دہلی : صفحہ ۴۸ -
۲- ایضاً : صفحہ ۵۰
۳- ایضاً : صفحہ ۵۱

طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کی اور ان کی اس توجہ نے قلعے کو ایک بہت بڑا تہذیبی اور ثقافتی مرکز بنا دیا ۔ اس وقت تک اُردو زبان قلعےمیں داخل ہو چکی تھی ۔ اور لوگ قلعے کی زبان کو معیاری اور مستند زبان سمجھتے تھے ۔ فارسی کا اثر بھی باقی تھا لیکن اب رفتہ رفتہ اُس کی جگہ اُردو نے لے لی تھی اور اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے وقت میں تو سارے قلعے میں اُردو زبان ہی کو تہذیب و ثقافت کی زبان سمجھا جاتا تھا ۔ بادشاہ سے لے کر معمولی آدمی تک سب ہی اس کو اپنی مادری اور تہذیبی زبان سمجھتے تھے ۔ اس صورت حال نے قلعے کو تہذیب و ثقافت کا منبع اور سرچشمہ بنا دیا تھا ۔ اور اس کے اثرات اُس زمانے کی زندگی پر بہت گہرے تھے ۔ بہادر شاہ کے زمانے میں اُردو زبان و ادب کو دربار کی سرپرستی حاصل ہوئی اور دبستان دہلی کے اُردو ادب کا ایک مرکز بن گیا جس کا سب سے درخشندہ ستارۂ عظیم غالب ہے[۱] ۔ اس میں شبہ نہیں کہ غالب اس زمانے کے بہت بڑے شاعر ہیں اور اُنھوں نے شاعری کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے ۔ لیکن اُن کے علاوہ بھی اس زمانے میں بعض اہم شاعر نظر آتے ہیں ۔ بہادر شاہ ظفر خود شاعر تھے اور انھیں شاعروں سے دلچسپی بھی تھی ۔ اس لیے اُنھوں نے قلعے میں شعر و شاعری کا اچھا خاصا ماحول پیدا کر لیا تھا ۔ ذوق اُن کے اُستاد تھے اور انھیں ملک الشعراء کا منصب حاصل تھا ۔ اُن کی وفات کے بعد غالب کو یہی حیثیت حاصل ہوئی ۔ مومن قلعے میں ملازم تو نہیں تھے لیکن اُن کا وہاں آنا جانا ضرور تھا ۔ اگرچہ اُنھیں ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا نہیں تھی کیونکہ بہت خود دار آدمی تھے لیکن کبھی کبھی کوئی انعام مل ضرور جاتا تھا[۲] ۔ قلعے میں باقاعدگی سے مشاعرے ہوتے تھے ۔ بہادر شاہ ظفر کو خود ان مشاعروں سے دلچسپی تھی، اس لیے اس وقت کے تقریباً تمام اہم شاعروں کو ان مشاعروں میں شریک کر لیتے تھے ۔ غرض شاہ وقت بہادر شاہ ظفر کے دلچسپی لینے کی وجہ سے اُس زمانے میں نہ صرف قلعے میں اچھا خاصا شاعرانہ ماحول پیدا ہوگیا تھا بلکہ قلعے سے باہر شہر میں بھی گھر گھر شعر و شاعری کے

۱- Percival Spear : *Twilight of the Mughals* : P. 83

۲- مولانا عبدالحیٔ انصاری کا خط راقم کے نام ۔

چرچے تھے۔ غالب ، مومن ، شاہ نصیر ، ذوق ، ظفر ، آشفتہ ، نیر و رخشاں ، عیش ، مجروح ، ظہیر ، عارف ، صہبائی وغیرہ کے اُردو فارسی نغموں سے دلی کی ساری فضا گونجتی ہوئی تھی ۔ یہ اُردو شاعری کے شباب کا زمانہ تھا بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے[1] ۔

اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ قلعے میں ایک زمانے تک بار نہ پانے کے باوجود ایک شاعر کی حیثیت سے غالب کی عظمت اُس زمانے میں بھی تسلیم کی جاتی تھی ، اور اس عہد میں اعلیٰ درجے کے شاعرانہ ماحول کو پیدا کرنے میں اُن کا بڑا ہاتھ تھا ۔ اُنھوں نے اُردو اور فارسی دونوں میں اعلیٰ درجے کی شاعری کی ، اور وہ اپنے زمانے میں ان دونوں زبانوں کے مسلم الثبوت اُستاد سمجھے جاتے تھے ۔ شیفتہ کے خیال میں وہ ایسے نکتہ سنج نغز گفتار تھے کہ کم دیکھنے میں آتے ہیں[2] ۔ سرسید نے انھیں موسس اساس شیوہ بیانی ، بانی ہائے الفاظ و معانی ، عندلیب بہارستان سخن گستری ، طوطئی شکرستان معنی پروری"[3] کہا ہے اور لکھا ہے :
"میں اپنے اعتقاد میں ان کے ایک حرف کو بہتر ایک کتاب سے اور ان کے ایک گل کو بہتر ایک گلزار سے جانتا ہوں اور اگر دیکھا جائے تو حق بھی یہی ہے ۔ خوشا حال ان لوگوں کا جو آپ کی خدمت با برکت سے مستفید ہوتے ہیں ۔ اور جوہر گرانمایہ آپ سے حاصل کرتے ہیں ۔ اس کو مغتنم جان کر بھی جزودان حافظ اور صندوق بیاض میں امانت رکھتے ہیں[4] ،
ذوق بھی اس زمانے میں مسلم الثبوت استاد سمجھے جاتے تھے اور چونکہ بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے ، اس لیے اس زمانے میں انھیں کچھ زیادہ ہی اہمیت دی جاتی تھی ۔ شیفتہ نے ان کے بارے میں لکھا ہے :
"قوت مشقے کہ او راست دیگرے نہ دیدہ شد و معہٰذا رطب و یابس کہ شیوۂ بسیار گویاں است در کلامش کم تر و بر جمیع اصناف سخن قدرت

۱- مرزا فرحت اللہ بیگ : دلی کا ایک یادگار مشاعرہ ، مضامین فرحت : حصہ اول : صفحہ ۲۴۴

۲- شیفتہ : گلشن بے خار : صفحہ ۱۳۹

۳- سر سید احمد خاں : تذکرہ اہل دہلی : صفحہ ۱۰۳

۴- ایضاً : صفحہ ۱۰۳

تمام دارد - بالجملہ از شعرائے مسلم و مقرر است و بایں ہمہ کثرت فکر و ہجوم اشعار ہنوز بہ ترتیب دیوان نہ پرداختہ صحبتش گاہ گاہ اتفاق می افتد از منتخبات زماں و مغتنمات دوراں است۱''۔ اس زمانے میں شاعرانہ ماحول میں ان کی حیثیت بھی بہت بلند تھی اور وہ بھی بہت مقبول تھے - بقول سرسید : ''دقیقہ سنجان روزگار سے گنے جا سکتے ہیں کہ جس کا کلام وحی نظام فخر متقدمین میں شرف متاخرین میں ہو اس کی ذات فائض البرکات بنی نوع میں کس قدر فضل و شرف رکھتی ہو گی۲''۔ ذوق کے ساتھ ساتھ مومن نے بھی اس زمانے کے شاعرانہ ماحول میں اضافہ کیا ہے - شیفتہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں : ''شاعری دون مرتبہ اوست اماں چوں سخن دریں فن است اعراض نامستحسن زبان جادو طرازش سحر را بمرتبہ اعجاز رسانیدہ و سخن دلپزیرش طول را بمپایۂ ایجاز گردانیدہ ، گوہر افشانی طبع نیساں بارش دامن دامن کان جواہر در جیب و آستین مفلساں الداخت و گل ریزی اندیشہ بہار نثارش جمن جمن ریاض جنت بچشم نظارگیاں جلوہ گر ساختہ۳'' - اس زمانے کے شاعروں میں اُن کا مرتبہ بہت بلند ہے اور اُن کی بلندی کو سب ہی نے تسلیم کیا ہے - سرسید کے خیال میں : ''اُنھوں نے سخن گوئی کو بحد اعجاز پہنچایا اور شعر نے اُن سے مرتبہ حکمت کا پایا - نکات سخن اور دقائق فن اُن کے قلم سے اس طرح گرتے ہیں جیسے ابر سے باران لطافت۴'' - شیفتہ بھی اُس زمانے کے مشہور شاعر ہیں اور اُنھوں نے نہ صرف اعلیٰ درجے کی شاعری کی ہے ، بلکہ شاعروں کو اپنی شاعرانہ بصیرت سے نئی زندگی بخشی ہے - وہ شاعر ہی نہیں تھے ، شاعری کے بہت اچھے نقاد بھی تھے - اس لیے اس زمانے کے شاعرانہ ماحول کو عظمت سے ہمکنار کرنے میں اُن کا بہت بڑا حصہ ہے - صہبائی اگرچہ اُردو کے شاعر نہیں تھے لیکن فارسی زبان پر انھیں پوری طرح عبور حاصل تھا - اور اُس میں اعلیٰ درجے کی شاعری کرتے تھے - نیر رخشاں بھی

۱- شیفتہ : گلشن بے خار : صفحہ ۴۷

۲- سر سید احمد خاں : تذکرہ اہل دہلی : صفحہ ۱۶۷

۳- شیفتہ : گلشن بے خار : صفحہ ۱۹۶

۴- سرسید احمد خاں : تذکرہ اہل دہلی : صفحہ ۱۵۰

فارسی کے اچھے شاعر تھے ۔ عیش مجروح ، عارف اور ظہیر نے اُردو میں شاعری کی ۔ اور اگرچہ اُن کی شاعری میں وہ بات تو نہیں جو غالب ، مومن اور ذوق کے یہاں ہے لیکن اُنھوں نے شاعری کی اس روایت کو باقی ضرور رکھا ہے جس کی بنیاد ان شعراء نے ڈالی تھی ۔ اور پھر بہادر شاہ ظفر تھے ، جنھوں نے نہ صرف اُردو میں اعلیٰ درجے کی شاعری کی ہے بلکہ وہ ایک ایسا محور تھے جس کے گرد یہ پورا شاعرانہ ماحول گھومتا تھا ۔ ان کی طبیعت میں بڑی عاجزی اور انکساری تھی ۔ اس لیے وہ آخر وقت تک ذوق اور پھر غالب سے اصلاح لیتے رہے لیکن اس سے اُن کی قادرالکلامی پر حرف نہیں آتا ۔ بلکہ یہ تو اُن کی بڑائی کی دلیل ہے ۔ اُن کے زمانۂ حکومت میں لال قلعے کی زندگی ناسازگار حالات سے دوچار رہی لیکن ان حالات میں بھی اُنھوں نے اس زمانے کے شاعروں کا خیال رکھا اور حتی المقدور اُن کی پرورش اور دیکھ بھال کی ۔ شعر و شاعری سے انہیں گہرا لگاؤ تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اُس میں ڈوبے ہوئے تھے ۔ اس لیے اُنھوں نے اپنے آس پاس زمانے کے تقریباً تمام شاعروں کو جمع کر لیا اور لال قلعے میں اُردو شاعری کی ایک فضا قائم ہوگئی تھی ۔

شاعری کے ساتھ اُس زمانے میں دوسرے فنون کو بھی بہت فروغ ہوا ۔ بہادر شاہ ظفر نے مصوری سے بھی دلچسپی لی اور اُس وقت کے نامور مصوروں کو نوازا ۔ اُنھوں نے مصوری کے دبستان دہلی کی روایت کو باقی رکھا ، جس نے اُس زمانے میں کم از کم دو اہم مصور راجہ جیون رام اور حسین نظر پیدا کیے[1] ۔ ان کی وجہ سے دلی میں مصوری کا شوق بھی عام ہوا ۔ اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کو موسیقی سے بھی بڑی دلچسپی تھی اور اُن کے دور حکومت میں لال قلعہ موسیقی کا بھی اچھا خاصا مرکز بن گیا تھا ۔ موسیقی کی باقاعدہ محفلیں منعقد ہوتی تھیں اور اُس میں بڑے موسیقار حصہ لیتے تھے ۔ ناصر نذیر فراق نے بی خانم کی زبانی ان محفلوں کی روداد بیان کی ہے لکھتے ہیں : "میرا قاعدہ تھا کہ میں ایک مہینے میں لال قلعے سے بارہ دری کے دو پھیرے کیا کرتی تھی ۔ ایک دوسری کو ایک چوبیسویں کو ۔ ان تاریخوں کے اندر میر درد صاحب

---

۱ - Percival Spear : *Twilight of the Mughals* : P. 83

کے وقت سے راگ کی دو محفلیں ہوتی تھیں اور اس دھوم دھام سے ہوتی تھیں کہ لال قلعے کے بادشاہ اور بادشاہ زادے پسند کرتے تھے۔ جب میں جہاں پناہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو جاتی تو حضور والا فرماتے: "ہم سمجھ گئے آج چاند کی دوسری یا چوبیسویں ہے - بارہ دری جانے کی جھوٹی چاہتی ہو - اچھا جاؤ یہ خواجہ صاحب کے یہاں کی بڑی پر برکت محفلیں ہیں - محمد شاہ پیا اور شاہ عالم ثانی اور اکبر شاہ ثانی اور ولی عہدی تک میں بھی اُن میں شریک ہوا ہوں"۱ - جب میں پلٹ کر لال قلعے میں آتی تو حضور کو آداب بجالاتی - حضور فرماتے: "کہو خانم اس تاریخ میں محفل کیسی رہی - کون کنچنی اچھا گائی ؟ کس گویے نے خواجہ محمد نصیر سے زیادہ داد لی ؟" جو کچھ مجھے حال معلوم ہوتا عرض کر دیتی"۔

ایک اور جگہ لکھا ہے: "سب شاہزادوں کو گانے بجانے کا بڑا شوق تھا - اچھے اچھے گویے اور کلاونت نوکر رکھ کر اس بات کو اُن سے سیکھتے تھے - کوئی قسم گانے کی ایسی نہ تھی جسے یہ لوگ ادا نہ کرتے ہوں ، کوئی ساز ایسا نہ تھا جو یہ لوگ سلیقے سے نہ بجاتے ہوں - اچھے اچھے اُستاد اس کام میں اُن کے آگے کان پکڑتے تھے - مگر سارنگی اُن میں سے کسی ایک کو نہ آئی - کہتے تھے 'اماں یہ ٹیڑھی کھیر ہے ، نہ اس میں کوئی پردہ ہے ، نہ سندری ہے ، رستہ کیوں کر جلا جائے؟ یہ بیشہ وروں کا ہی حصہ ہے ان کی ہڈی بولتی ہے - مرزا گوہر صاحب ، مرزا کالے صاحب مرزا چڑیا صاحب ستار بجانے میں اُستاد ہوگئے تھے"۲ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں موسیقی سے لوگوں کو کتنی دلچسپی تھی اور وہ اُس میں کس طرح ڈوبے ہوئے تھے۔ خوش نویسی کا بھی اُس زمانے میں بڑا چرچا تھا - اور اُسے بھی لوگ ایک اہم فن کی طرح سیکھتے تھے۔ بادشاہزادوں اور اُن کے باپ دادوں کو تین شوق ضرور ہوتے تھے؛ ایک نجوم ، ایک مصوری، ایک خوش نویسی کا اور ان سب میں کمال پیدا کرتے تھے - بادشاہ کو بھی اس فن سے دلچسپی تھی اور وہ عربی فارسی خط کے کامل تھے - خوش نویسی میں اُن کے اُستاد میر کلو صاحب تھے - اور بادشاہ نے بھی

۱- ناصر نذیر فراق : لال قلعہ کی ایک جھلک : صفحہ ۶۵
۲- ایضاً : صفحہ ۲۸

اس ہنر میں سیکڑوں کو شاگرد کیا تھا[1] ۔ اس زمانے کے خوش نویسوں میں سید محمد امیر ، آغا صاحب ، مرزا عبداللہ بیگ ، امام الدین احمد خاں ، محمد جان ، اخوند عبدالرسول قندھاری ، حافظ کلو خاں ، میر امام الدین ، مولوی حیات علی ، پنڈت شنکر ناتھ ، بدرالدین علی خان مہرکن ، فیض علی خاں ، مرزا شاہرخ بیگ اور محمد عالم خاص طور پر مشہور ہیں ، اور ارباب موسیقی میں ہمت خاں ، راگ رس خاں ، میر ناصر احمد ، بہادر خاں ستار نواز ، رحیم سین ستار نواز ، نظام خاں ، قائم خاں ، گلاب سنگھ ، پکھاوجی ، اور مکھوا پکھاوجی کے نام سر فہرست آتے ہیں ۔ ان سب نے اس زمانے کی دلی میں ان فنون کی صحیح فضا پیدا کرکے انھیں منتہائے کمال پر پہنچا دیا تھا ۔

یہ تو اس تہذیبی اور ثقافتی روایت کی تفصیل تھی جس کا تعلق مشرق سے تھا لیکن اُس زمانے میں مشرق کی یہ تہذیبی اور ثقافتی روایات مغرب کی تہذیبی اور ثقافتی روایت کے ساتھ شیر و شکر ہوئی ہیں ۔ انگریزوں کی آمد کے بعد سے یہ سلسلہ باقاعدگی سے شروع ہوا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں شدت پیدا ہوتی گئی ۔ لال قلعے تک اس کے اثرات پہنچے اور وہاں بعض لوگوں کے رہن سہن تک پر اس کا اثر ہوا ۔ بعض شہزادوں نے قلعے کے اندر مغربی طرز کی عمارتیں تعمیر کرائیں ۔ انگریزی لباس پہنا اور رہن سہن کا انگریزی انداز اختیار کیا ۔ اکبر شاہ ثانی کا دوسرا بیٹا مرزا بابر انگریزی طرز اختیار کرنے کے لیے خاص طور پر مشہور ہے ۔ اُس نے لال قلعے میں دیوان عام کی پشت پر رنگ محل کے احاطے میں مغربی طرز کا ایک مکان تعمیر کرایا ۔ وہ مغربی طرز کا لباس پہنتا تھا ، جس کی کیفیت وردی کی سی تھی ۔ اُس کے مغربی طرز کے کوٹ پر سینے کے دونوں طرف ستارے لگے ہوتے تھے ۔ وہ پاؤں میں بھاری بوٹ پہنتا تھا اور اُس کے ہاتھ میں ایک بھاری سی چھڑی ہوتی تھی ۔ اس انداز سے وہ چھ گھوڑوں کی گاڑی میں بیٹھ کر شہر میں نکلتا تھا[2] ۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں کی تہذیب و ثقافت کے اثرات بری طرح اندر ہی اندر مشرقی تہذیب و ثقافت پر اپنا رنگ

۱- ناصر نذیر فراق : لال قلعہ کی ایک جھلک : صفحہ ۲۸-۲۹

۲- Percival Spear : *Twilight of Mughals* P. 64-65

چڑھا رہے تھے ۔ ہر چند کہ شروع شروع میں اس کی حیثیت تقلید اور نقالی کی تھی لیکن جب انگریز باقاعدہ دلی پر حکمران ہوگئے ، اور انھوں نے اس سر زمین پر اقامت اختیار کرلی تو مشرق و مغرب کی تہذیبوں کا یہ اتصال اس زمانے کی زندگی کا بنیادی جزو بن گیا ۔ جب انگریز دلی میں فاتح کے حیثیت سے داخل ہوئے تو بیشتر لوگوں نے کوئی خاص مزاحمت نہیں کی ۔ بلکہ ان کے اس اقدام کو ایک حد تک پسند کیا ۔ کیونکہ اِن کے اس اقدام سے وہ ہنگامے ختم ہوگئے جن کی وجہ سے دلی ایک زمانے تک انتشار کی آماجگاہ بنی رہی تھی ۔ انگریزوں نے اپنا تسلط قائم کرنے کے بعد تعلیمی اور علمی معاملات کی طرف توجہ کی جس کا اثر اس زمانے کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی پر بڑا گہرا ہوا ۔ اس سلسلے میں سب سے اہم دہلی کالج کا قیام تھا ، جو بہت تھوڑے عرصے میں ایک علمی اور تعلیمی ادارے سے زیادہ ایک تہذیبی اور ثقافتی مرکز بن گیا ۔ مسلمانوں نے اس کی مخالفت بھی نہیں کی ۔ بلکہ اُس وقت بعض اہم علماء نے اس ادارے کے ساتھ تعاون کیا ۔ خود مولانا شاہ عبدالعزیز اس سلسلے میں پیش پیش نظر آتے ہیں ۔ ”جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی کالج قائم کیا ، اور لوگ وہاں تعلیم حاصل کرنے کے متعلق متامل تھے تو آپ نے ان سب شبہات کو رفع کیا اور علی گڑھ کالج قائم ہونے سے پچاس سال پہلے انگریزی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کا فتویٰ دیا[1] ۔ اس لیے مسلمان اس ادارے کے ساتھ وابستہ ہونے لگے ۔ کالج کا افتتاح ۱۸۲۵ء میں ہوا ۔ اور اُس شاہانہ عطیے میں سے اس کالج کے لیے پانسو روپے ماہانہ مقرر کیے گئے ۔ مسٹر جے ۔ ایچ ۔ ٹیلر مقامی مجلس کے سکریٹری ایک سو پچھتر روپے ماہانہ پر اس کے پرنسپل مقرر ہوئے ۔ ہیڈ مولوی کی تنخواہ ایک سو بتیس روپے قرار پائی اور دو اور مولوی پچاس پچاس کے رکھے گئے ۔ باقی پچیس پچیس اور تیس تیس کے تھے ۔ طلباء کے لیے بھی وظائف مقرر ہوئے ۔ سالانہ رپورٹیں باقاعدہ مجلس تعلیم عامہ کی خدمت میں بھیجی جاتی تھیں جن میں مولویوں کے عزل و نصب ، سالانہ امتحان کے نتائج اور دوسرے امور متعلق کالج درج ہوتے تھے“[2] ۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ کالج دن دونی رات چوگنی ترقی

۱۔ شیخ محمد اکرام : رود کوثر : صفحہ ۳۹۳

۲۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق : مرحوم دہلی کالج : صفحہ ۶

کرتا گیا ، اور اس نے دلی کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں اپنے لیے جگہ بنا لی ۔

دہلی کالج کا سب سے اہم تہذیبی اور ثقافتی کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے اُردو زبان کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ۔ اُردو زبان اس وقت تک فارسی کی جگہ لے چکی تھی اور دلی میں ہر شخص اس کا شیدائی تھا ۔ اس زمانے میں جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ، بڑے بڑے عالم ، ادیب اور شاعر موجود تھے ۔ اور وہ درباری اور سرکاری زبان بھی سمجھی جاتی تھی ۔ اس کالج نے اردو زبان کو بہت اہمیت دی اور اس کی ترقی کے لیے بڑا کام کیا ۔ اس کالج کی بڑی خصوصیت یہ تھی اور اسی میں اُس کی کامیابی کا راز تھا کہ ذریعۂ تعلیم اُردو تھا ، عربی ، فارسی ، سنسکرت کی تعلیم تو خیر اُردو میں ہوتی ہی تھی ؛ لیکن دوسرے علوم جو داخل نصاب تھے ، اُن کی تعلیم کا ذریعہ بھی اُردو تھا'' ۔ سائنس کی تعلیم تک اُردو میں ہوتی تھی ، اور ماسٹر رام چندر اور دوسرے اساتذہ نہایت خوش اسلوبی سے یہ کام انجام دیتے تھے[۲] ۔ ادب کی طرف بھی اس کالج نے خاص توجہ دی ۔ مختلف موضوعات پر کتابوں کے ترجمے بھی یہاں خاصی تعداد میں ہوئے ۔ یہاں مشاعرے بھی ہوتے تھے ، ادبی محفلیں بھی ہوتی تھیں ، تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری تھا اور ان سب باتوں نے مل کر اس کالج کو ایک ثقافتی مرکز کی حیثیت دے دی تھی ۔ جو لوگ اس کالج سے وابستہ تھے ، اُن میں بیشتر بڑے لائق اور قابل تھے اور اُنھوں نے علم و ادب میں اضافہ کیا ہے ۔ مسٹر بٹروس ، ڈاکٹر اسپرنگر اور مسٹر ٹیلر یہ کالج کے تین پرنسپل ایسے گزرے ہیں کہ اُنھوں نے کالج کی سچی خدمت کی اور اُس کی ترقی و اصلاح میں دل سے کوشش کی ۔ طلبہ و اساتذہ پر اُن کی بڑا اثر تھا اور شہر والے بھی اُن کا ادب کرتے تھے ۔ خاص کر مشرقی شعبے کی اصلاح اور اُردو زبان میں مغربی علوم کے ترجموں کے متعلق مسٹر بٹروس اور ڈاکٹر اسپرنگر نے جو بے ریا کوشش کی وہ بہت قابل قدر ہے[۳] ۔ عربی کے اساتذہ میں مولوی مملوک العلی بڑے جید

۱- ڈاکٹر مولوی عبدالحق : مرحوم دہلی کالج : صفحہ ۱۵

۲- ایضاً : صفحہ ۲۶

۳- ایضاً : صفحہ ۱۴۷

عالم تھے اور دور دور اُن کے علم و فضل کی شہرت تھی۔ مولوی امام بخش صہبائی صدر مدرس فارسی اپنے وقت کے بہت بڑے فارسی ادیب تھے۔ مصنف اور شاعر بھی تھے۔ اُن کی کتابیں نصاب تعلیم میں داخل تھیں۔ شہر میں ان کی بڑی عزت تھی۔ فارسی کتابوں کے علاوہ اُنھوں نے اُردو صرف و نحو لکھی اور شمس الدین کی تصنیف 'حدائق البلاغت' کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ شعرائے اُردو کا انتخاب بھی کیا تھا جو اس زمانے میں چھپ گیا تھا[۱]۔ مولوی سبحان بخش بھی کالج میں مدرس تھے، اُن کی کتاب 'محاورات ہند' مشہور ہے۔ ابن خلکان کی تاریخ کا ترجمہ 'وفیات اعیان' انھیں کا کیا ہوا ہے۔ 'تذکرۂ مفسرین' اور 'تذکرۂ حکما' بھی ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ ماسٹر رام‌چندر سائنس اور ریاضی کے اُستاد تھے اور ان موضوعات پر اُنھوں نے کئی کتابیں لکھی تھیں۔ مولوی احمد علی فارسی کے مدرس تھے۔ انھوں نے 'تاریخ کشمیر' کا فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ پنڈت رام کشن دہلوی بھی کالج میں مدرس تھے۔ اُنھوں نے علم طب پر ایک رسالے کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا اور ڈاکٹر اسپرنگر کے ساتھ مل کر قواعد صرف و نحو تالیف کی تھی۔ ایک کتاب زراعت پر بھی اُن سے یادگار ہے۔ ماسٹر حسین اگرچہ بچوں کو پڑھاتے تھے لیکن تصنیف و تالیف کا شوق تھا اُنھوں نے 'تاریخ مغلیہ' کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ اس کے علاوہ میکنا ٹن کی شرع شریف، قانون محدی فوجداری، قانون وراثت وغیرہ کے ترجمے بھی ان ہی کے کیے ہوئے ہیں۔ ہر دیو سنگھ بھی کالج میں منشی تھے اُنھوں نے اُصول حساب پر ایک کتاب کا ترجمہ کیا۔ ماسٹر نور محمد نے بنگال اور تاریخ مغلیہ کا ترجمہ کیا۔ مولوی حسن علی خاں نے 'قانون مال'، 'گلستان سعدی' اور 'الف لیلہ' (منتخب) کے ترجمے اُردو میں کیے[۲]۔ ان کے علاوہ کالج کے طالب علموں نے بھی تصنیف و تالیف میں بڑا نام پیدا کیا۔ ماسٹر رام چند مولوی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، مولانا محمد حسین آزاد، ڈاکٹر ضیاء الدین متعدد کتابوں کے مصنف ہیں اور اُن کی تصانیف اُردو زبان میں بڑا درجہ رکھتی ہیں۔ مولوی کریم الدین بھی کالج کے طالب علم تھے۔ اُن

۱- ڈاکٹر مولوی عبدالحق: مرحوم دہلی کالج: صفحہ ۱۴۸

۲- ایضاً: صفحہ ۱۴۸ - ۱۵۲

کی 'تعلیم النسا'، 'گلستان ہند'، 'تذکرہ شعرائے ہند' (طبقات شعرائے ہند) 'گلدستہ نازنینان'، 'تذکرۃالنسا'، 'ترجمہ ابوالفدا'، 'تاریخ شعرائے عرب' وغیرہ مشہور ہیں۔ ان اساتذہ اور طلباء نے اس کالج کے نام کو روشن کیا۔ اور تصانیف سے چار چاند لگا دیے۔ انھیں کی بدولت کالج ایک تعلیمی، علمی، تہذیبی اور ثقافتی ادارہ بن گیا اور مشرق و مغرب کی تہذیبی روایات کو اُنھوں نے ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ یہی اُن کے سب سے بڑے کارنامے ہیں۔

غرض دلی اُس زمانے میں تہذیب و ثقافت کا بڑا مرکز تھا اور اس میں بڑے لائق اور قابل لوگ جمع تھے۔ بادشاہ کو خود تہذیبی اور ثقافتی معاملات سے دلچسپی تھی اور اُن کی اس دلچسپی نے لال قلعے کو ایک ثقافتی مرکز بنا دیا تھا۔ قلعے کے باہر شہر میں بڑے بڑے عالم، مفکر، شاعر اور ادیب تھے جنھوں نے فکر و عمل سے تہذیب و ثقافت کی صحیح فضا قائم کر دی تھی۔ انگریز بھی اس سلسلے میں پیش پیش تھے اور اُن کا سب سے بڑا کارنامہ دہلی کالج کا قیام تھا جس نے اُس زمانے میں صحیح علمی اور ادبی ماحول پیدا کیا اور اس طرح ایک اہم تہذیبی اور ثقافتی ادارے کی حیثیت اختیار کر لی۔ اگرچہ انگریز اس کے روح رواں تھے لیکن اس میں مشرق کی تہذیبی اور ثقافتی روایات بھی پروان چڑھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کیونکہ اُنھوں نے مشرقی علوم و ادبیات کے بعض اہم علم برداروں کو اس ادارے میں جمع کیا تھا۔ یہ لوگ کشادہ دل اور روشن خیال تھے اس لیے اُنھوں نے اس عہد کے تقاضوں کو سمجھا اور وقت کی ضرورتوں کو محسوس کیا۔ چنانچہ اُن کی علمی اور ادبی کاوشوں نے اس ادارے کو مشرق و مغرب کی ثقافتی روایات کا ایک سنگم بنا دیا۔ اس صورت حال نے اس زمانے کے تہذیبی اور ثقافتی ماحول میں ایک نئی زندگی پیدا کی اور اس طرح دلی ایک دفعہ پھر تہذیب و ثقافت کا ایک اہم مرکز بن گئی۔

٦

یہ سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی ماحول تھا جس میں غالب پیدا ہوئے۔ اُن پر اس ماحول کا گہرا اثر نظر آتا ہے اور وہ اُس کی پیداوار معلوم

ہوتے ہیں ۔ اس ماحول نے انھیں پیدا کیا ہے اور اُن کی شخصیت اپنی بساط بھر خود بھی اُس کو پیدا کرنے کا باعث بنی ہے ۔ خاص طور ہر اس زمانے کے علمی اور ادبی ماحول کو پیدا کرنے میں آن کا بڑا ہاتھ ہے۔ ظاہر ہے کہ اُس زمانے کے سیاسی حالات سے انھیں براہ راست کوئی سروکار نہیں تھا ۔ اس لیے وہ خود تو ان حالات کو متاثر نہ کر سکے لیکن ان کا اثر انھوں نے براہ راست نہیں تو بالواسطہ طور پر قبول ضرور کیا ۔ یہی حال کم و بیش معاشی حالات کا ہے ۔ اس زمانے کے معاشی حالات کو وہ خود تو متاثر نہ کر سکے لیکن ان حالات کے اثرات اُن پر ضرور موجود ہیں ۔ البتہ اس زمانے کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی سے وہ خود بھی متاثر ہیں اور اُن کی شخصیت نے زندگی کے ان شعبوں کو متاثر بھی کیا ہے ۔ غالب کی شخصیت اُس زمانے کی معاشرتی زندگی کی علامت ہے ۔ وہ تہذیب و ثقافت کی صحیح نمایندگی کرتے ہیں ۔ اُنھوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شخصیت اُس زمانے کے تہذیبی اور ثقافتی اُفق پر ایک نہایت ہی درخشندہ ستارہ نظر آتی ہے ۔

غالب
کی
تصانیف

آردو

(۱)

دیوان غالب

غالب کا متداول دیوان در اصل اُن کے کلام کا انتخاب ہے ۔ اس کے بارے میں آزاد نے آب حیات میں یہ لکھا ہے کہ یہ انتخاب غالب نے مولانا فضل حق خیر آبادی اور مرزا خانی کوتوال کے مشورے سے کیا تھا ۔ لیکن امتیاز علی خاں عرشی نے اس سے اختلاف کیا ہے اور شیفتہ کے 'گلشن بے خار' کے اس بیان کو کہ 'دیوانش را بعد تکمیل و ترتیب دگرنگریست و فراواں ابیات از آں حذف و ساقط کردہ قدرےقلیل انتخاب زدہ' بنیاد بنا کر یہ لکھا ہےکہ 'یہ تذکرہ مرزا صاحب کی نظر سے گزر چکا تھا ، اور اُنھوں نے نہ صرف اس کی تقریظ لکھی تھی بلکہ اس کی بعض کوتاہیوں کی طرف مرتب کی توجہ بھی منعطف کی تھی ۔ اگر مرزا صاحب اپنے کلام کے خود منتخب نہ ہوتے تو شیفتہ کیوں لکھتے اور بہ فرض محال وہ منی سنائی لکھ بھی دیتے تو مرزا صاحب اس پر نکتہ چینی کیوں نہ کرتے' ـــــحقیقت جو کچھ بھی ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب کا متداول دیوان ان کے کلام کا انتخاب ہے اور یہ انتخاب بڑے سلیقے سے کیا گیا ہے ۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ غالب کی شہرت اسی دیوان کی وجہ سے ہے ۔

اس دیوان کا پہلا اڈیشن سرسید کے بھائی سید محمد خاں بہادر کے مطبع سید المطابع یا مطبع سید الاخبار سے شعبان ۱۲۵۷ھ (اکتوبر ۱۸۴۱ع میں

۱۔ آزاد : آب حیات : صفحہ ۵۱۷ ۔

چھپ کر شائع ہوا ۔ 'یہ نسخہ ۱۰۸ صفحات کو محیط ہے اور اس میں ۱۰۹۵ شعر ہیں ۔ اس کے شروع میں غالب کا فارسی دیباچہ اور آخر میں نواب ضیاءالدین احمد بہادر نیر رخشاں کی تقریظ ہے جو انہوں نے ۱۲۵۴ھ میں مرتب کیا تھا اور جب تین برس بعد ۱۲۵۷ھ میں شائع ہوا تو اس میں ۲۵ شعروں کا اضافہ کر دیا'[۱] ۔

اس اڈیشن کے نسخے بالکل نایاب ہیں ۔

غالب کے اردو دیوان کا دوسرا اڈیشن ۱۲۶۳ھ - ۱۸۴۷ء میں مطبع دارالسلام حوض قاضی دہلی میں چھپا ۔ اس میں بھی غالب کا فارسی میں لکھا ہوا دیباچہ اور نیر رخشاں کی تقریظ شامل تھی ۔ کل اشعار تعداد میں ۱۱۵۹ تھے ۔ اس کے نسخے بھی آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے ۔ اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتب خانے میں موجود ہے ۔ اسی نسخے سے سرورق کی عبارت کا متن ، غالب کا لکھا ہوا دیباچہ اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کی تقریظ کا اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے :

دیوان اردو

تصنیف مشتری بند فلک البروج سجانی، افصح فصحائے دوراں، شہنشاہ شعرائے ممالک ایران و ہندوستان ، دقاق غوامض و رموز سخن سنجی و نکتہ دانی ، خلاق مضامین و معانی، سر آمد ارباب فضل و کمال ، مہر سپہر نبالت و اجلال ، جناب مستطاب منیع الالقاب ، مرزا اسد اللہ خاں بہادر ادأم اللہ برکاتہم و حسناتہم ، المتخلص بہ غالب و اسد بہ تصحیح و مقابلہ جناب ،صدر المدح در مطبع درالسلام دہلی واقع محلہ حوض قاضی مبنیہ و اقل العباد عنایت حسین در ماہ مئی ۱۸۴۷ء باہتمام نور الدین احمد لکھنوی حلیۂ الطباع پوشیدہ ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مشام شمیم آشنایاں را صلا و نہاد انجمن نشیناں را مژدہ کہ لختے از سامان مجمرہ گردانی آمادہ و دامنے از عود ہندی دست بہم دادہ است ۔

۱- عرشی : دیوان غالب : صفحہ ۲۳

نہ چوب ہائے سنگ زوب خوردہ بہ ہنجار ناطبیعی شکستہ، بے اندام تراشیدہ، بلکہ بہ تبر شکافتہ، بہ کارد ریز ریز کردہ، بسوہان خراشیدہ، ایدون نفس گداختگی شوق بہ جستجوئے آتش پارسی است، نہ آتشے کہ در گلخن ہائے ہند افسردہ و خاموش و از کف خاکستر بمرگ خودش سیہ پوش بینی - چہ بروے مسلم است از نا پاکی باستخوان مردہ نا بار شکستن و از دیوانگی بہ رشتۂ شمع مزارکشتہ آویختن۔ ہر آئینہ بدل گداختن نیرزد و بزم افروختن را نشاید۔ رخ آتش بصنع بر افروزندہ و آتش پرست را بادافراہ در آتش سوزندہ نیک میداند کہ پرو پندہ در ہوائے آں رخشندہ آذر نعل در آتش است کہ بہ چشم روشنی ہوشنگ از سنگ بروں تاختہ و در ایوان لہراسپ نشو و نما یافتہ، خس را فروغ است و لالہ را رنگ و مغ را چشم و کدہ را چراغ۔ بخشندۂ یزداں دروں بر افروز را سپاسم کہ شرارے ازاں آتش تابناک بخاکستر خویش یافتہ بہ کاوکاو سینہ شتافتہ ام و از نفس دمے براں بر نہادہ بو کہ در اندک مایہ روزگاراں آتمایہ فراہم تواند آمد کہ مجمرہ را فروشنائی چراغ و رائحۂ عود را بال شناسائی دماغ تواند بخشید۔ ہانا نگارندۂ ایں نامہ را آں در سر است کہ پس از انتخاب دیوان ریختہ بگرد آوردن سرمایۂ دیوان فارسی بر خیزد و بہ استفاضۂ کمال ایں فربوفرں پس زانوئے خویشتن نشیند ۔ اُمید کہ سخن سرایان سخنور ستانی پراگندہ ابیاتے را کہ خارج ازیں اوراق یا بند از آثار تراوش رگ کلک ایں نامہ سیاہ نشناسند و چامۂ گرد آور را در ستائش و نکوہش آں اشعار ممنون و ماخوذ نہ سگالند۔ یا رب ایں بوئے ہستی نا شنیدہ، از نیستی بہ پیدائی نا رسیدہ یعنی نقش بہ ضمیر آمدۂ نقاش کہ باسد اللہ خاں موسوم و بہ میرزا نوشہ معروف و بہ غالب متخلص است چنانکہ اکبر آبادی مولد و دہلوی مسکن است فرجام کار نجفی مدفن نیز باد ۔"[۱]

تقریظ نواب ضیاء الدین احمد خاں

"------ترسم کہ آنچہ سرودم نہ سختہ باشی - ہانا منتخب دیوان اُردو زبان‌ست ریختہ کلک مسبجی فرتاب خدام، قسطاس دانش، اسطرلاب بنیش، جوہر

۱- دیباچۂ دیوان غالب اردو مطبع دارالسلام : صفحہ ۲ - ۴

آئینہ آفرینش ، معیار نقد گرانمایگی ، معراج سلم بلند پایگی ، قہرمان قلمرو معنی پروری ، فرمان فرمائے گیہان سخنوری ، گیتی خدایگان نو آئین نگاری ، جہان سالار تازہ گفتاری ، روان بخش کالبد سخن گستری ، بینائی فزائے چشم دیدہ وری ، فرازندۂ لوائے شوکت خامہ و فروزندہ چراغ دودۂ آمہ ، آیہ ناسخ شہرت ہمداستانان ، سرخیل انجمن نکتہ دانان ـــــ مثنوی

سخن را از خیالش ارجمندی
معانی را ز فکرش سر بلندی

صریر خامہاش بس دلپذیر است
بہشتی عندلیبان را صفیر است

مہین فرزند نہ آبائے علوی
بہین شاگرد عقل کل عالی

جہاں را بے دریغ آموزگار است
گزیں معنی شناس روزگار است

سر و سر دفتر شیوا بیانان
دریں فن افتخار ہم زبانان

بہ جولانگاہ معنی یکہ تازے
فلاطوں فطرتے حکمت ترازے

ز کلکش ریزش گنج معانی
چو ابر آذری در درفشانی

ز صہبائے سخن سرشار گشتہ
ورق از فکر او گلزار گشتہ

موجہ کیش ، صافی منش ستودہ خوئے فرو ہیدہ کنش ، بزرگ نہاد پاکیزہ گوہر ، فرشتہ سرشت آزرم گستر ، کیں گذار مہر پرور ، خورشید فروغ کیوان فر ، نکوہش نکوہ ، ستائش ستای ، کشور معنی را دہ خدای ، سر تا سر وفا و فتوت ، دیدہ تا دل حیا و مروت ، درک مصور ، روح مجسم ، عالم جان و جان عالم ، والاحسب ، عالی نسب ، سمی وصی واپسین وخشور ، آداش حضرت چارمیں دستور ، اعنی اُستادی ، مرشدی ، مولائی ، اخی میرزا اسد اللہ خاں بہادر غالب اللہم کمل الکلام بدیمومۃ بقایہ وحصل المرام بمیمونتہ لقاۂ ، پوزش آئیں ، نیاز گستر ، محمد ضیاء الدین نیر ، از دیر باز والای

اندیشۂ پست دراں اندیشیدی و گرانی قدر سبک الدراں سنجیدی کہ ایں گرامی برادر زادہ ہا را کہ یگاں یگاں خلف الصدق دود مان ضمیر بل ابوالآبائے مضامین دلپذیر است ، بہ تعلیم نو آموزاں لکو از بد نشناسی ، بر انگیزد و ایں ار زندہ جواہر پارہ را کہ ہر یک ازاں سیمیں ساعد شخص خرد را یارہ و نازنیں پیکر ہوش را گوشوارہ امست بہ شیشۂ پیش طاق شناسائی بر آویزد ۔ بارے کار ساز ایزد بزرگ را ہزاراں سپاس کہ دریں زماں کہ سنۂ ۱۲۵۴ مقدسہ ہجریہ نبویہ علی صاحبہا افضل التحیات و اکمل الصلوات، بہ یک ہزار و دویست و پنجہ و چار رسیدہ ، آں دیریں پسیچ و دلنشیں آرزو بہ مساعدت روزگار راست ہنجار و قلاوزی بخت بیدار ، خوشتر از آنکہ میخواستم روائی گرفت ۔ شاد کامی در دل جا گزید و اندوہ ترددگردآوری بدر رفت ۔ چوں باحصائے افراد این ہمایوں صحیفہ شتافتم ہمگی اشعار شعرئ شعار غزل و قصیدہ و قطعہ و رباعی یک ہزار و نود و اند یافتم۔ الا یا توانا ہوشاں ہوشی و شنوا گوشاں گوشی ! بر شاہراہ شناخت فراوانی نیکو معانی باید رفت نہ در پیغولۂ پیغارہ زنی خردہ بر قلت ابیات گرفت ۔ چنانچہ خود آں والا آموزگار درگذارش ایں ہنجار بہ پارسی نامۂ خویشن در پردۂ ساز آن گفتار خود می سراید ۔ آری راست میفرماید ۔ فرد :

نگویم تا نباشد نغر غالبؔ اندک
چہ غم گرہست اشعار من
از من یاد گاری و برائے دیگراں تذکاری باد

تمت تمام شد''[1]

۶۱ - ۱۸۶۲ع میں دیوان غالب دوبارہ چھپ کر شائع ہوا ۔ اس کی روداد مولانا مہر نے اس طرح بیان کی ہے :

''۱۸۶۰ع میں دیوان کا نیا اڈیشن چھاپنے کا خیال پیدا ہوا ۔ مئی ۱۸۵۷ع میں اردو دیوان کا ایک نسخہ خوش خط لکھوا کر نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور کے لیے بھیجا تھا ۔ جنوری ۱۸۶۰ع میں رام پور گئے تو اُس کی ایک نقل لے کر نواب ضیاء الدین خاں کی نرمائش کے مطابق اُن کے پاس ارسال کر دی ۔ رام پور ہی میں تھے کہ عظیم الدین میرٹھی نے اُردو دیوان کے چھاپے کی اجازت

۱۔ دیوان غالب : مطبع دارالسلام دہلی

کے لیے خط لکھا ۔ واپسی پر وہ میرٹھ پہنچے تو منشی ممتاز علی صاحب جو غالب کے دوست تھے ، عظیم الدین کے سفارشی بن گئے اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے کاپیاں دیکھنے کا ذمہ اُٹھا لیا۔ غالب راضی ہو گئے اور دلی پہنچ کر نواب ضیاء الدین احمد خاں والا قلمی نسخہ نواب مصطفیٰ خاں کے پاس میرٹھ بھیج دیا ۔ عظیم الدین نے دیوان کا چھاپنا ابھی شروع نہیں کیا تھا کہ منشی شیو نرائن صاحب اکبر آبادی نے دیوان کے لیے اصرار و ابرام کیا اور کہا کہ بڑے اہتمام سے اپنے مطبع میں چھاپوں گا۔ غالب نے تقاضا کرکے دیوان عظیم الدین سے واپس لیا اور منشی شیو نرائن کے پاس آگرہ بھیج دیا ۔ وہاں بھی اس کی اشاعت میں تاخیر ہوئی تو دلی میں محمد حسین خاں کے مطبع احمدی واقع شاہدرہ میں دیوان چھپوا لیا ۔"[1]

یہ نسخہ حد درجہ غلط چھپا تھا ۔ اس لیے غالب نے از سر نو کان پور میں چھپوانے کا ارادہ کیا ۔ چنانچہ اپنے قلم سے مطبوعہ نسخے پر تمام غلطیاں درست کیں ۔ اس کی پشت پر ایک رقعہ محمد حسین خاں مالک مطبع احمدی کے نام لکھ کر تصحیح شدہ نسخہ اُن کے پاس بھیج دیا ۔ محمد حسین خاں نے اُسے مطبع نظامی کان پور میں چھپوایا ۔ یہ اڈیشن ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ جون ۱۸٦۲ء میں مکمل ہوا ۔"[2]

مالک رام لکھتے ہیں :

"اس دوران میں شیو نرائن بھی دیوان کا چھاپنا شروع کر چکے تھے ۔ لیکن جب اُنھیں معلوم ہوا کہ دیوان دہلی اور کان پور دو جگہ سے شائع ہو گیا ہے تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سر دست اس کا چھاپنا ملتوی کر دیا تھا اور آخر اسے اگلے برس ۱۸٦۳ء میں پورا کرکے شائع کیا ۔ وہ غالباً دیوان کے ساتھ مرزا کی تصویر بھی چھاپنا چاہتے تھے ۔ چنانچہ غالب نے اپنی قلمی تصویر اُن کی نذر کی تھی ۔ مگر ان کے شائع کردہ دیوان کے ساتھ تصویر نہیں

۱- مہر : غالب : صفحہ ۳۸٦
۲- ایضاً : صفحہ ۳۹۰

چھپی ہے ۔ غالب کی زندگی میں ان پانچ کے علاوہ اور کوئی اڈیشن شائع نہیں ہوا ۔''[1]

غالب کی وفات کے بعد انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی میں متداول دیوان کے بے شمار اڈیشن شائع ہوئے۔ ان کی تفصیل تحصیل حاصل ہے ۔ ان میں صرف امتیاز علی خاں صاحب عرشی کا مرتب کیا ہوا 'دیوان غالب' ایسا ہے جو اہمیت رکھتا ہے ۔ کیونکہ اس میں انھوں نے غالب کا تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام یک جا کر دیا ہے اور اس پر نہایت مفید حواشی بھی لکھے ہیں ۔ اس دیوان کو انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ نے ۱۹۵۸ء میں شائع کیا ۔

سرور صاحب اس کے بارے میں لکھتے ہیں :

''غالب کے کلام کے جتنے اڈیشن شائع ہوئے ہیں ان میں 'نسخہ حمیدیہ' (انوار الحق) 'ارمغان غالب' (اکرام) ، 'انتخاب غالب' (عرشی) 'اردو دیوان غالب' (مالک رام) کی خاصی اہمیت ہے۔ غالب کے تنقیدی شعور کے مطالعے کے لیے ان نسخوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ عبداللطیف کو سب سے پہلے غالب کے سارے اردو کلام کو تاریخی ترتیب کے ساتھ جمع کرنے کا خیال آیا تھا۔ مگر اُن کے تیار کیے ہوئے مواد کا صرف نصف حصہ چھپ سکا ۔ اکرام نے پہلے 'غالب نامہ' اور بعد میں 'ارمغان غالب' میں یہ کوشش کی مگر ادھوری ۔ مالک رام نے 'نسخہ حمیدیہ' کے منتخب اشعار اور متفرق شعر مروجہ دیوان میں شامل کر کے ، عام پڑھنے والوں کے لیے ایک اچھا اڈیسن تیار کر دیا ۔ مگر زیر نظر اڈیشن جو اُردو کے مشہور محقق اور غالبیات کے ماہر جناب امتیاز علی عرشی کی برسوں کی محنت کا نتیجہ ہے نہ صرف ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتا ہے ، بلکہ کلام کی تاریخی ترتیب اور صحت ، نسخوں کے اختلاف کی نشان دہی ، شرح اور ضروری حواسی کے لحاظ سے اب تک کی ساری کاوشوں پر بھاری اور اُردو میں ادبی تحقیق اور عالمانہ نظر کا ایک قابل فخر اور ناقابل فراموش کارنامہ ہے ۔''[2]

۱۔ مالک رام : ذکر غالب : صفحہ ۱۳۳

۲۔ آل احمد سرور : دیباچہ دیوان غالب : (عرشی)

(۲)

نسخۂ حمیدیہ

غالب کا متداول دیوان جو بار بار شائع ہوا ہے، دراصل ان کے کلام کا انتخاب ہے ۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے اشعار کہے تھے جو شائع نہیں ہوئے، لیکن محفوظ رہے ۔ 'دیوان غالب' کو ان اشعار کے ساتھ 'دیوان غالب جدید' کے نام سے مفتی محمد انوارالحق نے ۱۹۱۹ء اور پھر ۱۹۲۶ء میں بھوپال سے شائع کیا ۔ یہی دیوان 'نسخۂ حمیدیہ' کے نام سے مشہور ہے ۔

اس نسخے کے مرتب مفتی انوارالحق نے اس دیوان کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے :

''یہ بات تو علی العلوم سب کو معلوم ہی ہے کہ غالب نے اپنے چند سخن فہم احباب کے مشورے سے اشعار کا ایک بڑا حصہ مشکل اور مغلق ہونے کی بنا پر قلم زدکر دیا تھا ۔ اور مروجہ اور مطبوعہ دیوان کی یہ سر و با بریدہ غزلیں اسی دیوان کی بچی کھچی نشانیاں ہیں جو ابنائے زمانہ کی آسان پسندی سے شائع ہونے سے پہلے ضائع ہو گیا

اس کے علاوہ خود غالب کے مکتوبات نظم و نثر سے بھی اس کا قطعی ثبوت ملتا ہے ۔ لیکن اب تو کسی ایسے ثبوت کی ضرورت ہی نہیں ۔ کیونکہ اب تک جس دیوان کو معدوم ثابت کیا جاتا تھا ، محض حسن اتفاق سے وہ بہ جنسہ مکمل حالت میں مل گیا ۔

اُمید ہے کہ شوق کے ہاتھ اسے ہاتھوں ہاتھ لیں اور قدر دانی کی نگاہیں اسے دل میں جگہ دیں ۔

اس نایاب کتاب کو محفوظ رکھنے کا شرف کتب خانۂ حمیدیہ بھوپال کو حاصل ہے ۔ یہ تو یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دیوان یہاں کیونکر پہنچا ۔ لیکن تاریخ ، کتابت اور مہروں وغیرہ سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ یہ غالباً رئیس وقت نواب غوث محمد خاں صاحب کے بیٹے میاں فوج دار محمد خاں صاحب کے لیے لکھا گیا تھا ۔ چنانچہ اس کے شروع میں ایک صفحے پر یہ لکھا ہوا ہے ''دیوان ہذا من تصنیف

مرزا نو شاہ دہلوی المتخلص بہ اسد از کتب خانۂ فیض آثار عالم پناہ میاں فوج دار محمد خاں بہادر دام اقبالہٗ" قلمی خوش خط ـــــــ اور اس کے سامنے ان کی مہر ہے ۔ اور خاتمے پر کاتب کے قلم کی یہ تحریر موجود ہے ۔ "دیوان من تصنیف مرزا صاحب و قبلہ المتخلص بہ اسد و غالب سلمہم ربہم علی ہذالعبد المذنب حافظ معین الدین بتاریخ پنجم شہر صفر المظفر ۱۲۳۷ھ من الہجرت النبویہ صورت اتمام یافت"ـ اس کا خط نہایت پاکیزہ اور نظر فریب ہے ۔ شروع میں خوبصورت طلائی کام اور تمام صفحات پر سنہری جدول ہے ۔ جگہ جگہ میاں فوج دار محمد خاں صاحب کی مہریں ثبت ہیں جن میں سے بعض ۱۲۳۸ھ اور بعض ۱۲۷۱ھ کی ہیں ۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان کم سے کم ایک بار اور ممکن ہے چند مرتبہ تصحیح و ترمیم کی غرض سے غالب کے پاس بھی گیا ہے اور ان کی نظر سے گذرا ہے ، اور انھوں نے خود اس میں جا بہ جا اصلاحیں کی ہیں ۔ کیونکہ اگرچہ ان اصلاحوں کا خط بہت خراب اور شکستہ ہے لیکن پھر بھی اس میں اور غالب کی طرز تحریر کے موجودہ نمونوں میں ایک گونہ مشابہت پائی جاتی ہے۔ اور گو محض اس کی بنا پر ان کو غالب کا قلمی نسخہ قرار دینا شاید درست نہ ہو ۔ لیکن خود ان اصلاحوں کی نوعیت ایسی ہے کہ ان کو مصنف کے سوا اور کسی کے قلم کی طرف منسوب کرنا مشکل ہے ۔ کیونکہ ان میں سے اکثر ایسی ہیں کہ لفظ کو کاٹ کر اس کی جگہ دوسرا لفظ رکھ دیا ہے یا کبھی مصرع کی کچھ صورت بدل دی جاتی ہے ۔ بہت سی غزلیں بھی اسی قلم سے حاشیے پر بڑھائی گئی ہیں جن میں سے بیشتر مروجہ دیوان میں بجنسہ موجود ہیں ۔ البتہ بعض ایسی بھی ہیں کہ ان میں بھی دوبارہ پھر کچھ انتخاب ہوا ہے اور مطبوعہ دیوان میں ان کے پورے شعر شائع نہیں ہوئے ۔ لیکن حقیقت میں اس امر کا ثبوت کہ یہ غالب کا گم شدہ دیوان ہی ہے ، خط کی مشابہت اور کاتب کی تحریر کی محتاج نہیں ہے بلکہ سب سے بڑی وجہ اور یقینی دلیل خود اس کے اشعار ہیں

آفتاب آمد دلیل آفتاب

ناظرین جب اس کا مطالعہ کریں گے تو خود کہہ دیں گے کہ

غالب کا کلام ہے ، اور غالب کے سوا اور کسی کا ہو ہی نہیں سکتا ۔مروجہ دیوان میں جتنی کٹی چھٹی غزلیں ہیں وہ سب اس میں مکمل موجود ہیں ۔ جو اشعار متفرق طور پر تلاش کر کے بعض دیوانوں میں بڑھائے گئے تھے اور جن کی بابت قیاسی طور پر کہا جاتا تھا کہ غالب کے ہیں ، وہ بھی سب کے سب اس میں پائے جاتے ہیں[1] ۔

اس دیوان میں ۲۷۵ غزلیں ہیں اور کل ۱۸۸۳ اشعار ہیں ۔ اس کے علاوہ قصیدے، رباعیاں اور قطعات بھی تعداد میں متداول دیوان سے زیادہ ہیں ۔

اس اعتبار سے یہ دیوان خاصی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں غالب کا ایسا کلام مل جاتا ہے جو عام دیوان میں نہیں ملتا[2] ۔

۱۔ مفتی انوارالحق: دیباچہ"دیوان غالب (نسخہ حمیدیہ): صفحہ ۵-۷

۲۔ غالب کے غیر مطبوعہ کلام کے بارے میں مولانا مہر لکھتے ہیں :

"غالب نے ابتدا میں میرزا بیدل کے رنگ میں اردو شعر کہنے شروع کیے تھے اور دس برس کی مدت میں ایک دیوان جمع کر لیا تھا ۔ جب ہوش آیا اور شاعری کی حقیقت سے آگاہی ہوئی تو ان میں سے صرف تھوڑے سے اشعار باقی رکھے، باقی قلم انداز کردیے ۔الغی اشعار کا ایک مجموعہ اعلیٰ حضرت نواب حمید اللہ خان بہادر فرماں روائے بھوپال کی توجہات عالیہ سے 'نسخہ حمیدیہ' کے نام سے شائع ہوچکا ہے ۔ جو اردو اشعار دیوان کی طباعت کے بعد کہے گئے ، وہ یا تو ان کے رقعات میں آ گئے ہیں یا بعض کسی مسودات سے لے کر شائع کیے جا چکے ہیں ۔ مثلاً چند چیزیں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے 'الہلال' میں چھاپ دی تھیں ۔ کچھ اشعار دیوان کے اس ایڈیشن میں چھپ چکے ہیں جو نظامی بدایونی نے خاص اہتمام سے شائع کیا تھا۔ کچھ اشعار آسی صاحب نے 'مکمل شرح کلام غالب' میں چھاپے ہیں ۔ لیکن بعض اشعار اس وقت تک منظر عام پر نہیں آئے ۔

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۶۱ پر)

نسخۂ حمیدیہ کے دو ایڈیشن بھوپال سے شائع ہوئے تھے ۔ اب یہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱٦۰)
حضرت مولانا ابوالکلام سے معلوم ہوا کہ نواب سعید الدین احمد خاں طالب مرحوم کے پاس اردو دیوان کا ایک قلمی نسخہ تھا ، جس میں غالب کے غیر مطبوعہ اشعار بھی تھے ۔ مولانائے محترم نے ان اشعار کی نقل لے لی تھی ۔ ارادہ یہ تھا کہ انھیں 'الہلال' (دور اول) میں شائع کردیں ۔ لیکن سوء اتفاق سے 'الہلال' بند ہو گیا اور بعض دوسرے مسودات کے ساتھ یہ اشعار بھی ضائع ہو گئے ۔

میں نے اس دیوان کی تلاش شروع کر دی ۔ مولانا مظہرالدین صاحب شیرکوٹی مرحوم مالک 'الامان' و 'وحدت' کی وساطت سے طالب مرحوم کے متعدد عزیزوں سے ملا ۔ لیکن قلمی دیوان کا کوئی سراغ نہ مل سکا ۔ اس تلاش میں نواب صلاح الدین مرحوم کی بیگم سے ایک اور قلمی دیوان مل گیا ، جس کے حاشیے پر اور بعض اوراق پر متفرق اشعار درج تھے ۔ میرا خیال ہے کہ کاتب نے انھیں غیر مطبوعہ سمجھتے ہوئے الگ درج کیا ۔ لیکن ان میں سے بعض مطبوعہ دیوان میں موجود ہیں ۔ کچھ اشعار 'اردوئے معلی' میں چھپ چکے ہیں مگر اب تک دیوان میں شامل نہیں ہو سکے ۔ مثلاً :

میں ہوں مشتاق جفا مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی

متفرق اشعار 'الہلال' یا دوسرے رسائل کے حوالے سے دیوان غالب کے نسخۂ نظامی میں چھپ چکے ہیں ۔ مثلاً والئی رام پور کے غسل صحت کا قصیدہ ، دو تین قطعات ، سخن تکیہ ، کہن تکیہ والی غزل ، بعض اشعار رام پور والے 'مکاتیب غالب' میں شائع ہوچکے ہیں ۔ مثلاً برسات والا قطعہ جو نواب کلب علی خاں مرحوم کو بھیجا گیا تھا ۔ اس کا شعر یہ ہے :

جناب قبلۂ حاجات اس بلاکش نے
بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس

(باقی حاشیہ صفحہ ۱٦۲ پر)

نایاب ہے اور کسی قیمت پر دستیاب نہیں ہوتا ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۱)

جو اشعار اب تک غیر مطبوعہ سمجھے جا سکتے ہیں ، اس لیے کہ کسی مجموعے میں شامل نہیں ہوئے ، وہ ذیل میں درج ہیں :

آپ نے مستثنی الضر کہا ہے تو سہی
یہ بھی اے حضرت ایوب گلا ہے تو سہی
رنج طاقت سے سوا ہو تو نہ پیٹوں کیوں سر
ذہن میں خوبیٔ تسلیم و رضا ہے تو سہی
ہے غنیمت کہ بہ امید گزر جائے گی عمر
نہ ملے داد مگر روز جزا ہے تو سہی
دوست ہی کوئی نہیں ہے جو کرے چارہ گری
نہ سہی لیک تمنائے دوا ہے تو سہی
غیر سے دیکھیے کیا خوب نباہی اس نے
نہ سہی ہم سے پر اس بت میں وفا ہے تو سہی
نقل کرتا ہوں اسے نامۂ اعمال میں میں
کچھ نہ کچھ روز ازل تم نے لکھا ہے تو سہی
کبھی آجائے گی کیوں کرتے ہو جلدی غالب
شہرۂ تیزیٔ شمشیر قضا ہے تو سہی

ممکن نہیں ہے بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشت غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں
ہوں درد مند جبر ہو یا اختیار ہو
گہ نالۂ کشیدہ گہ اشک چشیدہ ہوں
جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
از بس کہ تلخیٔ غم ہجراں چشیدہ ہوں
نے سبحہ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ
میں معرض مثال میں دست بریدہ ہوں
ہوں خاکسار پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ
نے دانۂ فتادہ ہوں نے دام چیدہ ہوں

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۶۳)

اب پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے اس کو ازسرنو مرتب کیا ہے اور مجلس ترقی ادب لاہور اس کو شائع کر رہی ہے ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۲)

جو چاہیے نہیں وہ مری قدر و منزلت
میں یوسف بہ قیمت اول خریدہ ہوں
ہر گز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلام نغز ولے نا شنیدہ ہوں
اہل ورع کے حلقے میں ہر چند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے زمرے میں میں برگزیدہ ہوں
پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئنے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

حاشیے اور متن کے علاوہ محولہ بالا قلمی نسخے کے اول و آخر کے بعض اوراق پر چند اشعار اردو اور فارسی کے موجود ہیں جو میرے علم کے مطابق آج تک کہیں شائع نہیں ہوئے ۔ مثلاً یہ اشعار جو غالباً لوہارو والوں کی طرف سے تقاضائے تشریف آوری کے جواب میں کہے گئے :

خوشی ہے یہ آنے کی برسات کے
پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں
سر آغاز موسم میں اندھے ہیں ہم
کہ دلی کو چھوڑیں لوہارو کو جائیں
سوا ناج ہے جو کہ مطلوب جاں
نہ واں آم پائیں نہ انگور پائیں
ہوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں
ابھی جا کے پوچھو کہ کل کیا پکائیں
وہ کھٹے کہاں پائیں املی کے پھول
وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں
فقط گوشت ، سو بھیڑ کا ریشہ دار
کہو اس کو کیا کھا کے ہم حظ اٹھائیں

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۶۴ پر)

(۳)

عود ہندی

غالب کے خطوط کا پہلا مجموعہ 'عود ہندی' کے نام سے ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ (۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ع) کو یعنی مرزا کی وفات سے تقریباً چار ماہ پہلے شائع ہوا ۔ اگرچہ تمام مسودہ ۱۸۶۶ع میں مکمل ہو کر سطبع میں دیا جا چکا تھا ۔ یہ نسخہ ۱۸۸ صفحات پر چھپا تھا ۔ اس کے شروع میں منشی ممتاز علی خاں کا دیباچہ اور آخر میں حکیم غلام مولا صاحب قلق میرٹھی کی تقریظ اور مختلف اصحاب کے چار تاریخی قطعے ہیں[۱]۔

حالی نے لکھا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ ع تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے ۔ مگر سنہ مذکورہ میں جب کہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے اور ہمہ تن 'مہر نیم روز' کے لکھنے میں مصروف ہوگئے ، اس وقت بہ ضرورت ان کو اردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہو گی—قیاس کہتا ہے کہ انھوں نے غالباً ۱۸۵۰ع کے بعد سے اردو زبان میں خط لکھنے شروع کیے ہیں[۲]۔

لیکن مولانا مہر نے اُس سے اختلاف کیا ہے اور لکھا ہے کہ غالب ۱۸۵۰ع سے قبل اردو میں خط و کتابت شروع کر چکے تھے لیکن چونکہ اس زمانے میں فارسی کا رواج تھا ، اس لیے اس کو اس وقت زیادہ اہمیت نہیں دی گئی[۳] ۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان خطوط کی اہمیت کو محسوس

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۲)

دو شعر سہرے کے ہیں جو نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقب کی شادی کے موقع پر کہے گئے تھے :

ہم نشیں تارے ہیں اور چاند شہاب الدین خاں
بزم شادی ہے فلک کاہکشاں ہے سہرا

ان کو لڑیاں نہ کہو بحر کی موجیں سمجھو
ہے تو کشتی میں ولے بحر رواں ہے سہرا

مہاراجہ الور نے 'گلستاں' کا ایک نہایت عمدہ نسخہ میر پنجہ کش سے لکھوایا تھا اور بہت روپیہ اس کی تزئین پر صرف کیا تھا ۔

۱- مالک رام : ذکر غالب : صفحہ ۱۳۳
۲- حالی : یادگار غالب :
۳- مہر : غالب : صفحہ ۳۹۷

کیا گیا - یہاں تک کہ بعض لوگوں کے دلوں میں ان کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا -

سب سے پہلے منشی شیو نرائن نے ان خطوط کو چھاپنے کی خواہش ظاہر کی - لیکن غالب نے اس کو مناسب خیال نہیں کیا اور منشی شیو نرائن کو لکھا :

''اردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا - ورنہ صرف سرسری ہے - اس کی شہرت میری سخن وری کے منافی ہے - اس سے قطع نظر کیا ضرورت ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں - خلاصہ یہ کہ ان کا چھاپنا میرے خلاف طبع ہے -''[1]

لیکن ۱۸۶۱ع میں چودھری عبدالغفور سرور اور منشی ممتاز علی خاں کے اصرار پر ان خطوط کو شائع کرنے کے لیے آمادہ ہوگئے جو ان صاحبوں نے اکٹھے کر لیے تھے -

مہر صاحب لکھتے ہیں :

''منشی ممتاز علی خاں نے مختلف رقعات جمع کرائے - سرور نے اپنا مجموعہ مع دیباچہ منشی صاحب کے حوالے کر دیا - خواجہ غلام غوث خاں صاحب بے خبر نے بعض دوسرے خطوط فراہم کر دیے - اس وقت تک یہی خیال تھا کہ تمام خطوط کی اشاعت ضروری نہیں - صرف وہ شائع کیے جائیں جن میں علمی رنگ نمایاں ہو - اسی لیے غالب نے خواجہ غلام غوث خاں کو لکھا تھا کہ اب یہ عبارت جو آپ کو لکھ رہا ہوں مجوزہ مجموعہ نثر میں شمول کے لائق نہیں ہے لیکن بعد میں جتنے خطوط مل سکے ، علمی اور غیر علمی کے امتیاز کو نظر انداز کرتے ہوئے مجموعے میں داخل کر دیے گئے - اس مجموعے نے 'عود ہندی' نام پایا -''[2]

۱- مہر : غالب : صفحہ ۳۹۷

۲- ایضاً : ۴۰۰

اس مجموعے پر ممتاز علی خاں نے پیش لفظ لکھا اور اس میں ان خیالات کا اظہار کیا :

''مجھے مدت سے اس کا خیال تھا کہ فارسی تصنیفیں تو ان کی بہت مرتب ہوئیں اور چھاپی گئیں - لوگوں نے فیض اٹھائے ، تعویذ بازو بنائے مگر کلام اردو نے سوائے ایک دیوان کے ترتیب نہ پائی - یہ دولت ارباب شوق کے ہاتھ نہ آئی ــ حالانکہ نثر اردو ان کی اوروں کی فارسی سے ہزار درجہ بہتر ہے - یہ سلاست بیان ، شستگیٔ زبان ، روزمرہ کی صفائی اور ان کی شوخی کس کو میسر ہے ــــ اسے بھی ترتیب دیجیے ، قدر دانوں پر احسان کیجیے -

اور مرزا صاحب کے شاگرد یکتا چودہری عبدالغفور سرور تخلص سے یہ ذکر آیا تو انھوں نے جتنے خطوط ، مرزا صاحب کے ان کے نام آئے تھے ، سب کو ایک جا کر کے ، اور اس پر ایک دیباچہ لکھ کے وہ مجموعہ عنایت کیا - عرصے تک سرگرم تلاش رہا - جا بجا سے اور تحریریں مرزا صاحب کی بہم پہنچائیں - بڑی محنت اٹھائی - تب تمنا بر آئی - اور مجموعہ مرتب ہوا - آج پورا اپنا مطلب ہوا - خواجہ غلام غوث خاں بے خبر تخلص جو نواب معلیٰ القاب لفٹیننٹ گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی کے میر منشی اور میرے مخدوم خاص اور حضرت غالب صاحب کے مخلص بالاختصاص ہیں ، اس تلاش میں میرے معین و مدد گار رہے - بہت کچھ ذخیرہ ان کی بدولت ہم پہنچا -

اس کتاب کی دو فصل اور ایک خاتمہ ہے - پہلی فصل میں چودہری صاحب کے مرتب کیے ہوئے خطوط اور ان کا لکھا ہوا دیباچہ ، دوسری فصل میں میرے جمع کیے ہوئے رقعات اور خاتمے میں چند نثریں ہیں جو جناب غالب نے اوروں کی کتابوں پر تحریر فرمائی ہیں -

'عود ہندی' اس کتاب کا نام ہے - خوشبو اس کی تمام عالم میں پھیلے ــ اسی دعا پر ختم کلام ہے -''[1]

'عود ہندی' کے اس ایڈیشن میں عبدالغفور سرور نے دیباچہ لکھا تھا اور اس میں یہ خیالات ظاہر کیے تھے :

'' اب ارباب اختیار کو معلوم ہو کہ میں انکسار ظہور عبدالغفور

۱- ممتاز علی خاں : پیش لفظ 'عود ہندی'

متخلص بہ سرور مارہروی بدو شعور سے اہل سخن کا طالب اور صاحب کلام کا خواہاں تھا ۔ جب کلام بلاغت نظام رشک صائب فخر طالب جناب اسد اللہ خاں غالب کا دیکھا ، دل کو بھایا ، یکتا پایا ۔ ترسیل مراسلات میں قدم بڑھایا ۔ ہر کتابت کا جواب آیا ۔

سبحان اللہ ! وہ زبان کہاں پاؤں کہ ان کے خلق کا بیان لب پر لاؤں ۔ مجھ سے ناچیز حقیر پر وہ ذرہ‌نوازی مہر وار فرمائی کہ میری نظر میں میری آبرو بڑھائی ۔ کبھی جواب مراسلہ میں تساہل و درنگ اور اصلاح شعر و عبارت میں دریغ اور ننگ نہ فرمایا ۔ جو نامہ کہ بہ نام میرے بہ عبارت اردو تحریر کیا ، مکتوب سادہ رویوں سے دلربا تر ۔ اور ہر سطر اس کی سلسلہ مویوں سے تاب فرسا زیادہ ہے ۔ جس آنکھ نے دیکھا وہ بینا ہے ۔ جس کان نے سنا وہ شنوا ہے ۔

بس تنہا متلذذ ہونا اور آپ ہی آب مزہ اٹھانا خلاف انصاف جانا دل مائل تمام بہ شہرت عام ہوا ۔ اور ہنوز یہ قصد نا تمام تھا کہ بہ حسن اتفاق فخر زماں ، وحید دوراں ، جناب ممتاز علی خاں صاحب متوطن میرٹھ — کہ عالم ریعان شباب میں بہ تہذیب نفس شب بیدار ، تہجد گزار ، دل نرم ، ہنگامۂ محبت گرم ، اخلاق مجسم ، شفیق‌مکرم فطرت ارجمند ، ہمت بلند ، خصائل حمیدہ ، اوصاف پسندیدہ ، پاک نہاد متحد با اتحاد ، پاکیزہ روش ، اخلاق منش ، سخن شناس ، انصاف اساس ، خوش تقریر ، عدیم‌النظیر ہیں ، رونق افزائے مارہرہ ہوئے اور قدوم تقدس لزوم سے اس قصبے کو مشرف کیا ۔

ایک روز محفل ممدوح میں ذکر ہمہ دانی و شیوا بیانی جناب استادی و مخدومی درمیان آیا ۔ ارشاد کیا کہ کلام مرزا صاحب نسیم جاں فزا اور شمیم دل کشا ہے ۔ فارسی کا کیا کہنا ، اردو بھی یکتا ہے ۔ نظم و نثر فارسی میں تو مجلیٰ بہ حلیہ انطباع ہوا ۔ لیکن نثر اردو زیور طبع سے عاری آیا ۔ اگر وہ خطوط کہ بہ نام تمہارے آئے اور تم نے سنائے ہیں ، جمع کرو تو میں بیڑا اٹھاتا ہوں — اس تعویذ سے نسیم تاثیر نے غنچۂ دل کھلایا ۔ منشا خاطر ظہور میں آیا ۔ وہ مکتوب کہ بہ نام میرے آئے تھے ، ترتیب دیے ۔ گویا جواہر بے بہا کان

قلم دان سے نکال کر کشتیٔ اوراق میں جمع کیے — چونکہ محبت جناب غالب مرے حال پر بہت غالب ہے ۔ لہٰذا نام ۔ اس انشا کا 'مہر غالب'، مناسب ہے ۔ سال ختم تالیف بھی اس نام سے مطابق پایا طبیعت اور بڑھی ۔ تحریر تاریخ کو دست قلم بڑھایا ۔

انشا مملو بہ صد مطالب لکھی
یعنی بۓ دوستان طالب لکھی
موسوم کیا جو 'مہر غالب' سے سرور
تاریخ بھی اس کی مہر غالب لکھی
۱۲۷۸ھ

کوکب شعر شاعران ہند بر تو التفات غالب سے روشن اور خاک فکر ہندیاں آبیاری مکرمت ممدوح سے گلشن ہو جیو ۔ آمین ثم آمین !'[1]

اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ سرور نے 'عود ہندی' کی اشاعت سے قبل 'مہر غالب' کے نام سے غالب کے خطوط کا مجموعہ مرتب کر لیا تھا ۔ لیکن بعد میں اس کو دوسری تحریروں کے ساتھ شامل کر دیا ۔ مجموعہ 'عود ہندی' کے نام سے شائع ہوا ۔

'عود ہندی' کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور گذشتہ سو سال میں اس کے مندرجۂ ذیل اڈیشن شائع ہوئے :

۱- مطبع میرٹھ ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۸ع (۲ رجب ۱۲۸۵ھ)
۲- مطبع نارا ئنی دہلی ۲۳ فروری ۱۸۷۸ع (۲ صفر ۱۲۹۵ھ)
۳- مطبع نول کشور کان پور ستمبر ۱۸۷۸ع (رمضان ۱۸۹۵)
۴- مطبع مفید عام آگرہ مئی ۱۹۱۰ع
۵- مطبع نول کشور کان پور ۱۹۱۳ع (بار چہارم)
۶- مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۲۷ع
۷- نیشنل پریس الہ آباد ۱۹۲۹ع
۸- مطبع انوار احمدی الہ آباد
۹- مطبع کریمی لاہور[2]

۱- عبدالغفور سرور : دیباچۂ عود ہندی
۲- مولانا مہر غالب : ۳۰۳—۳۰۴

۱۰- مطبع گلزار ہند اسٹیم پریس لاہور
۱۱- مجلس ترقی ادب لاہور - مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل جون ۱۹۶۷ء

(۴)

اردوئے معلیٰ

'اردوئے معلیٰ' غالب کے خطوط کا دوسرا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ ۶ مارچ ۱۸۶۹ء کو چھپ کر شائع ہوا۔ یہ 'اردوئے معلیٰ' کا پہلا حصہ تھا اس میں ۳۶۰ صفحے تھے۔ اس کے آخر میں تین صفحے کا غلط نامہ تھا۔ اسی مطبع سے یہ حصہ دوبارہ یکم رجب ۱۳۰۸ھ (۱۱ فروری ۱۸۹۱ء) کو شائع ہوا۔

اردو معلیٰ کی ترتیب میں خود غالب نے بھی دلچسپی لی۔ وہ اس طرح کہ جب 'عود ہندی' کی طباعت میں تاخیر ہوئی تو بعض احباب کے اصرار پر انھوں نے اپنے کچھ خطوط جمع کرنے کی کوشش کی تاکہ ان کو دوسرے مجموعے کی صورت میں شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے اس سلسلے میں اپنے احباب کو خط لکھے اور خطوط کی نقلیں بھیجنے کی طرف اس طرح توجہ دلائی:

"مطبع اکمل المطابع میں چند احباب میرے مسودات اردو جمع کرنے اور ان کو چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ مجھ سے مسودات مانگتے ہیں اور اطراف و جوانب سے فراہم کیے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا۔ جو لکھا وہ جہاں بھیجنا ہوا بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمہارے پاس بہت ہوں گے۔ اگر ان کا پارسل بنا کر بہ سبیل ڈاک بھیج دو گے یا آج کل میں کوئی ادھر آنے والا ہو اس کو دے دو گے تو موجب میری خوشی کا ہوگا۔"

(خط بنام علاؤالدین احمد خاں)

"اجی حضرت! یہ منشی ممتاز علی خاں کیا کر رہے ہیں۔ رقعے جمع کیے اور نہ چھپوائے فی الحال پنجاب احاطے میں ان کی بڑی خواہش ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ آپ کو کہاں ملیں گے جو آپ ان سے کہیں

مگر یہ تو حضرت کے اختیار میں ہے کہ جتنے میرے خطوط آپ کو پہنچے ہیں ، وہ سب یا ان سب کی نقل بطریق پارسل مجھ کو بھیج دیں - جی یوں چاہتا ہے کہ اس خط کا جواب وہی پارسل ہو -''

(خط بہ نام خواجہ غلام غوث خاں بے خبر)

مہر صاحب کا خیال ہے کہ جب خطوط جمع ہو گئے تو ۱۸۶۳ ع میں غالب نے اس کی طباعت کا ارادہ کیا - یہی مجموعہ 'اردوئے معلیٰ' کے نام سے شائع ہوا - اس میں میر مہدی مجروح کا دیباچہ تھا ، اور یہ اکمل المطابع میں فخرالدین کے زیر اہتمام چھپا تھا -[1]

' اردوئے معلیٰ ' کے اس وقت تک کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں - اس‌وقت مطبع مجیدی کا ۱۹۲۲ع کا چھپا ہوا مکمل 'اردوئے معلیٰ' کا نسخہ ہمارے سامنے ہے- اس میں سے میر مہدی مجروح کے دیباچے اور مرزا قربان علی بیگ سالک کی تقریظ سے چند اقتباسات یہاں نقل کیے جاتے ہیں -

''ـــــیہ جناب نجم الدولہ دبیرالملک نواب اسد اللہ خاں غالب تخلص کی ذات با برکات کی خوبیوں کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے :

میرا استاد کہ ہے جس کا سخن عالمگیر
ہے ظہوری کا ظہور اور نظیری کا نظیر

حضرت کا جو سخن ہے وہ در عدن ہے - جو بات ہے از رہ معنی کرامات ہے یہ نثر کی رنگینی - یہ نظم کی شیرینی - یہ غزل کی فصاحت - یہ قصیدہ کی متانت - یہ لفظوں کی محبوبی - یہ ترکیب کی خوش اسلوبی - یہ جدت معانی - یہ طاقت لسانی - یہ سلاست عبارت یہ روانی مطالب دیکھی نہ سنی - سطریں ہیں کہ سوتی کی لڑیاں ہیں- باتیں ہیں کہ مسری کی ڈلیاں ہیں - نثر نثرہ نثار پر نظم انجم قربان - حسن تقریر پر تحریر شعاع کے نثار کرنے کو آفتاب زر بداماں- گفتار شکر بار کو جادو کہوں سحر کہوں حیران ہوں کیا کہوں لاحول و لا قوۃ کیا سودائیوں کی باتیں کرتا ہوں - کیا جادو ہے کیا سحر کا اثر ہے - گفتار اعجاز طراز کے رشک سے ہندوستان میں نہ جادو ہے نہ سحر ہے ہاں بابل کے کسی کونے میں چھپا ہو تو کیا خبر ہے - بھلا اس عبارت فصاحت نشان کا کیا وصف بیان ہو جس کی صفائی

۱- مولانا مہر : غالب : صفحہ ۳۰۵

استعارات کی خجلت سے در شاہوار پانی پانی - جس کی رنگینی فقرات سے خون جگر لعل رمانی - نہیں نہیں - یہ ستائش کچھ سرمایۂ نازش نہیں - کیا موتی کیا لعل ان کی وجہ قدر و مقدار یعنی آب و تاب اندک تغیر میں نایاب ہے - اور یہ قیامت تک یکساں - تہی دستان سرمایۂ سخن کو فیض رساں عبارت متین کی کیفیت دیکھ کر جامی تو کیا افلاطون خم نشیں کے نسنے ہرن ہوتے ہیں اور اس کے ادراک غوامض میں اپنی عقل و خرد کھوتے ہیں - جہاں سر خوشان خمستان معانی جرعہ خوار بادۂ گفتار اور نشۂ حسن بیان سے سرشار ہوں پھر ہم سے نارسیدہ اس پختگی مطالب کو کیا پائیں ، کہاں سے ایسی قوت متخیلہ لائیں - سوائے اس کے کہ یہ راہ باریک دیکھ کر قدم لڑکھڑائیں اور اپنی نارسی پر عرق انفعال میں غوطہ کھائیں - مگر افسوس کہ اس جنس گراں ارز کا کوئی خریدار نہ ہوا اور یوسف مصر سخندانی کا طالب دیدار نہ ہوا - حضرت کا ظہور حضرت اکبر شاہ کے عہد میں ہوتا ، شاہ عباس دارائے ایران کے عصر میں ہوتا - نظیری اپنا نظیر دیکھ لیتا ، ظہوری کو فن شعر میں اپنا حریف غالب نظر آجاتا - خیر اب ہم یوں دل خوش کرتے ہیں کہ اگر حضرت اس وقت میں زینت بخش جہاں ہوتے تو ہم کہاں ہوتے - یہ ہمارے طالع کی خوبی یہ ہماری خوش نصیبی کہ ایسے منتخب روزگار کے جمال با کمال سے مقتبس انوار فیض ہوئے اور شرف قدم بوسی بہرہ اندوز - جب حضرت کو دیکھ لیا گویا سب سخندان پیشینہ کو دیکھ لیا - جب حضرت کا کلام سن لیا سب کا کلام سن لیا - مبین میرے قول کی یہ اردو کی تحریر ہے کہ سہل الممتنع بلکہ ممتنع النظیر ہے - اس اردو کا نیا انداز ہے کہ جس کے دیکھنے سے روح کو اہتزار ہے جو کہ بعد تکمیل ہو جانے کلیات نظم و نثر فارسی کہ وہ ایک آویزۂ گوش فصاحت و پیرایۂ گلوے بلاغت ہے اور ہندوستان سے ایران تک ہر نکتہ سنج کی ورد زبان ہے مدت سے حضرت کو طرز نوایجاد اردو سے لگاؤ ہے اور خط و کتابت میں اسی کا برتاؤ ہے - جب شائقین ہنر دوست نے اس نمک ہندی کا مزہ چکھا ، ہر ایک سرمایۂ لذت مائدہ سمجھ کر طلب گار خواستگار ہوا - اس واسطے منشی جواہر سنگھ صاحب جوہر

کہ یہ صاحب اخلاق و مروت میں یکتا اور علم دوست و ہنر آشنا ملازمین معزین سرکار سے ہیں اور اب بینشن دار ہیں علم فارسی کو خوب جانتے ہیں اشعار بھی اسی زبان میں فرماتے ہیں منشی صاحب کے اشعار قابل دید ہیں جناب مرزا صاحب قبلہ کے شاگرد رشید ہیں چنانچہ خود جناب مرزا صاحب فرماتے ہیں ۔ ع ۔ در معرکہ تیغیم کہ جوہر داریم ۔ ان کی طبع والا نے یہ اقتضا کیا کہ یہ گوہر ہائے شب افروز سلک تحریر میں منسلک ہو کر زینت بخش عروس سخن ہوں اور یہ گلہائے پراگندہ جمع ہو کر ایک جا گلدستہ ہوں تا اس کی رواج روح پرور سے دماغ نکتہ سرایان غیرت چمن ہوء اس واسطے۔ میرفخرالدین صاحب مہتمم اکمل المطابع دہلی نے سعی بے پایاں اور لالہ بہاری لال صاحب منشی مطبع مذکور نے کوشش فراواں سے اکثر خطوط جمع کیے اور قصد انطباع کیا اور 'اردوئے معلٰی' نام رکھا گیا اور ان خطوط کو دو حصوں پر منقسم کیا ۔ پہلے حصہ میں صاف صاف عبارت کے خط تحریر کیے تا کہ طلبائے مدرسہ فائدہ اٹھائیں ۔ دوسرے حصہ میں مطالب مشکلہ کی تحریر اور تقریظ وغیرہ لکھی تا سخنوران معنی یاب اس کے دیکھنے سے مزا پائیں اور منشی صاحب موصوف نے اس ہیمچدان خاکسار یعنی مجروح دل افگار سے اس کا دیباچہ لکھنے کو فرمایا ۔ بندہ یہ سن کر حیران ہوا کہ یا رب در شاہوار کے سامنے خزف ریزوں کا کیا اعتبار اور لعل و زمرد میں پتھر کے ٹکڑوں کا کیا وقار ۔ مگر الامر فوق الادب سمجھ کر اور اپنے کو اسی خوان نعمت کا ذلہ چین جان کر یہ چند سطریں لکھیں ۔ بقول عرفی :

چو ذرہ گرچہ حقیریم نسبتم ابں بس
کہ آفتاب بود نقطۂ مقابل ما

قربان علی بیگ سالک کی تقریظ

"شیدائیان شاہد دلفریب سخن ہر وقت اس کے خریدار اور شیفتگان حسن معانی ہر دم اس کے خواستگار رہتے ہیں کہ اچھا کلام جو مطبوع طبایع ناظرین خرد پیشہ اور پسند خواطر شائقین درست اندیشہ ہو میسر آئے ۔ صاحب نظران دیدہور جن کی آنکھیں شبستان معانی کی سیر سے سیر ہوتی ہیں۔

مشاہدۂ ماہ پیکراں مہر تمثال سے تسلی نہیں پاتے - اور رنگین مشامان نکتہ پرور جن کے دماغ میں گلستان سخن جو نیر اعظم سپہر سخنوری و ماہ منیر آسمان معنی گستری شہسوار عرصہ نکتہ دانی یکہ تاز میدان جادو بیانی فرماں روائے کشور نازک خیالی زینت افزائے اورنگ بیمثالی ناثر نثر عالی رفعت - شاعر شعریٰ رتبت - چمن آرائے گلستان فصاحت - حدیقہ پیرائے خیابان بلاغت - فروغ بزم آفرینش - نور دیدۂ بینش - استاد یگانہ - مسلم الثبوت زمانہ - رشک عرفی و غیرت طالب جناب استاذی نجم الدولہ دبیرالملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ غالب کی زبان معجز بیان پر آیا ہوا اور خامۂ پروین انشان سے نکلا ہوا علی الخصوص یہ سفینۂ بے نظیر و مجموعۂ دلپذیر جس کا ہر حرف باعث نظارۂ چشم نظارگیاں اور ہر لفظ سبب تازگیٔ دیدۂ مشتاقاں ہے- ہر سطر کو دریائے موج خیز معانی اور ہر فقرہ کو گلزار ہمیشہ بہار رنگین بیانی کہنا چاہیے - عبارت سے سلسبیل کی سلاست پیدا - مضامین سے آب کوثر کی لطافت ہویدا - کمند انداز رسا میں گردن معانی شکار - شیرینیٔ ادا پر ادائے شیریں لباں نثار - غور کیجیے کہ فراہم آنا اس نسخۂ بے بدل کا - اور طبع ہونا اس کتاب بے مثل کا کیونکر غنیمت نہ سمجھا جائے - ناظرین کو لطف ارزانی و شائقین کو مذاق سخن فراوانی مبارک - کیوں کر شکر فراہمی نہ ادا کیا جائے - ہاں اے سالک اندوہگیں کیسا شکر یہ کیا کلام ہے اے بے خبر گریہ و ہنگام ماتم عام ہے -

باید چو شمع در دل شبہا گریستن
سر گرم بودن از تہ دل باگریستن
نا سازگار جسم مرا نا گداختن
نا خوش گوار چشم مرا نا گریستن
گرنیست از تراوش سر چشمۂ حیات
باید بعمر خضر و مسیحا گریستن

ہنوز یہ نامۂ دلآویز تمام و کمال تشریف طبع نہ پا چکا تھا کہ سپہر بے مہر نے بتاریخ ۲ ذیقعدہ ۱۲۸۵ ہجری جامۂ حیات جناب مغفور و مرحوم کو چاک کیا - آفتاب علم و کمال کو رنج خسوف دکھایا - ماہتاب فضل و ہنر کو صدمۂ کسوف میں پھنسایا -

اس ستم گار سے کوئی پوچھے
ہاتھ اس واقعے سے کیا آیا

نہ سوجھا کہ عالم میں تاریکی چھائے گی ۔ زمانہ کو تسکین نہ ہاتھ آئے گی ۔ آنکھیں اشک بار دل بیقرار ہوں گے مگر :

نیش عقرب نہ از پئے کیں است
مقتضائے طبیعتش ایں است

اپنی عادت سے ناچار ہے ۔ دشمنی اہل کمال سے اس کا شعار ہے ۔ کوئی مبتلائے آفت ہو ۔ خواہ گرفتار مصیبت ہو ۔ اس کو اپنی گردن کا رنگ دکھانا ۔ کسی نہ کسی یگانۂ آفاق کا نقش ہستی صفحہ روز گار سے مٹانا۔ سخن آرائی نوحہ سرائی سے کیوں کر بدل ہو ۔ سخن سنجی کے عوض کبھی نالۂ پر درد اورکبھی آہ سرد لب پرہے ۔ کہیے جب یہ بارگراں اندوہ دل پر ہو دل کی مجال ہے کہ بیٹھ نہ جائے ۔ کیسی تاریخ خاتمۂ کتاب ۔ کیسا سال وفات.ہاں گفتگو کو مختصر کرتا ہوں اور ایک قطعہ لکھتا ہوں ۔

قطعہ

کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا
لب پہ نالوں کا اژدہام ہوا
صدمۂ مرگ حضرت غالب
سبب رنج خاص و عام ہوا
ہے یہی سال طبع سال وفات
آج ان کا سخن تمام ہوا

(۵)

مکاتیب غالب

غالب نے دربار رام پور سے منسلک ہونے کے بعد جو خطوط والیان ریاست کو لکھے تھے ، وہ اس مجموعے میں یک جا کر دیے گئے ہیں ۔ مولانا امتیاز علی خان عرشی نے ان کو مرتب کیا ہے اور ایک مفصل مقدمے اور مفید حواشی کے ساتھ ان کو رام پور سے شائع کیا ہے ۔ اس کتاب کا پہلا اڈیشن ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا تھا ۔ اس کے بعد اس کے چار

اڈیشن اور شائع ہوئے۔ آخری اڈیشن ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔
اس مجموعے کے سرورق پر یہ عبارت ملتی ہے :

''نجم الدولہ دبیرالملک مرزا اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ دہلوی متخلص بہ غالب کے آون عرائض و خطوط کا مجموعہ جو نواب فردوس مکاں، نواب خلد آشیاں (طاب ثراہما) یا دیگر وابستگان دربار کی خدمت میں لکھے گئے تھے ۔''

مکاتیب غالب کی ترتیب اور اشاعت کی تفصیل بشیر حسین زیدی صاحب نے اس طرح بیان کی ہے :

''نواب فردوس مکاں کے دامن جود و سخا میں پناہ لینے والے حضرات کی طویل فہرست میں مفتی محمد سعد اللہ مراد آبادی ، میرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی ، منشی مظفر علی خاں اسیر لکھنوی ، منشی امیر احمد مینائی ، صاحب عالم ، میرزا رحیم الدین حیا دہلوی ، شیخ علی بخش بیمار ، میر عوض علی عدیل ملیح آبادی خوش نویس نستعلیق اور منشی انبا پرشاد لکھنوی داستان گو وہ ممتاز ہستیاں ہیں جن سے ارباب علم و ادب بخوبی واقف ہیں ۔

لیکن ان تمام صاحبان فضل و کمال میں نجم الدولہ، دبیرالملک، میرزا اسد اللہ خاں بہادر غالب دہلوی کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ آغاز ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق خیر آبادی کی وساطت سے نواب فردوس مکاں نے انھیں فن سخن میں اپنا مشیر خاص مقرر فرمایا تھا ۔ ابتداً نواب فردوس مکاں وقتی عطیات سے میرزا صاحب کی امداد فرماتے رہتے تھے لیکن غدر کے بعد ان کی پنشن بند ہو گئی تو نواب صاحب نے جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ ماہوار تنحواہ جاری فرما دی تھی، جو ان کے انتقال کے بعد تک خلد آشیاں کے خزانے سے ملتی رہی اور مرزا صاحب کی وفات پر ان کے متبنیٰ حسین علی خاں شاداں کے وظیفے کی شکل میں تبدیل ہو گئی ۔

اس رشتے کی بدولت ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۹ء تک دربار رام پور اور میرزا غالب کے درمیان سلسلۂ مراسلت جاری رہا ۔ اس مراسلت کا

۱- مکاتیب غالب :

معتدبہ حصہ محکمۂ عالیۂ دارالانشا (پولیٹکل ریکارڈس آفس) رام پور میں محفوظ تھا۔ ۱۹۳۵ء میں احقر نے اعلیٰ حضرت بندگان حضورپرنور کپتان ہزہائنس عالی جاہ ، فرزند دل پذیر دولت انگلشیہ ، مخلص الدولہ ناصرالملک، امیرالامراء نواب سید محمد رضا علی خاں بہادر مستعدجنگ فرماں روائے رام پور دام اقبالہم و ملکہم کی توجہ ہمایوں اس نادر و نایاب ذخیرے کی اشاعت کی طرف مبذول کرانے کی جرأت کی ۔

بندگان اعلیٰ حضرت کی ذات گرامی اپنے آبائے کرام کی طرح سرپرستیٔ علوم و آداب میں عموماً اور پرورش زبان اردو میں خصوصاً اقرات و امائل میں ممتاز ہے ۔ بنا بریں حکم عالی نافذ ہوا کہ اس مجموعے کو باحسن وجوہ مرتب کر کے افادۂ ارباب ذوق کے لیے شائع کر دیا جائے ۔

میں نے مولوی امتیاز علی عرشی (ناظم کتب خانۂ رام پور) کو جن میں علمی قابلیت ، ذوق سلیم اور علم و ادب کی عملی خدمت کے جذبات جمع ہیں اور مجھے ان سے آئندہ کے لیے بہت بلند اور خوش آئند توقعات ہیں ، اس ادبی خدمت کے سر انجام پر مامور کیا اور وقتاً فوقتاً مناسب ہدایات اور مشورے دیتا رہا ۔ ان کی مسلسل دو سال کی سعی و جانفشانی کے بعد آج یہ مجموعہ اس قابل ہوا ہے کہ اعلیٰ حضرت شہریار رام پور دام اقبالہم و ملکہم کے حضور میں پیش کیا جا سکے ۔''[۱]

اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے دیباچے میں اس مجموعے کا تعارف اس طرح کرایا ہے :

''۱۹۳۵ء میں جناب معلیٰ القاب عالی مرتبت سید بشیر حسین صاحب بہادر زیدی ، چیف منسٹر ریاست رام پور نے حقیر عرشی کو حکم دیا کہ بندگان اعلیٰ حضرت ہزہائنس کپتان عالی جاہ ، فرزند دلپذیر دولت انگلشیہ ، مخلص الدولہ، ناصرالملک، امیرالامراء ، نواب سید محمد رضا علی خاں بہادر مستعد جنگ فرماں روائے رام پور دام اقبالہم و ملکہم کے ایمائے ہمایوں کے مطابق میرزا اسد اللہ خاں بہادر

۱- مکاتیب غالب : صفحہ ۸-۹ (پہلا اڈیشن)

غالب دہلوی کے مکاتیب جو موصوف نے نواب فردوس مکاں ، نواب خلد آشیاں (طاب ثراہا) یا دیگر وابستگان دربار کے نام لکھے تھے، اور عرصے سے محکمۂ عالیہ دارالانشا میں محفوظ تھے ، ضروری حواشی اور ایک سیر حاصل مقدمے کے ساتھ مرتب کروں ۔

میری علمی بے بضاعتی اس بارگراں کی کسی طرح متحمل نہ تھی اور دامن ہمت اس شرف بے پایاں کے احاطے کو کوتاہ نظر آتا تھا مگر بہ مقضائے :

من دریں رتبہ از کجا ، لیکن
مور پروردۂ سلیماں است

بہ تعمیل حکم ترتیب مکاتیب کا کام شروع کیا اور مسلسل دو سال کی شب و روز کی محنت کے بعد اس مجموعے کی ترتیب کے قرینے سے سبک دوش ہوا "[1]

(٦)

خطوط غالب

غالب کے خطوط کا یہ مجموعہ منشی مہیش پرشاد نے مرتب کیا اور اس کی پہلی جلد پروفیسر عبدالستار صدیقی صاحب کی نظرثانی کے بعد ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے ۱۹۴۱ع میں شائع ہوا ۔ اس پر عبدالستار صدیقی صاحب نے ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے اور اس میں مہیش پرشاد صاحب کی محنت کو سراہا ہے ۔ لکھتے ہیں :

"غالب کے اردو خطوں کے دو مشہور مجموعوں 'عود ہندی' اور 'اردوئے معلیٰ' کو شائع ہوئے ستر بہتر برس ہو چکے اور اب تک یہ دونوں کتابیں کئی بار چھپیں ، مگر اردو نثر کے ان سادہ پرکار نمونوں کو خوش اسلوبی سے ترتیب دینے یا ان کے متن کی ، جیسی چاہیے تھی ، تصحیح کرنے کی کوشش نہ ہوئی ۔ ہر نئی اشاعت میں کچھ نئی غلطیاں آ داخل ہوئیں ۔ یہاں تک کہ آخر اشاعتوں کا مشکل ہی سے کوئی صفحہ غلطیوں سے بچا ہے ۔ ان غلطیوں کی خاطر خواہ

۱- مکاتیب غالب : دیباچہ : صفحہ ۱۱

اصلاح تب ہی ہو سکتی ، جب غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خط سب کے سب مل جاتے ۔ اصل خطوط کا ہاتھ آنا تو بڑی بات، چھاپے کے پرانے نسخوں کا ملنا بھی دشوار ہو گیا ۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا تھا ، کام کی مشکلیں بڑھتی جاتی تھیں اور یقین نہ آتا تھا کہ کوئی کبھی اس کٹھن کام کو کر سکے گا ۔ بزار آفریں منشی مہیش پرشاد کی ہمت کو کہ وہ کمر باندھ کے اٹھ کھڑے ہوئے اور بڑی مستعدی سے غالب کے خطوں کے متعلق بہت وافر مواد جمع کیا ۔ نہ صرف 'عود ہندی' اور 'اردوئے معلیٰ' کے خطوں کو اک جا کر کے تاریخی سلسلے سے ترتیب دیا ، بلکہ جو اور خط کہیں اور شائع ہوئے تھے، ان کو بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا اور کچھ ایسے خط بھی ، نہ معلوم کن مشکلوں سے حاصل کیے ، جو اب تک شائع نہیں ہوئے تھے ۔ اس سارے ذخیرے کو انھوں نے تاریخی سلسلے سے مرتب کیا اور کئی برس کی لگاتار محنت اور دوڑ دھوپ کے بعد ایک ضخیم مجموعہ 'خطوط غالب' کے نام سے دو جلدوں میں تیارہوا۔ پہلی جلد اب شائع ہوئی ہے اور امید ہے کہ دوسری جلد کا چھاپا بھی اسی سال ہو جائے گا ۔"[1]

منشی مہیش پرشاد اس مجموعے کے بارے میں لکھتے ہیں :

"۱۹۲۳ء کی بات ہے کہ مجھے مرزا غالب کے خطوط کو پڑھنا پڑا ۔ اس وقت مطبوعہ خطوط کے اغلاط و اسقام معلوم ہوئے اور ان کے باب میں بعض امور کا خیال ہوا ۔ چنانچہ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج یہ نسخہ حضرت غالب کے قدردانوں کی خدمت میں پیش ہورہاہے۔ 'عود ہندی' اور 'اردوئے معلیٰ' میں جتنے خطوط ہیں ، وہ سب اس مجموعے میں اک جا کر دیے گئے ہیں ۔ اور ان کے علاوہ بہت سے خط اس میں شامل ہیں ، جو ان دونوں کتابوں کے کسی نسخے میں نہیں ملتے۔ بلکہ کسی اور کتاب یا مختلف ادبی رسالوں میں شائع ہوئے ہیں، کچھ ایسے بھی ہیں، جو اب تک کہیں شائع نہیں ہوئے ۔ یا شائع ہو چکے ہیں مگر ان میں جا بجا غلطیاں تھیں ۔ جو خط 'عود ہندی'

۱۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی : مقدمہ خطوط غالب

یا 'اردوئے معلیٰ' میں ہیں ، ان کے مقابلے اور تصحیح کی کوشش کی گئی ہے ۔ جہاں کہیں ایک متن کے دو یا زیادہ نسخوں میں اختلاف تھا ، بہتر صورت کو متن میں رکھا اور اختلاف اگر کاتب کے سہو پر مبنی پایا گیا تو اس سے قطع نظر کیا گیا ۔ صرف اسم اختلافات حاشیے میں دیے گئے ہیں ۔ کہیں کہیں متن میں کوئی لفظ کم معلوم ہوا اور اس کے بغیر جملہ ناقص ہو گیا تھا تو ضروری لفظ بڑھا دیا گیا اور اس طرح کا اضافہ کہنی دار لکیروں کے اندر رکھا گیا ہے ۔

ہر ایک مکتوب الیہ کے نام کے خط تاریخی ترتیب سے مرتب کیے گئے ہیں ۔ ہر مکتوب الیہ کے نام کے پہلے خط کی تاریخ کے لحاظ سے مکتوب الیہوں کی تقدیم و تاخیر کی گئی ہے ۔ 'عود ہندی' میں بہت تھوڑے خط آئے ہیں ، جن میں تاریخیں درج ہیں مگر ان میں اکثر ایسے ہیں کہ ان میں دن اور مہینہ لکھا گیا ہے مگر سنہ نہیں ہے ۔ 'اردوئے معلیٰ' کے بہت سے خطوں میں تاریخیں ہیں لیکن کہیں ہجری کہیں عیسوی تاریخیں ہیں ، کہیں دونوں ، اور بعض تاریخیں غلط بھی ہیں ۔ اس مجموعے میں تمام تاریخوں کو ایک ڈھنگ پر رکھنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ جن خطوط میں صرف ہجری تاریخیں ہیں ۔ ان کے مطابق عیسوی تاریخیں خط کے آخر میں درج کر دی گئی ہیں ۔ اس التزام کے ساتھ کہ جتنا حصہ اصل میں نہیں ہے ، وہ کہنی دار لکیروں کے اندر رکھا گیا ہے ۔ کہیں حاشیے میں تاریخ دے دی گئی ہے ۔ جس خط میں کوئی تاریخ درج نہیں ملی ، اس کے زمانے کا تعین اندرونی شہادت یا کسی اور ذریعے سے کی گئی ۔ مثلاً منشی ہرگوپال تفتہ کے نام کے پہلے خط کا وقت 'اسعد الاخبار' آگرہ کے ۲ اگست ۱۸۴۹ء کے پرچے سے معین کیا جا سکا ۔ اس لیے کہ اس میں منشی صاحب کے دیوان پر میرزا غالب کی لکھی ہوئی تقریظ کا ذکر ہے۔"[۱]

غرض یہ مجموعہ بڑی محنت اور تلاش و جستجو سے مرتب کیا گیا ہے ۔ اس میں والیان ریاست رام پور کے نام وہ خط بھی شامل کر لیے گئے ہیں ،

۱۔ منشی مہیش پرشاد : دیباچہ خطوط غالب

جو 'مکاتیب غالب' کے نام سے امتیاز علی عرشی صاحب نے مرتب کر کے شائع کیے تھے ۔

افسوس ہے کہ 'خطوط غالب' کی صرف ایک جلد شائع ہوئی۔ دوسری جلد شائع نہ ہو سکی ۔

(۷)

نادرات غالب

میرن صاحب کے نواسے آفاق حسین آفاق دہلوی نے اس مجموعے میں وہ خطوط جمع کر دیے ہیں جو غالب نے منشی نبی بخش حقیر اکبر آبادی کے نام لکھے تھے ۔

میر مہدی مجروح اور میر افضل علی میرن صاحب ان خطوط کو جمع کرتے رہے اور بالآخر یہ آفاق حسین صاحب کو ورثے میں ملے اور انھوں نے ان کو مرتب کیا، حواشی لکھے اور ۱۹۴۹ء میں پہلی بار یہ مجموعہ مشہور پریس کراچی میں چھپوا کر ادارۂ نادرات کراچی سے شائع کیا ۔

آفاق حسین صاحب تمہید میں لکھتے ہیں :

''بزرگوں کے تبرکات میں مرزا غالب کے یہ غیر مطبوعہ خطوط بھی شامل تھے ، جنھیں 'نادرات غالب' کے نام سے ارباب نظر کی خدمت میں سرمایۂ ناز بنا کر پیش کیا جا رہا ہے ۔ یہ خطوط مرزا غالب کے عزیز دوست میر مہدی حسین مجروح اور میر افضل علی عرف میرن صاحب نے فراہم کیے تھے ۔ لیکن کسی وجہ سے ان کی اشاعت کی نوبت نہ آ سکی ۔ چونکہ میں نے اس خانوادے میں آنکھیں کھولی ہیں اس لیے اس گنج گراں مایہ کو محفوظ رکھنے کا شرف بھی میرا ہی حصہ رہا ۔ اس صحیفۂ ادب کا تملک و تصرف ہر چند ہر چند میرے لیے قابل رشک رہا ہے ۔ لیکن دنیائے ادب کو اس سے محروم رکھنا بھی ایک گناہ سے کم نہ تھا ۔ ویسے بھی اس کی اشاعت ادبی خدمت کے علاوہ ایک ایسا قومی فرض تھی ، جسے ادا کیے بغیر سبک دوشی ممکن نہ تھی ۔ مجھے اپنی سعادت پر بجا طور پر فخر ہے کہ یہ کام میرے ہی ہاتھوں انجام پا رہا ہے ۔ اردو زبان اپنے سرمایۂ ادب میں

اس گراں مایہ اضافے پر جس قدر ناز کرے کم ہے ۔،،۱
بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے 'سرنامہ' کے عنوان سے اس مجموعے کا تعارف کرایا ہے ۔ لکھتے ہیں :

''آفاق حسین آفاق صاحب میرن صاحب کے نواسے ہیں ۔ 'اردوئے معلیٰ' جن کی نظر سے گذری ہے وہ میرن صاحب سے بخوبی واقف ہیں۔ میرن صاحب کو مرزا صاحب سے عقیدت نہیں ، عشق تھا اور مرزا صاحب بھی ان کو بہت عزیز رکھتے تھے ۔ ان کے پاس مرزا صاحب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے بہت سے خط تھے ۔ ان میں سے چند انھوں نے مجھے بھی عنایت فرمائے تھے ۔ آفاق صاحب کو مرزا صاحب کے خطوں کا ایک مجموعہ جو اب تک شائع نہیں ہوا ، ترکے میں ملا ہے ۔ یہ سب خط مرزا صاحب کے قدر شناس اور عزیز دوست منشی نبی بخش حقیر کے نام ہیں ۔ مرزا صاحب منشی نبی بخش حقیر کی سخن فہمی اور ذوق کے بہت قائل تھے اور ان سے انھیں خاص تعلق اور خلوص تھا ، جو ان رقعات کے لفظ لفظ سے نمایاں ہے ۔ اس بنا پر یہ خطوط بہت بیش قدر ہیں ۔

آفاق صاحب نے صرف خطوط کی اشاعت پر بس نہیں کی بلکہ مرزا صاحب کے بہت سے نجی اور معاشرتی حالات ، قلعہ سے تعلق اور روزمرہ کی زندگی کی بہت سی باتیں بھی اس مجموعے میں شامل کر دی ہیں ۔ ایک اور اچھا کام یہ کیا کہ ان خطوں میں نیز دوسرے خطوں میں جن اصحاب اور مقامات کے نام آئے ہیں ، ان کے حالات بھی تلاش کر کے لکھ دیے ہیں ۔ بعض خطوں کے سنہ اور تاریخ کی تصحیح بھی کر دی ہے ۔

مرزا غالب پر بہت سی کتابیں اور مضامین لکھے گئے اور ابھی اور بہت کچھ لکھا جائے گا ۔ یہ مجموعہ جسے آفاق صاحب نے 'نادرات غالب' کا نام دیا ہے ، اس موضوع میں قابل قدر اضافہ ہے ۔ اس میں بہت سی ایسی باتیں ملتی ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں

۱۔ آفاق حسین آفاق دہلوی : تمہید نادرات غالب : صفحہ ۵

ملیں گی ۔ آفاق صاحب نے نہ صرف بہت سے ان غیر مطبوعہ نادر رقعات کو ضائع ہونے سے بچا لیا جو منشی نبی بخش حقیر کے نام ہیں ۔ بلکہ اپنی طرف سے تلاش و تحقیق کے بعد ایسے حواشی وغیرہ کا اضافہ کیا ہے جن میں بہت سی کار آمد معلومات ہیں ۔''[۱]

(۸)

خطوط غالب

غالب کے خطوط کا مجموعہ مولانا غلام رسول مہر نے مرتب کیا ہے ۔ اور اس مجموعے میں وہ تمام خطوط آ گئے ہیں جن کا مرتب کو سراغ مل سکا ہے ۔ اس میں صرف وہ خطوط نہیں ہیں جو 'مکاتیب غالب' اور 'نادرات غالب' میں شائع ہو چکے ہیں ۔

اس مجموعے میں خطوط کو تاریخی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے ۔ جن خطوط پر تاریخیں نہیں تھیں ، ان کے بارے میں داخلی شہادتوں کی بنا پر فیصلہ کیا گیا ہے کہ وہ کس زمانے کے ہوں گے ۔

مولانا مہر نے اس مجموعے میں ان لوگوں کے حالات بھی بڑی محنت سے مرتب کر کے درج کر دیے ہیں ، جن کو غالب نے یہ خطوط لکھے تھے۔

ابتدا میں تعارف کے عنوان سے مولانا مہر نے اس مجموعے کی خصوصیات اس طرح بیان کی ہیں :

''اس مجموعے میں میرزا کے وہ تمام خطوط آ گئے ہیں، جن کا مرتب کو سراغ مل سکا ۔ صرف دو مجموعوں کو چھوڑا گیا ۔ ایک مکاتیب رام پور کا مجموعہ ، دوسرا منشی نبی بخش حقیر کے نام خطوط کا مجموعہ ، جو 'نادرات غالب' کے نام سے چھپا ۔

تمام خطوط تاریخ وار مرتب کر دیے گئے ہیں ۔ جن خطوط پر تاریخیں ثبت نہیں تھیں ، ان کے بارے میں داخلی شہادتوں کی بنا پر قیاساً فیصلہ کیا گیا کہ وہ کس زمانے کے ہوں گے ۔ اغلب ہے اکثر قیاس درست ہوں ۔ اگر کہیں لغزش ہوئی تو اسے مرتب کی سعیٔ نارسا کا نتیجہ سمجھنا چاہیے ۔

۱۔ ڈاکٹر عبدالحق : سرنامہ نادرات غالب : صفحہ ۳-۴

تمام مکتوب الیہم کے حالات لکھ دیے گئے ہیں تا کہ مرزا کے ساتھ ان کے تعلق کی حیثیت واضح ہو جائے اور خطوط ملاحظہ فرماتے وقت وہ حیثیت سامنے رہے۔

خطوط میں جا بجا مقامی اور تاریخی تلمیحات ہیں، جن کی حقیقت مکتوب الیہم سے مخفی نہ تھی۔ لیکن عام خوانندگان کرام تشریح کے بغیر انہیں سمجھ نہیں سکتے۔ اور خطوط سے بقدر طلب و ذوق لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ مرتب نے حتی الامکان تمام تلمیحات کی تشریح کر دی ہے۔

ابتدا میں مقدمہ لکھا ہے، جس میں انشائے غالب کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ ان خصوصیات کو مد نظر رکھتے ہوئے خطوط کا مطالعہ یقیناً زیادہ دلچسپی کا باعث ہو گا۔"[۱]

شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے اس مجموعے کے کئی اڈیشن شائع کئے ہیں، آخری اڈیشن چوتھی بار ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا ہے۔

(۹)

نکات و رقعات غالب

یہ مختصر سا مجموعہ میجر فلر ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم پنجاب نے مرتب کروایا اور فروری ۱۸۶۷ میں محمد سعادت علی خاں صاحب نے مطبع سراجی دہلی میں چھپواکر شائع کیا تھا۔ اس کے سرورق پر یہ عبارت ملتی ہے:

'حسب الحکم میجر فلر صاحب بہادر ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن ممالکِ پنجاب

یہ دو رسالے نامی بہ نکات غالب و رقعات غالب

تصنیف جناب اسد اللہ خاں

محمد سعادت علی خاں کے مطبع سراجی میں طبع ہوئے

اس میں غالب کے دو مختصر رسالے شامل ہیں۔ ایک تو 'نکات غالب' اس رسالے میں غالب نے فارسی زبان کے قواعد پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ رسالہ اُردو زبان میں ہے۔ دوسرے رسالے میں غالب کے چند فارسی خطوط

۱۔ مولانا غلام رسول مہر: تعارف خطوط غالب: صفحہ ۷

ہیں جو اُنھوں نے 'پنج آہنگ' سے انتخاب کیے ہیں ۔
'نکات و رقعات غالب' کو غالب کے شاگرد ماسٹر پیارے لال آشوب نے مرتب کیا ہے ۔

(۱۰)

قادر نامہ

اس مختصر سی کتاب کو غالب نے عارف کے بیٹوں باقر علی خاں اور حسین علی خاں کے لیے مرتب کیا تھا۔ یہ رسالہ 'آمدنامہ' اور 'خالق باری' کے طرز پر لکھا گیا ہے ۔

'قادر نامہ' کا پہلا اڈیشن مجلس پرس دہلی سے ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ع) میں شائع ہوا تھا ۔ اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں راقم نے دیکھا ہے ۔

فارسی

(۱۱)

کلیات غالب

غالب کے فارسی دیوان کا پہلا اڈیشن ۱۸۴۵ع میں مطبع دارالسلام دہلی میں چھپا تھا ۔ اس کے بعد کلیات مکمل صورت میں مطبع نول کشور سے ۱۸۶۳ع میں شائع ہوا ۔ اس کی تفصیل مالک رام نے اپنے ایک مضمون میں پیش کی ہے لکھتے ہیں :

''ہم یہ خیال کرنے میں حق بہ جانب ہیں کہ دیوان ستمبر ، نومبر ۱۸۳۵ع سہ ماہی میں مرتب ہوا - دوسری بات یہ کہ اس کا نام 'میخانۂ آرزو سرانجام' رکھا گیا تھا ۔ بد قسمتی سے تا حال اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہو سکا ۔ اس وقت تک دیوان کا جو سب سے پرانا مخطوطہ ملا ہے ، خدا بخش اورنٹیل لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہے ۔ اس کی کتابت کی تاریخ ۱۱ ربیع الآخر ۱۲۵۴ھ (۴ جولائی ۱۸۳۸ع) ہے اوراس کے کاتب غالب کے مشہور دوست لالہ چھج مل کھتری ہیں ۔ ممکن ہے کہ یہ مخطوطہ اصل نسخہ سے 'مے خانہ آرزو سر انجام' ہی کی نقل ہو۔ بہر حال یہ خطی نسخہ بھی غالب کا دیکھا ہوا ہے اور اس کے حاشیے میں بعض چیزیں خود ان کے قلم سے اضافہ ہوئی ہیں ۔

فارسی دیوان پہلی مرتبہ ۱۸۴۵ع میں چھپا ۔ جیسا کہ اس کے صفحۂ اول پر تحریر ہے ۔ یہ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کی تصحیح و ترتیب ہے ۔ مطبع دارالسلام حوض قاضی دہلی میں طبع ہوا تھا ۔ یہ بڑے سائیز کے پندرہ سطری مسطر پر لکھا گیا ہے ۔ کاتب خوش خط اور بڑی حد تک صحیح نویس ہے غلطی کم کرتا ہے ۔ اس کے آغاز اور آخر میں خودغالب کا لکھا ہوا دیباچہ اور تقریظ ہے

جو اس وقت بھی دیوان میں ملتی اور پنج آہنگ کے آہنگ چہارم میں بھی شامل ہے۔ دیوان میں نظم و نثر ۵۰٦ صفحات پر محیط ہے۔"[1]

دیوان کا دوسرا اڈیشن بہت مدت بعد ۱۸٦۳ء میں شائع ہوا۔ یہ ۵٦۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۱۲)

ابر گہربار

غالب کی یہ ناتمام مثنوی کلیات فارسی میں شامل تھی۔ لیکن ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۸٦۳ء میر حکیم غلام رضا خاں کے اصرار پر علیحدہ چھپوائی۔ یہ مثنوی اکمل المطابع دہلی میں مہر فخرالدین کے اہتمام سے چھپی۔ اس کے ساتھ انھوں نے دو قصیدے، تین قطعے اور دس رباعیاں بھی شامل کر دیں۔ بعد میں ان کو 'سبد چین' میں بھی شامل کر لیا گیا۔[2]

(۱۳)

سبد چین

'سبد چین' میں غالب کا متفرق فارسی کلام ہے۔ یہ مجموعہ سب سے پہلے ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸٦۷ء میں محمد مرزا خاں کے مطبع محمدی، کوچہ' چیلاں دہلی میں چھپ کر شائع ہوئی۔

۱۹۳۸ء میں مالک رام صاحب نے اس کا نیا اڈیشن تیار کیا جو جیّد برقی پریس دہلی میں چھپا اور مکتبہ' جامع دہلی کی طرف سے شائع ہوا۔ مالک رام صاحب لکھتے ہیں: "پہلے اڈیشن میں ترتیب کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ اس میں یہ نقص دور کر دیا گیا ہے۔ نیز مرزا کا بہت سا

۱- مالک رام: غالب کی فارسی تصانیف، افکار غالب نمبر ۱۹٦٦ء صفحہ ۱۳۰۔

۲- غلام رسول مہر: غالب: صفحہ ۳۱۲

کلام جو ادھر ادھر منتشر حالت میں پڑا تھا وہ بھی اکٹھا کر کے اس میں شامل کر دیا گیا ہے ۔ اس اڈیشن میں ۸۰۷ شعر ہیں ۔[1]

(۱۴)

پنج آہنگ

'پنج آہنگ' غالب کی فارسی نثر کا مجموعہ ہے ۔ اس کا پہلا اڈیشن مطبع سلطانی دہلی میں ۱۸۴۹ ع میں حکیم غلام نجف خاں کے اہتمام سے چھپا ۔ یہ اڈیشن ۹۳ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس کا دوسرا اڈیشن اپریل ۱۸۵۳ع میں منشی نور الدین احمد لکھنوی کے مطبع دارالسلام دہلی میں چھپ کر تیار ہوا ۔ اس اڈیشن میں ۳۴۴ صفحات ہیں ۔ پہلے اڈیشن کے مقابلے میں اس اڈیشن میں دو نثری تحریریں زیادہ ہیں ۔ ایک تو دیباچہ' دیوان ریختہ نواب حسام الدین احمد خاں دوسرے دیباچہ' تذکرہ الموسوم بہ طلسم راز فراہم آوردۂ میر مہدی—

غالب کی زندگی میں 'پنج آہنگ' کے یہی دو اڈیشن شائع ہوئے۔[2]

(۱۵)

مہر نیم روز

غالب نے 'مہر نیم روز' ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ع) میں مکمل کی اور اس کا پہلا اڈیشن مرزا فتح الملک غلام فخرالدین عرف مرزا فخرو کے مطبع فخر المطابع دہلی سے شائع ہوا ۔ یہ اڈیشن بڑے سائز کے ۱۱۶ صفحات پر مشتمل تھا ۔

اس کتاب میں غالب نے خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھی ہے۔۱۸۵۰ع میں بہادر شاہ ظفر نے یہ کام ان کے سپرد کیا تھا اور اس لیے وہ قلعے میں باقاعدہ ملازم ہو گئے تھے ۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ 'پرتوستان' کے نام سے پوری تاریخ دو حصوں میں لکھیں گے ۔ پہلے حصے 'مہرنیم روز' میں امیر تیمور سے لے کر ہمایوں تک کے حالات و واقعات کی تفصیل ہوگی۔

۱۔ مالک رام : ذکر غالب : صفحہ ۱۲۷

۲۔ مالک رام : غالب کی فارسی کی تحریریں ، " افکار " فروری ۱۹۶۶ ع صفحہ ۱۳۳

اور دوسرے حصے 'ماہ نیم ماہ' میں جلال‌الدین اکبر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کے تاریخی حالات و واقعات کا بیان ہوگا—بعد میں اس منصوبے میں شاہ وقت کے حکم سے یہ تبدیلی ہوئی کہ بجائے امیر تیمور کے آغاز آفرینش سے اس کتاب کو شروع کیا گیا تھا۔ واقعات کو فراہم کرنے کا کام حکیم احسن اللہ خاں کے سپرد کیا گیا تھا۔ غالب ان واقعات کو فارسی کے قالب میں ڈھالنے پر مامور تھے۔ غالب نے پہلا حصہ 'مہر نیم روز' تو مکمل کر لیا، اور وہ چھپ کر شائع بھی ہوگیا لیکن 'ماہ نیم ماہ' کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ کیوں کہ ۱۸۵۷ء میں غدر پڑا، اور وہ بساط الٹ گئی۔ بہادر شاہ اور ان کے خاندان پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹے۔ چنانچہ 'ماہ نیم ماہ' مکمل نہ ہو سکی۔

چونکہ 'مہر نیم روز' میں 'ماہ نیم ماہ' کا ذکر تھا۔ اس لیے لوگ اس کے بارے میں دریافت کرتے رہتے تھے۔

غالب لکھتے ہیں:

"اکثر صاحب اطراف و جوانب سے 'ماہ نیم ماہ' کے بھیجنے کا حکم بھیجتے ہیں اور میں جی میں کہتا ہوں کہ جب 'مہر نیم روز' کی عبارت نہ سمجھے تو 'ماہ نیم ماہ' کو لے کر کیا کریں گے۔ صاحب! 'مہر نیم روز' کے دیباچے میں میں نے لکھ دیا ہے کہ اس کتاب کا نام 'پرتوستان' ہے اور اس کے دو مجلد ہیں۔ پہلی جلد میں ابتداء خلقت عالم سے ہمایوں بادشاہ تک کی سلطنت کا بیان، پہلے حصے کا نام 'مہر نیم روز' اور دوسرے حصے کا نام 'ماہ نیم ماہ'۔ پہلا حصہ چھاپا گیا۔ جا بجا بھیجا گیا قصہ تھا جلال الدین اکبر کے حالات لکھنے کا کہ امیر تمر تک کا نام و نشان مٹ گیا۔"[۱]

(۱۶)

دستنبو

'دستنبو' کا پہلا اڈیشن منشی ہر گوپال تفتہ، منشی نبی بخش حقیر، مرزا حاتم علی بیگ مہر اور منشی شیو نرائن آرام، کی نگرانی میں مطبع

۱- بحوالہ مولانا مہر: غالب: صفحہ ۳۱۵

مفید خلائق آگرہ میں نومبر ۱۸۵۸ ع میں چھپا ۔ دوسرا اڈیشن ۱۸۶۵ ع میں لٹریری سوسائٹی روہیلکھنڈ بریلی کے مطبع میں قاضی عبد الجمیل جنوں کے اہتمام سے شائع ہوا ۔ تیسرا اڈیشن اسی مطبع سے ۱۸۷۱ع میں چھپ کر شائع ہوا ۔

غالب نے اس کتاب میں اپنے حالات اور ۱۸۵۷ ع کے ہنگامے کی تفصیل لکھی ہے ۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ ع سے انھوں نے اس کو لکھنا شروع کیا اور ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ کو ختم کیا ۔

ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں :

''میں نے آغاز یاز دہم مئی ۱۸۵۷ ع سے ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ ع تک روداد سمہر اور اپنی سرگزشت یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسی قدیم میں لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے ۔ جو نظم اس میں درج ہے وہ بھی بے آمیزش عربی ہے ۔ ہاں اشخاص کے نام نہیں بدلے وہ عربی ، انگریزی ، ہندی ، جو ہیں لکھ دیے ہیں ۔''[۱]

'دستنبو' کا فارسی متن اور اس کا ترجمہ رسالہ 'اردوئے معلیٰ' دہلی (شمارہ ۲-۳) میں بھی شائع ہوا ہے ۔

(۱۷)

کلیات نثر غالب

''پنج آہنگ'' کا دوسرا اڈیشن ۱۹۵۳ع میں شائع ہوا تھا 'مہر نیم روز' ۱۸۵۴ع میں چھپی تھی ، اور 'دستنبو' کا دوسرا اڈیشن ۱۸۶۵ع میں نکلا تھا ۔ یہ کتابیں جلد ہی نایاب ہو گئیں ۔ اس لیے منشی لال کشور نے جنوری ۱۸۶۸ع میں ان تینوں کو 'کلیات نثر غالب' کے نام سے شائع کر دیا ۔

۱- غالب : اردوئے معلیٰ : صفحہ ۲۰

(۱۸)

قاطع برہان

غالب نے 'قاطع برہان' کو ۱۲۷٦ھ مطابق ۱۸٦۰ء میں مکمل کیا اور یہ کتاب ۱۲۷۸ھ (۱۸٦۲ء) میں مطبع نول کشور میں چھپی ۔ ایک روپیہ اس کی قیمت مقرر ہوئی ۔ اس سے پہلے اڈیشن میں ۹۸ صفحات تھے۔ آخر میں غالب کی لکھی ہوئی تقریظ بھی شامل تھی ۔ اس کی کتابت مشہور شاعر امیر اللہ تسلیم نے کی تھی ۔ ان کی تاریخ بھی اس اڈیشن کے آخر میں درج ہے ۔

یہ کتاب غالب نے غدر کے بعد لکھی ۔ اس زمانے میں ہر طرف خاموشی اور اداسی کا عالم تھا ۔ اس زمانے میں انھوں نے وقت گزارنے کے لیے محمدحسین تبریزی کی کتاب 'برہان قاطع' کا مطالعہ شروع کیا ۔ اس کتاب میں انہیں بے شمار غلطیاں نظر آئیں ۔ چنانچہ 'قاطع برہان' کے نام سے ان اغلاط کو شائع کیا ۔

صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں :

''اس درماندگی کے دنوں میں چھاپے کی 'برہان قاطع' میرے پاس تھی ۔ اس کو میں دیکھا کرتا تھا ۔ ہزارہا لغت غلط ، ہزارہا بیان لغو ، عبارت پوچ ، اشارات پا در ہوا ۔ میں نے سو دو سو لغت کے اغلاط لکھ کر ایک مجموعہ بنایا ہے اور 'قاطع برہان' اس کا نام رکھا ہے ۔ چھپوانے کا مقدور نہ تھا ۔ مسودہ کاتب سے صاف کروا لیا ہے ۔ اگر کہو تو بہ سبیل مستعار بھیج دوں ۔ تم اور چودھری صاحب اور جو اور سخن شناس اور منصف ہوں اس کو دیکھیں اور پھر میری کتاب میرے پاس پہنچ جائے ۔''

(۱۹)

درفش کاویانی

'درفش کاویانی' در اصل 'قاطع برہان' کا دوسرا اڈیشن ہے جس کو غالب نے کچھ ترمیم اور اضافے کے ساتھ ۱۸٦۵ء میں اکمل المطابع دہلی میں چھپوا کر خود شائع کیا ۔ اس اڈیشن میں کل ۱۵٦ صفحات تھے ۔

'قاطع برہان' کی اشاعت کے بعد غالب کی مخالفت کا ایک طوفان اُمڈا ور مندرجہ ذیل رسالے ان کے جواب میں لکھے گئے :

۱- 'محرق قاطع' مولفہ مولوی سادات علی - یہ مطبوعہ ۱۸۶۳ء مطبع احمدی شاہدرہ دہلی صفحات ۹۶ -

۲- 'ساطع برہان' مولفہ مرزا رحیم بیگ -

۳- 'قاطع القاطع' مولفہ مولوی امین الدین پٹیالوی -

۴- 'موئد برہان' مولوی آغا احمد علی -

غالب اور اُن کے احباب نے ان کے جواب میں مندرجہ ذیل رسالے لکھے :

۱- 'دافع ہذیان' مولفہ نجف علی مطبوعہ اکمل المطابع دہلی ۱۸۶۵ء ۲۸ صفحات -

۲- 'لطائف غیبی' ۴۴ صفحات کا یہ رسالہ در حقیقت غالب نے خود لکھا تھا لیکن اپنے دوست سیف الحق میاں داد خاں سیاح کے نام سے شائع کیا تھا -

۳- 'سوالات عبدالکریم' غالب کا لکھا ہوا رسالہ ضخامت کل ۸ صفحے -

۴- 'نامہ غالب' یہ خط غالب نے میرزا رحیم بیگ مصنف 'ساطع برہان' کے نام لکھا تھا - اگست ۱۸۶۵ء میں چھپا - 'عود ہندی' میں بھی شامل ہے -

۵- 'تیغ تیز' غالب کا لکھا ہوا ۳۲ صفحے کا یہ رسالہ اکمل المطابع دہلی میں چھپا - اس میں مولوی احمد علی کے اعتراضات کے جواب ہیں - یہ رسالہ ۱۸۶۷ء میں شائع ہوا -

(۲۰)

گل رعنا

'گل رعنا' غالب کے فارسی اور اُردو کلام کا انتخاب ہے - یہ انتخاب غالب نے کلکتہ کے دوران قیام میں اپنے دوست مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر کیا تھا -

---

۱- مہر : غالب : صفحہ ۳۲۸ - ۳۲۹

مالک رام صاحب اس کے متعلق لکھتے ہیں :

''مولوی سراج الدین احمد کلکتہ کے ہفتہ وار فارسی اخبار 'آئینۂ سکندر' کے اڈیٹر بھی تھے۔ وہ مرزا کے کلام کے بہت قدر دان تھے ۔ چنانچہ انھوں نے فرمائش کی کہ آپ اپنے اُردو اور فارسی کلام کا انتخاب میرے لیے تیار کر دیجیے۔ اس پر مرزا نے وہیں کلکتہ میں ۲۹-۱۸۲۸ع میں 'گل رعنا' کے نام سے ایک انتخاب مرتب کیا ۔ بد قسمتی سے یہ کتاب ناپید ہوگئی ۔ البتہ غالب نے اس کے آغاز و انجام کے لیے جو فارسی نثر لکھی تھی ، وہ محفوظ رہ گئیں اور یہ بھی اس لیے کہ یہ 'پنج آہنگ' میں شامل کر لی گئی تھیں ۔ اس انتخاب کے چند اوراق مولانا حسرت موہانی مرحوم کے پاس تھے جو اُن کی وفات کے بعد اُن کے قیمتی کتب خانے کے ساتھ ضائع ہو گئے ۔ خوش قسمتی دیکھیے کہ ۱۹۵۷ع میں میرے ایک مہربان دوست نے اچانک اس کا ایک مکمل نسخہ مجھے تحفہ میں دیا ۔ میرے علم میں یہ اس کتاب کا واحد نسخہ ہے ۔''[۱]

مالک رام صاحب نے اس کو دلی سے شائع بھی کر دیا ہے ۔ 'گل رعنا' کا ایک قیمتی نسخہ حکیم محمد نبی خاں صاحب کے کتب خانے میں بھی ہے ۔

(۲۱)

انتخاب غالب

'انتخاب غالب' غالب کے فارسی اور اردو کلام کا انتخاب ہے جو انھوں نے نواب خلد آشیاں کی فرمائش پر ۱۸۶۶ع میں مرتب کیا ۔ اس انتخاب کو امتیاز خاں صاحب عرشی نے مقدمے اور حواشی کے ساتھ مطبع قیّمہ بمبئی میں چھپوا کر ۱۹۴۲ع میں شائع کیا ۔

بشیر حسین زیدی صاحب 'تقریب' کے عنوان سے اس انتخاب کے بارے میں لکھتے ہیں :

''نواب خلد آشیاں نے فارسی و اردو کے چیدہ اشعار کی ایک بیاض مرتب فرمانے کے سلسلے میں مرزا اسد اللہ خاں غالب سے فرمائش کی کہ اپنے اردو اور فارسی کلام کا انتخاب ارسال کر دیجیے تاکہ اسے شامل بیاض کر لیا جائے ۔ ستمبر ۱۹۶۶ع میں ، مرزا

۱- مالک رام : غالب کی فارسی تصانیف 'افکار غالب' نمبر ۶۶ صفحہ ۱۵۰

صاحب نے اس ارشاد کی تعمیل کی اور یکے بعد دیگرے کلیاتِ اردو و فارسی کے خود کردہ انتخابات جدا گانہ کتابی صورت میں نقل کرا کے ، نواب خلد آشیاں کے حضور میں ڈاک کے توسط سے پیش کیے -

سرکار کے ملاحظے کے بعد ، یہ دونوں نسخے کتاب خانے کو بھیج دیے گئے - اس عہد کے منتظمین کتب خانہ نے ، صرف فارسی انتخاب کو شعبہء دوادین میں داخل ہونے کا شرف عطا کیا ، اور رسم زمانہ کے مطابق انتخاب اردو کو ناقابل التفات خیال کر کے ، کتاب خانے کے 'ردی گھر' میں گم‌نامی کی گھری نیند سلا کر مطمئن ہو گئے - حسن اتفاق سے مولوی امتیاز علی خاں عرشی ، ناظم کتاب خانہ نے 'ردی گھر' کی متاع کاسد کا جائزہ لیتے ہوئے ، دوسرے نوادرات کے ساتھ اردو انتخاب بھی برآمد کر لیا ، اور میرزا صاحب کی نھکی ہوئی زندگی کا یہ کارنامہ ، ملک کے اربابِ ذوق کے لیے محفوظ ہو گیا - "[۱]

عرشی صاحب نے اس انتخاب کی تفصیل دیباچے میں لکھی ہے اور اُس کی قدر و قیمت کی وضاحت کی ہے - اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں :

"مرزا صاحب نے یہ انتخاب چند روز کے اندر مرتب کیا تھا - عجلت میں یوں بھی ذہن کی تمام قوتیں کامل اشتراک و ہم آہنگی سے کام نہیں کر سکتیں - میرزا صاحب کے یہاں اس پر مستزاد یہ تھا کہ آئے دن کی بیماریوں سے ان کے قوائے ظاہر و باطن بے حد کمزور و ناتواں ہو گئے تھے - تنگ دستی اور پریشاں روزگاری نے طرح طرح کی دماغی الجھنوں میں الگ گرفتار کر دیا تھا - اب انھیں شعر و سخن کی جگہ کافور و کفن کی پڑی رہتی تھی - اور صرف موت کی آس پر جی رہے تھے - ان حالات میں مستبعد نہیں کہ اچھے برے میں فرق و تمیز کرتے وقت ان سے اچھے شعر نظر انداز ہوگئے ہوں ، اور دو چار معمولی اشعار کو کسی وقتی جذبے کے تحت چن لیا ہو -

---

۱- انتخاب غالب 'تقریب' : صفحہ ے

بہر حال یہ انتخاب بے حد قابل قدر اور غالب سے متعلق ادب میں ایسا نایاب اضافہ ہے جس کی قدر و قیمت میں برابر ترقی ہوتی رہے گی ۔"[1]

(۲۲)

مثنوی دعاء صباح

'مثنوی دعاء صباح' اس دعا کا ترجمہ ہے جو حضرت علی سے منسوب ہے ۔ غالب نے اس دعا کا منظوم فارسی ترجمہ اپنے بھانجے عباس بیگ عشر کی فرمائش پر کیا ۔

مالک رام لکھتے ہیں :

"یہ مختصر سا رسالہ ہے ۔ اوپر جلی قلم سے عربی عبارت اور اس کے نیچے کسی اور کا کیا ہوا فارسی نثری ترجمہ ہے ۔ پھر اس کے نیچے غالب کا منظوم ترجمہ ہے ۔ یہ مثنوی مرزا کی زندگی ہی میں مطبع نول کشور میں چھپی تھی لیکن اس پہلے اڈیشن کے نسخے نایاب ہیں۔ میرے علم میں اس کا صرف ایک نسخہ ہے ۔ اس میں کل ۲۶ صفحے ہیں ۔ 'دعاء صباح' کے ۱۲۳ شعر پہلے ۲۴ صفحوں میں آ گئے ہیں ۔ صفحہ ۲۴ ، ۲۵ پر سات شعر ایک اور دعا کے ہیں جو حضرت زین العابدین سے منسوب ہے اور جس سے متعلق روایت ہے کہ اسے 'دعاء صباح' کے بعد سجدے میں پڑھنا چاہیے ۔"[2]

(۲۳)

متفرقات غالب

'متفرقات غالب' میں پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب نے غالب کے متفرق کلام کو ایک نادر و نایاب بیاض کو سامنے رکھ کر مرتب کیا اور یہ کتاب ۱۹۴۷ میں رام پور کے ہندوستان پریس میں چھپ کر شائع ہوئی ۔

یہ مجموعہ غالب کے فارسی خطوط ، مثنوی باد مخالف اور ایک اور

۱- عرشی : دیباچہ انتخاب غالب

۲- مالک رام : غالب کی فارسی تصانیف : 'افکار' غالب نمبر : صفحہ ۱۲۲

مثنوی پر (جو ۱۸۵۳ ع) میں تشیع کے الزام سے برأت کے اظہار کے لیے لکھی گئی تھی ، مشتمل ہے ۔

مسعود صاحب 'مقدمہ' میں لکھتے ہیں :

''مرزا غالب کے غیر مطبوعہ مکتوبات و منظومات کا یہ مجموعہ جو 'متفرقات غالب' کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے ، غالب کے قدر دانوں کے لیے خاصی دلچسپی کا باعث ہو گا ۔ اور غالب کے متعلق تحقیق کرنے والوں کے لیے کچھ نیا سواد فراہم کر دے گا ۔ اس مجموعے میں جو چیزیں شامل ہیں ، ان کے بارے میں کچھ ضروری باتیں ذیل میں بیان کی جاتی ہیں :

میرے کتب خانے میں ایک بیاض ہے جس میں مرزا غالب کے اڑتالیس (۴۸) پارسی خط ، دو فارسی قطعے ، ایک فارسی مثنوی ، اور ایک اردو غزل بھی شامل ہے ۔ یہ کل خط ایسے لوگوں کے نام ہیں جو کلکتہ میں مقیم تھے ۔ اور یہ سب نظمیں ایسی ہیں جو غالب نے کلکتے کے قیام کے زمانے میں کہی تھیں ۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کسی کلکتہ کے رہنے والے ہی نے یہ تمام چیزیں اس بیاض میں جمع کی ہیں ۔ ان میں سے چند نظمیں اور چند خطوں کے اقتباس اپنے ایک مضمون کے سلسلے میں رسالہ' 'الناظر' لکھنؤ کے دسمبر ۱۹۳۳ع کے پرچے میں شائع کر دیے تھے'[1] ۔''

'متفرقات غالب' کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ پہلے حصے میں غالب کے غیر مطبوعہ خط ہیں اور دوسرے حصے میں غیر مطبوعہ منظومات ۔ خط مولوی سراج الدین احمد ، مرزا احمد بیگ خاں ، ابوالقاسم خاں ادارۂ جام جہاں نما اور شیخ ناسخ کے نام ہیں ۔ منظومات کے حصے میں ایک غزل در توصیف میرزا احمد بیگ خاں طپاں و مرزا ابو القاسم خاں قاسم ، قطعۂ قاسم بہ غالب ، قطعۂ غالب بہ قاسم ، قطعہ حذم در جواب قطعۂ قاسم ، مثنوی باد مخالف ، ایک سلام اور ایک مثنوی شامل ہیں ۔ آخر میں دو ضمیمے ہیں ، ضمیمہ الف میں رقعۂ ناطق بنام غالب اور ضمیمہ ب میں جواب مثنوی غالب کو درج کیا گیا ہے ۔

۱- پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب : مقدمہ متفرقات غالب : صفحہ ۱-۲

مسعود صاحب نے 'متفرقات غالب' پر ایک مفصل مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں غالب کی ان غیر مطبوعہ تحریروں کی اہمیت پر تفصیلی بحث کی ہے۔

(۲۴)

باغ دودر

'باغ دودر' غالب کی فارسی نظم و نثر کا مجموعہ ہے۔ اس کا واحد قلمی نسخہ سید وزیرالحسن صاحب عابدی کے پاس محفوظ تھا۔ اس مجموعے کو عابدی صاحب نے پہلے اورنٹیل کالج میگزین میں چھاپا اور اب اس کو کتابی صورت میں بھی حساب دیا گیا ہے۔ لیکن یہ کتاب باقاعدگی کے ساتھ ۱۹۷۰ ع میں اورنٹیل کالج کے جشن صد سالہ کے موقع پر شائع کی جائے گی۔

عابدی صاحب دیباچہ' اشاعت ثانی میں لکھتے ہیں :

''اس سے پہلے 'باغ دودر' راقم نے مجلہ' دانش کدۂ خاور شناسی' دانش گاہ (یونیورسٹی اورنٹیل کالج میگزین) میں دو قسطوں میں شائع کی تھی۔ پہلی قسط میں کتاب کا حصہ' نظم ۱۹۶۰ میلادی مسیحی میں اور دوسری قسط میں حصہ' نثر ۱۹۶۱ میں طبع ہوا تھا ، لیکن تحقیق نامہ' باغ دو درجو تعلیقات پر مشتمل ہے۔ اور تیسری قسط کے طور پر چھپنا تھا ، ابھی مطبع کو نہیں دیا گیا تھا کہ کالج کی طرف سے فیصلہ ہوا کہ 'باغ دودر' ادارے کے جشن صد سالہ میں تاسیس (بسال ۱۹۷۰م) کی یاد گار مطبوعات کے سلسلے میں مستقل کتاب کے طور پر شائع کی جائے۔ چنانچہ تحقیق نامے کو تیسری قسط کے طور پر چھاپنے کے بجائے کتاب کی اس دوسری اشاعت میں شامل کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔''۱

'باغ دودر' موجودہ صورت میں ۱۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اصل کتاب ۱۹۸ صفحے پر ختم ہو جاتی ہے۔ بقیہ صفحات میں عابدی صاحب کے

۱- سید وزیرالحسن عابدی : دیباچہ' باغ دودر

لکھی ہوئے حواشی ہیں۔ صفحہ ۲۹۸ پر خاتمہ' کُتب کےتحت مندرجہ' ذیل عبارت ملتی ہے :

''آفریدگار مہر و ماہ را سپاس کہ درس زمان فرخندہ تواماں کتاب فیض انتساب سبد حین از تصنیف خان والا شان شہنشاہ قلمرو سخن گستری ، یکہ تاز عرصہ' معنی پروری 'علامہ عصر' بانی مبانی نظم و نثر رشک عرفی و فخر طالب نجم الدولہ دبیرالملک اسد اللہ خاں غالب رحمۃ اللہ علیہ حسب فرمائش منشی ہیرا سنگھ صاحب کھتری ساکن دہلی واقع کوچہ گندی گلی کہ یکے از شاگردان حضرت مصنف اند بخط بدخط احقرالعباد عنایت علی بتاریخ ہفتم جولائی ۱۸۶۰ع روز پنجشنبہ صورت اختتام پزیرفت۔''[1]

اور شروع میں مندرجہ' ذیل عبارت ہے :

دو در دار و این باغ آراستہ
در و بند از ہر دو برخاستہ

''بنامیزد سبد حین میوۂ را گویند کہ بایان موسم برشاخسار ماند و چوں آں را بچینند شاخسار سراسر بے بار ماند۔ ہر آئینہ آنچہ ہم از انطباع کلیات فارسی گفتہ شد با آنچہ ہنگام فراہم آوردن نگارش دست بہم نہ دادہ بود اینک در اوراق جداگانہ ضبط کردہ شد و ایں را سبد چین نامیدہ آمد۔ دانم کہ از فراہم آوردن دہ ہزار بیت کلیات چہ کشود کہ ازیں ابیات کہ در شمار بہ ہزار نتواند رسید خواہد کشود۔ ناسور کہن را از تراوش گریز نیست ، تا باید زیست سخن باید گفت۔ ناچار تا زندہ ام ایں مجموعہ' مقالات پریشاں انتہا نہ خواہد پزیرفت۔ ضیانکہ در علم و عمل نا تمام می گذرم۔ ایں نیز ناتمام خواہد ماند چوں زنجیرۂ نظم کراں نزیرفت ، نا گاہ یاراں نثری چند آوردند۔ آں را نیز درس مجموعہ گنجانیدیم و باغ دودر نامیدیم۔ از آں جا کہ سبد باغ دودر یک ہزار و دو صد و ہشتاد و سہ عدد دارد۔ و از روئے حسن اتفاق با آغاز نگارش صحیفہ مطابق اُفتاد ، ایں نام لطفے دیگر دارد۔''[2]

۱- باغ دودر : صفحہ ۱۹۸
۲- ایضاً : صفحہ ۶

'باغ دودر' کا پہلا حصہ منظومات پر مشتمل ہے ۔ اس میں قطعات ، ترکیب بند ، ترجیع بند ، مثنویاں ، قصائد ، غزلیات ، فردات اور رباعیات شامل ہیں ۔ دوسرے حصے میں مثنویات کو یک جا کیا گیا ہے ۔ اس میں مختلف نگارشات، خطوط بنام منشی جواہر سنگھ جوہر، رائے جھج مل کھتری ، محمد فضل اللہ ، منشی نبی بخش ، نواب علاؤالدین خاں ، جان جا کوب ، میر ولایت علی ، رجب علی خاں ، تفضل حسین خاں، ہرگوپال تفتہ، بانکے لال ، میر احمد حسین میکش ، قطب الدولہ شاہ صاحب ، نوروز علی خاں، ہیرا سنگھ شامل ہیں ۔

عابدی صاحب نے ان سب پر مفید ، حواشی لکھے ہیں جو کتاب کے آخر میں شامل ہیں ۔

غالب
کی
شاعرانہ عظمت

غالب ایک عظیم شاعر ہیں ۔ ان کی شاعرانہ عظمت کو سب ہی نے تسلیم کیا ہے ۔ اردو میں شاید وہ تنہا شاعر ہیں ، جن کی شاعری دل‌نشیں اور دل آویز ہونے کے ساتھ ساتھ خیال انگیز اور فکر خیز بھی ہے ۔ وہ دلوں کو لبھاتی ، حواس پر منڈلاتی اور روح پر سرخوشی بن کر چھا جاتی ہے ۔ لیکن اس کا سحر بس یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا ۔ وہ فکر کو اذن پرواز بھی دیتی ہے ۔ اس کے ہاتھوں ذہن میں اجالا بھی ہوتا ہے اور وہ ادراک میں تیزی اور شعور میں بیداری بھی پیدا کرتی ہے ۔ غالب صرف محسوسات ہی کے شاعر نہیں ہیں ، ان کے یہاں غور و فکر اور سوچ بچار کا بھی خاصا سامان ملتا ہے ۔ وہ زندگی کو دیکھنا اور بسر کرنا ہی نہیں سکھاتے ، اس میں حقیقتوں کی تلاش و جستجو کا درس بھی دیتے ہیں ۔ اور نہ صرف یہ بلکہ ان حقیقتوں کے مختلف پہلوؤں کا ادراک بھی ان کے پیش نظر رہتا ہے ۔ وہ بظاہر معمولی سی بات کہتے ہیں ، لیکن اس کی تہہ میں انسانی زندگی کی کوئی بڑی ہی اہم حقیقت ہوتی ہے ۔

بادی‌النظر میں وہ کوئی بہت ہی معمولی سا خیال پیش کرتے ہیں ، لیکن اس کی تہہ میں بھی کوئی بڑا ہی فلسفیانہ نکتہ ہوتا ہے ۔ غالب عظیم انسان بھی ہیں اور عظیم شاعر بھی ، عظیم فن کار بھی ہیں اور عظیم مفکر بھی ۔ زمانے کے عظیم نباض بھی ہیں اور تہذیب کے عظیم علم‌بردار بھی اور ان کی شاعری ان کی عظیم شخصیت کے انھیں پہلوؤں کی ایک نہایت ہی حسین اور دل آویز تصویر ہے ۔

اس تصویر میں عظمت کا رنگ بہت نمایاں نظر آتا ہے ۔ وہ بڑی ہی باوقار معلوم ہوتی ہے ۔ وجاہت اس کے ایک ایک انداز سے ٹپکتی ہے ۔ شان و شکوہ اس کے ہر خط سے پھوٹا پڑتا ہے ۔ اس میں جلال بھی ہے ، جمال بھی ۔ وہ پرکار بھی ہے ، سادہ بھی ۔ اس میں گہرائی بھی ہے ، گیرائی بھی ۔ وسعت بھی ہے ، ہمہ گیری بھی ۔ بلند آہنگی بھی ہے ، آہستہ روی بھی ۔ اس میں بڑا تنوع ہے ۔ بڑی ہی رنگا رنگی ہے ۔ وہ پشت پہلو رکھتی ہے بلکہ بڑی ہی پہلودار شاعری ہے ۔ وہ آئینہ ہے اور آئینہ بھی دکھاتی ہے ۔ ہر شخص اس آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ سکتا ہے ۔ ہر فرد کو اس میں اپنے گرد و پیش کی تصویر نظر آ سکتی ہے ۔ اس کے آہنگ میں اس عہد کے دل کی دھڑکنوں کو سنا جا سکتا ہے ۔ بظاہر وہ محدود ہے کیوں کہ وہ ظرف تنگنائے غزل سے باہر نہیں نکلتی ۔ لیکن اس کی وسعتوں کا کوئی ٹھکانا نہیں ۔ اس میں اختصار اور اجمال ضرور ہے لیکن اس کے باوجود اس میں جو غضب کی گہرائی و گیرائی ہے وہ کسی دوسری جگہ ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتی ۔ ہر چند کہ وہ دشنہ و خنجر اور بادہ و ساغر سے گہرا ربط رکھتی ہے لیکن اُس کی تہ میں ناز و غمزہ کی بات اور مشاہدۂ حق کی گفتگو کو دیکھا اور سنا جا سکتا ہے ۔ وہ بڑی ہی پرکار شاعری ہے ۔ اس کو دیکھ کر بعض اوقات آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس کی جگمگاہٹ دلوں کو نور اور آنکھوں کو سرور بخشتی ہے ۔ وہ بڑی ہی مرصع اور زرنگار ہے اور اکثر اس میں ان شبستانوں کا سا ماحول نظر آتا ہے ، جس میں ہر وقت رنگ و نور کی بارشیں ہوتی رہتی ہیں اور جن کی آب و تاب اور چمک دمک میں بہ یک وقت حسن و جمال بھی نظر آتا ہے اور عظمت و جلال بھی !

غالب غزل کے شاعر ہیں ۔ انھوں نے غزل کے بنیادی موضوع حسن و عشق کی حقیقت سے بڑی ہی بھرپور تصویریں کھینچی ہیں ۔ ان کی عسقیہ شاعری زندگی سے معمور ہے ۔ وہ زندگی آمیز بھی ہے اور زندگی آموز بھی ۔ اسی لیے وہ زندگی سے بیزاری نہیں سکھاتی ۔ بلکہ زندگی کو بسر کرنے کا درس دیتی ہے ۔ اس میں جذبات کی بڑی اہمیت ہے لیکن وہ تمام تر جذباتی نہیں ہے۔ اس میں روایت کے اثرات ہیں لیکن روایتی ہونے سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں ۔ اس میں ایک فرد کی انفرادی کیفیات کی ترجمانی ضرور ہے ۔

لیکن وہ ایک سماجی پس منظر بھی رکھتی ہے ۔ وہ اپنے زمانے کی پیداوار ہے ۔ اس میں زمانے کے مخصوص حالات کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔ اسی لیے اس کی سماجی اہمیت بھی ہے ۔ وہ ایک تہذیب کی عکاس اور آئینہ دار ہے ۔ اس میں فراری ذہنیت کا احساس نہیں ہوتا ۔ وہ تو بنیادی انسانی جذبات کی عکاسی کرتی ہے ۔ اس سے انسانی زندگی کے جذباتی پہلوؤں کا صحیح اندازہ ہوتا ہے ۔ اس میں بڑی ہی ستھری فضا ہے ۔ وہ بڑی پاک صاف اور شفاف ہے ۔ جیسے کوثر و تسنیم میں دھل کر نکلی ہو ۔ اس میں تہذیبی پہلو غالب ہے ۔ وہ بڑی مہذب ہے ۔ اسی لیے تہذیب کرتی اور مہذب بناتی ہے ۔ اس سے دلوں میں تاریکی اور نگاہوں میں اندھیرا نہیں ہوتا ۔ وہ تو زندگی میں شمعیں سی فروزاں کرتی اور دلوں میں دیے سے جلاتی ہے ۔ روشنی دیتا اور منور کرتا ہر حال میں اس کے پیش نظر رہتا ہے ۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ جذباتی زندگی کے شعور کو عام کرتی ہے ۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر سوچنا اور غور کرنا سکھاتی ہے ۔ اس لیے اس کے خالص جذباتی پہلو میں بھی ایک مفکرانہ آہنگ کا احساس ہوتا ہے اور ایک فلسفیانہ زاویۂ نظر کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے ۔

یہ عشقیہ شاعری سیدھی سادی اور سپاٹ نہیں ہے ۔ اس میں پیچ و خم ہیں ۔ نشیب و فراز ہیں ۔ یہ خاصی پہلودار ہے ۔ اس میں تہیں ہیں۔ اس میں رمز و ایما ہے ۔ اشارہ و کنایہ ہے ۔ یہ کچھ نہ کہنے پر بھی نہ جانے کیا کیا کچھ کہتی ہے ۔ اسی لیے اس میں معنوی گہرائی کا احساس بھی ہوتا ہے اور صوری گہرائی بھی نظر آتی ہے ۔ غالب کی عظمت اسی میں ہے کہ عشقیہ موضوعات کو پیش کرتے ہوئے وہ عینی رجحانات کا شکار نہیں ہوئے ۔ ذہنی الجھنوں نے ان کا راستہ نہیں روکا ۔ اسی لیے ان کی صورت مسخ نہیں ہوئی ۔ وہ اس وقت کے ایک عام صحت مند انسان کی ذہنی و جذباتی کیفیت کی پوری طرح ترجمانی کرتی ہے ۔ یہ انسان ایک خاص معاشرے کا فرد ہے ۔ چنانچہ اس کی عام حرکات و سکنات اس معاشرے سے گہرا تعلق رکھتی ہیں ۔ اسی لیے اس کی ایک ایک بات میں اس معاشرے کا عکس نظر آتا ہے ۔ غالب نے اس معاشرے میں آنے والے فرد کی جذباتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنی عشقیہ شاعری میں بے نقاب کیا ہے ۔ یہی سبب ہے کہ غالب کی عشقیہ شاعری اپنی ایک مضبوط بنیاد رکھتی ہے ۔ وہ محض خیالی

نہیں ہے ۔ اس میں حقیقت و واقعیت کا خون ہے ۔ خلوص و صداقت کی گرمی ہے ۔ اس کا اپنا ایک نظام ہے ۔ اس کا آغاز حسن پرستی سے ہوتا ہے کہ یہ حسن پرستی انسانی فطرت میں داخل ہے ۔ غالب نے اس حسن کو اپنے آس پاس اورگرد و پیش دیکھا ہے ۔ وہ اس حسن سے متاثر ہوئے ہیں ۔ اس نے ان کے دل کو لبھایا ہے ۔ ان کی زندگی میں رنگینی پیدا کی ہے اور اس طرح یہ زندگی ان کے لیے بلا کی حسین اور یہ دنیا غضب کی دل آویز بن گئی ہے ۔ غالب نے اس حسن اور دل آویزی سے زندگی کو بسر کرنا سیکھا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی ان کے لیے ایک فن بن گئی ہے اور انھوں نے ہمیشہ اس کو ایک فن ہی سمجھا ہے ۔ ان کی ساری شاعری میں شروع سے آخر تک اس خیال کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے ۔ وہ زندگی کو فن بنانے کی فکر میں سرگرداں دکھائی دیتے ہیں ۔ یہ کاوش ان کے یہاں برابر جاری رہتی ہے ۔ اسی لیے ان کے یہاں زندگی کے ساز کے ساتھ اس کا سوز بھی ملا جلا نظر آتا ہے ۔ جب انہیں زندگی میں خاطر خواہ حسن نہیں ملتا اور وہ فن بنتی ہوئی نہیں دکھائی دیتی ، تو وہ اداس اور غمگین دکھائی دیتے ہیں اور وقتی طور پر رولھنے کا سا انداز ان کے یہاں پیدا ہوجاتا ہے ۔ یہی ان کے غم کی بنیاد ہے ۔ انہیں زندگی کو حسین دیکھنے کی تمنا ہے ۔ جب یہ تمنا پوری نہیں ہوتی تو وہ اپنے اوپر اداسی طاری کر لیتے ہیں ۔ ان کا دل غم کھانے میں بہت بودا ہے ۔ ان کے لیے مٹے گل فام کے کم ہونے کا رنج بھی بہت زیادہ ہے ، بلکہ یہی تو ان کا غم ہے ۔ اسی لیے غالب نے حسن کو اتنی اہمیت دی ہے ۔ یہ حسن صرف گوشت پوست کے انسانوں ہی میں نہیں ہوتا ۔ یہ تو کائنات کی ہر چیز میں ہوتا ہے ۔ یہ حسن قول و فعل میں بھی ہے ۔ رشتے اور رابطے میں بھی ہے ۔ انسان کی کوئی بات بھی اس سے خالی نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ غالب زندگی بسر کرنے کے لیے ایک حسن نظر کا تقاضا کرتے ہیں ۔ یہی خیال ان کی شاعری میں تہذیب کو پیدا کرتا ہے اور اسی سے وہ خود بھی مہذب بنتی ہے ۔ غالب کی زندگی اور فن کا محور یہی حسن اور اس کے مختلف پہلو ہیں ۔ یہ حسن غالب کے یہاں کسی ایک چیز تک محدود نہیں ۔ اس کا عمل دخل تو زندگی کے مختلف اور متنوع پہلوؤں میں ہے ۔ وہ تو انہیں ہر طرف چھایا ہوا نظر آتا ہے ۔ اسی لیے تو وہ حیرانی کے ساتھ اس کو دیکھتے ہیں اور

سوچنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں ؟ اور ان کا غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے ؟ شکن زلف عنبریں کیوں ہے؟ اور نگہ سرمہ سا کی کیا حقیقت ہے ؟ اور نہ صرف یہ بلکہ یہ خیال بھی ان کے ہاں غور و فکر کی تحریک پیدا کرتا ہے کہ آخر اس کے علاوہ زندگی میں جو حسن ہے وہ کہاں سے آیا ہے ؟ سبزہ و گل کے حسن کا منبع کیا ہے؟ ابر کیا چیز ہے ، ہوا کیا ہے ؟ اور یہ سلسلہ کہیں رکتا نہیں ۔ غالب کی شاعری میں انھیں مناظر اور مظاہر کی تلاش و جستجو ہے ۔ اس کا آغاز حیرت سے ہوتا ہے ۔ اور حیرت ہی غور و فکر کی بنیاد ہے ۔ لیکن غالب صرف اس غور و فکر تک ہی اپنے آپ کو محدود نہیں رکھتے ۔ غور و فکر کے ساتھ ساتھ اس سے لطف اندوز ہونے اور اس کے ہاتھوں پیدا ہونے والی مسرتوں سے سینہ بھر لینے کی تمنا بھی ان کے ہاں جاری رہتی ہے ۔ اس صورت حال سے ان کی عظمت کو سہارا ملتا ہے اور وہ اس کے لیے ایک ستون بن جاتی ہے ۔

غالب کے عشق کا منبع بھی یہی حسن اور اس سے پیدا ہونے والی لذت ہے ۔ اس کا وجود حسن سے دلچسپی لینے اور متاثر ہونے کے نتیجے ہی میں ہوتا ہے اور حسن سے یہ دلچسپی انسانی فطرت میں داخل ہے ۔ اس لیے غالب کے نزدیک عشق ایک بنیادی انسانی جذبہ ہے ۔ اس کے بغیر انسان کی تکمیل ممکن نہیں ۔ غالب اسے ایک رشتہ سمجھتے ہیں ۔ ان کے نزدیک وہ ایک تعلق ہے ۔ ایک لگاؤ ہے ۔ ایک نسبت ہے ۔ جس کی نوعیت بہ یک وقت جذباتی بھی ہے ، ذہنی بھی ۔ جسمانی بھی ہے ، روحانی بھی ۔ لیکن غالب افلاطونی عشق کے قائل نہیں ہیں ۔ طبعاً وہ رومانی ہیں ۔ ان کے عشق میں اس رومانی مزاج کے اثرات بھی ملتے ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود وہ عشق کا تمام تر تخیلی تصور نہیں رکھتے ۔ ان کی شاعری میں تو عسی عام انسانوں کا عسق رہتا ہے ۔ اسی لیے وہ اسے انسانوں کی جذباتی زندگی کا ایک نظام سمجھتے ہیں ۔ خواہش اور جذبہ اس عسق کی بنیاد ہے ۔ انسان اس خواہش کی تکمیل اور اس جذبے کی تعمیر چاہتا ہے ۔ اس لیے نئے رابطے بنتے اور رشتے قائم ہوتے ہیں ۔ اور انسانی زندگی کے نشیب و فراز انھی رشتوں اور رابطوں کے گرد گھومتے ہیں ۔ انسان ان کو قائم اور باقی رکھنے کے لیے نہ جانے کیا کیا کچھ کرتا ہے ۔ عجب عجب حرکتیں اس سے سرزد ہوتی ہیں ۔ لیکن وہ اس سے دامن نہیں بچا سکتا ۔ بہر حال

غالب کے عشق کی نوعیت انسانی ہے - اس کی بنیادیں حقیقت پر استوار ہیں - وہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے - لیکن اس کی تکمیل آسان نہیں - اس کے لیے تو نہ جانے کیا کیا کچھ کرنا پڑتا ہے - نہ جانے کیسے کیسے ہفت خواں طے کرنے ہوتے ہیں، تب کہیں جاکر وہ رونق ہستی کا باعث بنتا ہے - اس کے بغیر انجمن بے شمع نظر آتی ہے - عشق سے طبیعت کو زیست کا مزا ملتا ہے - وہ اسے درد کی دوا بھی سمجھتے ہیں اور درد لا دوا بھی - لیکن عشق کی آزمائشوں سے گذرنا ان کے نزدیک آسان نہیں - وہ تو اس کو نبرد پیشہ سمجھتے ہیں اور اسی لیے ان کے خیال میں وہ طلب گار مرد ہوتا ہے - اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تو باب نبرد ہونے کی ضرورت ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو انسان اس کی ایک دھمکی میں مرجاتا ہے - غالب عشق کا ایک فعالی تصور رکھتے ہیں - کیونکہ وہ اُس کو زندگی اور اُس کی کشمکش سے الگ کر کے نہیں دیکھتے - اسی لیے معاشرتی زندگی، ان کے خیال میں، اس پر اثر انداز ہوتی ہے - وہ معاشرتی زندگی کو متاثر کرتا ہے - حالات ہی اس کی قدریں متعین کرتے ہیں - ماحول ہی اس کے معیاروں کو بناتا ہے - یہ خیالات غالب کے عشق کو حقیقت سے قریب کرتے ہیں - اس کی حیثیت تمام تر جذباتی ہی نہیں رہتی - وہ محض غم عشق ہی کو سب کچھ نہیں سمجھتے، غم حیات کو بھی دیکھتے ہیں - بلکہ بعض جگہ تو غم حیات کا خیال ان کے یہاں غم عشق پر غالب آ جاتا ہے - اور غم حیات ایک ایسی چیز ہے کہ محبوب کی وفا سے بھی اس کی تلافی نہیں ہو سکتی - اور پھر عشق غالب کے یہاں صرف دنیاوی معاملات تک محدود نہیں ہے - وہ ایک روحانی حیثیت بھی رکھتا ہے - اس لیے غالب اس کے وجدانی پہلو پر بھی غور کرتے ہیں - اور یہیں سے ان کی شاعری میں عشق کی منکرانہ تحلیل اور اس کے فلسفیانہ تجزیے کا آغاز ہوتا ہے - غرض غالب کے تصور عشق کی نوعیت انسانی ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کے اظہار میں زندگی کے ان گنت نفسیاتی اور اخلاقی حقائق بے نقاب ہوتے ہیں - غالب کی عظمت اس میں ہے کہ انھوں نے ان سب کو پیش کرنے میں ایک فلسفیانہ آہنگ کو پیش نظر رکھا ہے - اور اس فلسفیانہ آہنگ کے ساتھ ایک انسان کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے - جو کچھ وہ دیکھتا ہے، جو کچھ وہ محسوس کرتا ہے، جو کچھ سوچتا ہے، ان سب کی تصویریں غالب کی شاعری میں ملتی ہیں -

اس عشقیہ شاعری ہی سے اس حقیقت کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ غالب کا مزاج بنیادی طور پر فلسفیانہ ہے ۔ اور یہ فلسفیانہ مزاج کسی حدود کا پابند نہیں ہے ۔ یہ تو پھیل کر بے کراں ہونا چاہتا ہے ۔ اس کی نظر تو ساری زندگی پر ہوتی ہے ۔ وہ تو کل کائنات کو اپنے پیش نظر رکھتا ہے ۔ غالب نے بھی اپنے آپ کو صرف عشق اور اس کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی ہی تک محدود نہیں کیا ہے ۔ انھوں نے عشق کو وسعت ضرور دی ہے ۔ اس کو متنوع معاملات کا حامل ضرور بنایا ہے ۔ لیکن وہ اس دائرے سے باہر بھی نکلے ہیں اور حیات و کائنات کے مختلف مسائل کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے ۔ ان معاملات کی نوعیت ما بعد الطبیعیاتی بھی ہے ، اخلاقی بھی ۔ نفسیاتی بھی ہے، عمرانی بھی ۔ غالب نے ان سب میں فلسفیانہ حقائق کی تلاش و جستجو کی ہے ۔ لیکن اس سلسلے میں انھوں نے جتنی باتیں بھی کہی ہیں ، وہ کسی نہ کسی زاویے سے انسان اور انسانی زندگی کو سمجھنے میں معاون ضرور ہوتی ہیں ۔ غالب ان باتوں کو اسی مقصد سے پیش کرتے ہیں ۔ ان میں انسان کی بلندی اور اس کے ارتقا اور تہذیب کا خیال ہوتا ہے ۔ غالب کے نزدیک انسان عظیم ہے ۔ اس کی عظمت کا کوئی ٹھکانا نہیں ۔ یہ دنیا ، یہ زندگی ، یہ ساری کائنات انسان کی ہے ۔ انسان کے لیے ہے ۔ انسان نہ ہو تو اس کی کوئی حیثیت نہیں ۔ ان کو انسان سے الگ کرنے کا خیال غالب کے یہاں سب سے زیادہ نمایاں ہے ۔ لیکن اس کی وضاحت انھوں نے براہ راست نہیں کی ہے ۔ بالواسطہ طور پر اس خیال کو جگہ جگہ واضح کیا ہے ۔ جہاں کہیں بھی وہ انسان کی زبوں حالی ، اس کی محرومی اور ناکامی کا بیان کرتے ہیں ، وہاں در حقیقت اس کی تہ میں یہی خیال ہوتا ہے ۔ انسان کی عظمت کا احساس زندگی میں انسان کی محرومی کے خیال کو ابھارتا ہے ۔ غالب کا میلان تصوریت اور عینیت کی طرف ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انسان کے لیے ایک مثالی ماحول کی تمنا کرتے ہیں ۔ اور جب زندگی میں اس کے لیے یہ ماحول نہیں پیدا ہوتا تو وہ اس کی شکایت کرتے ہیں اور یہ خیال ہر جگہ ان کے یہاں نمایاں ہوتا ہے کہ انسان اس ماحول کے نہ ہونے کے باوجود زندہ رہتا ہے اور اسی میں اس کی عظمت کا راز ہے ۔ زندگی انسان کو جینے نہیں دیتی ۔ زندگی میں وہ جن چیزوں کی تمنا کرتا ہے، وہ اسے نصیب نہیں ہوتیں ۔ لیکن اس کے باوجود وہ زندگی سے منہ نہیں

موڑتا ۔ بلکہ ان ناسازگار حالات میں بھی زندگی بسر کرتا ہے ۔ غالب کی فکر میں ان خیالات کی گونج جگہ جگہ سنائی دیتی ہے ۔ اور وہ در حقیقت انھیں کی بدولت عظمت سے ہم کنار ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

غالب کو اپنے مسائل تصوف پر بڑا ناز ہے ۔ وہ ان پر بڑا فخر کرتے ہیں اور وہ فخر و ناز بے جا نہیں ہے ۔ کیونکہ ان کے یہاں تصوف انسان اور انسانیت کی ذہنی اور روحانی تہذیب کے لیے ایک راہ عمل ہے ۔ غالب اس تہذیب پر ایمان رکھتے ہیں اور انسانی ارتقا میں ان کے نزدیک اس کی بڑی اہمیت ہے ۔ اس لیے اس کا پورا نظام غالب کے یہاں مل جاتا ہے ۔ توحید غالب کا ایمان ہے لیکن یہ توحید صرف ذات باری کے بیان تک محدود نہیں ۔ وہ تو اس سلسلے میں وحدت الوجود کے تمام پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں اور اس کا مقصد صرف مابعد الطبیعاتی ہی نہیں ہوتا بلکہ انسان کو بعض حدود کا پابند بنانا ہوتا ہے ۔ کہ ان حدود میں رہ کر ہی ذہنی تہذیب ہو سکتی ہے ۔ اصل شہود اور شاہد و مشہود کو ایک سمجھنا ، ہر حباب کو ہودۂ ساز جاننا ، ایک برق حسن کے جلوے سے زمین تا آسمان ہر چیز کو سرشار دیکھنا اور اسی طرح کی ان گنت باتیں جو غالب کے یہاں جگہ جگہ ملتی ہیں ، در حقیقت ان کی بنیاد انسان کی ذہنی تہذیب ہے ۔ اس طرح سوچے بغیر انسانی زندگی کو سمجھا نہیں جا سکتا اور اس کی اصل حقیقت سے اس کو واقفیت نہیں ہو سکتی ۔ ان خیالات کے باوجود انسان کی زندگی میں بے راہ روی بھی پیدا ہو سکتی ہے ۔ معیاروں کا خیال اس کی نظروں سے اوجھل بھی ہو سکتا ہے ۔ بنیادی انسانی قدریں اس کے یہاں نظر انداز ہو سکتی ہیں ۔ ظاہر ہے اس طرح وہ ارتقا کے راستے پر آگے نہیں بڑھ سکتا اور اس کی ذات ایک مثالی نظام حیات کو قائم کرنے میں معاون نہیں ہو سکتی ۔

انسان یہ سب کچھ کرتا ہے اور اس کی بدولت اسے زندگی کو بسر کرنے کے آداب آ جاتے ہیں اور وہ اس کو بسر کرتا بھی ہے لیکن اس کے باوجود زندگی بسر کرنے میں اسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوتی ۔ جو کچھ وہ کرنا چاہتا ہے ، نہیں کر سکتا ۔ اسی لیے وہ زندگی میں انسان کو اس کی عظمت کے باوجود مجبور محض سمجھتے ہیں ۔ قید حیات و بند غم میں انھیں کوئی فرق نظر نہیں آتا ۔ انھیں تو وہ دونوں ایک معلوم ہوتے ہیں اور

ان کے خیال میں موت سے پہلے انسان کو اس سے نجات نہیں مل سکتی۔ زندگی میں انھیں موت کا کھٹکا لگا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان کی نگاہیں کارگہ ہستی میں لالے کو داغ ساماں دیکھتی ہیں اور انھیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ خون گرم دہقاں ہی در حقیقت برق خرمن کا ہیولا ہے۔ انھیں خیالات کا یہ اثر ہے کہ غالب انسانی زندگی کو فریب اور عالم کو دام خیال سمجھتے ہیں۔ اور انھیں اس کی کوئی مضبوط بنیاد نظر نہیں آتی۔ لیکن اس کے باوجود وہ زندگی سے مایوس نہیں ہیں۔ ان کے یہاں قنوطیت نہیں ہے۔ حزن و یاس سے وہ کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ زندگی کا انداز نظر انھیں غم سے دوچار کرتا ہے۔ وہ اداس ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن زندگی کی مسرتوں سے کنارہ کشی اختیار نہیں کرتے۔ مسرتوں کا خیال بہر صورت ان کے پیش نظر رہتا ہے اور وہ اس خیال کو زندگی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ غالب کے خیال میں وہی انسان عظیم ہے جو ان مسرتوں کو تلاش کرتا ہے۔

یہ خیالات غالب کی شاعری میں بہت نمایاں ہیں۔ ان کو پیش کرنے میں ایک مفکرانہ انداز اور فلسفیانہ آہنگ ہے۔ غالب کی بڑائی اس میں ہے کہ انھوں نے ان خیالات کو زندگی سے الگ نہیں کیا ہے۔ وہ انسانی زندگی کو سمجھنے اور بسر کرنے میں مد و معاون ہوتے ہیں۔ انسانی زندگی سے گہرے لگاؤ ہی نے ان خیالات کو پیدا کیا ہے۔ اسی لیے ان کی بنیادوں میں استواری نظر آتی ہے۔

غالب کی فکر ماورائی نہیں ہے۔ ان کے خیالات محض مابعدالطبیعیات ہی سے تعلق نہیں رکھتے۔ ان کی نوعیت انسانی ہے اور وہ انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں انسانی نفسیات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ ایک اجتماعی زاویۂ نظر سے عمرانی معاملات کی ترجمانی بھی ملتی ہے۔ اپنے زمانے کے تہذیبی اور معاشرتی پہلوؤں کو انھوں نے اپنی غزلوں میں بڑی خوبی سے سمویا ہے۔ ان کی شاعری میں جگہ جگہ ان کی اپنی شکست کی آواز ضرور سنائی دیتی ہے۔ لیکن ایک تہذیب اور ایک نظام معاشرت کی آواز شکست سے بھی اس میں قدم قدم پر دوچار ہونا پڑتا ہے۔ غالب نے ایک ایسے ماحول میں آنکھ کھولی تھی جو انحطاط و زوال سے دو چار تھا۔ جس میں ہر چیز کی

بنیادیں ہل چکی تھیں۔ جس میں زندگی کے تمام شعبے کچھ اکھڑے اکھڑے سے نظر آتے تھے ۔ تہذیب کے آفتاب کو گہن لگ رہا تھا ۔ سیاسی قدروں کے ستارے جھلملا رہے تھے۔ معاشرتی معاشی قدروں کی شمعیں بجھ چکی تھیں ۔ اس صورت حال نے اجتماعی زندگی میں ایک حشر سا برپا کر رکھا تھا ۔ نفسی نفسی کی کیفیت تھی ۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آفتاب سوا نیزے پر آگیا ہے ۔ زندگی میں ایک عجیب انتشار تھا ۔ افراد ان حالات کے ہاتھوں پریشان تھے۔ انھیں ایک حکومت کے دم توڑ دینے کا بڑا غم تھا۔ ایک تہذیب کے متزلزل ہو جانے کی وجہ سے ان کی آنکھیں پرنم تھیں ۔ ان کے دلوں‌میں آندھیوں کے غبار تھے ۔ اور ان کی زندگی ایک ذہنی کرب کے عالم میں گذر رہی تھی ۔ غالب نے اس صورت حال کو شدت سے محسوس کیا ۔ انھیں‌خود بھی ان حالات کا غم تھا ۔ اسی لیے ان کی آنکھیں بھی پرنم دکھائی دیتی ہیں ۔ غالب کے یہاں جو شدید غم ہے اس کی نوعیت بظاہر انفرادی نظر آتی ہے لیکن اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو اس میں اجتماعی رنگ و آہنگ کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ غالب کا سارا غم درحقیقت معاشی معاشرتی اقدار کی ناہمواری کی پیداوار ہے ۔ اس ناہمواری کا نتیجہ تھا کہ غالب جو کچھ کرنا چاہتے تھے، وہ نہ کر سکے ۔ انھوں نے زندگی سے جن چیزوں کا تقاضا کیا ، وہ انھیں نہ مل سکیں ۔ کیوں کہ حالات اس کے لیے سازگار نہیں تھے ۔ ساری زندگی میں انتشار تھا ۔ اس انتشار کے عالم میں افراد کی تمناؤں کے بر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی صورت حال غالب کے دل میں داغ بن گئی ہے ۔ اور اس نے ان کی ساری شاعری میں ایک کسک کا سا عالم پیدا کر دیا ہے ۔ غالب کی لے یوں تو بڑی جان‌دار ہےلیکن وہ اسی وجہ سے زخمی معلوم ہوتی ہے ۔ اس کو سن کر دل بھر آتا ہے اور آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں ۔

اپنے زمانے کے عمرانی معاملات کو غالب نے کھلم کھلا پیش نہیں کیا ہے ۔ ان‌کو پیش‌کرنے میں ان کی تہ داری ، ان کی رمزیت اور ایمائیت اپنے شباب پر نظر آتی ہے ۔ لیکن جو شخص ذرا بھی سماجی شعور رکھتاہے اور جس‌کو غزل‌کے مزاج سے تھوڑی سی بھی واقفیت ہے ، وہ ان کی شاعری میں اجتماعی معاملات و مسائل کو بخوبی دیکھ سکتا ہے ۔ غالب غزل کے مخصوص اشاروں اور کنایوں میں یہ باتیں کرتے ہیں ۔ لیکن اس پردے کے

پیچھے معنویت کی جو اصلی روح ہے ، اس کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے ۔ غالب جب دل کے سوز نہاں سے جلنے اور اپنے عدم سے بھی پرے ہونے کا ذکر کرتے ہیں، جب ان کے یہاں تپاک اہل دنیا کا شکوہ ہوتا ہے اور وہ افسردگی کی آرزو کرتے ہیں ۔ جب ان کی نگاہیں دل سے جگر تک ایک ساحل دریائے خوں دیکھتی ہیں ۔ حالانکہ اس سے قبل اس رہگذر میں جلوۂ گل بھی گرد نظر آتا تھا ۔ جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ خموشی میں نہاں لاکھوں خوں گشتہ آرزوئیں ہیں اور جب انھیں اپنا وجود گور غریباں کا چراغ مردہ نظر آتا ہے ، جب وہ ہر موسم میں ماتم بال و پر کی صدائیں سنتے ہیں ، جب انھیں اپنی اسیری کا احساس ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کو گرفتار الفت صیاد سمجھتے ہیں ۔ جب ان کی نظریں بادۂ شبانہ کی سرمستیوں کو ختم ہوتے ہوئے دیکھتی ہیں ، جب انھیں داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی شمعیں خاموش نظر آتی ہیں تو درحقیقت ان کا زاویہ نظر اجتماعی ہی ہوتا ہے ۔ اور وہ اس اجتماعی زاویہ نظر سے اپنے زمانے کے عمرانی حقائق کو بے نقاب کرتے ہیں ۔ لیکن غالب ان عمرانی حالات کی حد درجہ ناساز گار کیفیت کو محسوس کرنے کے باوجود قنوطیت اور یاسیت کا شکار نہیں ہوتے ۔ زندگی سے روگردانی کا خیال ان کے یہاں پیدا نہیں ہوتا ۔ جولانی ان کے یہاں باقی رہتی ہے ۔ انھیں تھک کر بیٹھنا نہیں آتا بلکہ کہیں کہیں تو ایک ہلکی سی للکار کا سا آہنگ ان کےیہاں نمایاں ہوجاتا ہے۔ بادۂ شبانہ کی سرمستیوں کو ختم ہوتا ہوا دیکھ کر جب وہ لذت خواب سحر سے اٹھنے اور بیدار ہونے کا پیغام دیتے ہیں تو اس خیال کی پوری طرح وضاحت ہو جاتی ہے ۔ غالب زندگی کے شاعر ہیں ۔ اس لیے ان حالات کی حد درجہ مایوس کن حالت دیکھ کر بھی وہ ان حالات سے مایوس نہیں ہوتے بلکہ نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے پر اکساتے ہیں ۔ زندگی اور اس کی قدروں کا خیال ہی ان سے یہ سب کچھ کراتا ہے ۔ انسانیت ہی انھیں یہ سب کچھ کرنے پر مجبور کرتی ہے ۔ یہاں بھی ایک تو تفکر کا پہلو ان کی شاعری میں غالب دکھائی دیتا ہے اور دوسرے ان خیالات کی نوعیت انسانی نظر آتی ہے ۔ اور اسی میں غالب کی بڑائی ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ ان خیالات و نظریات نے غالب کو عظیم بنانے میں نمایاں حصہ لیا ہے ۔ معنوی گہرائی اور گیرائی ان کی عظمت کی

بنیاد ہے۔ لیکن ان خیالات و نظریات کو جس طرح انھوں نے فن کا روپ دیا ہے ، اور یہ معنویت جس طرح ان کے یہاں جمالیاتی اقدار سے ہم آہنگ ہوتی ہے ، اس کا بھی ان کو عظیم بنانے میں بڑا ہاتھ ہے ۔ غالب کے یہاں موضوع اور فن ، مواد اور ہیئت کی مکمل ہم آہنگی ملتی ہے ۔ انھوں نے اظہار کے نئے سلسلے تلاش کیے ہیں ، فن کو نئی وسعتیں دی ہیں اور حسن و جمال کا ایک نیا عالم پیدا کیا ہے ۔ ان کے اظہار میں اس تہذیب کی روح ہے جس میں انھوں نے آنکھ کھولی اور جس کے سائے میں ان کا نشو و نما ہوا ۔ ان کا فن اس معاشرے کا عکس ہے جس کے وہ ایک فرد تھے اور انھوں نے جن جمالیاتی اقدار کو پیدا کیا ہے ، ان میں اس زندگی کی گرمی اور روشنی ہے جو خود ان کے اندر اور ان کے آس پاس اور گرد و پیش موجود تھی ۔ غالب کے فن میں رچاؤ ہے ، رنگینی ہے ، ولولہ ہے ، حوصلہ ہے ۔ اسی لیے وہ سجا سجایا نظر آتا ہے اور زندگی کی شعاعیں اس میں سے پھوٹتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں ۔ غالب نے الفاظ سے بڑا کام لیا ہے ۔ الفاظ جس طرح ان کے یہاں زندگی سے بھرپور نظر آتے ہیں ، کسی اور اردو شاعر کے یہاں نظر نہیں آتے ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ غالب کے الفاظ میں معنویت کا خون ہوتا ہے ، خیال کی گرمی ہوتی ہے ۔ اسی لیے تو وہ جس شاعرانہ حسن کو پیدا کرتے ہیں ، اس کی مثال ساری اردو شاعری کی روایت میں کہیں اور نہیں مل سکتی ۔ غالب نے ان الفاظ سے گل و گلزار کھلائے ہیں اور کچھ اس طرح چمن آرائی کی ہے کہ اس کی ساحری پر ایمان لانا پڑتا ہے ۔ ان الفاظ کو ملا کر جو ترکیبیں وہ تراشتے ہیں وہ ان کے فن میں گلکاریاں سی کرتی ہیں اور ساتھ ہی ان کی دروبست سے وہ جو ایک صوتی آہنگ پیدا ہوتا ہے اس پر سے ہزار ترنم قربان کیے جا سکتے ہیں ۔ غالب کے یہاں غضب کا ترنم ، موسیقیت اور نغمگی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ غالب کی فکر ہی مترنم ہے ۔ ان کے خیالات ہی اپنے اندر ایک آہنگ رکھتے ہیں ۔ غالب کی تخئیل بلا کی سحر کار ہے ۔ اس لیے وہ تشبیہات و استعارات ، علامات و اشارات کے روپ میں نئی دنیاؤں کو پیدا کرتی ہے ۔ اس کی محرک تخیل کی وہ بے باکی ہے جو غالب میں بدرجۂ اتم موجود تھی ۔ اور جس نے ان کے فن میں رنگا رنگ پھول کھلائے ہیں ۔ غالب کا فن مختلف رنگوں کا مرکب ہے ۔ اس کا ہیولا تو جذب و سوز و تخیل کی

پرواز ، ادراک کی قوت وجدان کے حسن امید اور نا امیدی کی کشمکش ، جذب و مستی ، شوخی و شگفتگی ، فعالی اور جولانی ، طنز و مزاح ، جدت و ندرت اور تازہ خیالی و تازہ کاری سے تیار ہوا ہے ۔ غالب درحقیقت انھیں کا مرکب تھے ۔ اسی لیے ان کا عکس ان کے فن میں بھی نظر آتا ہے ۔ بہرحال اس میں بڑا حسن ہے ، بڑی رنگینی ہے ، بڑی رعنائی ہے ، بڑی ہی لے دے رہنے والی کیفیت ہے ، بڑا وقار ہے ، بڑا رکھ رکھاؤ ہے ۔ وہ بڑا مہذب فن ہے ، وہ ایک عظیم تہذیب اور بڑی باوقار معاشرت کا عکس اور آئینہ دار ہے ۔ غالب کو عظیم بنانے میں اس فنی اور جمالیاتی پہلو نے بھی کچھ کم حصہ نہیں لیا ہے ۔ ان کو عظیم بنانے اور ان کی شاعری کو عظمت سے ہمکنار کرنے میں اس کا یہ جمالیاتی پہلو برابر کا شریک ہے ۔

غالب بڑے پہلو دار شاعر ہیں ۔ ان کی شاعری میں بڑا تنوع ہے ۔ بڑی ہی رنگا رنگی ہے ۔ بڑی ہی گہرائی اور گیرائی ہے ۔ وہ صرف جذبات ہی کو متاثر نہیں کرتی ، ذہن پر بھی اس کا گہرا اثر ہوتا ہے ۔ وہ خیال انگیز اور فکر خیز بھی ہے ۔ وہ انسان ، زندگی اور کائنات سے تعلق رکھتی ہے ۔ انھیں کے معاملات و مسائل کو اس نے اپنے دامن میں سمویا ہے ۔ وہ زندگی سے بیزار نہیں کرتی ، اس کو بسر کرنا سکھاتی ہے ۔ وہ کائنات سے روگردانی کا درس نہیں دیتی ، کائناتی حقیقتوں کے ادراک کی طرف متوجہ کرتی ہے ۔ ماحول سے چشم پوشی اس کا مقصد نہیں ۔ وہ تو اس کے مختلف پہلوؤں کا شعور پیدا کرتی ہے ۔ اس میں بڑی زندگی ہے ۔ وہ بڑی ہی ہمہ گیر ہے ۔ اس میں بڑا حسن ہے ، بڑی ہی دلآویزی ہے ۔ اس لیے اس میں عظمت کا احساس ہوتا ہے اور وہ خود غالب کو بھی عظیم بناتی ہے !

غالب کی شاعری
کا
آفاقی پہلو

اس میں شبہ نہیں کہ شاعری ، شاعر کے ذاتی احساسات اور انفرادی تجربات کا آئینہ ہے ۔ لیکن شاعر کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ اپنے ان ذاتی احساسات اور تجربات میں عمومیت کا کچھ ایسا رنگ بھرتا ہے کہ وہ ایک عام انسان کے احساسات اور تجربات کا روپ اختیار کر لیتے ہیں—اور اس طرح اس کا ہر تجربہ انسانی زندگی کی ایک عام حقیقت بن کر سامنے آتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر آپ بیتی جگ بیتی بن جاتی ہے اور ہر انفرادی خیال اور جذبے کا اطلاق عام اجتماعی اور انسانی خیال اور جذبے پر ہونے لگتا ہے ۔ بڑا شاعر صرف اس کو جذبات و احساسات ہی تک محدود نہیں رکھتا ، بلکہ اس کو فکر سے ہم آہنگ کر کے انسانی زندگی کے فلسفیانہ اور نفسیاتی حقائق کی تصویر بھی بنا دیتا ہے ۔ یہی شاعری کا آفاقی پہلو ہے ۔ اسی پہلو کی بدولت شاعری عظمت سے ہم کنار ہوتی ہے اور اس کا تخلیق کرنے والا عظیم شاعر کہلاتا ہے ۔

غالب کی شاعری میں شروع سے آخر تک یہی صورت حال نظر آتی ہے ۔ وہ ایک عظیم شاعر ہیں ۔ ان کی شاعری میں عظمت ہے ۔ اس لیے کہ انھوں نے اس میں جن جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے ، ان میں ہر جگہ آفاقی پہلو اپنی جھلک دکھاتا ہے ۔ بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان کی شاعری میں وہ مقامات بھی آتے ہیں ، جہاں یہ آفاقیت اپنے معراج کمال پر نظر آتی ہے—اور حقیقت یہ ہے کہ آفاقیت کے اس معراج کمال ہی نے انہیں عظیم بنایا ہے—اس آفاقیت ہی کا یہ اثر ہے کہ غالب کی شاعری میں تاثر کا سحر پیدا ہو جاتا ہے اور ان کے اشعار دلوں میں اترتے ہیں

اور روح پر سرخوشی بن کر چھا جاتے ہیں ۔ بات یہ ہے کہ انسان ان کی شاعری میں اپنے ہی جذبات و احساسات کا ارتعاش سا محسوس کرتا ہے اور اس آئینے میں اس کو اپنے ہی افکار و خیالات اور معاملات و مسائل کے خد و خال بے نقاب نظر آتے ہیں ۔

یہ شاعری موضوع کے اعتبار سے وسیع اور ہمہ گیر ہے ۔ اس میں تنوع اور رنگا رنگی ہے ۔ وہ ظرف تنگنائے غزل میں محدود ہونے کے باوجود اپنے دامن میں کشادگی رکھتی ہے ۔ اس میں حسن کی رنگینیاں ، محبوب کی رعنائیاں ، عاشق کی الم سامانیاں ، سب ہی کچھ موجود ہیں ۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ان موضوعات کے ان گنت پہلوؤں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ محبوب کے بیان حسن میں، اس کی سیرت و شخصیت کی ترجمانی میں ، عشق و عاشقی کی بے شمار واردات و کیفیات کے تذکرے میں، زندگی کی مسرتوں اور شادمانیوں ، مجبوریوں اور محرومیوں کی شاعرانہ عکسی میں ، ہر انسان کو اپنی ہی تصویر دکھائی دیتی ہے ۔

حسن و جمال اور اس کے مختلف پہلوؤں کا احساس غالب کی شاعری کا ایک اہم موضوع ہے اور ان سب کا بیان انھوں نے بڑے ہی رچے ہوئے انداز میں کیا ہے ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ حسن و جمال سے دلچسپی غالب کی گھٹی میں پڑی تھی ۔ اس دلچسپی کو پیدا کرنے میں ان کی نسلی خصوصیت اور خاندانی مزاج کا بھی بڑا ہاتھ تھا ۔ ماحول کے اثرات بھی اس میں شامل تھے ۔ کیونکہ جس ماحول میں غالب نے آنکھ کھولی اور جس تہذیبی روایت کے سائے میں ان کا نشو و نما ہوا ، اس میں حسن اور حسن پرستی کو بنیادی حیثیت حاصل تھی ۔ ناسازگار سیاسی ، معاشی اور معاشرتی حالات نے اس تہذیبی روایت کی بہت سی دوسری خصوصیات کو پس منظر میں ڈال دیا تھا ۔ شجاعت اب صرف تصور میں باقی رہ گئی تھی ۔ سپہ گری کا خیال صرف فخر کرنے کے لیے افراد کے دلوں میں پیدا ہوجاتا تھا لیکن احساس حسن اور ذوق جمال کی شمعیں ابھی تک اس تہذیبی روایت کی محرابوں میں فروزاں تھیں ۔ اب یہ احساس حسن اور ذوق جمال باعث تسکین ہی نہیں تھا ، اس کی حیثیت ایک پناہ گاہ اور وسیلۂ فرار کی بھی ہوگئی تھی ۔ وہ غم غلط کرنے کا ایک ذریعہ اور سنگین حقائق کو تھوڑی دیر کے لیے فراموش کر دینے کا ایک وسیلہ بھی تھا ۔ لیکن بنیادی طور پر

یہ احساس حسن اور ذوق جمال، ایک عام انسان کی فطری کیفیت کو ظاہر کرتا ہے ۔ غالب نے اپنی شاعری میں جہاں حسن اور اس کے متعلقات کی ترجمانی کی ہے ، وہاں عام انسان کی فطری کیفیت کو ظاہر کیا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں ایک تہذیب کی حسن پرستی بھی اپنی جھلک دکھاتی ہے ۔ غالب نے اس حسن اور حسن پرستی پر کیسے کیسے حسین اور دلآویز اشعار کی تخلیق کی ہے :

سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

شب ہوئی پھر انجم رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بت کدے کا در کھلا
منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

رنگ شکستہ ، صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتن گل ہائے ناز کا

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا ، اشارت کیا ، ادا کیا

کوئی میرے دل سے پوچھے ، ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

دل سے مٹا تری انگشت حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

جب وہ جمال دل فروز، صورت مہر نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں

دیکھو تو دل فریبیٔ انداز نقش پا
موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

دل ہوائے خرام ناز سے پھر
محشرستان بے قراری ہے

چال جیسے کڑی کماں کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامان باغبان و کف گل فروش ہے
لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ
یہ جنّت نگاہ، وہ فردوس گوش ہے

نہ شعلے میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے
اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے

بظاہر یہ اشعار غالب کے ذاتی اور انفرادی تجربات سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں ان کا ذاتی رد عمل ہی نمایاں نظر آتا ہے لیکن ان میں جو باتیں کہی گئی ہیں، ان کا اطلاق ہر انسان پر ہو سکتا ہے۔ ان تجربات میں ہر انسان کو اپنے ہی تجربات کی جھلک نظر آتی ہے۔

غالب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان تجربات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ ہر شخص کو اپنے تجربات معلوم ہوتے ہیں اور ان میں اپنے مخصوص انداز بیان سے یہ کیفیت پیدا کر دی ہے کہ وہ دل میں اتر جاتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ تو میرے ہی دل کی بات ہے۔ غالب کے یہاں اس سلسلے میں ایک جدت اور اچھوتا پن ہے، جو دلوں میں اپنی جگہ بناتا ہے۔ اس میں التہاب کی کیفیت ہے، جو حواس کے تاروں میں ارتعاش کی سی کیفیت پیدا کرتی ہے اور ان تمام باتوں سے مجموعی طور پر ان کے اس قسم کے اشعار میں ایک آفاقی رنگ و آہنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

حسن اور حسن پرستی کے ساتھ غالب کی شاعری میں عشق و عاشقی کے معاملات اور واردات و کیفیات کی ترجمانی بھی ملتی ہے اور حسن پرستی کے موضوعات کے مقابلے میں عشق و عاشقی کے موضوعات کچھ زیادہ ہی نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان معاملات اور واردات و کیفیات میں غالب نے بڑا تنوع پیدا کیا ہے۔ وہ بہت وسیع اور ہمہ گیر ہیں۔ کیونکہ ان میں انسانی زندگی کے رنگا رنگ تجربات کی تصویریں ملتی ہیں۔ ان تصویروں میں حقیقت پسندی کا رنگ بہت گہرا ہے۔ ان میں روایت سے تھوڑا سا انحراف ضرور ملتا ہے۔ جذبے کے ساتھ شعور کی ہم آہنگی بھی نظر آتی ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود غالب نے ان کو اس طرح شاعری کے سانچے میں ڈھالا ہے کہ وہ ان کے انفرادی معاملات اور جذبات و احساسات ہوتے ہوئے بھی عام انسانوں کے جذبات و احساسات معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان میں رومان حقیقت کے ساتھ اور جذبہ شعور کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ غالب نے ان کو اس طرح شاعری کے سانچے میں ڈھالا ہے کہ وہ ان کے انفرادی معاملات اور جذبات و احساسات ہوتے ہوئے بھی عام انسانوں کے معاملات اور جذبات و احساسات

معلوم ہوتے ہیں اور ان میں انسانی زندگی کے نفسیاتی حقائق کی صحیح تصویریں نظر آتی ہیں ۔ یہ اشعار ان کی شاعری کے اسی رجحان کے صحیح ترجمان اور عکاس ہیں :

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی ، درد بے دوا پایا

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا

کوئی میرے دل سے پوچھے، ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی ، جو جگر کے پار ہوتا

غم فراق میں تکلیف سیر گل مت دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

درد دل لکھوں کیوں کر، جاؤں ان کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی ، خامہ خوں چکاں اپنا

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدّت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

وفا کیسی ، کہاں کا عشق ، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل ! تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلّف سے
تکلف بر طرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
گرچہ ہے طرز تغافل پردہ دار راز عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصوّر جاناں کیے ہوئے

یہ اسعار عشق و عاشقی کے مختلف پہلوؤں کی تصویریں پیش کرتے ہیں ۔ ان میں ایک خاص مزاج، ایک خاص افتاد طبع ، ایک خاص زاویہ نظر، ایک خاص تہذیبی فضا اور ایک خاص معاشرتی ماحول کے اثرات بہت نمایاں ہیں ۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ان میں ایسے جذبات و احساسات کی ترجمانی ہے ، جو تمام انسانوں میں مشترک ہیں ۔ جو ازل سے ہیں اور جو ابد تک رہیں گے ۔ ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عشق انسان کا بنیادی جذبہ ہے اور اس جذبے کے زیر اثر جو کیفیات اس پر طاری ہوتی ہیں ، وہ بالکل

فطری ہیں ۔ ہر انسان کو ان منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے ۔ یہی ان کا آفاقی پہلو ہے اور غالب نے اس قسم کے اشعار میں اسی آفاقی پہلو کو نمایاں کیا ہے ۔

عشق اور اس کی واردات و کیفیات بھی عجیب عجیب صورتیں اختیار کرتی ہیں ۔ کبھی تو انسان اس راہ پر چل کر اس کی لذتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے اور مسرتوں سے اپنے سینے کو بھر لیتا ہے ۔ لیکن کبھی یہ مسرتیں ایسے نصیب ہی نہیں ہوتیں اور اس راہ کی ہر منزل اس کے لیے رنج و غم کا سامان پیدا کرتی ہے ۔ انسانی زندگی میں یہ دونوں پہلو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ملے جلے ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا ۔ ہر مسرت پر غم کا سایہ ہوتا ہے ۔ ہر شادمانی بالآخر المناکی میں تبدیل ہوجاتی ہے ۔ عشق کی رنگینیوں اور رعنائیوں کا خاتمہ محرومیوں اور ناکامیوں پر ہوتا ہے اور ان رنگینیوں اور رعنائیوں کے ہاتھوں پیدا ہونے والی مسرتیں اور شادمانیاں ، مصائب و آلام میں تبدیل ہوجاتی ہیں ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں رہتی ۔ وہ اندوہ وفا سے اپنے آپ کو چھڑانا چاہتا ہے لیکن اس کا محبوب ستم گر اس پر راضی نہیں ہوتا ۔ پھر بھی محبوب سے محبت اور اُس سے لطف اندوز ہونے کی آرزو بہر حال اس کے دل میں باقی رہتی ہے ۔ وہ اس کے کوچے میں جاتا ہے ، رہ گذر پر بیٹھتا ہے لیکن خواہش پوری نہیں ہوتی اور آرزو کی تکمیل کا سامان پیدا نہیں ہوتا ۔ وہ زمانے کے ستم بھی اُٹھاتا ہے ۔ ناسازگار حالات بھی اس کے راستے میں حائل ہوتے اور سامان ستم بنتے ہیں ۔ وہ رہین ستم ہائے روزگار رہتا ہے ۔ لیکن محبوب کے خیال سے پھر بھی غافل نہیں رہتا ۔ اسی عالم میں وقت گذرتا جاتا ہے ۔ رخش عمر کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے اور وہ وقت کے ساتھ ساتھ فنا کے قریب ہوتا جاتا ہے ۔ بالآخر شعلۂ عشق سیہ پوش ہو جاتا ہے ، تمنا کی شمع بجھ جاتی ہے ، آرزو کا چراغ گل ہو جاتا ہے ۔ یہی انسانی زندگی کا انجام ہے ۔ یہی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے ۔ کسی انسان کو ان حالات سے مفر نہیں ۔

غالب عشق و عاشقی کے معاملات اور واردات و کیفیات کی ترجمانی میں انسانی زندگی کے انھیں حقائق کو پیش نظر رکھتے ہیں ۔

یہ صحیح ہے کہ غالب نے عشق و عاشقی کے مختلف پہلوؤں پر اپنی شاعری میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ اس میں شبہ نہیں، کہ آپ بیتی سے تعلق رکھتے ہیں - لیکن غالب کی انسان دوستی ، انسانیت پرستی اور آفاقیت پسندی نے ان سب میں ایک جگ بیتی کا رنگ و آہنگ ضرور پیدا کردیا ہے۔ وہ جب اپنی بات کرتے ہیں اور اپنے انفرادی جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں، تو اس میں ایسی باتیں زیادہ ہوتی ہیں، جو تمام انسانوں میں مشترک ہیں - غالب کے ایسے ہی اشعار میں ان کا انسانی شعور اپنے شباب پر نظر آتا ہے اور نفسیاتی ژوف بینی اپنے معراج کمال پر دکھائی دیتی ہے -

غالب کے اس انسانی شعور اور نفسیاتی ژوف بینی نے ان کی شاعری میں ایسے موضوعات کو بھی جگہ دی ہے ، جو حیات و کائنات کے بنیادی معاملات و مسائل کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور ان کی شاعری میں ان موضوعات کو نمایاں جگہ حاصل ہے - اور یہی موضوعات ہیں، جن کی بدولت ان کی شاعری عظمت سے ہمکنار نظر آتی ہے - حسن و عشق کے معاملات و مسائل کو بھی ، وہ حیات و کائنات کے معاملات و مسائل سے الگ کرکے نہیں دیکھتے - بلکہ ان کو انہیں مسائل کا حصہ سمجھتے ہیں اور انسانی زندگی کے بنیادی معاملات و مسائل سمجھ کر ان کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کرتے ہیں - بنیادی طور پر ان کی نگاہ تحیر و تحسین اس حقیقت کی بھی جستجو کرتی ہے کہ خود زندگی کیا ہے ؟ اس زندگی میں انسان کی کیا حیثیت ہے ؟ وہ زندگی کے تقاضوں کو کس حد تک پورا کرتا ہے ؟ اور پھر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ زندگی بے ثبات ہے - اس کی حیثیت خواب و خیال سے زیادہ نہیں - انسان اشرف المخلوقات ہے - وہ عظیم ہے اور اس کی عظمت کا راز اس میں ہے کہ وہ زندگی کے اس احساس بے ثباتی کے باوجود اس کو بسر کرتا ہے اور اس کو برتنے میں پیش پیش رہتا ہے - اس سلسلے میں اپنی ذات کا احساس اور خودی کا خیال اس کے لیے شمع راہ ثابت ہوتا ہے اور وہ اسی کی روشنی میں ناسازگار حالات کی تاریکیوں کو چیرتا ہوا زندگی کے راستے پر آگے کی طرف بڑھتا ہے - لیکن ان تمام باتوں کے باوجود زندگی کے تجربات اس کو قدم قدم پر یہ احساس دلاتے ہیں کہ وہ مجبور محض ہے اور اس کو خود اپنا وجود ان حالات کا شکوہ سنج نظرآتا ہے -

اسی لیے غالب کی نگاہ دور رس زندگی میں غم کو دیکھتی ہے اور وہ قید حیات اور بند غم کو لازم و ملزوم سمجھنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ خواہش و آرزو اس غم میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ ہزاروں خواہشیں ایسی ہوتی ہیں کہ ہر خواہش پر اس کا دم نکلتا ہے۔ لیکن اس زندگی میں یہ خواہشیں بھلا کب تکمیل سے ہمکنار ہوتی ہیں۔ یہ صورت حال توانسان کو خود اپنا نوحہ خواں بنا دیتی ہے اور وہ داغ حسرت ہستی لیےہوئے ایک شمع کشتہ کی طرح اس زندگی سے رخصت ہوتا ہے۔ انسان کی بڑائی اس میں ہے کہ ان تمام حالات کے باوجود زیست کرنے کی شمع اس کے دل میں فروزاں رہتی ہے اور وہ زندہ رہنے کی جد و جہد کرتا ہے۔ ہر انسان کو زندگی کے سفر میں ان منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ غالب نے ان بنیادی انسانی حقائق کی ترجمانی بڑے ہی منکرانہ انداز میں کی ہے۔ یہ اشعار ان کے اس قسم کے افکار و خیالات کو پوری طرح پیش کرتے ہیں :

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا، جل گیا
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو، غالب! کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا ، جل گیا

بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل،
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب
اس رہ گذر میں جلوۂ گل ، آگے گرد تھا

دہر میں نقش وفا، وجہ تسلّی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
کس سے، محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں، سو وہ بھی نہ ہوا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ، تیرے جلوے نے
کرے جو پرتو خورشید، عالم شبنمستاں کا
مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولٰی برق خرمن کا ہے، خون گرم دہقاں کا
نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب!
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا، غم روز گار ہوتا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے، در کعبہ اگر وا نہ ہوا

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا، پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ 'یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟'

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کے، مکاں اپنا
ہم کہاں کے دانا تھے؟ کس ہنر میں یکتا تھے؟
بے سبب ہوا غالب! دشمن آسماں اپنا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

نہ گل نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک
غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

نغمہ ہائے غم کو ہی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

قید حیات و بند غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو

خیال مرگ کب تسکیں دل آزردہ کو بخشے
مرے دام تمنا میں ہے اک صید زبوں وہ بھی

مۓ عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

خزاں کیا ؟ فصل گل کہتے ہیں کس کو ؟ کوئی موسم ہو،
وہی ہم ہیں ، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے
ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغ ستم نکلے

ان اشعار میں جو جذبات و احساسات اور افکار و خیالات پیش کیے گئے ہیں ، ان کا تعلق کسی نہ کسی طرح انسانی زندگی کے بنیادی حقائق سے ہے ۔ ازل سے انسان ان حقائق سے دوچار ہے ۔ زندگی کے سفر میں قدم قدم پر ایسی منزلیں آتی ہیں ، جب اس کو ان حقائق کا احساس ہوتا ہے کہ یہ زندگی بے اساس اور اس زندگی میں اس کی ہستی بے ثبات ہے ۔ اس کا وجود ہی فنا کی دلیل ہے ۔ زندگی ایک کرب مسلسل ہے اور وہ اس کرب مسلسل میں زندگی کے دن گزارتا ہے ۔ اس زندگی میں ہر چیز موت کی طرف دوڑ رہی ہے ۔ ہر خوشی پر غم کا سایہ منڈلا رہا ہے ۔ اس لیے خوشی اگر انسان کو حاصل بھی ہو جائے ، تب بھی وہ اس سے خاطر خواہ لطف اندوز نہیں ہو سکتا ۔ تغیر کا احساس اور فنا کا خیال ہر لمحہ اس کو زندگی کی بے ثباتی کا احساس دلاتا رہتا ہے ۔ کائنات کی ایک ایک چیز میں اس کو یہی بے ثباتی نظر آتی ہے اور وہ اس کو دیکھ کر اپنے دل و جگر کو خون کرتا رہتا ہے ۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود جینے ، زندہ رہنے ، زندگی کو برتنے اور بسر کرنے کی خواہش اس کے یہاں کم نہیں ہوتی ۔ اس لیے وہ ان حالات میں بھی ولولوں اور حوصلوں کی شمعوں کو فروزاں رکھتا ہے اور اسی میں اس کی بڑائی ہے ۔ غالب نے انہیں حقائق پر مختلف زاویوں سے ان اشعار میں روشنی ڈالی ہے اور ان موضوعات نے ان کی شاعری کے آفاقی رنگ و آہنگ کو اپنی انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا ہے ۔

غالب کی شاعری کے بنیادی موضوعات حسن و عشق اور حیات و کائنات کے معاملات و مسائل ہیں۔ انھوں نے اُن سب کو خالص انسانی زاویۂ نظر سے دیکھا ہے اور ان سب کی ترجمانی میں اُن کے یہاں انسان دوستی کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انسان کو غالب کے پیش کیے ہوئے یہ مسائل اپنے مسائل معلوم ہوتے ہیں اور وہ ہر جگہ ان معاملات و مسائل کے پردے میں اپنی ہی تصویر دیکھتا ہے۔ اور یہی ان کے کلام کا آفاقی پہلو ہے!

۷

غالب کی شاعری
کے
نئے زاویے

غالب کے یہاں ایک انقلابی کی روح اور ایک باغی کا مزاج تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ عملی زندگی میں کوئی انقلاب اور بغاوت نہ کر سکے۔ لیکن جہاں تک شعر و ادب کی دنیا کا تعلق ہے، وہ اس میں ایک بہت بڑے انقلابی اور باغی نظر آتے ہیں۔ ان کی بت شکنی مشہور ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کے یہاں بت شکنی کا میلان بہت نمایاں ملتا ہے۔ انھوں نے روایت پرست ہونے کے باوجود روایت کے بہت سے بت توڑے ہیں اور رسم و رہ عام کے بہت سے سومناتوں کو ڈھایا ہے۔ لیکن اس کی تہہ میں ان کے یہاں ایک تعمیری رجحان کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے۔ وہ نئی دنیاؤں کو تعمیر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے بہت سے بتوں کو توڑا ہے۔ لیکن بے شمار حسین بتوں کو بنایا بھی ہے، اور اس اعتبار سے ان کی شاعری میں ایک نئی دنیا نظر آتی ہے۔ وہ نئی ہے۔ اس میں نئے حالات کی عکاسی ہے۔ نئے ماحول کی ترجمانی ہے۔ نئے احساس و شعور کی تصویر کشی ہے۔ اس میں ایک نئے ذہن کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔ اسی لیے وہ ذہن میں نئی تحریک پیدا کرتی ہے۔ اس کو صحیح طور پر سمجھنا اور اس سے اثر قبول کرنا آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے ایک نئے ذہن کی ضرورت ہے۔ یہ نیا ذہن بغیر ایک ذہنی تربیت کے پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ ذہنی تربیت کلام غالب کے ان گنت زاویوں کو سامنے لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ اور یہ نئے زاویے ان کے کلام کو بہت ہی وسیع و ہمہ گیر اور بڑا ہی پہلو دار بنا دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ایک ناپید اکنار سمندر نظر آنے لگتا ہے۔

اردو شعراء کے دیوان عام طور پر حمد و نعت سے شروع ہوتے ہیں ۔ لیکن 'دیوان غالب' کا آغاز حمد و نعت سے نہیں ہوتا ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ غالب توحید پر ایمان نہیں رکھتے تھے یا یہ کہ عشق رسول سے انھیں کوئی تعلق نہیں تھا ۔ وہ بہت بڑے موحد تھے ۔ ان کے عشق رسول سے سرشار ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں ۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے دیوان کو شکوہ و فریاد سے شروع کرتے ہیں اور یہ شکوہ ان کا ذاتی شکوہ نہیں ہے ۔ یہ فریاد ان کی اپنی فریاد نہیں ہے ۔ اس شکوہ و فریاد میں تو انسانیت کی لے نمایاں ہے اور اس انسانیت کی لے میں شکوہ و فریاد ہے ۔ غالب اس خیال کو زندگی کی سب سے بڑی حقیقت سمجھتے ہیں ۔ ان کی آنکھ انسان کو گھائل دیکھتی ہے ۔ انسانیت انھیں زخموں سے چور نظر آتی ہے ۔ اس اعتبار سے وہ بڑی ہی مظلوم مخلوق ہے ۔ انسان مجبور محض ہے ۔ وہ کچھ کر نہیں سکتا ۔ حالات کے سامنے اس کی پیش نہیں جاتی ۔ وہ پیدا ہوتا ہے اس لیے کہ اسے مرنا ہے اور مرنے سے پہلے بھی اسے نہ جانے کتنی بار موت آتی ہے ۔ ہر لمحے اس کو موت کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ اس کی زندگی ایک مستقل کرب کے عالم میں گذرتی ہے ۔ مسرت کے لمحے اس کو بس برائے نام ہی نصیب ہوتے ہیں اور ہر مسرت ایک غم کا پیغام ہوتی ہے ۔ وہ اسی کشمکش میں زندگی بسر کرتا ہے ۔ اس کی زندگی کے ایک ایک پہلو سے بے بسی ٹپکتی ہے ۔ ایک ایک بات سے بے ثباتی کا احساس ہوتا ہے ۔ وہ فطرت کی بڑی ہی حسین تخلیق ہے لیکن اس کی ہستی کا خمیر بے بسی اور بے ثباتی سے اٹھا ہے ۔ اس لیے وہ اس فطرت کی شکوہ سنج ہے ، جس کے ہاتھوں اس کی تخلیق ہوئی ہے ۔ غالب نے اسی حقیقت کو اپنے اس شعر میں پیش کیا ہے :

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

غالب اس حقیقت کو صحیح سمجھتے ہیں ۔ اسی لیے یہ نقش انھیں فطرت کی شوخیٔ تحریر کا فریادی نظر آتا ہے ۔ یہاں انھوں نے فن کار کی چابک دستی کی داد بھی دی ہے ۔ اس تخلیقی عمل میں جو دل کشی اور دل آویزی ہے، اس کو سراہا بھی ہے ۔ لیکن یہ نقش انھیں فانی نظر آیا ہے اور یہ ان کے نزدیک فطرت کی سب سے بڑی ستم ظریفی ہے ۔ نقش کبھی فانی نہیں ہوتا ۔

فن کے شاہکار میں تو ابدیت ہوتی ہے ۔ وہ تو ہمیشہ ہمیشہ باقی رہتا ہے ۔ لیکن یہ کیسی عجیب بات ہے کہ زندگی اور فطرت کا سب بڑا فنی شاہکار یعنی انسان فانی ہے ۔ انسان کو خود اس حقیقت کا احساس ہے ۔ اسی لیے تو اس کا وجود کاغذی نظر آتا ہے۔ کاغذی سے غالب کی مراد بے ثباتی بھی ہے۔ لیکن اس میں اس کے فریادی ہونے کی طرف بھی ایک بہت واضح اشارہ ہے کیونکہ ایک زمانے میں ایران کی سرزمین پر یہ رواج عام تھا کہ فریادی کو کاغذ کے کپڑے پہنائے جاتے تھے ۔ انسان کے بے ثبات وجود کا خیال آتے ہی یہ سارا منظر غالب کے ذہن پر منڈلانے لگتا ہے ۔ ایک بجلی سی کوندتی ہے اور یہ سحر تخلیق ہوتا ہے ۔ اس کی معنویت انسانی زندگی کی ایک نہایت ہی اہم اور بنیادی حقیقت کو اپنے دامن میں رکھتی ہے ۔ غالب اس حقیقت کو سمجھتے ہیں لیکن اس کو سمجھنے کے باوجود ذہنی طور پر اس سے مطابقت پیدا نہیں کر پاتے ۔ اس لیے اس حقیقت کا احساس ایک دکھ کی سی کیفیت ان پر طاری کر دیتا ہے ۔ وہ اس پر کڑھتے ہیں ۔ یہی سبب ہے کہ ان کی لے فریادی ہو جاتی ہے اور اس فریادی لے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو ہر نقش فریادی اور ہر پیکر تصویر کا پیرہن کاغذی نظر آنے لگتا ہے ۔ اس معنویت کے شدید احساس نے غالب سے یہاں نقش فریادی ، شوخیٔ تحریر ، پیرہن کاغذی اور پیکر تصویر کے نئے اشاروں کی تخلیق کرائی ہے ، اور ان سب نے اس کو جمالیاتی اعتبار سے چار چاند لگا دیے ہیں ۔

غالب کی انقلاب پسندی یہاں موضوع اور فن دونوں میں نمایاں ہے ۔ ایک بے چین روح ہی کو اس مضمون کا خیال پیدا ہو سکتا ہے اور اسی کے ہاتھوں ان نئے اشاروں اور کنایوں میں اس کی وضاحت ہو سکتی ہے ۔ کلام غالب میں یہ اشارے اور کنایے بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔ جمالیاتی اقدار کو پیدا کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے ۔ یہاں بھی سارا کھیل اشاروں اور کنایوں ہی کا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کی بدولت خود معنویت میں نئی جان پڑ گئی ہے ۔

اردو شعراء نے تنہائی اور ہجر و فراق کے مضمون کو طرح طرح سے باندھا ہے ۔ اسی لیے اردو کی شعری روایت میں یہ مضمون خاصا پامال ہے ۔ اس میں کوئی نئی بات پیدا کرنا خاصا مشکل کام ہے ۔ لیکن غالب نے اپنے دیوان کی پہلی غزل کے دوسرے شعر میں نئی بات پیدا کی ہے ۔ یہاں ان کے

پیش نظر تنہائی اور ہجر و فراق کی تکلیف کا بیان ہے۔ یہ بیان انہوں نے کیا ہے اور بظاہر صرف اتنی سی بات کہی ہے کہ تنہائی کی رات کاٹنا بڑا ہی سنگل کام ہے۔ اس شام کی صبح نہیں ہوتی۔ بڑے بڑوں کو جب اس سے سابقہ پڑتا ہے تو وہ خون تھوکنے لگتے ہیں۔ ان کی حالت غیر ہو جاتی ہے اور ہزاروں جتن کرنے کے باوجود بھی یہ رات ان سے کاٹے نہیں کٹتی۔ اس مختصر، سادہ اور پامال مضمون کو غالب نے اپنے اس شعر میں پیش کیا ہے:

کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا

لیکن چند پہلو اس میں ایسے نمایاں ہیں، جن کی بدولت یہ شعر بہت بلند ہو گیا ہے۔ ان پہلوؤں میں سب سے زیادہ توجہ طلب تو اس کی چھپی ہوئی اور تہہ در تہہ معنویت ہے، جو اس کو نہایت ہی وسیع اور ہمہ گیر بناتی ہے۔ اور دوسرے اس کا مخصوص جمالیاتی اظہار، جو اس معنویت کو نئی زندگی سے ہمکنار کرتا ہے۔ بظاہر تو اس میں تنہائی کی سختجانی کا ذکر ہے۔ لیکن غالب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جو تکلیفیں عاشق کو ہجر و فراق کے عالم میں اٹھانی پڑتی ہیں، ان کا بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تکلیفیں اتنا طول کھینچتی ہیں اور ان کا سلسلہ اس قدر دراز ہوتا ہے کہ یہ رات کبھی کٹتی ہی نہیں۔ بے چارا عاشق مر مر کے جیتا ہے اور بالآخر اس کو جان محق تسلیم ہونا پڑتا ہے۔ لیکن غالب ایسی سیدھی سادی بات نہیں کرتے۔ وہ بڑے پہلودار شاعر ہیں۔ بظاہر ان کے شعر میں جو معنویت نظر آتی ہے، اس کی تہہ میں کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ کون جانے کہ یہاں تنہائی کی سخت جانیاں اس عام انسان کی سخت جانیاں ہیں، جو انسانیت اور انسانی زندگی کی علامت ہے۔ جس کا نقش کسی کی شوخی تحریر کا فریادی ہے اور جس کا پیراہن غالب کو کاغذی نظر آتا ہے۔ غالب بڑے پہلو دار شاعر ہیں۔ ان کی بات سیدھی سادی ہونے کی بجائے تہہ در تہہ ہوتی ہے۔ وہ استعاروں، اشاروں اور کنایوں میں باتیں کرتے ہیں۔ مشاہدۂ حق کی گفتگو بادۂ و ساغر میں اور ناز و غمزے کی بات دشنۂ و خنجر میں کرنا ان کا مخصوص انداز ہے۔ اس پہلو کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو یہ

بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ اس شعر میں غالب نے ، جہاں تک پیرایہٴ بیان کا تعلق ہے ، استعارے کا استعمال کیا ہے اور اس پردے میں اسی خیال کی وضاحت کی ہے کہ دنیا میں انسان کی زندگی ایک مستقل تنہائی اور ایک مسلسل ہجر و فراق ہے ۔ تنہائی اور ہجر و فراق کی یہ شب تار اس سے کاٹے نہیں کٹتی ۔ اس پر وار ہوتے رہتے ہیں ۔ وہ زخم کھاتا رہتا ہے اور ان زخموں کی تکلیف کبھی کم نہیں ہوتی ۔ ان کے مندمل ہونے کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ غرض وہ اسی عالم میں زندگی کی رات کو گذارتا ہے ۔ لیکن یہ رات گذرتی نہیں ۔ تکلیفوں کی وجہ سے اس کا کلیجا منہ کو آتا ہے ۔ وقت گذارنے کی تمام تدبیریں ناکام ہو جاتی ہیں اور بالآخر وہ جان آفریں کے سپرد کر دیتا ہے ۔ یہی انسانی زندگی کا انجام ہے ۔ انسانی زندگی جوایک مستقل سخت جانی اور ایک مسلسل کرب کی داستان ہے انسان کا سب سے بڑا محبوب مسرت کا خیال اور نشاط کا احساس ہے ۔ وہ زندگی پر جان دیتا ہے ۔ ان دونوں کو حاصل کرنے ہی میں اس کی زندگی گذرتی ہے ۔ لیکن اس کی یہ تمنا پوری نہیں ہوتی اور ساری زندگی اس پر ایک ہجر و فراق کا عالم طاری رہتا ہے ۔ تنہائی کسی حال میں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی ۔ یہ تنہائی تو درحقیقت وہ محرومی ہے ، جس سے انسانی زندگی عبارت ہے ۔ یہ محرومی فرہاد کی زندگی میں بھی تھی ، جس نے شیریں کو حاصل کرنے کے لیے جوئے شیر کو نکالنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا ۔

غالب نے یہاں سخت جانی ہائے تنہائی کے استعارے میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ دیا ہے ، انسانی زندگی کے نہ جانے کتنے معاملات و مسائل کی تصویر کھینچ دی ہے اور نہ جانے کتنے ٹھوس اور سنگین حقائق بے نقاب کر دیے ہیں ۔ شام کو صبح کرنے کے لیے جوئے شیر کی مثال دے کر نہ صرف یہ کہ غالب نے یہاں بالکل ایک نیا شاعرانہ پیکر تراشا ہے بلکہ انسانی زندگی کی ایک اہم حقیقت کی وضاحت بھی کر دی ہے ۔ اسی لیے یہاں معنویت اور حسن کا امتزاج اپنے شباب پر نظر آتا ہے ۔ موضوع اور فن کی تکمیل اور ہم آہنگی کی معراج اسی کو کہتے ہیں ۔

اور پھر آگے چل کر غالب نے عاشق کے جذبہٴ بے اختیار شوق کا

ذکر کیا ہے جس سے شمشیر بھی متاثر ہوتی ہے اور جذبۂ عشق کی بے اختیاری کو دیکھ کر اس کا بھی شوق فراواں جوش میں آ جاتا ہے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قتل کرنے کے لیے ایک والہانہ انداز میں آگے بڑھتی ہے۔ عاشق کے قتل ہونے اور اس کو قتل کرنے میں مزہ آتا ہے اور اس طرح کاروبار شوق کی تکمیل ہوتی ہے ۔ یہ دونوں یہاں ایک بڑے مقصد کے لیے سرگرم کار ہیں ۔ ان دونوں کے سامنے ایک عظیم نصب العین ہے اور یہ مقصد اور نصب العین ہے، عشق کی آخری منزل تک رسائی اور کاروبار شوق کے بلند ترین مقامات کا حصول ۔ اس صورت حال کے بغیر عشق بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے ۔ غالب کے یہاں عشق مارے باندھے کی چیز نہیں ہے ۔ وہ ایک اندرونی خواہش اور دلی جذبہ ہے ، جس میں عاشق کو ایک روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے ۔ اس میں جان دینے کو وہ اپنی زندگی کی معراج سمجھتا ہے ۔ محبوب اس کام میں کسی طرح پیچھے نہیں رہتا ، بلکہ برابر کا شریک ہوتا ہے ۔ عاشق کے دل میں اس کے ہاتھوں قتل ہونے کی آرزو بیدار ہوتی ہے تو وہ اس آرزو کو پورا کرنے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ یہی اس کا مقصد ہے ۔ غالب نے اس خیال کی تصویرکشی بڑے ہی دل موہ لینے والے انداز میں کی ہے :

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

جذبۂ بے اختیار شوق یہاں محبت کرنے والے کے والہانہ جذب و شوق کو واضح کرتا ہے ۔ شمشیر محبوب کی علامت ہے اور سینۂ شمشیر سے دم کا باہر آنا ، اس کیفیت کی عکاسی ہے، جو محبوب کے دل میں عاشق کے جذبۂ بے اختیار شوق کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے ۔ یہ ایک بڑا ہی مکمل اور بھرپور خیال ہے ۔ لیکن غالب کی نظر اتنی سطحی نہیں تھی ۔ وہ اپنے آپ کو صرف اسی خیال تک محدود نہیں کر سکتے تھے ۔ درحقیقت اس شعر میں بھی جو معنویت ہے، وہ پچھلے دو شعروں ہی کی معنویت کا تسلسل ہے ۔ غالب یہاں بھی جذبۂ بے اختیار شوق ، شمشیر اور سینۂ شمشیر کے استعاروں میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انسان اپنے اندر ایک والہانہ شوق اور جذبہ رکھتا ہے ، اسی کا نام زندگی ہے ۔ انسانیت کی تمام ترقی اسی جذب و شوق سے عبارت ہے ۔ انسانیت کی تکمیل اس کے بغیر خواب و

خیال ہے ۔ نصب‌العین اور مقصد اس کے بغیر اپنے آپ کو نمایاں نہیں کرتے ۔ بلکہ انسان میں جذب و شوق نہ ہو تو وہ اس سے گریزاں رہتے ہیں ۔ لیکن اگر انسان کے جذب صادق کا انھیں یقین ہو جائے ، تو وہ اس کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور اس سے ہم آغوش ہونے کی تمنا خود ان کے دل میں موجیں مارنے لگتی ہے ۔ انسانی زندگی کا ارتقا اسی طرح عمل میں آتا ہے ۔ اس کی ترقی یہی صورت اختیار کرتی ہے ۔

غالب کے اس شعر کو اگر اس انداز سے دیکھا جائے تو اس میں معنویت کا ایک نیا زاویہ پیدا ہوتا ہے اور اُس معنویت سے شعر کی حیثیت بہت بلند ہو جاتی ہے ۔ بلکہ فنی اور جمالیاتی اعتبار سے بھی اس میں ایک ترفع نظر آنے لگتا ہے ۔ کیونکہ یہ نیا زاویہ جذبہ' بے اختیار شوق کو صرف سینہ' شمشیر ہی نہیں رہنے دیتا ۔ بلکہ یہ سب علامتوں اور اشاروں کا روپ اختیار کر لیتے ہیں اور اس طرح ان کا وجود بڑی اہمیت اختیار کرلیتا ہے ۔ کیونکہ وہ بہ یک وقت نئی معنویت کو بھی پیدا کرتے ہیں اور نئی جمالیاتی اقدار بھی ان کے ہاتھوں رونما ہوتی ہیں ۔

اس کے بعد جو شعر اس غزل میں آتا ہے، وہ بظاہر معنوی اعتبار سے بقیہ تمام اشعار سے الگ معلوم ہوتا ہے ۔ غالب اس شعر میں تو بظاہر یہ کہتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ عقل چاہے جتنے بھی جتن کرے لیکن دنیا میری بات کو سمجھ نہیں سکتی ۔ اس کے پاس جتنے بھی جال ہیں ، وہ سب بچھا دیے جائیں لیکن میری گفتگو اتنی بلند ہے اور میرا عالم تقریر اس قدر ارفع ہے کہ وہ میری گفتگو اور تقریر کے عنقا کو اسیر نہیں کرسکتی ۔ مطلب بظاہر یہ ہے کہ غالب کی بات کا سمجھنا آسان نہیں ۔ دنیا جہان کے علوم اور ان علوم کے سائے میں پرورش پانے والی عقل ، اس کے اسرار و رموز تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی ۔ غالب نے بظاہر اسی خیال کو سامنے رکھ کے یہ شعر کہا ہے :

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

لیکن اگر غالب اور ان کے فن کے مخصوص مزاج کو دیکھا جائے ، تو اس میں کچھ معنویت پیدا ہوتی ہے اور اس معنویت میں بھی اس سے قبل کے اشعار میں پیش کی جانے والی معنویت کا تسلسل نظر آتا ہے ۔ دراصل

غالب یہاں بھی یہی کہنا چاہتے ہیں کہ انسان ایک عجیب و غریب مخلوق ہے ۔ اس کو سمجھنا آسان بات نہیں ہے ۔ وہ جو کچھ کہتا ہے ، جس خیال کا اظہار کرتا ہے ، اس میں بے شمار عوامل اور محرکات کا خون ہوتا ہے ۔ اس لیے اس کی باتوں کا سمجھنا علم اور عقل کے بس کی بات نہیں ۔ انسانوں کی باتوں میں احساس، جذبے، ادراک اور شعور کی تہہ در تہہ کیفیات ہوتی ہیں ۔ ان تہوں کو بھلا کون کھول سکتا ہے ؟ اسی لیے ترقی کی اتنی منزلیں طے کر لینے کے باوجود کوئی بھی انسان کو پوری طرح سمجھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا ۔

غالب نے اس شعر میں بظاہر اپنی بات کہہ کر انسان کی بلندی کو واضح کیا ہے اور دام شنیدن اور عنقا کے اشاروں سے کام لے کر اس میں نہ صرف معنوی وسعت اور بلندی پیدا کی ہے بلکہ انداز بیان کو حسن وجمال سے بھی معمور کر دیا ہے ۔

غزل کے آخری شعر میں غالب نے بظاہر عالم وحشت کی تصویر کھینچی ہے ۔ یہ عشق کی ایسی منزل ہے جہاں پہنچ کر عاشق کو کسی طرح چین نہیں ملتا ۔ اسیری اس کا مقدر بن جاتی ہے لیکن وہ ہر لمحے آتش زیر پا رہتا ہے اور یہ کیفیت زنجیروں کو بے کار کر دیتی ہے ۔ اس کے حلقے موئے آتش دیدہ ہو کر بے کار ہو جاتے ہیں ۔ عشق کی وحشت بہر صورت اپنا کام کرتی رہتی ہے ۔ اس کی گرمی کی تاب بھلا کون لا سکتا ہے :

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

لیکن کون جانے کہ غالب نے اس میں اسیری ، آتش زیر پا ، موئے آتش دیدہ اور زنجیر کے اشاروں میں اس کے علاوہ اور کیا کیا کچھ کہا ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ اسیر خود وہ انسان ہو جس کا تذکرہ انھوں نے اس غزل کے پہلے شعر میں کیا تھا ۔ اس کی اسیری اس منزل کی علامت ہو ، جس پر انسان کسی خاص نصب‌العین کو حاصل کرنے کی غرض سے پہنچنا چاہتا ہے اور اس کے آتش زیر پا ہونے والی کیفیت وہ قوت ارادی ہو، جس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا ۔ جس کے سامنے زنجیریں کٹ کٹ کر گر جاتی ہیں اور اس کا ہر حلقہ ایک موئے آتش دیدہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ اور یہ معنویت بعید از قیاس نہیں ہے ۔ کیوں کہ غالب اپنے اس مخصوص

انداز میں کچھ ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ ان کی شاعری اس قسم کے خیالات سے بھری پڑی ہے -

یہ معنویت نہ صرف یہ کہ بلند اور عظیم ہے بلکہ اس سے شعر کا حسن بھی دوبالا ہو جاتا ہے - اس معنویت کے ہاتھوں غالب کے اس شعر میں ایک بڑی ہی تہہ دار سی علامتی فضا پیدا ہوتی ہے ، جس سے اس کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے -

غرض یہ کہ غالب کا کلام اپنے دامن میں معنویت اور فن دونوں کے کچھ ایسے نئے زاویے رکھتا ہے ، جن میں ان کی انسان دوستی اور انقلاب پسندی کی تصویر ابھری ہوئی نظر آتی ہے -

غالب
کی
شاعری میں
شوخی اور شگفتگی
کے عناصر

غالب ایک بڑی ہی رنگین ، ایک بڑی ہی پرکار اور ایک بڑی ہی پہلو دار شخصیت رکھتے تھے۔ زمانے نے انھیں یوں تو ان کو خود اپنی شکست کی آواز بنا دیا تھا ۔ لیکن اس کے باوجود ان میں گل نغمہ ، اور پردۂ ساز ، ہونے والی خصوصیت موجود تھی ۔ اردو میں ان کی سی باغ و بہار شخصیت کا شاعر کوئی اور پیدا نہیں ہوا ۔ ویسے یہ بہت بڑا دعویٰ ہے کیوں کہ سودا ، انشا اور اکبر کے سے شاعر بھی اردو میں پیدا ہوئے ہیں ، جن کی بنیاد ہی شوخی اور شگفتگی پر ہے ۔ لیکن غالب کی شخصیت میں جو بات تھی، وہ ان شعراء میں بھی نہیں ہے۔ غالب کی طبیعت میں جو رچاؤ اور ان کے مزاج میں جو پرکاری تھی ، اس سے سودا ، انشا اور اکبر محروم تھے ۔ ان سب کے یہاں شوخی ضرور ہے لیکن ان کی شوخی کی تہہ میں کسی سے الجھنے ، کسی سے لڑنے ، کسی کی نفی کرنے کا ہاتھ ضرور کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ غالب کے یہاں یہ الجھنے والی بات نہیں تھی ۔ وہ ہر چیز سے محظوظ ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ہر بات ان کے یہاں لطیف احساس کو بیدار کرتی تھی ۔ وہ غلط باتوں پر بھی مسکرا سکتے تھے ۔ سنجیدہ معاملات پر بھی ان کی طبیعت رواں ہوسکتی تھی ۔ اور یہ سب کچھ کرشمہ تھا مزاج کی اس خصوصیت کا جسے عام طور پر احساس مزاح یا (Sense of Humour) سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ غالب کی شخصیت میں یہ خصوصیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور یہ اسی کا اثر ہے کہ ان کی شخصیت میں شوخی کا وہ رچاؤ ملتا ہے جس نے ان کی شاعری میں گل کاریاں کی ہیں اور اسے زعفران زار بنا دیا ہے ۔

یوں تو ان کی شخصیت میں غم بھی ہے لیکن اس غم نے ان کے یہاں تاریکی نہیں پیدا کی ۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ اس غم کے باوجود زندگی سے دل چسپی لے سکتے ہیں ۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر ہنس سکتے ہیں ۔ مسکرا سکتے ہیں ۔ انھیں رونا نہیں آتا ۔ وہ روتے میں بھی ہنستے ہیں ۔ انھیں ہنسنے پر رونا نہیں آتا ، رونے پر ہنسنا ضرور آتا ہے ۔ اور ان کی شخصیت کی یہ خصوصیت بڑی حد تک اس معاشرتی، تہذیبی اور فکری ماحول کی بھی پیدا کردہ ہے، جس میں انھوں نے آنکھ کھولی اور جس میں ان کے ذوق و شعور کا نشو و نما ہوا ۔ غالب نے اس رچی ہوئی تہذیب کے دور آخر کو دیکھا، جس کو مغلوں نے کئی صدیوں میں پیدا کیا تھا ۔ ان کے زمانے میں یہ تہذیب انحطاط پذیر ضرور تھی لیکن اس کی پختگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ اس پختگی نے اس زمانے کے افراد میں خود اعتمادی پیدا کی اور انھیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا ۔ اس زمانے کی نیم مذہبی اور نیم سیاسی تحریکوں نے افراد کے دلوں میں ولولوں کے چراغ روشن کیے، امنگوں کی شمعیں فروزاں کیں اور اس کا نتیجہ ایک عام جولانی کی صورت میں رونما ہوا ۔ غالب کی شخصیت اسی صورت حال کی ترجمان ، عکاس ، بلکہ علم بردار ہے ۔ اور ان کے کلام میں شوخی کی جو چاندنی سی چھٹکی ہوئی نظر آتی ہے ، اس میں اس صورت حال کا بڑا ہاتھ ہے ۔

غالب کے مزاج کی یہ شوخی سب سے زیادہ ان کی شاعری پر اثرانداز ہوئی ہے ۔ اس شوخی نے اس میں زندگی اور جولانی پیدا کی ہے ، جدت اور اپج پیدا کی ہے رنگینی اور پرکاری پیدا کی ہے ، اور ان سب نے مل کر اس کو ایک اچھا خاصا نگار خانہ بنا دیا ہے ۔ ایک ایسا نگار خانہ ، جہاں ہر تصویر اپنے رنگوں کی شوخی اور اپنے خطوط کے بانکپن سے پہچانی جاتی ہے ۔ غالب کی شوخی نے ان تصویروں کو زندگی سے اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ ان میں سے ہر ایک منہ سے بولتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ۔

یہ شوخی غالب کی شاعری کا کوئی ایک پہلو نہیں ہے ۔ ان کی شاعری کے ہر پہلو میں یہ شوخی ہے ۔ اور غالب کی شاعری کسی ایک پہلو سے عبارت بھی نہیں ہے ۔ اس میں بڑا تنوع ہے ۔ بڑی رنگا رنگی ہے ۔ بڑی وسعت ہے ۔ بڑی ہمہ گیری ہے ۔ لیکن اس تنوع ، رنگا رنگی ، وسعت اور ہمہ گیری میں شوخی کا عنصر ضرور نمایاں نظر آتا ہے ۔ انھوں نے حسن و

عشق کے معاملات اور واردات و کیفیات کی تصویر کشی بھی کی ہے اور اس کے ان گنت پہلوؤں کو اپنی غزلوں کا موضوع بنایا ہے ۔ تصوف کے مسائل اور فلسفے کے نکات بھی انھوں نے اپنی غزلوں میں پیش کیے ہیں ۔ عمرانی اور تہذیبی معاملات کے اسرار و رموز کو بھی بے نقاب کیا ہے ۔ لیکن ان سب کے بیان میں ان کی طبعیت کی شوخی عجیب عجیب زاویوں سے اپنے آپ کو رونما کرتی رہی ہے ۔ یہ بہ ذات خود ہی اہم نہیں ہے ۔ اس اعتبار سے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ اس نے ان کی شاعری میں ایک نئی فضا ، ایک نیا انداز اور ایک نیا آہنگ پیدا کر دیا ہے اور اس طرح ان کی غزلوں میں معنوی اور فنی اعتبار سے ایک نئی زندگی کی لہر سی دوڑا دی ہے ۔

غزل کی شاعری سوز و گداز کی شاعری ہے ۔ وہ شوخی کو گوارا نہیں کرتی ۔ لیکن غالب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس شوخی کو غزل کے لیے گوارا بنا دیا ہے اور وہ ان کی غزلوں کا ایک لازمی جزو نظر آتی ہے ۔ اس شوخی کا پتہ ان کے یہاں حسن کے بیان میں بھی چلتا ہے ، محبوب اور محبت کرنے والے کے جو روابط ہیں اور ان کے نتیجے میں جو حالات پیدا ہوتے ہیں ، ان میں بھی اس کی جھلک نظر آتی ہے ۔ عشق اور کاروبار شوق کی جو تفصیل انھوں نے پیش کی ہے ، اس میں بھی اس شوخی کا عنصر کار فرما دکھائی دیتا ہے ۔ اس عشق کے جو نتائج نکلتے ہیں اور جو اس کا انجام ہوتا ہے ، اس کی جزئیات میں بھی شوخی اپنا اثر دکھاتی ہے ۔ غرض غالب کسی جگہ بھی اس شوخی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ۔ بلکہ اس سے خاطر خواہ کام لیتے ہیں ۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کے ایسا کرنے سے غزل کے کارگہ شیشہ گری کو ٹھیس نہیں لگتی ۔ یہ آبگینہ اس تندیٔ صہبا سے پگھلتا نہیں ۔ اس کی آب و تاب پوری طرح باقی رہتی ہے بلکہ اس میں جو شراب ہے ، اس کی مستی میں کچھ اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کے ظاہری رنگ میں کچھ اور بھی تیزی پیدا ہو جاتی ہے اور ان دونوں چیزوں سے دل کو سرور اور آنکھوں کو نور ملتا ہے ۔

اردو غزل کی روایت میں عشق کا آغاز دل دینے سے ہوتا ہے ۔ عاشق کو محبوب سے محبت ہو جاتی ہے ۔ گویا وہ اپنے دل سے ہاتھ دھو لیتا ہے اور اس کا دل محبوب لے لیتا ہے ۔ غالب نے اس خیال کو پیش تو کیا ہے

لیکن اس کو پیش کرتے ہوئے صرف یہ بات ہی نہیں کہی ہے کہ عاشق نے دل محبوب کو دے دیا اور اس طرح عشق کا آغاز ہو گیا بلکہ اس خیال میں یوں ایک پہلو پیدا کیا ہے:

کہتے ہو نہ دیں گے ہم ، دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے، ہم نے مدعا پایا

یہاں غالب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ دل تو ان کے پاس موجود ہی نہیں ہے ۔ اس کے گم ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے ۔ ایسی صورت میں محبوب کا شوخی سے یہ کہنا کہ اس کو دل پڑا ہوا مل گیا ، تو وہ نہیں دے گا کوئی معنی نہیں رکھتا ۔ یہاں محبوب کے بیان اور اس کے جواب دونوں میں شوخی ہے اور یہ شوخی ہی اس شعر کی بنیاد ہے ۔

غالب ایک عاشق شاعر کی خصوصیات اپنی شخصیت میں رکھتے ہیں ۔ وہ حسن پرست ہیں اور حسن پرستی ہی سے ان کے عشق کا سوتا پھوٹتا ہے ۔ لیکن اس رابطے کا خیال ان کے یہاں کیسے کیسے دلچسپ خیالات پیدا کرتا ہے ۔

ایک جگہ کہتے ہیں :

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

اور پھر دوسرے شعر میں کہتے ہیں :

غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

ان اشعار میں چاہے بڑی حقیقتوں کا بیان نہ ہو لیکن ان میں شوخی کا عنصر بڑی پر لطف سی فضا پیدا کر دیتا ہے ۔

اپنی غزلوں میں غالب نے رندی اور شاہد بازی پر بہت زور دیا ہے اور عشق کی بنیاد شاہد بازی ہی بتائی ہے ۔ ظاہر ہے ایک رند شاہد باز محبوب کو خاطر میں نہیں لاتا ۔ وہ اس کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر اپنا مطلب نکالتا ہے اور جب محبوب اس کے دام میں پھنس جاتا ہے تو اس کو خوشی حاصل ہوتی ہے ۔ لیکن جب اس کی طرف سے پیمان وفا باندھنے کا اظہار ہوتا ہے تو وہ محبوب کی اس حرکت کو اس کی سادگی پر محمول کرتا ہے ۔ غالب نے کیسی شوخی سے اس خیال کی ترجمانی کی ہے :

سادہ پرکار ہیں خوباں غالب
ہم سے پیان وفا باندھتے ہیں

اس شوخی نے غالب کی غزلوں میں بعض ایسے مضامین بھی پیدا کیے ہیں - جو بالکل نئے ہیں اور جو ان سے قبل کی غزلوں میں نظر نہیں آتے - مثلاً حسرت دیدار کا موضوع ویسے تو تغزل میں بہت عام ہے - عاشق کو محبوب کے دیدار کی حسرت رہتی ہے- وہ اس تک اپنا پیام مختلف طریقوں سے پہنچاتا بھی ہے - لیکن غالب کی شوخی اس پیام کو محبوب تک بالکل ایک نئے طریقے سے پہنچاتی ہے - وہ سرنامے پر آنکھ کی تصویر کھینچتے ہیں تا کہ خط کو شروع کرتے ہی محبوب پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ عاشق حسرت دیدار کا شکار ہے :

آنکھ کی تصویر ، سرنامے پہ کھینچی ہے کہ تا
تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرت دیدار ہے

سرنامے پر آنکھ کی تصویر کھینچنا ایک ایسا خیال ہے جس میں حد درجہ سادگی اور معصومیت ہے - لیکن اس میں شوخی کا رنگ بھی بہت تیکھا ہے - اور یہی اس کی جان ہے -

یہ شوخی ایک جگہ غالب کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ساری دنیا کو چھوڑ کر ، سارے شہر میں کان پر قلم رکھ کر یہ آواز لگاتے پھریں کہ اگر کسی کو خط لکھوانا ہو تو لکھوا لے - اس خیال سے کہ محبوب کو ان گنت خط لکھنے والے ہیں- بہت ممکن ہے اس سے لکھوالیں - اس طرح انہیں خط کے مضمون کا علم ہوتا رہے گا اور دلچسپی بھی رہے گی - چنانچہ وہ ہر صبح کان پر قلم رکھ کر نکل جاتے ہیں - بس یہی ان کا مشغلہ ہے :

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

گویا عاشق کے لیے اب کوئی مشغلہ رہ ہی نہیں گیا ہے - سوائے اس کے کہ وہ صبح سے شام تک خط لکھتا پھرے - اس خیال کے مضحکہ خیز ہونے ہی میں شوخی ہے - اور اس شوخی نے اس میں جدت اور اپج پیدا کر دی ہے -

محبوب کے بوسے کا متمنی ہر عاشق ہوتا ہے اور اس تمنا کا اظہار وہ نہ جانے کس کس طرح کرتا ہے - غالب اس موضوع کو بالکل نئے انداز

میں پیش کرتے ہیں۔ ایک شعر میں حسن طلب کا اظہار یوں کیا ہے :

غنچۂ نا شگفتہ کو ، دور سے مت دکھا کہ یوں

بوسے کو پوچھتا ہوں میں، منہ سے مجھے بتا کہ یوں

منہ سے بتانے میں حسن طلب موجود ہے اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ بوسے کی صورت ہی میں نکل سکتا ہے۔ یہاں شوخی ہی اس اظہار تمنا کی جان ہے۔

ایک اور شعر میں غالب نے اس سے بھی زیادہ تیکھے انداز میں اس مضمون کو باندھا ہے۔ کہتے ہیں :

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ

جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

یہاں بھی اس شعر کی بنیاد غالب کی شوخی ہی ہے۔ اگر شوخی نہ ہوتی تو یقیناً اس شعر کو مبتذل کہا جاتا لیکن اس شعر میں شوخی نے بڑی حد تک اس ابتذال کو کم کر دیا ہے۔ جب ابتذال کا خیال آتا ہے۔ شوخی سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے اور اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔

غالب دوسرے غزل گو شاعروں کی طرح محبوب کے کوچے میں جاتے ہیں ، اور اس کوچہ گردی میں انھیں عجیب عجیب واقعات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ وہ بستر لے کے نکلتے ہیں۔ اس خیال سے کہ محبوب کے در کے سامنے لگا دیں گے اور مزے سے لیٹے رہیں گے۔ یہاں دیدار کا بھی امکان ہے اور وصال کا بھی۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ محبوب پہلے تو اپنے در پر رہنے کی اجازت دیتا ہے مگر جیسے ہی بستر کھلتا ہے، وہ اپنے قول سے پھر جاتا ہے اور نکال باہر کرتا ہے :

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا

جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

یہ ایک مضحکہ خیز سا خیال ہے لیکن شوخی نے اس کی مضحکہ خیزی کو پس منظر میں ڈال دیا ہے اور اس طرح اس موضوع میں جان ڈال دی ہے۔

غرض محبوب غالب کا بستر گول کرتا ہے لیکن اس بستر کے گول ہونے کے بعد بھی وہ چین سے نہیں بیٹھتے اور اس کوچے کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔ جہاں پاسبان ان کو آڑے ہاتھوں لیتا ہے۔ دربان کے ہاتھوں

ان کی خوب مرمت ہوتی ہے ۔ کبھی پاسبان ان کا آشنا بھی نکل آتا ہے ۔ اس لیے محبوب جو ذلت دیتا ہے ، وہ اسے ہنسی میں ٹالتے ہیں :

دے وہ جس قدر ذلت، ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ، ان کا پاسباں ، اپنا

لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انھیں اُٹھ کے پاسباں کے قدم لینے پڑتے ہیں ، ورنہ ان کی شامت آنے میں کوئی کسر نہیں رہ جاتی :

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا ، مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

ورنہ ہوتا یہ کہ مار کھانی پڑتی ۔

لیکن وہ باز نہیں آتے ۔ ان کا جی بار ہا چاہتا ہے کہ محبوب کے کوچے میں صدا لگائیں تاکہ اسے خبر ہو جائے لیکن وہ سیاست درباں سے ڈرتے ہیں ۔ بس یہی ان کے راستے میں حائل ہو جاتی ہے :

دل ہی تو ہے ، سیاست درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے

وہ صدا تو نہیں لگاتے لیکن دوسری حرکتیں جاری رہتی ہیں ، جن کو دیکھ کر محبوب گالیاں دیتا ہے ۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جتنی دعائیں یاد کرکے جاتے ہیں ، وہ سب صرف درباں ہو جاتی ہیں :

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں ، صرف درباں ہو گئیں

ان تینوں اشعار میں بھی اصل بنیاد شوخی ہے ۔ اس شوخی نے انھیں دلچسپ بنایا ہے ، ورنہ بہ ذات خود ان اشعار کے موضوعات میں کوئی خاص بات نہیں ۔ شوخی ہی نے ان میں معنویت کی بجلیاں بھر دی ہیں ۔

غزل کی روایت میں محبوب کی مجلس آرائی کو پیش کرنا یوں تو ایک بہت عام سی بات ہے ۔ تقریباً ہر شاعر نے اس پر طبع آزمائی کی ہے ۔ لیکن یا تو اس میں محبوب کی زیادتی کا احساس ہوتا ہے یا محبت کرنے والے کی ناکسی اور پامالی پر جا کے تان ٹوٹتی ہے ۔ غالب اس مضمون کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان دونوں میں سے کوئی بات بھی ضرورت سے زیادہ نہیں اُبھرتی ۔ بلکہ اس کے بجائے ان کا خیال ایک دلچسپ مزاحیہ سی

فضا قائم کر دیتا ہے ۔ چنانچہ اسی فضا کی طرف نظر زیادہ جاتی ہے ۔
یہ شعر دیکھیے :

میں نے کہا کہ 'بزم ناز چاہیے غیر سے تہی'
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ 'یوں ؟'

یہاں حزن و یاس اور ذلت و رسوائی سے کہیں زیادہ محبوب کی ستم ظریفی کا احساس چھایا ہوا معلوم ہوتا ہے اور غالب نے اپنی شوخی سے یہ صورت حال پیدا کی ہے ۔

ایک اور شعر میں نوبت محبت کرنے والے کی بے حیائی تک جا پہنچتی ہے ۔ محبوب کی محفل میں اس پر انگلیاں اٹھتی ہیں اور اشارے ہوتے رہتے ہیں لیکن وہ اپنی جگہ بیٹھا رہتا ہے ، اُٹھنے کا نام لیتا :

اِس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

بظاہر اس شعر کی فضا مجموعی طور پر ایسی کچھ زیادہ ہنسانے والی نہیں ہے ۔ کیونکہ یہاں محبت کرنے والے کی محرومی کا غم بھی اس میں شامل نظر آتا ہے، لیکن "اشارے ہوا کیے" کا فقرہ جیسے ہی آتا ہے، شوخی کی ایک بجلی سی کوندتی ہے اور ساری فضا کو ایک لمحے کے لیے منور کر دیتی ہے۔

غالب کی غزلوں میں تغزل کے متعلق بعض اور اشعار بھی ایسے ملتے ہیں ، جن میں محبت کرنے والے کی ناکامی اور حسرت ، مجبوری اور معذوری کا احساس ہوتا ہے لیکن ایسے اشعار میں بھی غالب اپنی شوخی سے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیتے ہیں ، جن میں ایک شگفتگی ہوتی ہے ۔ یہ اشعار اس صورت حال کے ترجمان ہیں :

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا ؟

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر، تھا جو راز داں اپنا

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

مرے ہونے میں کیا ہے رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اور ایسے اشعار کی غالب کے کلام میں کمی نہیں ہے ۔ ان کا دیوان ایسے اسعار سے بھرا پڑا ہے ۔ ان میں غالب کی شوخی بہر حال کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے ۔

اردو غزل میں محبوب سے ملنے اور ملاقات کرنے کے جن طریقوں اور وسیلوں کا ذکر ہے ، ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے ۔ کبھی شاعر دیوار کے سائے تلے بیٹھا ہے ۔ کبھی اس کے ارد گرد چکر کاٹتا ہے اور بہت ہوا تو اس کی محفل میں جا پہنچتا ہے ، جہاں اس کی شامت ہی آ جاتی ہے ۔ لیکن غالب کی شوخ مزاجی نے اس کام کے لیے ایک بڑا ہی لطیف ذریعہ اور وسیلہ تلاش کیا ہے ۔ وہ مصوری سیکھتے ہیں :

سیکھیں ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

ظاہر ہے کہ مصوری ایک لطیف فن ہے اور اس کو مہ رخوں کی ملاقات کے لیے تقریب بنانا اس سے بھی لطیف بات ہے ۔ اس کو غالب کی شوخی ہی پیدا کر سکتی ہے ۔

غالب کی شاعری میں روایت کا رچا ہوا شعور ملتا ہے لیکن وہ روایتی شاعر نہیں ہیں ۔ ان کے یہاں روایتی شاعری سے انحراف ہے ۔ اور وہ اس کے موضوعات سے اس حد تک برگشتہ ہیں کہ کہیں کہیں خود ان موضوعات کو کچھ اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ اس کی تہہ میں طنز کی ایک لہر سی اٹھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے غالب ہماری شاعری کے روایتی موضوعات پر فقرے چست کر رہے ہیں ۔ ان کے اس قسم کے اشعار اسی صورت حال کے ترجمان ہیں :

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے ، اے خدا !
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ہے کیا جو کس کے باندھیے ؟ میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں ؟

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا، دے مجھے
میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

یہاں تلوار کے بغیر لڑنے ، محبوب کی کمر کے معدوم ہونے کے باعث بزم محبوب میں نظر نہ آنے کے مضامین کو سنجیدگی کے ساتھ پیش نہیں کیا گیا ہے - بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے ، جیسے وہ ان تمام باتوں کا مذاق اڑا رہے ہیں - اسی لیے یہاں ہلکی پھلکی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور طنز کا ہاتھ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے اور یہ سب کچھ ان کی شوخی ہی کا طفیل ہے -

غالب کی غزلیں شوخی کے عناصر سے بھری پڑی ہیں - ان کی غزلوں میں باعتبار مضامین جتنے پہلو بھی نمایاں ہیں ، ان سب میں اس شوخی کے اثرات نظر آتے ہیں - ان کا تصوف اور فلسفہ تک اس سے خالی نہیں ہے - لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان کی اس شوخی کا شباب معاملات حسن و عشق کی ترجانی ہی میں ملتا ہے -

غالب
کی
شاعری میں
اجتماعی شعور

غالب انیسویں صدی کے ایک ایسے شاعر ہیں جنہیں ، اُس زمانے کے مسلمانوں کی زندگی میں برپا ہونے والے آسوب حشر کا بخوبی علم تھا ۔ وہ اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے ۔ انہیں اس حقیقت کا احساس تھا کہ اُن کے آس پاس کی زندگی کا شیرازہ منتشر ہوچکا ہے ۔ اس کی شیرازہ بندی اُن کے بس کی بات نہیں تھی ۔ لیکن اس انتشار کو شدت کے ساتھ محسوس کرنا اور اُس پرخون کے آنسو بہانا، اُن کے اختیار میں ضرور تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی شاعری میں جگہ جگہ اس انتشار کی تصویر کشی کی ہے ۔ اس تصویر کشی کی تہہ میں اپنی تہذیب کو زندہ رکھنے کا خیال ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے ۔ جب وہ اپنی زبوں حالی پر کڑھتے ہیں اور اپنی پامالی پر خون کے آنسو بہاتے ہیں تو در حقیقت اُس وقت کے مسلمانوں کی معاشرتی اور تہذیبی زبوں حالی کا احساس کار فرما ہوتا ہے ۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اس معاشرت اور تہذیب کی رسوائی ہو رہی ہے اور اُس کا چراغ آندھیوں کی زد پر ہے ۔

غالب نے جس زمانے میں آنکھ کھولی وہ سیاسی ، معاشرتی اور تہذیبی اعتبار سے ایک عجیب انتشار اور بد نظمی کی نشان دہی کرتا ہے ۔ اُس وقت اس بر عظیم میں مسلمانوں کا قائم کیا ہوا سیاسی نظام دم توڑ رہا تھا ۔ اُن کی معاشرت کی بنیادیں ہل چکی تھیں ۔ اُن کی تہذیب میں رخنے پڑ گئے تھے ۔ وہ مغل جو صدیوں تک اس سر زمین پر اسلامی اقدار کا پرچم لہراتے رہے تھے، اب صرف نام کے حکمراں رہ گئے تھے ۔ اُن کی طاقت ختم ہو چکی تھی ۔ اُن کے اقبال کا آفتاب گہنا گیا تھا ۔ اس انحطاط

و زوال کے باعث جو انتشار پیدا ہو سکتا ہے ، وہ اس ماحول میں نمایاں تھا ۔ افراد زندگی سے بیزار تھے ۔ انھیں اپنے مستقبل کا علم نہیں تھا ۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے ۔ اُن کی زندگی میں ایک کھوکھلا پن پیدا ہو گیا تھا ۔ وہ اپنے آس پاس اور گرد و پیش ایک خلا سا محسوس کرتے تھے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس ماحول میں نئی زندگی کی لہریں اُٹھ رہی تھیں ۔ نئی قدروں کا وجود بھی ہو رہا تھا ۔ یہ اور بات ہے کہ ان سے اُس وقت افراد نے ذہنی طور پر مطابقت پیدا نہیں کی تھی ۔ انھیں اپنا ماضی بہت عزیز تھا ۔ وہ اس کی عظیم روایات کو اپنے سینے سے چمٹائے اور کلیجے سے لگائے ہوئے تھے ۔ انھیں اس روایت کی ارتقائی کیفیت کے رک جانے کا بڑا غم تھا ۔ اس غم کی وجہ سے اُن کی آنکھیں پرنم تھیں ۔ ایک نئی زندگی کا آفتاب ضرور طلوع ہو چکا تھا لیکن ایک دھند سی اُس کو چاروں طرف گھیرے ہوئے تھی ۔ مسلمانوں کی زندگی کو بدلنے اور اُس کو نئے حالات سے آشنا کرنے کے خیالات بھی کسی نہ کسی صورت میں پیدا ہونے لگے تھے ۔ اِن خیالات نے اس زمانے میں بعض تحریکوں کا روپ بھی اختیار کر لیا تھا ۔ جہاد کے تصورات بھی عام ہونے لگے تھے ۔ عمل کا خیال بھی نمایاں ہونے لگا تھا ۔ افراد شعور سے بھی کام لینے لگے تھے ۔ غرض اُس وقت کا ماحول، باوجود ناسازگار حالات کے، ایک انقلابی تبدیلی سے ہمکنار تھا ۔

غالب اسی ماحول کی پیداوار ہیں اور اُن کی شخصیت اور شاعری اسی ماحول کی آئینہ دار ہے ۔ غالب صرف اپنی انفرادیت ہی میں گم نہیں تھے، وہ اپنے آپ سے باہر نکل کر بھی دیکھتے تھے ۔ اُس زمانے کے مسلمانوں کی زندگی کا پورا نقشہ اُن کی آنکھوں کے سامنے تھا ۔ اُس وقت کے معاشرتی اور تہذیبی نشیب و فراز کی تصویر اُن کی نظر میں تھی ۔ اُنھوں نے مسلمانوں کی ایک عظیم سلطنت کو دم توڑتے ہوئے دیکھا ۔ اُن کی بلند پایہ معاشرت اور تہذیب کی شہرت اُنھیں گرتی ہوئی نظر آئی ۔ وہ ان حالات سے متاثر ہوئے اور یہ تاثر اتنا گہرا ہوا کہ وہ اس کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کے لیے مجبور ہوئے ۔ اُن کے خطوں میں تو ان حالات کی تفصیل کچھ اس طرح بکھری ہوئی ہے کہ اس کو دیکھ کر اس زمانے کے مسلمانوں کی زندگی کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے ۔ خیر ، خطوں میں تو یہ سب کچھ ہونا ہی

چاہیے تھا۔ کیونکہ وہ بہر حال اُس زمانے میں لکھے گئے ہیں جب ناساز گار حالات اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے - اور غالب کی زندگی ان ہی حالات کے سائے میں گذر رہی تھی - لیکن اُنھوں نے اپنی غزلوں میں بھی اُن حالات کی تصویر کشی کی ہے - وہ مشاہدۂ حق کی گفتگو بادہ و ساغر میں اور ناز و غمزہ کی بات دشنہ و خنجر میں کرتے تھے - یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اپنے ان اجتماعی اور قومی تاثرات کو غزل کے مخصوص اشاروں اور کنایوں میں پیش کیا ہے -

اس میں شبہ نہیں کہ غالب کی غزل کا ایک اہم موضوع حسن و عشق ہے - لیکن اُنھوں نے اس حسن و عشق کے مختلف پہلوؤں کو اپنے زمانے کے مخصوص معاشرتی پس منظر میں پیش کیا ہے - وہ اپنی عشقیہ شاعری میں اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ اُن کے معاشرے میں بوالہوس کی کوئی حیثیت نہیں - حسن پرستی تو اہل نظر کا شیوہ ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حسن پرستی کے کچھ معیار رکھتے تھے - یہ حسن پرستی اُن کے خیال میں عشق کا منبع ہے اور عشق زندگی میں ایک مکمل نظام کی حیثیت رکھتا ہے - سماجی زندگی اس کو متاثر کرتی ہے اور خود وہ سماجی زندگی کو متاثر کرتا ہے - ان دونوں کو الگ کرکے نہیں دیکھا جا سکتا - اُن کے یہ اشعار اس حقیقت کو پوری طرح واضح کرتے ہیں :

✓ گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار

لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

✓ تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں

تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

✓ لکد کوب حوادث کا تحمّل کر نہیں سکتی

مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اُٹھانے کی

کم جانتے تھے ہم بھی غم عشق کو پر اب

دیکھا تو کم ہوئے پہ غم روزگار تھا

یہاں غالب نے غم عشق اور غم روزگار کے رشتے کی وضاحت کی ہے اور دونوں کے باہمی ربط کو بے نقاب کیا ہے - ان سے صاف ظاہر ہے کہ

ناسازگار حالات کے باعث عشق کے عام تقاضوں کو پورا کرنا اور اُس کے اعلیٰ معیاروں کا برقرار رکھنا آسان نہیں تھا ۔ یہ خیالات اُن کے سماجی اور اجتماعی شعور پر دلالت کرتے ہیں ۔

لیکن یہ اجتماعی شعور صرف ان کی عشقیہ شاعری ہی تک محدود نہیں ۔ یہ شعور تو اُن کے یہاں اس قدر بڑھا ہے کہ وہ اپنی غزلوں میں اس زمانے کی زندگی کا اچھا خاصا مرثیہ لکھنے لگے ہیں ۔ غزلوں کے ان اشعار میں اسلوب تو غزل کا ہے لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو ان میں اُس زمانے کی سماجی حالت، اُس کے بنیادی معاملات اور اساسی مسائل بے نقاب نظر آتے ہیں اور ان کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُس زمانے کی سماجی زندگی کا کیا حال تھا ؟ افراد پر کیا بیت رہی تھی اور وہ اُس کے بارے میں کیا سوچ رہے تھے ؟

غالب کو مسلمانوں کی تہذیبی عظمت کا احساس تھا ۔ وہ یہ جانتے تھے کہ اُن کی تہذیب نے جو روایت قائم کی ہے ، اُس پر یقیناً فخر کیا جا سکتا ہے ۔ انسانی تاریخ میں اُس نے جو کار ہائے نمایاں انجام دے ہیں ، اُن کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن اس روایت کو اپنے ارتقائی سفر میں ناسازگار حالات سے بھی دوچار ہونا پڑا ۔ اسی احساس کو غالب نے اس شعر میں ڈھالا ہے :

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

بظاہر تو یہ شعر ایک انفرادی جذبے کا ترجمان معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی تہہ میں در حقیقت ایک اجتماعی احساس و شعور موجود ہے ۔

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے جس میں غالب نے اسی بنیادی خیال کو کچھ اور وضاحت سے پیش کیا ہے ۔ غالب کو مغلوں کی تہذیبی بساط کے اُلٹنے کا بڑا غم تھا ۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں وہ اس کو بہت بڑا سانحہ سمجھتے تھے ۔ کیونکہ مسلمانوں کی اس عظیم سلطنت کی بنیادوں کے ہل جانے کی وجہ سے انتشار اور افراتفری کا دور دورہ ہوا اور اُن کی عزت خاک میں مل گئی ۔ غالب نے جب یہ شعر کہا تو اُس کی تہہ میں یہی خیال تھا :

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

یہاں آدم کے خلد سے نکلنے کی تلمیح کا سہارا لے کر غالب نے اپنی تہذیبی روایات کے بارے میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ دیا ہے۔ جتنا بھی غور کیجیے، اس میں معنویت کی دنیائیں نظر آتی ہیں۔

اس تہذیبی روایت کے انحطاط و زوال کی وجہ سے کساد بازاری کا دور دورہ ہوا، معیار باقی نہ رہے۔ قدریں منتشر ہو گئیں۔ اصول ڈانوا ڈول ہو گئے۔ اس انتشار اور ہنگامے میں کسی ایک کو بھی طانیت نصیب نہ ہوسکی۔ نفسی نفسی کا عالم پیدا ہوا۔ ایک دوسرے سے توقعات اٹھ گئیں۔ خستگی کی کوئی داد دینے والا نہ رہا کیونکہ خستگی تو ہر ایک کا مقدر بن گئی تھی۔ غالب نے اس شعر میں اسی بنیادی خیال کی ترجمانی کی ہے:

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغ ستم نکلے

صاف ظاہر ہے کہ سماجی زندگی کے انحطاط و زوال کے باعث پیدا ہونے والی زبوں حالی اس شعر کی بنیاد ہے۔

غالب کی ایک اور غزل ہے جس میں سوز نہاں سے بے محابا جلنے، اس میں ذوق وصل اور یاد یار تک کے باقی نہ رہنے، گھر کو آگ لگنے اور اس میں سب کچھ جل جانے، اپنے عدم سے پرے ہونے اور اُس کی وجہ سے آہ آتشیں تک کے بے اثر ہو جانے کا تذکرہ ہے۔ اس میں غالب نے افسردگی کی آرزو بھی کی ہے کیونکہ طرز تپاک اہل دنیا نے انھیں ایسا کرنے کے لیے مجبور کیا ہے۔ اس کی تفصیل خود غالب کی زبانی سنیے:

دل مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا
آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بار ہا
میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا

ان اشعار میں ایک اجتماعی رنگ و آہنگ بہت نمایاں ہے۔ غالب یہاں بھی کہنا چاہتے ہیں کہ اُن کے معاشرے میں ہر شخص کا دل سوز نہاں سے

جل گیا ہے ۔ ساری زندگی میں ایک سلگنے والی کیفیت ہے ۔ پوری تہذیب میں ایک آگ سی اندر ہی اندر پھیل رہی ہے ۔ دلوں کی بستیاں ویران ہیں ۔ اُمنگوں اور حوصلوں پر اوس سی پڑگئی ہے ۔ اور ہر طرف ایک ماتم سا برپا ہے ۔ غالب خود بھی اس ماتم میں شریک ہیں ۔

جب زندگی کا قافلہ اس موڑ پر آ جائے تو ظاہر ہے کہ اُس میں کوئی دل‌کشی باقی نہیں رہتی ۔ افراد زندگی کی ہر چیز سے بیزار ہو جاتے ہیں ۔ سیرِ گل تک سے اُن کا جی گھبرانے لگتا ہے ۔ غالب کہتے ہیں :

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

غم فراق میں تکلیفِ سیرِ گل مت دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

یہ اشعار اُس شکست خوردگی کو ظاہر کرتے ہیں جو اس زمانے کے مسلمانوں کی زندگی میں بہت عام تھی ۔ غالب نے یہاں اسی کا نقشہ کھینچا ہے ۔

اس انحطاط و زوال اور شکست خوردگی کے باعث پیدا ہونے والی تباہی اور بربادی کے ان گنت مناظر غالب کی غزلوں کے اشعار میں ملتے ہیں ۔ یہ چند اشعار دیکھیے :

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اُس شمع کی طرح جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغ نا تمامی

بوئے گل نالۂ دل ، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

یہ سب انحطاط و زوال ہی کے احساس کا نتیجہ ہے ۔ غالب کو ہر طرف بیاباں کی سی کیفیت نظر آتی ہے ۔ جگہ جگہ انھیں آگ سی بھڑکتی، سعلے سے لپکتے اور دھواں سا اُٹھتا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ وہ شمع کو خموش پاتے ہیں اور ان مناظر کو دیکھ کر محرومی کا احساس اُن پر چھا جاتا ہے ۔

اس عالم میں وہ لہو روتے ہیں اور زندگی کی محرومیوں کا شکوہ کرتے ہیں ۔ غالب کا دیوان اس قسم کے اشعار سے بھرا پڑا ہے ۔ یہ اشعار دیکھیے :

غنچہ پھر لگا کھلنے ، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا ، گم کیا ہوا پایا

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا، جل گیا
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو، غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا ، جل گیا

بوئے گل ، نالۂ دل ، دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا ، سو پریشاں نکلا

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب
اس رہگذر میں جلوۂ گل ، آگے گرد تھا

خموشی میں نہاں، خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغ مردہ ہوں ، میں بے زباں ، گور غریباں کا

گر یہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ، ورنہ میرے حال پر
ہر گل تر ایک چشم خوں فشاں ، ہو جائے گا

میں اور بزم مے سے ، یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا ؟

گھر ہمارا ، جو نہ روتے بھی، تو ویراں ہوتا
بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے !
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

جاتا ہوں داغ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمع کشتہ ، در خور محفل نہیں رہا

بے داد عشق سے نہیں ڈرتا ، مگر اسد
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

درد دل لکھوں کب تک، جاوں، اُن کو دکھلاؤں
اُنگلیاں فگار اپنی ، خامہ خوں چکاں اپنا

موج خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے
آستان یار سے اٹھ جائیں کیا ؟

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت مہر و وفا ، میرے بعد

آتش پرست کہتے ہیں ، اہل جہاں مجھے
سرگرم نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر

ہے خون جگر جوش میں، دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم !
گری ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اُس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں، ہوں داغ نا تمامی

خزاں کیا ، فصل گل کہتے ہیں کس کو ، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں ، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

سختی کشان عشق کی پوچھے ہے کیا خبر ؟
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے
لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں ، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

ہے موج زن اک قلزم خوں، کاش یہی ہو
آتا ہے ، ابھی دیکھیے ، کیا کیا مرے آگے

ان اشعار میں بظاہر تو انفرادی معاملات کی ترجمانی نظر آتی ہے لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو ان کی تہ میں اُس زمانے کے اجتماعی معاملات کا احساس و شعور نظر آتا ہے اور غالب انفرادی رنگ و آہنگ کے پردے میں انھیں اجتماعی معاملات کی ترجمانی کی ہے ۔

ایک اور غزل کے چند مسلسل اشعار سے بھی اس کی وضاحت ہوتی ہے :

وہ فراق اور وہ وصال کہاں ؟
وہ شب و روز و ماہ سال کہاں ؟
فرصت کار و بار شوق کسے
ذوق نظارۂ جمال کہاں ؟
ایسا آساں نہیں لہو رونا !
دل میں طاقت، جگر میں حال کہاں ؟

فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

یہاں بھی فراق و وصال ، فرصت کار و بار شوق ، ذوق نظارۂ جمال وغیرہ کے اشاروں میں غالب نے اپنے زمانے کی اجتماعی صورت حال کی ترجمانی کی ہے۔

یہ حالات ، ظاہر ہے ، کہ طاقت ختم ہونے کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔ اس موقع سے نئی طاقتوں نے فائدہ اُٹھایا اور وہ حکمراں بن بیٹھیں۔ اُنھوں نے افراد کو سبز باغ دکھائے لیکن انھیں اپنے پا بہ زنجیر ہونے کا احساس بہر صورت باقی رہا۔ اس شعر میں اسی صورت حال کی ترجمانی ہے کہتے ہیں :

✓ ہوں گرفتار الفت صیاد
ورنہ باقی ہے طاقت پرواز

اس زمانے کے ہندوستان اور خصوصاً دلی کے سیاسی حالات کو سامنے رکھا جائے تو اس شعر میں بڑی معنوی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا ، جب سیاست فرنگ نے اپنا کھیل کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ اس سر زمین پر دام بچھا دیے گئے تھے اور بھولے بھالے لوگوں کو اس دام میں اسیر کر لیا گیا تھا۔ لیکن ایسی پٹی پڑھائی تھی کہ وہ اس دام کو دام بھی نہیں سمجھتے تھے۔ غالب نے اس شعر میں اسی حقیقت کو پیش کیا ہے۔

غالب نے اپنے زمانے کے ان ناسازگار حالات کا صرف رونا ہی نہیں رویا ہے ، نئی زندگی سے مطابقت پیدا کرنے اور اُس کو ہاتھوں ہاتھ لینے کا پیام بھی دیا ہے۔ جب وہ یہ کہتے ہیں :

۔ وہ بادۂ شبانہ کی سر مستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ نئی زندگی کا استقبال کر رہے ہیں۔ اس میں عمل کا ایک پیام بھی موجود ہے ، جو روحانی زاویۂ نظر کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

یہ چند خیالات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ غالب صرف اپنی شکست کی آواز ہی نہیں تھے ، اُنیسویں صدی کی آواز شکست بھی اُن کی آواز میں شامل تھی۔ اُنھوں نے اس پر آنسو بہائے اور اپنے زمانے کی حکایت خوں چکاں کچھ اس طرح لکھتے رہے کہ اُن کی شاعری میں ایک اور ہی عالم نظر آتا ہے۔

غالب
کی
شاعری میں
غم دوراں

غالب آدمی کو بجائے خود ایک محشر خیال سمجھتے تھے ۔ اسی لیے خلوت میں اُنھیں انجمن نظر آتی تھی—لیکن جہاں تک اپنی ذات کا تعلق ہے انھوں نے انجمن میں ایک خلوت بھی دیکھی ہے ۔ یوں اس میں شک نہیں کہ اپنی ذات سے وہ ایک انجمن تھے لیکن حالات نے اس انجمن کو خلوت بھی بنا دیا تھا کم از کم اس انجمن میں خلوت نظر ضرور آتی تھی ۔ اسی لیے اُن کی شخصیت کی دنیا میں کبھی انجمن ایک خلوت بن جاتی ہے اور کبھی خلوت ایک انجمن !

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ غالب نے محشر خیال اور ایک انجمن ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اس زندگی میں تنہا پایا ہے ۔ ایک علیحدگی سی محسوس کی ہے ۔ اُنھوں نے وصل کی تمنا کی ہے لیکن وہ ہجر و فراق کا شکار رہے ہیں ۔ جس چیز کو اُنھوں نے حاصل کرنے کی کوشش کی ہے ، وہ اُن سے دور بھاگی ہے ۔ جن عناصر سے اُنھوں نے انجمن آرائی کرنا چاہی ہے ، وہ اُن سے کنارہ کش ہو گئے ہیں ۔ اسی لیے ایک انجمن ہونے کے باوجود اُن سے انجمن آرائی نہیں ہو سکی ہے ۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے آپ کو تنہا محسوس کیا ہے ۔ بے یار و مددگار پایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ زندگی ان کے لیے دلکش اور دلآویز ہونے کے باوجود ایک وبال جان بن گئی ہے ۔ پھر بھی اُنھوں نے اُس کو عزیز رکھا ہے ۔ وہ اس کے پیچھے دوڑے ہیں ۔ اس سے ہم کنار ہونے کی کوشش کی ہے ۔ لیکن اس دوڑ بھاگ میں کتنی ہی منزلیں ایسی آتی ہیں ، جب زندگی نے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا ہے ۔ وہ اُن سے بچھڑ گئی ہے اور اس طرح وہ تنہا رہ گئے ہیں ۔ اس تنہائی کو انھوں نے

ہمیشہ شدت سے محسوس کیا ہے ۔ ان کا سارا غم اسی احساس محرومی کی پیداوار ہے ۔

اور غم عشق ہو یا غم روزگار، دونوں کے چشمے ان کے یہاں اسی احساس تنہائی اور احساس تنہائی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے احساس محرومی سے پھوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

زندگی غالب کو بہت عزیز تھی ۔ زندگی اور زندگی کو بسر کرنا ہی اُن کے نزدیک سب کچھ تھا ۔ وہ اس کی ایک ایک بات اور ایک ایک پہلو پر جان چھڑکتے تھے — اور زندگی اُن کے نزدیک مسرتوں کا نام تھی۔ دلآویزیوں اور دلفریبیوں کا نام تھی ۔ ان مسرتوں ، دلآویزیوں اور دلفریبیوں سے وہ اپنے سینے کو بھر لینا چاہتے تھے۔ لیکن زندگی کی یہ مسرتیں ، یہ دلفریبیاں، یہ دلآویزیاں بھلا کس کا ساتھ دیتی ہیں ؟ ان سے محرومی ہی ایک حقیقت ہے — یہی زندگی کا قانون ہے — لیکن انسان اس حقیقت کا شعور رکھتے ہوئے بھی اُن سب کو حاصل کرنے کے لیے سرگرداں رہتا ہے ۔ بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ انہیں کے سہارے جیتا ہے — لیکن ان سب کا احساس بھی ایک مخصوص ذہنی کیفیت کا تابع ہے — یہ کیفیت نہ ہو تو ان کا احساس بھی مشکل ہے — احساس کا انحصار بڑی حد تک حالات پر ہوتا ہے — اگر حالات سازگار نہ ہوں تو یہ مسرتیں اپنے آپ کو رو پوش کر لیتی ہیں اور آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں ۔

اس عالم میں انسان چاہے بھی تو اُن کو نہیں دیکھ سکتا — وہ سامنے آ جائیں تب بھی ان سے محظوظ نہیں ہو سکتا ۔ اسی عالم میں انسان کو اپنی بے بسی کا احساس ہوتا ہے ۔

زندگی اسے ناسازگار نظر آتی ہے اور تاریکی میں وہ اس طرح محصور ہو جاتا ہے کہ روشنی کی کرن اسے دور تک بھی دکھائی نہیں دیتی — اس کا تصوّر بھی اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے — یہ زندگی کی بڑی ہی کٹھن منزل ہوتی ہے ۔

غالب کو اپنی زندگی میں یہی صورت حال پیش آئی ہے — انہیں حالات سے دو چار ہونا پڑا ہے — زندگی کو وہ اپنے لیے سمجھتے تھے لیکن زندگی انہیں اپنے لیے نہیں سمجھتی تھی — وہ زندگی کے شیدائی تھے لیکن زندگی اُن کی شیدائی نہیں تھی ۔ وہ اُس کے پیچھے دوڑتے تھے ۔ اُسے اپنی گرفت

میں لینے کی کوشش کرتے تھے لیکن وہ خود اُن سے دور بھاگتی تھی—زندگی کا عیش تو ان کے خیال میں تجمل حسین خاں کے لیے بنا تھا—حالانکہ غالب اس عیش کو اپنے لیے سمجھتے تھے۔ یہ عیش انھیں کسی قدر حاصل تو ہوا لیکن اس قدر حاصل نہ ہو سکا کہ اُن کی طبیعت سیر ہو جاتی—وہ ساری زندگی اس عیش کی تلاش و جستجو میں سرگرداں رہے۔ اُن کی زندگی اسی جد و جہد کی ایک کہانی ہے۔ یہ کہانی ایک المیہ ہے۔ اسی لیے اس میں ایک عظمت ہے—اس عظمت کو اُن حسرتوں اور ناکامیوں نے پیدا کیا ہے جو مرتے دم تک غالب کے ساتھ رہی ہیں۔ یہ حسرتیں اور ناکامیاں کچھ تو غالب کی زندگی میں آئیں بھی اور کچھ ان کی مخصوص ذہنی اور جذباتی کیفیت نے ان حسرتوں اور ناکامیوں کو پیدا بھی کر لیا۔ معمولی سے غم کو ان کی یہ کیفیت ایک بہت بڑا غم بنا لیتی تھی—اسی لیے اُن کی زندگی میں حسرتوں اور ناکامیوں کا ایک ہجوم ملتا ہے۔ وہ زندگی بھر کڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں—اس بات پر کڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ وہ جس چیز کی جتنی تمنا کرتے ہیں، وہ انھیں اتنی حاصل نہیں ہوتی۔ اسی لیے اس عالم میں اُن پر ایک محرومی کا احساس طاری ہو جاتا ہے۔ اُن کی زندگی اسی احساس محرومی سے عبارت ہے۔ لیکن اس احساس محرومی میں بھی زندگی کی خواہش اُن کے دل سے نہیں نکلتی۔ کامیابی اور کامرانی کا خیال بہر حال اُن کے دل میں باقی رہ جاتا ہے—ولولوں کے جراغ جلتے رہتے ہیں۔ ذوق و شوق کی شمعیں فروزاں رہتی ہیں—لیکن یہ سب کچھ حواب و خیال کی دنیا میں ہوتا ہے۔ غالب اسی خواب و خیال کی دنیا میں کھو جاتے ہیں، وادیٔ خیال کو مستانہ طے کرنا اُن کا شعار بن جاتا ہے—تاکہ اس کے بعد حسرت اور ناکامی کی اس دنیا میں باز گشت کی تمنا نہ رہے:

مستانہ طے کروں ہوں رہ وادیٔ خیال
تا باز گشت سے نہ رہے مدعا مجھے

سرور صاحب نے اس کیفیت کو اُن کی نسلی خصوصیت سے تعبیر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"غالب کو اپنے حسب و نسب پر فخر تھا۔ سپہ گری اُن کا آبائی پیشہ تھا۔ اُن کے باپ دادا اس لیے نہیں لڑتے تھے کہ انھیں کوئی

مقدس جہاد یا بڑا مشن عزیز تھا—لڑنا اُن کا پیشہ تھا—مگر یہ ایک ترک صرف لڑتے ہی نہیں تھے ، خواب بھی دیکھتے تھے ۔ ان حوابوں میں بڑے بڑے معرکوں کا جلال اور شاہد و شباب کا جمال تھا ۔ یہ عیش امروز ہی کے قائل نہ تھے ، انھیں عیش کے خواب بھی ستاتے تھے ۔ ترکوں کے یہاں رزم و بزم ایک خواب کے دو پہلو تھے ۔ غالب کے وقت تک آتے آتے تلوار نشتر رہ گئی مگر یہ خواب دیکھنا نہ گیا ۔ غالب کو ایک تندرست ذہن ملا تھا ۔ بچپن میں بے فکری اور رنگ رلیوں سے سابقہ رہا ۔ اُن کی جوانی خاصی دیوانی تھی مگر یہ ان کی ساری زندگی کی پیاس کو کبھی نہ بجھا سکی ۔ یہ اشعار اُن کے مزاج کی بڑی اچھی تفسیر ہیں :

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

نا کردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب ! اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

لیکن یہ اشعار صرف نسلی خصوصیت ہی کے زیر اثر تخلیق نہیں کیے گئے ہیں ۔ ان کے پیچھے اور بھی بہت کچھ ہے—ان کے پیچھے آرزوؤں اور تمناؤں کا وہ خون ہے جو غالب کی زندگی میں سب سے زیادہ نمایاں تھا ۔ ان کی محرک وہ حسرتیں اور ناکامیاں بھی ہوئی ہیں جن سے غالب کی زندگی عبارت تھی اور جن کو غالب نے اپنے اوپر کچھ زیادہ ہی شدت سے طاری کر لیا تھا ۔ لیکن اس میں ان کی شعوری کوشش شامل نہیں تھی ۔ خارجی حالات اس کے محرک ہوئے تھے ۔ غالب انھیں خارجی حالات کے زخم خوردہ تھے—اور اس کا انھیں بڑا غم تھا ۔ لیکن وہ مجبور تھے ۔ مشیت کے آگے اُن کی کچھ بھی پیش نہیں جاتی تھی ۔ اسی لیے تو وہ چیخ اٹھے تھے :

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمھیں
وہ ولولے کہاں ، وہ جوانی کدھر گئی

یہ زمانے کی سفاکی غالب کی سب سے بڑی دشمن رہی ہے ۔ اسی نے ولولوں کا خون کیا ہے — اسی نے جوانی کو خاک میں ملایا ہے — اسی کا اثر ہے کہ ہزاروں خواہشیں ایسی ہیں کہ ہر خواہش پر ان کا دم نکلا ہے ۔ — اسی کا یہ اثر ہے کہ ان کے ارمان اگرچہ بہت نکلے ہیں لیکن پھر بھی کم نکلے ہیں — اسی کا اثر ہے کہ انہیں خدا کے سامنے حساب دیتے وقت بھی داغ حسرت دل کا شمار یاد آتا ہے اور اسی کا اثر ہے کہ وہ ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی داد طلب کرتے ہیں — غالب کو زمانے کی اس سفاکی کا بڑا غم تھا ۔ وہ زندگی بھر اسی غم میں پابجولاں رہے ۔ اسی زمانے کے غم یا غم دوراں نے ان کی اُن ذہنی و جذباتی کیفیات کو پیدا کیا ہے جو ان کے فکر و فن میں قدم قدم پر اپنے آپ کو رونما کرتی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی شاعری میں شروع سے آخر تک کم و بیش انہیں کیفیات کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے ۔

یہ غم، جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا گیا ، کچھ تو غالب کے ماحول میں موجود تھا لیکن کچھ غالب کی افتاد طبع نے بھی اس کو پیدا کیا ہے ۔ زندگی کی مسرتوں کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کا خیال ان کی گھٹی میں پڑا تھا ۔ ان مسرتوں سے سینہ بھر لینے کی تمنا ان کے مزاج کا بنیادی جزو تھی ۔ ان مسرتوں کے جھرمٹ میں اکتساب لذت ہی کو وہ سب کچھ سمجھتے تھے ۔ لیکن سماجی حالات اس کے لیے سازگار نہیں تھے ۔ کیونکہ یہ سیاسی انتشار اور معاشی افراتفری کا زمانہ تھا ۔ زمانے کی گردش نے قسمتوں پر بھی گردش طاری کر دی تھی ۔ ان حالات میں جس چیز کی تمنا کی جائے ، اس کا ملنا آسان نہیں ہوتا ۔ غالب نے ایسی گردش کے دن اس سے قبل نہیں دیکھے تھے ۔ اس لیے انہیں یہ گردش کچھ عجیب سی معلوم ہوتی تھی — وہ اس پر کڑھتے تھے ، پریشان ہوتے تھے ۔ لذت پرستی اور تعیش پسندی ان کی طبیعت میں داخل تھی ۔ حالات کا اس لذت پرستی اور تعیش پسندی کی راہوں میں حائل ہونا ان کے لیے مصیبت کا سامان تھا ۔ چنانچہ یہی بات ان کے لیے غم کا باعث بن جاتی تھی ۔ ان کا دل غم کھانے میں بہت بودا تھا — اسی لیے بے گلفام کے کم ہونے کے رنج کو بھی وہ بہت محسوس کرتے تھے ۔ بے گلفام بالکل ہی نہ ہوتی تو خدا جانے ان کا کیا حال ہوتا :

غم کھانے میں بودا دل ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام، بہت ہے

غالب رئیس زادے تھے۔ انھوں نے امارت اور جاہ و ثروت کی آغوش میں آنکھ کھولی تھی—لیکن ان کی زندگی میں ایسی منزلیں بھی آئیں، جب اس امارت کا خیال اور جاہ و ثروت کا احساس ہی ان کے لیے مصیبت بن گیا۔ زندگی بھر وہ اس امارت اور جاہ و ثروت کو برقرار رکھنے اور اس کو سنبھالنے میں زمین آسمان ایک کرتے رہے۔ اس راہ میں کیسے کیسے نازک موڑ آئے۔ راستے کی ناہمواری کے باعث انھیں کیسی کیسی ٹھوکریں کھانی پڑیں۔ لیکن اس امارت اور جاہ و ثروت کے خیال کو انھوں نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے آپ سے جدا نہیں ہونے دیا۔ کیونکہ اس کو وہ اپنا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتے تھے—وہ ساری زندگی ٹھوکریں کھاتے، گرتے اور سنبھلتے رہے—یہاں تک کہ ان کی زندگی ختم ہو گئی لیکن جاہ و ثروت کا خیال آخر دم تک باقی رہا۔ انھوں نے اس کو ٹھیس نہیں لگنے دی۔ لیکن اس سلسلے میں جن مصیبتوں اور پریشانیوں کا انھیں منہ دیکھنا پڑا، وہ کبھی ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں آئی تھیں۔ انھوں نے ایک زمانے تک زندگی کو محض پھولوں کی سیج سمجھا تھا لیکن اب انھیں یہ معلوم ہوا کہ وہ تو کانٹوں کا بستر ہے۔ اسی صورت حال نے انھیں سماجی اور معاشی حالات کی ناسازگار کیفیت کا احساس دلایا—اس زمانے کی ساری سماجی زندگی انھیں ایک کرب کے عالم میں نظر آئی۔ لیکن زندگی کے اس کرب کو انھوں نے اپنی شخصیت کے آئینے میں دیکھا ہے۔ ان کے پاس کوئی اجتماعی زاویۂ نظر نہیں تھا، اس لیے انھیں اپنی ہی پریشانیاں زیادہ نظر آئی ہیں—لیکن جہاں بھی انھوں نے پریشانیوں کا تذکرہ کیا ہے، وہاں زمانے کی ناسازگار کیفیت کو وہ محسوس کرتے ہوئے ضرور معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے خطوں میں اس کی ساری تفصیل ملتی ہے۔ چودہری عبدالغفور سرور کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

''میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا۔ نو برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عوض میری اور میرے شرکاء حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے۔ انھوں نے نہ دیے، مگر تین ہزار روپے سال۔ اس میں سے خاص

میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپے سال ۔ میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا ۔ کولبروک صاحب بہادر ریذیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکرٹر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر ۔ ریذیڈنٹ معزول ہوئے ۔ سکرٹر گورنمنٹ ناگاہ مر گئے ۔ بعد ایک زمانے کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپے مہینہ مقرر کیا ۔ ان کے ولی عہد نے چار سو روپے سال ۔ ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے ۔ واجد علی شاہ کی سرکار سے بہ صلہ مدح گستری پانچ سو روپے سال مقرر ہوئے ۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیے ۔ یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی ۔ دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی ۔ سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی ۔ ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں ۔ اب جو میں والئی دکن کی طرف رجوع کروں یاد رہے کہ متوسط یا مر جاوے گا یا معزول ہو جائے گا ۔ اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع جائے گی اور والئی شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی ۔ اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے ــ اے خداوند بندہ پرور ! یہ سب باتیں وقوعی اور واقعی ہیں ۔"

یہ ظاہر اس خط میں غالب نے اپنا رونا رویا ہے لیکن اس میں سلطنتوں کے مٹنے کا ذکر ہے ، بادشاہوں کے معزول ہونے کا بیان ہے ، جاگیروں کے ختم ہونے کا تذکرہ ہے ، جس کے نتیجے میں ایک عام افراتفری پیدا ہوئی ہے اور اس افراتفری کا شکار بہت سے افراد ہوئے ہیں ۔ غالب بھی ان میں شامل ہیں ۔ اس عام افراتفری میں انھیں جن حالات سے دو چار ہونا پڑا ہے ، اس کی تفصیل و جزئیات کی منہ بولتی تصویر ان خطوں میں موجود ہے ۔

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں :

''یہ تمھارا دعا گو اگرچہ امور میں پایۂ عالی نہیں رکھتا مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے ۔ یعنی بہت محتاج ہوں ۔ سو دو سو میں میری پیاس نہیں بجھتی ۔ تمھاری ہمت پر سو ہزار آفرین ۔ جے پور سے

مجھ کو دو ہزار آجاتے تو میرا قرض رفع ہو جاتا ۔ اور پھر اگر دو چار برس زندگی اور ہوتی تو اتنا ہی قرض اور مل جاتا ۔ یہ پانچ سو تو، تمھاری جان کی قسم، متفرقات میں جا کر سو ڈیڑھ سو بچ رہیں گے۔ سو میرے صرف میں آ جائیں گے ۔ مہاجنوں کا جو سودی قرض ہے وہ بقدر پندرہ سولہ کے باقی رہے گا ۔ اور وہ جو بابو صاحب سے منگوائے تھے ، قیمت اس چیز کی جو ہمارے مذہب میں حرام اور تمھارے مشرب میں حلال ہے ، سو وہ دے گئے ۔ یقین کہ آج کل میں بابو صاحب کا خط مع ہنڈوی آجاوے۔ بابو صاحب کے جوخطوط ضروری اور کواغذ ضروری میرے پاس آئے ہوئے تھے ، وہ میں نے پنجشنبہ ۲۶ مئی کو پارسل میں ان کے پاس روانہ کر دیے اور اس میں لکھ بھیجا کہ ہنڈوی اور میرے بھیجے ہوئے لفافے جلد بھیج دو ۔ پنجشنبہ کو آج پندرہ دن پورے ہوئے ۔''

مرزا علاؤالدین خاں کو لکھتے ہیں :

''بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب ! وہ زمانہ نہیں کہ ادھر متھرا داس سے قرض لیا ، ادھر درباری مل کو مارا ۔ ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی ۔ ہر ایک کے پاس تمسک مہری موجود ۔ شہد لگاؤ چاٹو ۔ نہ مول نہ سود ۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ پھوپھی کے سر ۔ بایں‌ہمہ کبھی خان نےکچھ دے دیا ۔ کبھی الور سے دلوایا ۔ کبھی ماں نے کچھ آگرہ سے بھیج دیا ۔ اب میں اور باسٹھ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے سو روپے رام‌پور کے ۔ قرض دینے والا ایک میرا مختار کار ، وہ سود ماہ بماہ لیا چاہے ۔ دل میں قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جدا، چوکیدار جدا ، مول جدا ، بی بی جدا ، بچے جدا ، شاگرد پیشہ جدا ۔ آمد وہی ایک سو باسٹھ ۔ تنگ آ گیا ۔ گزارا مشکل ہو گیا ۔ روزمرہ کا کام بند رہنے لگا ۔ سوچا کہ کیا کروں ، کہاں سے گنجائش نکالوں ۔ قہر درویش برجان درویش ۔ صبح کی تبرید متروک ، چاشت کا گوشت آدھا رات کی شراب و گلاب موقوف ۔ بیس بائیس روپے مہینہ بچا ۔ روزمرہ کا خرچ چلا ۔ یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیو گے ۔

کہا گیا جب تک وہ نہ پلائیں گے ۔ پوچھا کہ نہ پیو گے تو کس طرح جیو گے ؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے ۔''
مرزا قربان علی بیگ کو لکھتے ہیں :

''میری جان ! کن اوہام میں گرفتار ہو ۔ جہاں باپ کو پیٹ چکا اب چچا کو بھی رو ۔ خدا تجھ کو جیتا رکھے اور تیرے خیالات و احتمالات کو صورت وقوعی دے ۔ یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں ۔ مخلوق کا کیا ذکر، کچھ بن نہیں آتی ۔ آپ اپنا تماشائی بن گیا ہوں ۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں ۔ یعنی میں نے اپنے آپ کو غیر تصور کیا ہے ۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں : لو غالب کے ایک اور جوتی لگی ۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں ۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں ۔ لے اب تو قرض داروں کو جواب دے ۔ سچ تو یہ ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا ، بڑا کافر مرا ۔ ہم نے از راہ تعظیم جب بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرامگاہ و عرش نشیمن خطاب دیے ہیں ۔ چونکہ یہ اپنے آپ کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا ۔ سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے ۔ آئیے نجم الدولہ بہادر ! ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ ۔ ایک قرض دار کو بھوگ ستا رہا ہے ۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں ۔ اجی حضرت ! نواب صاحب ، نواب صاحب کیسے ۔ او خاں صاحب ! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں ، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے ۔ کچھ تو اکسو ، کچھ تو بولو—بولے کیا بے حیا ، بے عزت ، کوٹھی سے شراب ، گندھی سے گلاب ، بزاز سے کپڑا ، میوہ فروش سے آم ، صراف سے دام قرض لیے جاتا ہے ۔ یہ بھی تو سوچا ہوتا کہ کہاں سے دیا جائے گا ۔''

میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں :

''میرن صاحب کو جب تک نہ کہو میں دلی نہ بلاؤں— بھائی ہوش میں آؤ ، غور کرو ۔ یہ مقدور مجھ میں نہیں کہ ان کو یہاں بلا کر ایک الگ مکان رہنے کو دوں ۔ اور اگر زیادہ نہ ہو تو تیس روپے مہینہ مقرر کروں کہ بھائی ! یہ لو اور دریبہ اور چاوڑی اور اجمیری دروازہ کا بازار اور لاہوری دروازہ کا بازار ناپتے پھرو ۔

اور اردو بازار اور خاص بازار اور بلاقی بیگم کا کوچہ اور خان دوران خاں کی حویلی کے کھنڈر گنتے پھرو - اے میر مہدی ! تو درماندہ و عاجز پانی پت میں پڑا رہے - میرن صاحب وہاں پڑے ہوئے دلی دیکھنے کو ترسا کریں - سرفراز حسین نوکری ڈھونڈتا پھرے - اور میں ان غمہائے جاں گداز کی تاب لاؤں۔ مقدور ہوتا تو دکھا دیتا کہ میں نے کیا کیا - اے بسا آرزو کہ خاک شدہ -"

اور یوسف مرزا کے نام لکھتے ہیں :

"میری جان ! خدا تیرا نگہبان - جانتے ہو کہ علی کا بندہ ہوں - اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا - اس وقت کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں - اس کے بعد نہ کہیں سے قرض کی امید ہے، نہ کوئی جنس رہن و بیع کے قابل - اگر رام پور سے کچھ آیا تو خیر ورنہ انا للہ و انا الیہ راجعون - "

یہ خطوط ، غالب ہی کا نہیں، اس پورے دور کا مرثیہ ہیں، جس میں ہر فرد کی انفرادیت آندھیوں کی زد پر تھی—کیونکہ معاشی افرانفری کی وجہ سے زندگی کی بنیادوں میں کھوکھلا پن پیدا ہو گیا تھا - جاہ و ثروت اور عزت و آبرو کے جنازے نکل چکے تھے - عظمت رفتہ کی صرف یاد باقی رہ گئی تھی - زیست کے لیے کوئی سامان نہیں تھا - افلاس نے قرض کے دروازے کھول دیے تھے - کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا تھا - نفسی نفسی کی کیفیت تھی - یہ گویا ایک میدان حشر تھا ، جس میں ہر ایک کو اپنی اپنی فکر تھی - سورج سوا نیزے پر آ گیا تھا اور لوگ اس عالم میں پڑے تلملا رہے تھے - غالب پر ان حالات نے گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ ان حالات پر خون کے آنسو بہاتے گذرا ہے -انہیں صرف اس بات ہی کا غم نہیں ہے کہ ان کے لیے زندگی دوبھر ہوگئی ہے —بلکہ اس بات کا بھی غم ہے کہ ان حالات میں دوسروں کے لیے بھی زیست مشکل ہے :

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغ ستم نکلے

وہ اس پر کڑھتے ہیں ، پریشان ہوتے ہیں — بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں لیکن کچھ کر نہیں سکتے—اس لیے بے بسی اور کس مپرسی کا شکار

ہوجاتے ہیں۔ غالب کی زندگی اس بے بسی اور کس مپرسی سے عبارت ہے۔ اسی بے بسی اور کس مپرسی کے سمندر سے غم کے بادل اٹھے ہیں اور غالب کی زندگی کے افق پر منڈلانے لگے ہیں، چھا گئے ہیں—اور اس طرح برسے ہیں کہ غالب کو شرابور کر دیا ہے۔

ظاہر ہے اس غم کو پیدا کرنے میں زمانے کا ہاتھ ہے—اسی لیے غالب اس غم کو پیش کرتے ہوئے غم دوراں کے شکوہ سنج نظر آتے ہیں۔ اس غم کی نوعیت اگرچہ بظاہر انفرادی ہے لیکن در حقیقت وہ ایک بڑا پس منظر رکھتی ہے اور اسی لیے وہ غالب کے یہاں ایک اجتماعی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ وہ غالب کے انفرادی غم کے بجائے ایک طبقے کا غم، ایک معاشرت کا غم، ایک تہذیب کا غم اور ایک نظام کا غم ہوجاتا ہے—غالب اس غم کو اسی طرح محسوس کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ غالب کے زمانے کے عام سماجی انتشار اور معاشی افراتفری نے بڑی حد تک ان کے یہاں غم دوراں کے اس احساس کو پیدا کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی میں کچھ اور معاملات بھی ایسے ہیں، جو اس کو جگانے میں برابر کے شریک ہیں۔ غالب کی زندگی میں سب سے پہلی ٹھوکر ان کی یتیمی تھی اور غالب اس زندگی میں دو بار یتیم ہوئے۔ پہلے ان کے والد عبداللہ بیگ خاں کا انتقال—والد کے انتقال کے بعد ان کے چچا نصراللہ بیگ خاں نے ان کی پرورش اپنے ذمے لی۔ لیکن زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ وہ بھی اس دنیا سے چل بسے۔ انھوں نے خود لکھا ہے "پانچ برس کا تھا جو باپ مر گیا۔ آٹھ برس کا تھا چچا مر گیا۔" اس طرح غالب گویا دوسری بار یتیم ہوئے—کم از کم انھوں نے محسوس یہی کیا۔ اور اگرچہ چچا کے انتقال کے بعد ننھیال میں ان کی زندگی نسبتاً زیادہ آرام و آسائش سے گذری لیکن یہ خیال ان کے دل میں بیٹھ گیا کہ وہ اس زندگی میں بے یار و مددگار ہیں—اگر شعوری طور پر نہیں تو کم از کم غیر شعوری طور پر وہ اس اعتبار سے اپنے اندر اور آس پاس ایک کمی سی ضرور محسوس کرتے رہے—یہ ایک بہت بڑا خلا تھا، جو ان کی زندگی میں کبھی بھی پر نہ ہو سکا—لڑکپن میں ان کا لہو و لعب میں پڑ جانا، درحقیقت اس غم کو غلط کرنے کے لیے ایک فرار کا ذریعہ بھی ہے۔ پھر سمند ناز پہ ایک اور تازیانہ یہ ہوا کہ ۱۳ سال کی عمر میں

ان کی شادی کر دی گئی ۔ اس شادی کو انھوں نے ساری زندگی ایک مصیبت ہی سمجھا کیوں کہ اس کی وجہ سے وہ بے یار و مددگار زندگی کے نا پیدا کنار سمندر میں پھینک دیے گئے—اور ساری زندگی انھیں کنارہ نہ ملا۔ —وہ خود اس کو 'حبس دوام' کہتے ہیں ۔ لکھا ہے : 'ساتویں رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس (یعنی نکاح) صادر ہوا ۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا ۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا—برسوں کے بعد میں جیل خانے سے بھاگا ۔ تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا ۔ پایان کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی حبس میں بٹھا دیا ۔ جب دیکھا یہ قیدی گریز پا ہے، دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں ۔ پاؤں بیڑی سے فگار ، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار، مشقت مقرری اور مشکل ہو گئی ۔ طاقت یک قلم زائل ہو گئی ۔ بے حیا ہوں ۔ سال گذشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑا ۔ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا ۔ میرٹھ ، مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا ۔ کچھ دن کم دو مہینے رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا ۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا ۔ بھاگوں کیا ۔ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی ۔ حکم رہائی دیکھیے کب صادر ہو ؟—ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اس ماہ ذی‌الحجہ میں چھوٹ جاؤں ۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا ۔ میں بھی بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا ۔' اس سے صاف ظاہر ہے کہ متاہل زندگی ان کے لیے تمام عمر ایک مصیبت بنی رہی ۔ شادی شدہ زندگی کے معاملات و مسائل نے نہ جانے کیا کیا کچھ ان سے کرایا ۔ بہرحال اس زندگی نے غالب کے یہاں تلخیٔ حیات کے احساس کو زیادہ شدید کیا—اور زیست کرنی انھیں ہمیشہ دشوار نظر آئی ۔ غم دوراں کے احساس کو ان کی زندگی کے اس پہلو نے بھی شدید سے شدید تر کیا ہے ۔ چنانچہ ساری زندگی میں انھیں اپنے آس پاس اس کی حکمرانی نظر آتی ہے ۔

غالب کو ان تمام حالات نے اس بات کا یقین دلایا کہ مشیت ان کے خلاف ہے اور اسی لیے زمانہ ان کے لیے سازگار نہیں ہے—یہ احساس کچھ اور بھی شدید ہوا، جب انھوں نے اپنوں اور بیگانوں کی سردمہری دیکھی ۔ جب انھیں ایک زمانہ مخالفت پر آمادہ اور دشمنی پر کمر بستہ نظر آیا— لوگوں نے خطوں میں انھیں گالیاں لکھیں اور طرح طرح سے ان کی پگڑی

اچھالی—قسمت نے انھیں قید و بند کی صعوبتوں تک سے دو چار کیا—
غرض وہ 'اوضاع ابنائے زماں' کے ہمیشہ شکوہ سنج رہے—انھوں نے تو
ہمیشہ ان کے ساتھ نیکی کی لیکن اس کا بدلہ انھیں ہمیشہ بدی کی صورت
میں ملا :

کہوں کیا خوبیٔ اوضاع ابنائے زماں غالب
بدی کی اُس نے، جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

اس کے ساتھ ہی ہے مہریٔ یاران وطن سے بھی انھیں ہمیشہ شکوہ
رہا—اس کا اظہار انھوں نے واضح طور پر کیا ہے :

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریٔ یاران وطن یاد نہیں ؟

اسی لیے تو وہ اپنے آپ کو مردم گزیدہ کہتے ہیں :

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

یہی وجہ ہے کہ ان کی نظریں دلی میں 'قحط غم الفت' دیکھتی ہیں
—اور وہ سوچ کر پریشان ہو جاتے ہیں کہ اگر اس معمورے میں رہے تو
کھائیں گے کیا۔ کھانے کے لیے غم الفت بھی تو یہاں موجود نہیں :

ہے اب اس معمورے میں قحط غم الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں، کھائیں گے کیا ؟

اور غالب ان حالات سے اس حد تک متاثر ہوئے کہ دہر میں انھیں
'نقش وفا' وجہ تسلی ہوتا ہوا نظر نہ آیا—ان کے خیال میں تو یہ ایک ایسا
لفظ ہے ، جو کبھی بھی شرمندۂ معنی نہ ہو سکا :

دہر میں نقش وفا ، وجہ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

غرض غالب کو لوگوں کی ایک ایک بات اور ایک ایک انداز میں
زمانے کی سردمہری نظر آئی—کیوں کہ انھیں اس بات کا یقین تھا کہ یہ
تمام حالات زمانے کی افراتفری ہی کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں -

غالب کی زندگی اور شخصیت پر زمانے کا یہ غم اسی لیے چھایا ہوا
معلوم ہوتا ہے ۔ اس کو الگ کر لیا جائے تو ان کے یہاں کوئی اور اہم
بات باقی نہیں رہتی ۔ ان کے فکر و فن دونوں میں اس کی کارفرمائی ہے ۔ ان

کے سارے خیالات و نظریات اسی کے گرد گھومتے ہیں ۔ جس خیال کا اظہار بھی انھوں نے کیا ہے ، جو کیفیت بھی انھوں نے بیان کی ہے، جو تجربات بھی انھوں نے پیش کیے ہیں ، ان میں غم دوراں کا اثر کسی نہ کسی صورت میں ضرور جھلکتا ہے ۔ یہ اثر ان کے لیے مفید بھی ثابت ہوا ہے ، مضر بھی ــــ مفید تو اس طرح کہ اس کے سہارے انھیں زندگی کی سنگین اور ٹھوس حقیقتوں کا احساس ہوا ہے ۔ غالب طبعاً رومانی تھے ۔ اس اثر نے ان کی رومانیت میں اعتدال اور توازن کی کیفیت پیدا کی ہے ، جس کے سہارے وہ حقیقت سے قریب ہوئے ہیں اور مضر اس طرح کہ اس غم نے غالب کو بڑی حد تک بجھایا ہے ۔ یوں یہ بات صحیح ہے کہ غالب کے یہاں بڑی زندگی اور جولانی بھی ۔ وہ تھک کر بیٹھنا نہیں جانتے تھے ۔ انھیں جد و جہد سے منہ موڑنا نہیں آتا تھا ــــ لیکن غم دوراں نے اُن کی ان صلاحیتوں کو بڑی حد تک محدود کر دیا ــــ زمانے کا غم نہ ہوتا تو ان کی یہ صلاحیتیں زندگی کے کسی میدان میں جولانیاں دکھا سکتی تھیں اور غالب نہ جانے کیا کچھ کر سکتے تھے ــــ لیکن زمانے کے غم نے ان کا راستہ روک لیا ۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتے تھے، نہ کر سکے ۔ پھر بھی انھوں نے جد و جہد اور عمل کے خیال کو اپنے دل سے نہیں نکالا ہے ۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہیں کہ زمانے کے غم نے انھیں زندگی بسر کرنا سکھایا ہے ۔ وہ پریشانیوں سے گھبراتے نہیں ہیں کیوں کہ یہ پریشانیاں انھیں درس عمل دیتی رہی ہیں ۔ اسی لیے تو وہ ان سے خوش ہوتے ہیں :

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرایا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

ان اشعار میں زندگی بسر کرنے کی خواہش ہے ، عمل کا جذبہ ہے ۔ تھوڑی سی اذیت پرستی یہاں ضرور پیدا ہوتی ہے لیکن یہ اذیت پرستی درحقیقت ناسازگار حالات میں بھی ولولوں کے چراغوں کو جلائے رکھنے کی آرزو ہے ــــ اس کیفیت نے غالب کو عظیم بنانے میں بڑا حصہ لیا ہے ــــ اور یہ عظمت سب سے زیادہ ان کی شاعری کے آئینے میں اپنے آپ کو رونما کرتی ہے ۔

غالب کی شاعری حسن و عشق کے معاملات، حیات و کائنات کے مسائل اور عمرانی حالات کی ترجمانی پر مشتمل ہے۔ ان سب کی ترجمانی میں غم دوراں کے اثرات ملتے ہیں—اور اس حد تک ملتے ہیں کہ غالب کا پیش کیا ہوا کوئی خیال بھی اس سے الگ نہیں معلوم ہوتا۔ سب کی جڑیں غم دوراں کے احساس میں پیوست نظر آتی ہیں۔

جہاں تک عشقیہ شاعری کا تعلق ہے، غالب اس سلسلے میں خاصے رومانی ہیں۔ لذت کا خیال اور تعیش کا احساس ان کے یہاں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے تصوّر عشق کی بنیادیں تمام تر مادیت اور جنسیت پر استوار ہیں۔ لیکن اس کے باوجود حسن و عشق کی مختلف کیفیات کو پیش کرتے ہوئے غم دوراں کا خیال ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہوتا۔ غالب نے اس کے سہارے اپنی عشقیہ شاعری میں رومان اور حقیقت کا ایک سنگم بنایا ہے۔ ان کے یہاں لذت کے احساس اور تعیش کے خیال کے باوجود وہ جو ایک وقار اور رکھ رکھاؤ کی کیفیت ملتی ہے، وہ جو ایک لیے دیے رہنے والا انداز نظر آتا ہے، اس میں اسی صورت حال کو دخل ہے:

گو میں رہا رہین ستم ہائے روز گار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

سختی کشان عشق کی پوچھے ہے کیا خبر
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے
تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

ہوئے ہیں پاؤں پہلے ہی نبرد عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے
سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے
کہ داماں خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

قد وگیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

غم اگرچہ جانگسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا غم روز گار ہوتا

خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ
ہتھکنڈے ہیں چرخ نیلی فام کے

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبہٗ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

لکد کوب حوادث کا تحمّل کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب
اس رہگزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

ان اشعار میں مختلف عشقیہ کیفیات و معاملات کا بیان ہے لیکن یہ بیان تمام تر جذباتی نہیں ہے ۔ عقل و شعور بھی ان میں کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب نے معاملات و کیفیات عشق کو زندگی کی الجھنوں سے علیحدہ کر کے نہیں دیکھا ہے ۔ ان کا عشق ایک پس منظر رکھتا ہے ۔ اور اس پس منظر میں غم دوراں کے خط و خال نمایاں نظر آتے ہیں ۔ اسی لیے ان کا عشق محض اکتساب لذت کا نام نہیں ہے—وہ تو ایک میدان کار زار ہے جس میں پے درپے ناساز گار حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور یہ ناساز گار حالات صرف عشق ہی کے پیدا کیے ہوئے نہیں ہوتے ، زمانے کی ناساز گار کیفیت بھی اس میں برابر کی شریک

ہوتی ہے ۔ چنانچہ غم عشق اکثر غم روزگار میں تبدیل ہو جاتا ہے—اور اس غم روزگار کے ہاتھوں غم کے ایسے پہاڑ ٹوٹتے ہیں کہ محبوب کی وفا سے بھی جس کی تلافی نہیں ہو سکتی ۔ بہر حال غالب کے خیال میں غم عشق غم دوراں سے خالی نہیں ہوتا ۔ عاشق کی بڑائی تو اس میں ہے کہ وہ غم عشق اور غم دوراں دونوں پر قابو پالے کیوں کہ اسی عالم میں وہ رہین ستم ہائے روز گار ہونے کے باوجود محبوب کے خیال سے غافل نہیں رہ سکتا— اور یہی ان کے خیال میں عشق کا کمال ہے ۔ لیکن یہ کام آسان نہیں ہے ۔ کیوں کہ ایسا کرنے کے لیے گر گر کر سنبھلنا پڑتا ہے—مر مر کے جینے کے آداب سیکھنے پڑتے ہیں ۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک غم دوراں پر قابو نہ پا لیا جائے ۔ کیوں کہ غم دوراں غم عشق کو شدید سے شدید تر بنا دیتا ہے ۔ غالب غم عشق سے نہیں گھبراتے ، غم دوراں سے گھبراتے ہیں ۔ ان کی طاقت لکد کوب حوادث کا تحمل نہیں کر سکتی کیوں کہ وہ تو محض بتوں کے ناز اُٹھانے کی ضامن ہے ۔ اسی لیے زمانے کا غم انھیں بری طرح ستاتا ہے ۔ یہاں تک کہ ان کے دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں رہتی—دامان خیال یار ان سے چھوٹنے لگتا ہے—اور وہ پوری طرح غم دوراں کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ یہ غم دوراں غم عشق کو بھی پس منظر میں ڈال دیتا ہے—اسی لیے تو غالب اس سے گھبراتے ہیں ۔

غالب کی عشقیہ شاعری انھیں خیالات کی تفسیر ہے ۔

یہ ٹھیک ہے کہ غالب فلسفی نہیں ہیں لیکن ان کی شاعری میں فلسفہ ضرور ہے ۔ انھوں نے حیات و کائنات کے مسائل پر غور ضرور کیا ہے ۔ سوچنے کی کوشش ضرور کی ہے ، اس لیے ان کی شاعری میں فلسفیانہ آہنگ جگہ جگہ ملتا ہے ۔ اس غور و فکر کے بعد جو نتائج انھوں نے نکالے ہیں ، ان میں غم دوراں کے احساس کی جھلک بھی نظر آتی ہے ۔ ان کے بنیادی فلسفیانہ خیالات و نظریات کی تہہ میں اس کے اثرات بڑی شدت سے کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ جب وہ سوچتے ہیں کہ قید حیات و بند غم ایک ہی چیز کے دو نام ہیں ، جب انھیں یہ خیال آتا ہے کہ کشا کش ہائے ہستی سے سعئی آزادی ممکن نہیں ، جب انھیں یہ حقیقت نظر آتی ہے کہ ہستی فنا پر دلالت کرتی ہے ، جب ان کے یہاں یہ شعور بیدار ہوتا ہے کہ ساقیٔ گردوں سے مئے عشق کی خواہش ایک لایعنی سی بات ہے کیوں کہ خود

وہ ایک دو چار جام واژگوں لیے بیٹھا ہے ، جب وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ رنج کا خوگر ہونا ، رنج کو مٹا دیتا ہے ، جب انھیں خموشی میں نہاں لاکھوں خوں گشتہ آرزوئیں نظر آتی ہیں، جب وہ شیشۂ دل کو سیلیٔ خارا سے لالہ رنگ دیکھتے ہیں ، تو در حقیقت اس کا محرک زمانے کا غم ہی ہوتا ہے—غم دوراں کا احساس ان کے یہاں اتنا شدید نہ ہوتا تو وہ اس طرح کے شعر ہر گز نہیں کہہ سکتے تھے :

قید حیات و بند غم ، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

کشا کش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیٔ آزادی
ہوئی زنجیر موج آب کو فرصت روانی کی

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے

مئے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

رنج سے خوگر ہوا انساں ، تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغ کشتہ ہوں میں ، بے زباں ، گور غریباں کا

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے جی
انسان ہوں ، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

حالاں کہ ہے یہ سیلیٔ خارا سے لالہ رنگ
غافل کو میرے شیشے پہ مئے کا گماں ہے

حنائے پائے خزاں ہے ، بہار اگر ہے یہی
دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

ان اشعار میں غالب کا سارا فلسفہ نہیں ہے لیکن ان کے فلسفے کے بہت سے پہلو ان میں ضرور موجود ہیں ۔ انسانی زندگی میں موت اور فنا ، غم اور پریشانی ، بے بسی اور مجبوری کے خیالات جہاں کہیں بھی پیدا ہوتے ہیں ، وہاں صاف نظر آتا ہے کہ غم دوراں ہی ان سب کا محرک ہے۔ غالب اگر خود غم دوراں سے روشناس نہ ہوتے اور اگر انسانی زندگی میں انہیں اس کا دروازہ کھلتا دکھائی نہ دیتا تو وہ زندگی کو اس زاویے سے نہ دیکھتے—کیوں کہ وہ اس مزاج کے انسان نہیں تھے—اس کے بغیر تو انسانی زندگی ان کے نزدیک محض سرور و انبساط اور مسرت و شادمانی کا نام تھی ۔

غم دوراں کے شدید احساس نے غالب کے یہاں عمرانی معاملات کا شعور بھی پیدا کیا ہے ۔ ان کی شاعری میں ایک تہذیب ، ایک معاشرت ، ایک نظام کے سرود رفتہ کی آواز سنائی دیتی ہے—اس تہذیب اور معاشرت کے ختم ہونے کا انہیں بڑا غم ہے ۔ وہ اس پر خون کے آنسو بہاتے ہیں ۔ کیوں کہ اس تہذیب اور معاشرت کے خاتمے نے ساری زندگی کو انتشار اور افراتفری کا شکار کر دیا تھا ۔ غالب جب اس تہذیب کے ختم ہونے کا تذکرہ کرتے ہیں ، تو گویا وہ اس انتشار اور افراتفری کا ماتم ہوتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی انتشار اور افراتفری نے غالب کو تہذیب اور معاشرت کا ماتمی بنایا ہے ۔ غم دوراں کے بغیر غالب اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے ۔ یہ باتیں انھوں نے دشنہ و خنجر ، اور بادہ و ساغر ، کے روپ میں ضرور کی ہیں لیکن تہذیبی ، معاشرتی اور عمرانی معاملات کے بارے میں انھوں نے جو کچھ کہنے کی کوشش کی ہے ، وہ اگرچہ بہت واضح نہیں ہے، لیکن دیکھنے والے اسے دیکھ سکتے ہیں ۔ یہ اشعار اس تہذیب، معاشرت اور نظام کا مرثیہ ہی تو ہیں ، جس کو غالب اپنی آنکھوں کے سامنے فنا ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے :

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اٹھیے بس اب کہ لذت خواب سحر گئی

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذت فراغ
تکلیف پردہ داریٔ زخم جگر گئی

میں اور بزم مئے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ، ساقی کو کیا ہوا تھا

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر ، سو خموش ہے

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں
جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
داماں باغبان و کف گل فروش ہے
اور صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز ، نہ جوش و خروش ہے
داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے ، سو وہ بھی خموش ہے

یہاں غالب نے جام و سبو کے ٹوٹ جانے کے بعد بادۂ گلفام کے برسنے کا جو ذکر کیا ہے ، بادۂ شبانہ کی سرمستیوں کے ختم ہونے کا جو پیام سنایا ہے ، ظلمت کدے میں شب غم کے جوش کی جو کیفیت انھیں نظر آئی ہے ، آشیانے کے قریب دام سخت کے پنہاں ہونے کو جس طرح انھوں نے محسوس کیا ہے ، شام فراق میں جس طرح جوئے خوں انھوں نے آنکھوں سے بہتے ہوئے دیکھی ہے اور داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی

شمع کو جو انھوں نے خموش پایا ہے ، اُن میں تہذیبی اور عمرانی شعور کی جھلک صاف نظر آتی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ غم دوراں کے شدید احساس نے ان سے اس طرح کے اشعار کی تخلیق کرائی ہے ۔

غالب اس اعتبار سے ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں !

اس ساری بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالب زندگی کے شیدائی تھے لیکن انھیں زندگی کا غم بھی تھا اور یہ غم ان کی ساری شخصیت پر محیط ہے ۔ زندگی کی شیفتگی نے ان کے یہاں مسرتوں کے احساس کو بیدار کیا ہے اور مسرتوں کے احساس نے ان کی شاعری کے بڑے حصے کو دامان باغباں اور کف گل فروش بنا دیا ہے ۔ لیکن اس کے باوجود اس میں ایک کسک سی محسوس ہوتی ہے اور اس کسک ہی کا یہ اثر ہے کہ وہ گل نغمہ اور پردۂ ساز ہونے کے بجائے ان کی اپنی شکست کی آواز بن گئی ہے :

نے گل نغمہ ہوں ، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

غالب
کی
عشقیہ شاعری

اردو شاعری کی روایت میں جذبۂ عشق کی ترجمانی کا پلہ دوسرے موضوعات کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ بھاری نظر آتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کے زمانے سے لے کر موجودہ دور تک، مختلف زمانوں میں اردو شعراء نے جذبۂ عشق کی ترجمانی مختلف زاویوں سے کی ہے اور ماحول اور حالات کے زیر اثر مختلف تصورات عشق کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تصورات میں یکسانی اور یک رنگی نظر نہیں آتی، بلکہ رنگا رنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مختلف زمانوں کے معاشرتی اور تہذیبی حالات ان تصورات عشق کی تشکیل کا باعث بنے ہیں۔ اردو شاعری کی روایت میں کہیں عشق کے پرانے اور فرسودہ تصورات کو قیس اور فرہاد، لیلیٰ اور مجنوں، شیریں اور فرہاد کی داستانوں کے پردے میں پیش کیا گیا ہے، کہیں عشق کے خالص جنسی اور جسمانی تصورات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ کہیں عشق و عاشقی کے بعض تصورات کی حدیں تصوف اور معرفت و حقیقت سے جا ملی ہیں اور کہیں عشق و عاشقی کے اس تصور میں وسعتیں پیدا کی گئی ہیں اور اس کے مختلف پہلوؤں کی فلسفیانہ تحلیل کا رجحان نظر آتا ہے۔ غرض اردو شاعری کی روایت نے مختلف اور متنوع تصورات عشق کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ ان تصورات کی رنگا رنگ پھولوں کا ایک گلدستہ نظر آتی ہے۔

غالب نے بھی اردو شاعری کی اس روایت میں اپنے تصورات عشق کو پیش کرکے بعض نئے پہلوؤں کی ترجمانی کی ہے۔ غالب کا تصور عشق اردو شاعری کے روایتی تصورات عشق سے مختلف ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ

ان کے یہاں بعض جگہ روایتی تصورات عشق کی جھلک نظر آتی ہے لیکن اس سلسلے میں جن افکار و خیالات کی انھوں نے ترجمانی کی ہے ، وہ ماورائی نہیں ہیں ۔ ان میں بھی حقیقت پسندی کا احساس ہوتا ہے اور عشق کے وہ تصورات نمایاں نظر آتے ہیں ، جن کی بنیاد صحت مندی پر استوار ہے ۔ وہ صرف عشق کا افلاطونی تصور پیش نہیں کرتے بلکہ روایتی عشق کی ترجمانی میں بھی بنیادی طور پر عشق کے جسمانی اور جنسی تصور کو اپنے سامنے رکھتے ہیں ۔ اس لیے کہ یہ ان کا مزاج ہے ۔ وہ جب پرستش کی نفی کرتے ہیں اور خواہش کو اپنے عشق کی بنیاد قرار دیتے ہیں، توگویا اسی پہلو کو نمایاں کرکے پیش کرنا چاہتے ہیں ۔ ان کا مشہور شعر ہے :

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اُس بت بیداد گر کو میں

اس شعر میں غالب نے صاف صاف اس حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ جو لوگ صرف عشق کو پرستش سے عبارت سمجھتے ہیں وہ احمق اور نادان ہیں کیوں کہ حسن اور محبوب کی پرستش ، بغیر کسی مقصد اور مدعا کے بے معنی چیز ہے ۔ اور پھر اس بات کی وضاحت کی ہے کہ خواہش عشق کی بنیاد ہے اور خواہش غالب کے خیال میں کسی بنیادی انسانی جذبے کی تسکین اور کسی جسمانی تقاضے کی تکمیل ہے ۔ غالب نے اس شعر میں اردو شاعری کے روایتی تصورات عشق سے انحراف کیا ہے ۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ بغاوت کی ہے کیوں کہ حسن اور محبوب کی پرستش بغیر کسی مدعا ، مقصد اور خواہش کے اردو شاعری کی روایت میں عام تھی ۔ غالب نے نہایت جرأت اور بےباکی کے ساتھ اس تصور سے اختلاف کیا اور حسن اور محبوب کی صرف بے مقصد پرستش کو بےمعنی قرار دیا ۔ اس سے ان کے انقلابی اور باغیانہ مزاج کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ ایک ایسے نئے تصور عشق کو پیش کر رہے تھے، جس کی بنیاد حقیقت پسندی پر استوار تھی ۔ ویسے یہ بات صحیح ہے کہ غالب کے یہاں عشق و عاشقی کے معاملات کی ترجمانی صرف اس تصوّر تک محدود نہیں ہے ۔ ان کے یہاں عشق کا وہ تصور بھی ملتا ہے جس کی بنیادیں روحانیت پر استوار ہیں اور جس کی تہہ میں معرفت اور حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کا خیال اور احساس بھی

موجود ہے ۔ لیکن یہ ان کی شاعری کا وہ حصہ ہے جس کو ہم تصوف اور فلسفے کے تحت رکھ سکتے ہیں ۔ اس حصے میں غالب کی شخصیت کا ایک اور پہلو ابھرتا ہے ، جس میں نسبتاً زیادہ فکری گہرائی نظر آتی ہے ۔

غالب سے قبل اردو شاعری کی روایت میں عشق کے جو تصورات موجود تھے، ان میں سے بیشتر کی بنیادیں روایتی تصورات پر استوار تھیں ۔ بعض تصورات فارسی شاعری کی روایت سے اردو شاعری کی روایت میں آئے اور بعض شاعروں نے انھیں تصورات کو اپنا معیار تصوّر کیا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی شاعری میں پیش کیے جانے والے مختلف تصورات عشق کسی نہ کسی طرح اردو شاعری کی روایت میں داخل ہو گئے ۔ لوگوں نے اس کی پیروی بھی کی ۔ اس وجہ سے کہ اس کا اثر بہت وسیع اور ہمہ گیر تھا ۔ وہ اس سے دامن نہیں جھڑا سکتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری کی روایت کا مطالعہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ بیشتر شعراء ایسے تصورات عشق کی ترجمانی کرتے ہیں، جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں ۔ مثلاً فارسی شاعری کی روایت کی طرح اردو شاعری کی روایت میں حسن پرستی بہت عام ہے ۔ عشق کا منبع اور مخرج ہی حسن پرستی ہے ۔ اسی کے گرد اس کے مختلف تصورات گھومتے ہیں ۔ عشق کرنے والا حسن سے متاثر ہوتا ہے ۔ جس سے عشق کیا جاتا ہے ، وہ ایک ایسی مخلوق ہے، جو عشق کرنے والے کو در خور اعتنا نہیں سمجھتی ۔ بلکہ عجیب و غریب صورت حالات یہ پیدا ہوتی ہے کہ وہ جذب صادق رکھنے والے عاشق سے کنارہ کشی اختیار کرکے یا اختلاف کرکے دوسروں سے پیماں وفا باندھتا ہے ۔ اس لیے رقابت اردو شاعری کی روایت میں بہت عام ہے اور اس میں رقیب ایک بہت نمایاں کردار ہے ۔ عاشق اس کے مقابلے میں ایک پامال مخلوق ہے ، جو معشوق کی بے اعتنائی کی تاب نہ لا کر اپنی پوری انفرادیت کو ختم کر دیتی ہے اور اس کی کوئی حیثیت اس پورے نظام میں باقی نہیں رہتی ۔ نا چار وہ غم کھاتا ہے ۔ صحراؤں کی خاک چھانتا ہے ۔ محبوب کے کوچے میں مارا مارا پھرتا ہے ۔ دربان و پاسبان اس کی خبر لیتے ہیں ۔ غرض وہ ایک ایسی مخلوق بن جاتی ہے، جس میں تمام تر انفعال پسندی نمایاں ہو جاتی ہے ۔ بالآخر وہ مر جاتا ہے لیکن مر کر بھی اسے چین نہیں ملتا ۔ اس کے مرقد کے نشانات مٹا دیے جاتے ہیں اور محبوب کی ستم رانیاں اسے مرنے کے بعد بھی چین سے

نہیں بیٹھنے دیتیں ۔ تقریباً تمام اردو شاعروں کے ہاں اس قسم کے خیالات ضرور ملیں گے ۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ بیشتر اردو شاعروں کے ہاں عشق کے جو تصورات ملتے ہیں، ان میں ایک عام انفعالیت پسندی کا احساس ہوتا ہے اور زندگی کی رمق ، اس کی جولانی ، احساس نشاط اور طربیہ خیالات اس میں دور دور تک نظر نہیں آتے ۔۱۰اگر اس قسم کے خیالات کی ترجمانی ملتی بھی ہے، تو اس میں اس صورت حالات کے رد عمل کی وجہ سے ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ، جس میں چھیڑ چھاڑ ، لاگ ڈانٹ اور معاملہ بندی کے موضوعات زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں ۔ غالب سے قبل اردو شاعری کی روایت انہیں دو میلانات سے عبارت نظر آتی ہے ۔

غالب کی عشقیہ شاعری نے اسی روایت کے سائے میں آنکھ کھولی ۔ اس نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے آس پاس اور گرد و پیش اس قسم کے تصورات عشق کو دیکھا ۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہاں بھی یہ تصورات بڑی حد تک نمایاں ہوئے ۔ خاص طور پر غالب کے ابتدائی دور کی شاعری میں اس روایت کا اثر خاصا نمایاں نظر آتا ہے ۔ اس کا ایک سبب فارسی شاعری کی روایت سے ان کی گہری دلچسپی بھی ہے ۔ اس زمانے میں، جیسا کہ اردو کے بعض نقادوں نے تسلیم کیا ہے ، ان کے ہاں جو عشقیہ مضامین نظر آتے ہیں ، ان میں سے بیشتر رسمی اور روایتی ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی ذہانت ان مضامین میں بھی اپنا جوہر دکھاتی ہے اور ان کی صداقت اور اخلاص مندی کو ان اشعار میں بھی بڑی آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے ۔ ان مضامین میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ غالب نے روایتی انداز کے پردے میں ایسی باتیں کہی ہیں ، جن سے اس روایت کی تضحیک کا پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ غالب نے ان تمام تصوّرات کو پوری طرح تسلیم نہیں کیا تھا ۔ بلکہ وہ ان کو مضحکہ خیز بھی خیال کرتے تھے ۔ چنانچہ ایسے اشعار ان کے دیوان میں جگہ جگہ مل جائیں گے ، جن میں خالص روایتی انداز موجود ہے لیکن جن کو پیش کرتے ہوئے وہ ایسے پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں ، جن میں احساس مزاح کا پہلو نمایاں ہوتا ہے ۔ یہ چند اشعار دیکھیے :

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحراء مگر، بہ تنگیٔ چشم حسود تھا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن، اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

کہتے ہو نہ دیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے، ہم نے مدعا پایا
حال دل نہیں معلوم، لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈا، تم نے بارہا پایا
شورِ پندِ ناصح نے، زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے، تم نے کیا مزا پایا؟

شوق ہر رنگ، رقیبِ سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

سبزۂ خط سے، ترا کاکل سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں، ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

مانع وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے
خانۂ مجنون صحرا گرد بے دروازہ تھا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا؟
حضرت ناصح گر آئیں، دیدۂ و دل فرش راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھاویں گے کیا؟
گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا یوں سہی
یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا؟

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟
اک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد!
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

عرض و نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

ہو گئی ہے غیر کی شیریں زبانی کارگر
عشق کا اُس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا
تعجب سے وہ بولا "یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں!"

ہے کیا جو کس کے باندھیے؟ میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں؟

"غیر سے رات کیا بنی؟" یہ جو کہا تو دیکھیے
سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو، ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

آنکھ کی تصویر سرنامے پہ کھینچی ہے کہ تا
تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

دست گاہِ دیدۂ خوں بار مجنوں دیکھنا
یک بیابان جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا، اگرچہ اشارے ہوا کیے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

اس میں شبہ نہیں کہ ان اشعار میں غالب کا مخصوص تصور عشق نہیں ملتا ۔ اس میں روایتی فضا ہے ۔ فارسی کے کچھ ایسے شاعروں کے اثرات ہیں جن کے یہاں روایتی تصور عشق کا پہلو بہت نمایاں تھا ۔ اس میں کہیں کہیں ناسخ اور ذوق کے اثرات بھی ملتے ہیں جو غالب کے ہم عصر تھے لیکن جنھوں نے اس زمانے کی شعری روایت میں اپنی دھاک بٹھا دی تھی ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں بیدل کا اثر بھی نظر آتا ہے ۔ بیدل جس طرح خالص انسانی زاویۂ نظر سے حسن و مظاہر فطرت کو دیکھتے تھے، اس کی جھلک بھی ان اشعار میں کہیں کہیں دکھائی دیتی ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں غالب کے یہاں ، جہاں تک ان کے تصورات عشق کا تعلق ہے ، پختگی پیدا نہیں ہوئی تھی ۔ یہ وہ دور تھا ، جب ہر چیز انھیں متاثر کرتی تھی اور وہ اس کی طرف لپکتے تھے ۔ اس لیے ان کے اس قسم کے اشعار کو معیاری سمجھنا اور ان کے صحیح تصورات عشق کا ترجمان تصوّر کرنا ، شاید زیادہ صحیح نہیں ہے ۔

غالب کے صحیح تصورات عشق کے ترجمان تو وہ اشعار ہیں ، جن میں ان کی نسلی خصوصیت ، ان کے مخصوص ذہنی رجحانات ، ان کے زمانے کے مخصوص تہذیبی اور اخلاقی معیار اور ایک انسانی اور آفاقی زاویۂ نظر کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں ۔ ان اشعار میں غالب کہیں حسن اور کہیں حسن پرستی کو معیار تصور کرکے ان کے مختلف مظاہر کی تصویر کشی کرتے ہیں اور کہیں انسانی زاویۂ نظر سے ان جذبات و احساسات کا نقشہ کھینچتے ہیں ، جو تمام انسانوں میں مشترک ہیں اور کہیں ان مخصوص معیاروں کی وضاحت کرتے ہیں ۔ جو اس زمانے کے افراد کو بہت عزیز تھے ۔

یہ صورت حال غالب کے یہاں اس وقت پیدا ہوئی ہے، جب وہ روایت سے پوری طرح بغاوت کر کے ایک نئی دنیا میں سانس لینے لگے ہیں ۔ جب انھوں نے اپنے اوپر خود اپنے آپ کو ، اپنی شخصیت کو اور اپنی ذات کو غالب کر لیا ہے ۔ اس عالم میں انھوں نے جن اشعار کی تخلیق کی ہے، وہ ان کے دیوان میں بہت نمایاں ہیں ۔ ان کو دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے عشق کا جو تصوّر پیش کیا ہے، وہ روایتی تصورات عشق سے مختلف ہے ۔ اس میں ایک نو انسانی رنگ و آہنگ ملتا ہے اور ہر جگہ ایک آفاقی زاویۂ نظر کی جھلکیاں نظر آتی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ

ان کے اس قسم کے اشعار میں زندگی اور جولانی کا احساس ہوتا ہے، گرمی اور روشنی دکھائی دیتی ہے اور رنگینی اور رجاؤ کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں ۔

غالب کی عشقیہ شاعری کے ان پہلوؤں کے عوامل اور محرکات کو سمجھنے کے لیے ان کی نسل اور خاندان ، ان کی شخصیت اور کردار ، ان کے زمانے کی فضا اور ماحول ، ان کے عہد کے ذہنی اور فکری رجحانات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے ۔ کیوں کہ ان کی عشقیہ شاعری اور عشقیہ تصورات کی تشکیل و تعمیر میں ان تمام پہلوؤں نے نمایاں حصّہ لیا ہے ۔

غالب مغلوں کی نسل سے تعلق رکھتے تھے — وہ مغل جو جنگ جو اور بہادر ہونے کے باوجود لطیف اور حسین و جمیل چیزوں کے شیدائی تھے ۔ سو پشت سے جن کا پیشہ سپہ گری تھا اور بظاہر شعر و شاعری جن کے نزدیک ذریعۂ عزّت نہیں تھی ۔ لیکن اس کے باوجود جو شب و روز شعر و شاعری کی دنیا میں زندگی بسر کرتے تھے ۔ جنھوں نے فن تعمیر ، مصوری اور شاعری کو اپنے تخلیقی کارناموں سے انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا ۔ مغلوں کی نسل سے تعلق رکھنے کے باعث غالب کو یہ تمام خصوصیات ورثے میں ملیں ۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ خود فن سپہ گری میں کوئی کار ہائے نمایاں انجام نہ دے سکے ، لیکن سپہ گروں کی خصوصیات مرتے دم تک ان کے ساتھ رہیں ۔ ان کی جرأت مندی اور دلاوری ، بےباکی اور بے نیازی کے رنگ ہمیشہ ان کی شخصیت میں نمایاں رہے ۔ حد درجہ ناسازگار حالات بھی ان کے مزاج کی ان خصوصیات کو ڈانوا ڈول نہ کرسکے ۔ ان کی زندگی کا قافلہ ان ناسازگار حالات میں سے گزرتا رہا ۔ لیکن ان کے باوجود حسن و جمال کا احساس اور ادب و فن کا مذاق، ہمیشہ ان کے ساتھ رہا ۔ وہ مرتے دم تک ان سے دلچسپی لیتے رہے ۔ حسن و جمال جس حال میں جس جگہ بھی ہوں ، ان کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتا رہا ۔ بہر حال انھیں یہ دونوں چیزیں وراثت میں ملیں اور وہ ہمیشہ انھیں سینے سے لگائے اور کلیجے سے چمٹائے رہے ۔

اس نسلی خصوصیت کے ساتھ ساتھ ، خاندانی حالات بھی ان کی طبیعت اور مزاج پر اثر انداز ہوئے اور انھوں نے ان کی شخصیت میں ایک پہلو دار

کیفیت پیدا کی ۔ غالب نے ایک ایسے خاندان میں آنکھ کھولی ، جہاں ریاست اور امارت تھی ان کے آباؤ اجداد ہندوستان آنے سے قبل ، وسط ایشیا میں اور ہندوستان آنے کے بعد یہاں بھی، اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ غالب کا بچپن ریاست اور امارت کے سائے میں بسر ہوا ۔ اور اگرچہ آگرے سے دلی منتقل ہونے کے بعد ، ان کی زندگی کے انداز میں فرق ہوا ، لیکن وہ ناساعد حالات سے دوچار ہونے کے باوجود، زندگی کی اُن امیرانہ خصوصیات کو خیرباد نہ کہہ سکے، جو انہیں اپنے آباؤ اجداد کی طرف سے ملی تھیں— وہی جاہ و جلال کا خیال اور بلندی و برتری کا احساس ان کی زندگی کا جزو بنا رہا ۔ وہ خود زیر نہیں رہ سکتے تھے ، دوسروں کو زیر دیکھنا چاہتے تھے ۔ وہ سمجھتے تھے کہ دنیا کی تمام چیزیں صرف ان کے لیے ہیں ۔ ان سب کو ان کے دام تمنا کا اسیر ہونا چاہیے ۔ غالب کو زندگی میں حد درجہ ناسازگار حالات سے دو چار ہونا پڑا لیکن ان کے طبقے کی یہ خصوصیات ان حالات میں بھی ان کا دامن نہ چھوڑ سکیں ۔ ان کی زندگی کا ایک ایک واقعہ اس خیال پر صداقت کی مہر لگاتا ہے ۔

غالب کے مزاج کی یہ خصوصیات ان کی عشقیہ شاعری اور ان کے تصورات عشق پر بھی اثر انداز ہوئی ہیں ۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان کے عشقیہ تصورات کا تار و پود انھیں خصوصیات سے تیار ہوا ہے ۔

حسن اور حسن پرستی کا خیال غالب کی شخصیت اور شاعری دونوں میں بہت نمایاں ہے ۔ اس کو کسی حد تک ان کی انفرادیت کا نتیجہ بھی کہا جا سکتا ہے ۔ لیکن اس میں ان کی نسل ، خاندان ، ماحول اور گرد و پیش کے اثرات کو بھی بہت دخل ہے ۔ مغلوں کی روایتی حسن پرستی ، امیرانہ ماحول کی تعیش پسندی اور بچپن کی لاأبالی اور آزاد زندگی نے اس احساس کی تشکیل کی اور اس کو غالب کی شخصیت اور کردار کا بنیادی جزو بنا دیا ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اثرات غالب کی زندگی اور شاعری دونوں میں اس قدر نمایاں نظر آتے ہیں ۔ غالب نے حسن کا بیان بڑی نفاست اور لطافت ، لیکن بڑی جرأت اور بے باکی سے کیا ہے — اس بیان سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ اس میں ڈوب ڈوب گئے ہیں اور انہوں نے اس کے ایک ایک انداز اور ایک ایک پہلو میں اپنے آپ کو گم کر کر دیا ہے ۔

اس حسن کے شدید احساس ہی نے انہیں صنف لطیف کا شیدائی بنا دیا ہے۔ نسوانی حسن کہیں بھی ہو، وہ اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ یوں تو وہ مظاہر فطرت سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ سبزہ زار ہائے مطرا بھی ان کے دل کو لبھاتا ہے۔ لیکن بالآخر اس کی تان نازنین بتان خود آرا، ان کی صبر آزما نگاہوں اور طاقت ربا اشاروں پر جا کر ٹوٹتی ہے۔ کلکتہ میں انھوں نے جو کچھ دیکھا، اس میں انھیں اسی صورت حال سے دو چار ہونا پڑا۔ چنانچہ اس کی یاد ہمیشہ ان کے سینے پر ایک تیر مارتی رہی:

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں!
اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتان خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت ربا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازۂ شیریں کہ واہ! واہ!
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

اس صورت حال کی بہترین ترجمان اُن کی فارسی مثنوی 'چراغ دیر' ہے جو اُنھوں نے بنارس کی تعریف میں لکھی ہے۔ اس کے چند اشعار اُن کے مزاج کی اس کیفیت کو پوری طرح ظاہر کرتے ہیں۔ اس لیے اُن کا یہاں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

بیا اے غافل از کیفیت ناز
نگاہے بر پریزادانش انداز
ہمہ جانہائے بے تن کن تماشا
ندارد آب و خاک ایں جلوہ حاشا
نہاد شاں چو بوئے گل گراں نیست
ہمہ جانند جسمے درمیاں نیست
خس و خاش گلستان است گوئی
غبارش جوہر جان است گوئی
دریں دیرینہ دیرستان نیرنگ
بہارش ایمن است از گردش رنگ
چہ فرودیں چہ ماہ و مہ چہ مرداد
بہر موسم فضایش جنت آباد

به تسلیم ہوائے آں چمن زار
ز موج گل بہاراں بستہ زنار
فلک را قشقہ گر بر جبیں نیست
پس ایں رنگینیٔ موج شفق چیست
کف ہر خاکش از مستی کنشتے
سر ہر خارش از سبزی بہشتے
سوادش پائے تخت بت پرستاں
سراپایش زیارت گاہ مستاں
عبادت خانۂ ناقوسیان ست
ہمانا کعبۂ ہندوستان ست

تیانش را ہیولا شعلۂ طور
سراپا نور ایزد چشم بد دور
میانہا نازک و دلہا توانا
ز نادانی بکار خویش دانا
تبسم بس کہ در لبہا طبعی ست
دہن ہا رشک گل ہائے ربیعی ست
ادائے یک گلستاں جلوہ سرشار
خرامے صد قیامت فتنہ در بار
بہ لطف از موج گوہر نرم رو تر
بہ ناز از خون عاشق گرم رو تر
ز انگیز قد انداز خرامے
بپائے گلبنے گستردہ دامے
ز رنگیں جلوہ ہا غارت گر ہوش
بہار بستر و نوروز آغوش
ز تاب جلوۂ خویش آتش افروز
بتان بت پرست و برہمن سوز
بہ سامان دو عالم گلستاں رنگ
ز تاب رخ چراغاں بر لب گنگ

رمانده از ادائے شست و شوئے
بہر سوجے نوید آبروئے
قیامت قامتان مژگاں درازاں
ز مژگاں بر صف دل تیزہ بازاں
بہ تن سرمایۂ افزائش دل
سراپا مژدۂ آسائش دل
بہ مستی موج را فرمودہ آرام
ز نغزیٔ آب را بخشیدہ اندام
فتادہ شورش در قالب آب
ز ماہی صد دلش در سینہ بے تاب
ز بس عرض تمنا می کند گنگ
ز موج آغوش ہا وا می کند گنگ
ز تاب جلوہ ہا بے تاب گشتہ
گہر ہا در صدف ہا آب گشتہ
مگر گوئی بنارس شاہدے ہست
ز گنگش صبح و شام آئینہ در دست

ان اشعار میں بنارس ، اُس کے مناظر و مظاہر اس کی آب و ہوا ، اس کی عمارات و مکانات سے کہیں زیادہ اُن بتان بت پرست و برہمن سوز کا ذکر رنگیں ہے ، جن کا وجود غالب کے خیال میں بہار بستر و نو روز آغوش ہے ۔ صنف لطیف کی تعریف میں ایسے حسین اور دلآویز اشعار ذرا مشکل ہی سے کسی اور شاعر کے ہاں ملیں گے ۔

ایک اور قطعہ میں بنارس کے ساتھ کلکتہ کا بھی ذکر کیا ہے اور تان 'خوبان کشور لندن' کے ذکر لطیف پر جا کر ٹوٹی ہے :

گفتمش چیست ایں بنارس ، گفت
شاہدے مست محو گل چیدن
گفتمش چوں بود عظیم آباد
گفت رنگیں تر از فضائے چمن
گفتمش سلسبیل خوش باشد
گفت خوشتر نباشد از سوسن

حال کلکتہ باز جستم ، گفت
باید اقلیم ہشتمش گفتن

گفتم آدم ہمرسد در وے
گفت از ہر دیار و از ہر فن

گفتم این جا چہ شغل سود دہد
گفت از ہر کہ ہست ترسیدن

گفتم این جا چہ کار باید کرد
گفت قطع نظر ز شعر و سخن

گفتم این ماہ پیکران چہ کس اند
گفت خوبان کشور لندن

گفتم اینان مگر دلے دارند
گفت دارند لیک از آہن

گفتم از بہر داد آمدہ ام
گفت بگریز و سر بہ سنگ مزن

غالب کے کلیات فارسی سے یہ اشعار یہاں صرف اس خیال سے نقل کیے گئے ہیں کہ ان سے غالب کے احساس حسن اور ذوق جمال کا اندازہ ہوتا ہے اور خصوصیت کے ساتھ صنف لطیف کے حسن و جمال سے اُن کی والہانہ دلچسپی کی وضاحت ہوتی ہے ۔

غرض غالب کے ہاں صنف لطیف کے حسن و جمال سے اکتساب لذت کا رجحان کسی نہ کسی صورت میں ضرور نمایاں ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی وہ مہ رخوں کے لیے مصوری سیکھتے ہیں تاکہ ملاقات کے لیے کوئی تقریب پیدا ہو اور خوباں سے چھیڑ چھاڑ کو بھی جاری رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ ان کا وصل نصیب نہ ہونے کی صورت میں ، اس کی حسرت بھی اُن کے لیے عزیز ہے ۔ حسن غالب کو نہ صرف مدہوش اور سرشار کر دیتا ہے بلکہ وہ اس کو دیکھ کر مبہوت ہو جاتے ہیں ۔ جب انھیں اپنے آس پاس اورگرد و پیش حسن کی فروانی اور آس کے جلووں کی بلا سامانی نظر آتی ہے، تو وہ حیرت سے پوچھتے ہیں :

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں ؟
غمزۂ و عشوہ و ادا کیا ہے ؟

شکن زلف عنبریں کیوں ہے—؟
نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے—؟

اور یہ کیفیت ایسی ہے کہ ہر انسان کے دل میں ان مناظر کو دیکھ کر اس کی ایک لہر سی اٹھتی ہے — اور یہ کیفیت تمام انسانوں میں مشترک ہے ۔ یہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی ۔ غالب نے حسن کے ان مختلف پہلوؤں کا ذکر کرکے صرف اپنی ہی کیفیت کی ترجمانی نہیں کی ہے ، بلکہ انسانی فطرت کو بے نقاب کیا ہے اور عالم انسان کی ایک بنیادی کیفیت کی عکاسی کی ہے ۔

حسن و جمال کا یہ خیال اور اُس کی اہمیت کا احساس غالب کے ہاں اس قدر بڑھا ہے کہ اُنھوں نے بعض اوقات اپنی ذات کی اہمیت کے احساس کو بھی خیر باد کہہ دیا ہے اور صرف یہ ایک ایسی منزل ہے ، جہاں پہنچ کر غالب اپنی انانیت کو مجروح کرتے ہیں اور حسن کےمقابلےمیں اپنی بےبضاعتی اور کم مایگی کا خیال ان پر غالب آ جاتا ہے ۔ جب وہ یہ کہتے ہیں :

غافل ! ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے
چاہتے ہیں خوبرویوں کو ، اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

تو اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ غالب مہ طلعتوں کے واسطے چاہنے والا بھی ایسا چاہتے ہیں ، جو اچھا ہو—اور پھر مزاح لطیف کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اپنی کم مایگی اور بے بضاعتی کی وجہ سے وہ خود اس قابل نہیں کہ خوبرویوں کو چاہنے کے قابل ہوں ۔ یہاں غالب کی انانیت اور خود پسندی خاصی حد تک مجروح ہو جاتی ہے—اور اس کی وجہ صرف حسن کی اہمیت کا احساس اور اُس کی برتری کا خیال ہے ۔

حسن کی اہمیت کا یہ شدید احساس غالب کے تخیل کی پرواز کو اس دنیا سے بھی آگے لے جاتا ہے اور وہ صرف اس دنیا کے لوگوں ہی کے حسن کا احساس نہیں رکھتے ، بلکہ اُن لوگوں کے حسن کا احساس بھی رکھتے ہیں ، جو اس دنیا میں موجود نہیں ہیں ۔ نہ جانے کتنے ایسے حسین خاک میں مل چکے ہیں اور اُن میں سے بعضوں کا حسن کہیں کہیں لالہ و گل کی صورت میں رو نما ہوتا ہے :

سب کہاں ، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

ایک ایسا شاعر جو نہ صرف اپنے آس پاس اور گرد و پیش کے حسن کا احساس رکھتا ہو بلکہ جس کو دنیا میں پیدا ہونے والی بے شمار حسین صورتیں خاک میں پنہاں ہو جانے کے بعد بھی لالہ و گل کی صورت میں نمایاں ہوتی ہوئی نظر آئیں ، اُس کی حسن پرستی کا بھلا کیا ٹھکانا ہے ۔

غالب کے یہاں یہ حسن پرستی بے مقصد نہیں ہے ۔ وہ حسینوں کو صرف دیکھنے ہی کے قائل نہیں ہیں ۔ وہ تو اُن سے قربت حاصل کرنے کی تمنا کرتے اور اُن کی محفلوں میں باریاب ہونے کی خواہش رکھتے ہیں ۔ انہیں ان سے ملنے کی آرزو ہوتی ہے اور وہ اُن کے وصل کو زندگی کی بنیاد سمجھتے ہیں :

اسد بہار تماشائے گلستان حیات
وصال لالہ عذاران سرو قامت ہے

اور اُن کی حسن پرستی کی تان یہیں پر جا کر ٹوٹتی ہے ۔ اور یہ صورت حال غالب کو حقیقت پسندی سے قریب کرتی ہے ۔

غالب کے عشق کی بنیاد اُن کی یہی حسن پرستی ہے ۔ اُن کے عشق کا چشمہ اسی حسن پرستی سے پھوٹتا ہے ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُن کے عشق میں جذباتیت نہیں ہے ۔ وہ کوئی مقصد رکھتا ہے—اور اُس کا سب سے بڑا مقصد حسن و جمال سے اکتساب لذت اور بعض بنیادی انسانی جذبات کی تسکین اور جسمانی تقاضوں کی تکمیل ہے ۔

لذت کا احساس انسان میں بالکل فطری ہے اور اُس کا عمل اسی لذت پسندی سے عبارت ہے ۔ غالب کے عشق کی نوعیت بھی انسانی ہے ۔ اسی لیے اُس کی بنیادیں بھی لذت پسندی پر اُستوار نظر آتی ہیں لیکن غالب کی یہ لذت پسندی نشاط و طرب ہی تک محدود نہیں ہے ۔ وہ غم عشق سے بھی لطف اندوز ہوتے اور لذت حاصل کرتے ہیں :

عشق سے طبیعت نے ، زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی ، درد بے دوا پایا

لیکن اس میں شبہ نہیں کہ عشق میں صحیح لذت انہیں حسن ہی کے سہارے حاصل ہوتی ہے ۔ لذت کا شدید احساس ہی اُنھیں حسن کی طرف راغب کرتا ہے

اور وہ پوری طرح اُس کے شیدائی ہو جاتے ہیں ۔ چنانچہ معشوق کے حسن کا بیان ، اُس کے عشوہ و ناز و ادا کی تصویریں ، اُن حالات کے نقشے جن سے لذت حاصل کی جا سکتی ہے ، اُن کی شاعری میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں — بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ اُن کی شاعری کا بہت بڑا حصہ اسی حسن ، اُس کے متعلقات اور ان کے رد عمل پر مشتمل ہے ، جن میں زندگی سے لطف اندوز ہونے کا خیال بنیادی حیثیت رکھتا ہے ۔ لیکن اُن کے بیانات میں معاملہ بندی کی خصوصیت پیدا نہیں ہوتی ۔ برخلاف اس کے بڑے ہی لطیف معاملات ، بڑے ہی لطیف جذبات اور بڑے ہی لطیف حالات کی تصویریں سامنے آتی ہیں ۔ یہ چند اشعار اس صورت حال کی پوری طرح عکاسی کرتے ہیں :

اگر وہ سرو قد ، گرم خرام ناز آ جاوے
کف ہر خاک گلشن، شکل قمری ، نالہ فرسا ہو

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم
میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

دیکھ اُس کے ساعد سیمیں و دست پر نگار
شاخ گل جلتی تھی مثل شمع ، گل پروانہ تھا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر ، نقاب اُس شوخ کے رخ پر کھلا

کوئی میرے دل سے پوچھے، ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی ، جو جگر کے پار ہوتا

بلائے جاں ہے غالبؔ اُس کی ہر بات
عبارت کیا ، اشارت کیا ، ادا کیا ،

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

دل ہوائے خرام ناز سے پھر
محشرستان بے قراری ہے

چال جیسے کڑی کماں کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

آ اے بہار ناز! کہ تیرے خرام سے
دستار گرو شاخ گل نقش پا کروں

دیکھو تو دل فریبئی انداز نقش پا
موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

غنچۂ نا شگفتہ کو، دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں، منہ سے مجھے بتا کہ یوں

سطوت سے تیرے جلوۂ حسن غیور کی
خوں ہے مری نگاہ میں رنگ ادائے گل

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

صد رنگ گل کترنا، در پردہ قتل کرنا
تیغ ادا نہیں ہے، پابند بے نیامی

اسد بند قبائے یار ہے فردوس کا غنچہ
اگر وا ہو تو دکھلا دوں کہ اک عالم گلستاں ہے

جو کچھ ہے محو شوخیٔ ابروئے یار ہے
آنکھوں کو رکھ کے طاق پہ دیکھا کرے کوئی

اس نزاکت کا برا ہو ، وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

گل کھلے ، غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی
سر خوش خواب ہے وہ نرگس مخمور ابھی

وہ نیشتر سہی ، پر دل میں جب اتر جاوے
نگہ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

غالب کا دیوان اس قسم کے اشعار سے بھرا پڑا ہے ۔ ان اشعار سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ حسن سے ، حسن کی اداؤں سے ، اس کی شوخیوں سے ، اُس کی سج دھج سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں ۔ وہ معاملہ بند شاعروں کی طرح حسن سے صرف ہوس کو پورا کرنا نہیں چاہتے بلکہ اُس سے لطف اندوز ہونے اور لذت حاصل کرتے ہیں—وہ پہلے معشوق سرو قد سے ، اُسی کی ساعد سمیں، چشم میگوں اور اُس کی زلفوں سے کھیلتے ہیں ۔ اُس کی تقریر ، اس کے خرام ناز ، اُس کے نقش پا ، اُس کی عبارت ، اشارت اور ادا سے متاثر ہوتے ہیں ، جھومنے لگتے ہیں ، مست ہو جاتے ہیں اور اس اثر حسن بار سے نہ صرف اُن کے عشق بلکہ اس کے اظہار میں بھی رعنائی آ جاتی ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب نے اس حسن کو محض تماشائی کی حیثیت سے بیان ہی نہیں کر دیا ہے ، بلکہ اپنی ذات ، اپنی شخصیت ، اپنی اُفتاد طبع اور اپنے ذہنی رجحانات کو پیش کرنے کی

کوشش کی ہے ۔ وہ اپنے انفرادی تاثرات اور جذبات و احساسات کو سامنے لائے ہیں ۔ در اصل بات یہ ہے کہ غالب کا احساس سطحی نہیں تھا ۔ وہ صرف خارجی حسن یا حسن کے خارجی پہلو ہی کو پیش کرنے کے قائل نہیں تھے ۔ کیونکہ خارجی حسن یا حسن کا خارجی پہلو بہ ذات خود اُن کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا ۔ انھوں نے تو اس حسن کے حسیاتی پہلو اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ذہنی رد عمل کو پیش کیا ہے ۔ اُن کے بیان سے معشوق ہی کا حسن بے نقاب نہیں ہوتا ، اُس کی اداؤں اور اشاروں ہی کی تصویریں ہی سامنے نہیں آتیں ، بلکہ غالب کا حسیاتی تاثر بھی سامنے آتا ہے ۔

غالب کا معشوق حسین ہے ، شعلہ خو ہے ، آتش نفس ہے ، سرو قد ہے ، پری تمثال ہے ۔ گویا مثالی حسن کی تمام خصوصیات اُس میں موجود ہیں ۔ لیکن وہ ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص کردار بھی رکھتا ہے ۔ غالب نے اُس کے حسن کے ساتھ ساتھ اُس کے کردار کو بھی نمایاں کیا ہے ۔ اُس کے عادات و اطوار کی تصویریں بھی کھینچی ہیں ۔ وہ ستم شعار اور جفا پیشہ ضرور ہے لیکن کبھی کبھی اُس کے جی میں نیکی بھی آ جاتی ہے ۔ اس عالم میں وہ اپنی جفاؤں کو یاد کرکے شرماتا بھی ہے :

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے
جفائیں کرکے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

وہ اُردو شاعروں کے معشوقوں کی طرح ایسی مخلوق نہیں ہے جو اس دنیا کی مخلوق نہ معلوم ہو ۔ وہ اسی دنیا کا انسان معلوم ہوتا ہے ۔ اسی لیے اس کے عمل میں ایک متوازن کیفیت نظر آتی ہے ۔ وہ ضدی ضرور ہے لیکن بد مزاج نہیں ہے ۔ اس میں معصومیت ہے اور وہ بھولے سے سیکڑوں وعدے وفا کرتا ہے :

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں
بھولے سے اُس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

غرض غالب نے اپنے معشوق کو انسانی اقدار کا علم بردار ثابت کیا ہے اور جگہ جگہ اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ وہ اس کو اس کی اسی خصوصیت کی وجہ سے چاہتے ہیں ۔

غالب اس معشوق سے اکتساب لذت ہی کو اپنے عشق کا نصب العین قرار دیتے ہیں اور اس اکتساب لذت کے سلسلے میں جو مختلف منزلیں آتی ہیں، اُن کی تفصیل غالب نے اپنے اشعار میں جگہ جگہ بیان کی ہے ـــــ یہ چند اشعار اسی تفصیل کو پیش کرتے ہیں :

غنچۂ نا شگفتہ کو، دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

بوسہ نہیں، نہ دیجیے دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم، گر دہاں نہیں

ساقیا دے ایک ہی ساغر میں سب کو مے کہ آج
آرزوئے بوسۂ لب ہائے میگوں ہے مجھے

اسد بند قبائے یار ہے، فردوس کا غنچہ
اگر وا ہو تو دکھلا دوں کہ اک عالم گلستاں ہے

دھوتا ہوں جب میں پینے کو، سیمیں بدن کے پانو
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے، باہر لگن کے پانو

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

دل ہوائے خرام یار سے پھر
محشرستان بے قراری ہے

دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت
ہے نگاہ آشنا تیرا سر ہر مو مجھے

غالب کا احساس لطیف اکتساب لذت کے لیے خوب صورت اور لطیف پس منظر کو بھی تلاش کر لیتا ہے۔ اگر اس عالم میں محبوب کی ذات انھیں میسر نہ آئے تو ان کی بے قراری اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ ہجر کی کیفیت

کا بیان اُن کے یہاں ایسے ہی مواقع پر ملتا ہے ۔ یہ غزل اس صورت کی بہترین مثال ہے :

شب کہ برق سوز دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ ، ہر اک حلقۂ گرداب تھا
جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو
یاں رواں مژگاں چشم تر سے خون ناب تھا
یاں سر پر شور بے خوابی سے تھا دیوار جو
واں وہ فرق ناز ، محو بالش کم خواب تھا
یاں نفس کرتا تھا روشن شمع بزم بے خودی
جلوۂ گل ، واں ، بساط صحبت احباب تھا
فرش سے تا عرش واں ، طوفاں تھا موج رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک ، سوختن کا باب تھا
ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوق کاوش ناخن سے لذت یاب تھا
مقدم سیلاب سے ، دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق ، مگر ساز صدائے آب تھا

ظاہر ہے کہ اس ہجر کی کیفیت کا پیدا کرنے والا وہ پس منظر ہے ، جس کی مصوری غالب نے اس غزل کے اشعار میں کی ہے ۔ اس کیفیت کو لذت کے خیال ہی نے پیدا کیا ہے اور محبوب سے قربت کی خواہش اس کی تخلیق کا باعث بنی ہے ۔

غالب کے یہاں اکتساب لذت کی یہ خواہش اتنی شدید ہے کہ جب اس کا سامان موجود نہ ہو تو وہ اپنے تخیل سے کام لے کر اُس فضا کو پیدا کر لیتے ہیں جو اکتساب لذت کے لیے ضروری ہوتی ہے ۔ یہ میلان اُن کی رومانی مزاجی کا نتیجہ ہے ۔ وہ خود کہتے ہیں :

مستانہ طے کروں ہوں رہ وادیٔ خیال
تا باز گشت سے نہ رہے مدعا مجھے

یہ وادیٔ خیال کو مستانہ طے کرنے کا خیال دراصل اکتساب لذت ہی کے لیے ہے ۔ غرض تخیل غالب کے یہاں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور وہ اس کے سہارے اکتساب لذت کے لیے بڑی ہی رنگین اور پرکار سی فضا پیدا

کر لیتے ہیں ۔ غالب کی تخئیل رنگین کار اس فضا کو نہایت ہی حسین اور دلآویز ، رنگین اور پرکار بنا دیتی ہے ۔ اُن کی یہ غزل اس کیفیت کی بہترین مثال ہے :

مدت ہوئی ہے ، یار کو مہماں کیے ہوئے
جوش قدح سے ، بزم چراغاں کیے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر ، جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے ، دعوت مژگاں کیے ہوئے

پھر وضع احتیاط سے ، رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں ، چاک گریباں کیے ہوئے

پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے ، سیر چراغاں کیے ہوئے

پھر پرسش جراحت دل کو چلا ہے عشق
سامان صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

پھر بھر رہا ہے خامۂ مژگاں بخون دل
ساز چمن طرازیٔ داماں کیے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں ، دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ، ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرض متاع عقل و دل و جاں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں ، نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذر دل فریبیٔ عنواں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر ، کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز ، دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے ، گلستاں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بار منت درباں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے، پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں ، تصوّر جاناں کیے ہوئے

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ ہم جوش عشق سے
بیٹھے ہیں پھر تہیّہ طوفاں کیے ہوئے

جو شخص ایک نو بہار نازکو تا کتا ہو، جس کو آرزو ہوکہ کوئی فروغ مے سے چہرہ گلستاں کیے ہوئے اُس کے پاس آئے۔ جو سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کو اپنے سینے میں آثار لینے کا متمنّی ہو ، جس کو کسی کے در پر سر زیر بار منت درباں کیے ہوئے پڑے رہنے کی خواہش ہو ، اس کی لذت پرستی میں شک و شبہ کی کس کو گنجائش ہو سکتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ وہ یہ سب کچھ اکتساب لذت کے خیال ہی سے کرنا چاہتا ہے ۔ غالب نے آگے بڑھ کر اس کا اظہار اس طرح بھی کیا ہے :

تماشائے گلشن تمنائے چیدن
بہار آفرینا گنہگار ہیں ہم

عشرت صحبت خوباں ہی غنیمت سمجھو
ہوئی غالب نہ اگر عمر طبیعی نہ سہی

گنہ گاری کا یہ اعتراف اور عشرت صحبت خوباں کو عمر طبیعی کے مقابلے میں غنیمت جاننے کا اظہار ، حسن پرستی اور عشق و عاشقی میں غالب کی حد درجہ بڑھی ہوئی لذت پرستی کے ثبوت کے لیے کافی ہے ۔

غالب حسن پرستی اور عشق و عاشقی کی دنیا میں صرف حسن و شباب اور ناز و غمزہ ہی سے اکتساب لذّت نہیں کرتے ، صرف مسرت و شادمانی ہی اُن کے لطف کا باعث نہیں بنتی ، حسن پرستی اور عشق عاشقی کی راہ میں جو پر خار مقامات آتے ہیں ، اُن سے بھی اُن کا جی خوش ہوتا ہے ۔ اس میں بھی اُن کو لذت ملتی ہے ۔ گویا غالب حسن و عشق کے ہاتھوں پیدا ہونے والی اذیت میں بھی لذت محسوس کرتے ہیں ۔ یہ لذت کبھی اُن کے معشوق کے ہاتھوں اس کی کج ادائیوں اور بے نیازیوں سے اُن تک پہنچتی ہے—اور کبھی گردش روزگار کی ناخوش گوار صورت حال اس کو پیدا کرتی ہے—کبھی مطلوبہ چیز کو نہ ملنے کی صورت میں اپنے آپ کو اُداس کرکے ، غمگین بنا کر ، اذیت پرستی کا شکار ہو کر ، زندگی ، ماحول

اور معاشرے اور خود اپنے اوپر احسان کرنے کا احساس اُن کے اندر پیدا ہوتا ہے ۔ غرض غالب کے یہاں اس اذیت پسندی کی کئی صورتیں ملتی ہیں :

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے ، راہ کو پر خار دیکھ کر

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخم کاری ہے

ستم کشی کا کیا دل سے حوصلہ پیدا
اب اُس سے ربط رکھوں جو بہت ستم گر ہو

ہم کو ستم عزیز، ستم گر کو ہم عزیز
نا مہرباں نہیں ہے ، اگر مہرباں نہیں

نالہ جز حسن طلب ، اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا ، شکوۂ بے داد نہیں

شق ہوگیا ہے سینہ ، خوشا لذت فراغ!
تکلیف پردہ داریٔ زخم جگر گئی

حالانکہ غم بہ ذات خود انہیں عزیز نہیں ۔ وہ اپنے دل کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ وہ غم اٹھا سکے :

غم کھانے میں بودا ، دل ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام ، بہت ہے

یہی احساس انھیں یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور کر دیتا ہے :

قید حیات و بند غم ، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی ، غم سے نجات پائے کیوں

عشق و عاشقی کی دنیا میں غالب اس غم کو لذت بنا لیتے ہیں اور وہ اس لذت سے مست و سرشار رہتے ہیں ۔

جیسا کہ اس سے قبل بھی کہا جا چکا ہے ، اکتساب لذت کے یہ مختلف پہلو ان کی نسلی خصوصیات ، خاندانی حالات ، ماحول کے اثرات اور

ان سب کے زیر اثر تشکیل پائی ہوئی ان کی افتاد طبع اور کردار کے یہاں پیدا ہوا ہے—غالب جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے، لذت پسندی اس کے افراد کی گھٹی میں پڑی تھی اور وہ اس کو اپنا نصب‌العین تصور کرتے تھے۔ بات یہ ہے کہ زندگی کے ایک خاص معیار نے اس طبقے کے افراد میں لطافت اور نفاست کے ساتھ وابستگی کے خیالات کو ان کی زندگی کا لازمی جزو بنا دیا تھا۔ ان کے پاس وقت بہت تھا۔ کرنے کے لیے بہت کم کام تھے۔ یہ افراد اپنےوقت کا زیادہ حصہ زندگی کی رنگ رلیوں میں گذارتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں لذت کا احساس اور لذت پرستی کا خیال تو پیدا ہونا ہی چاہیے تھا۔ غالب اسی طبقے کے ایک فرد تھے۔ اسی لیے اس کی ان خصوصیات کا ان کے کردار میں پیدا ہونا لازمی تھا۔ اُن کی حد درجہ بڑھی ہوئی لذت پسندی کا ایک سبب ان کا یہ طبقاتی مزاج بھی ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ یہ لذت پسندی ان کے لیے کسی حد تک ایک فرار کی حیثیت بھی رکھتی تھی۔ ناساز گار حالات کے باعث وہ اسی لذت کے خیال سے دل بہلاتے تھے۔ یہ ان کے لیے جینے اور غم غلط کرنے کا ایک سہارا تھا۔ یہی تمام اسباب ہیں، جنھوں نے غالب کے یہاں لذت کے خیال کو پیدا کیا ہے۔

غالب کے تصوّر عشق میں اس لذت پسندی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس لیے ان کے تصوّرِ عشق کو جدید دور کے نفسیاتی نظریات عشق کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ کیوں کہ اسی پس منظر میں اس کی اصلیت کو پوری طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ مابعدالطبیعیات کے زمانے سے لے کر اس وقت تک، عشق کے متعلق مختلف نظریات پیش کیے جاتے رہے ہیں اور آج بھی اس کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن موجودہ زمانے میں عشق کے جس مادی اور جنسی تصور کو اہمیت حاصل ہے، وہ اپنی جگہ ان تمام نظریات سے اہم ہے۔ کیوں کہ ان کی بنیادیں نفسیاتی حقائق پر استوار ہیں۔ افلاطون نے عشق کا جو تصوّر پیش کیا تھا اور جس کے اثرات ایک زمانے تک اس دنیا میں رائج رہے، وہ تمام تر رومانی اور خیالی تھا۔ اس کی بنیادیں حقیقت پر استوار نہیں تھیں۔ اس کے عشق کی تان جذباتی حسن پرستی پر ٹوٹتی ہے۔ بغیر کسی خواہش اور بنیادی انسانی جذبے کے عشق پروان چڑھتا ہے۔ اتصال جسانی کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں

رکھتا ۔ اس کا عشق تو صرف اتصال روحانی ہے اور حسن میں اپنے آپ کو بغیر کسی جسمانی اور مادی مقصد کے فنا کر دینے کا نام ہے ۔ مغرب و مشرق دونوں میں ، چونکہ افلاطون کا اثر خاصا گہرا رہا ، اس لیے صدیوں تک عشق کے اسی تصور کو لوگ سب کچھ سمجھتے رہے۔ مشرق کی روحانیت پرستی نے اس نظریے کو قبول کرنے میں کچھ اور بھی مدد کی ۔ ادھر مغرب میں عیسائیت نے اس تصوّر کو پروان چڑھایا ۔ چنانچہ یہ نتیجہ ہوا کہ عشق کو محض مخصوص اخلاق قدروں کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا، جس کا اثر یہ ہوا کہ اس کی صورت کچھ سے کچھ ہو گئی ۔ اس زمانے میں جنسی تصور موجود ضرور تھا ۔ لوگ اس کی اہمیت سے ضرور واقف تھے لیکن اس کے اظہار کو بہیمیت اور مجنونانہ کیفیت پر محمول کیا جاتا تھا ۔ عاشی کی معراج یہ سمجھی جاتی تھی کہ اس میں کسی جنسی یا جسمانی خواہش کو دخل نہ ہو ۔ چنانچہ ایسے عاشق کی مثالیں مشرق و مغرب دونوں جگہ نظر آتی ہیں ۔ لوگ کسی انسان سے نہیں، بلکہ 'عشق' سے محبت کرتے ہیں ۔ معشوق کے خیال کو سینے سے لگائے رکھنا اور اسی میں جان دے دینا ہی ان کے نزدیک سب کچھ تھا ۔ اور یہ سب افلاطونی عشق کی کارفرمائیاں تھیں ۔ لیکن اب بعض فلسفیوں اور ماہرین نفسیات کا یہ خیال لوگوں کے دلوں میں گھر کرتا جا رہا ہے کہ عشق کی نوعیت حقیقتاً جنسی ہوتی ہے ۔ اس کی تہ میں جنس کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے ۔ کیوں کہ جنسی عشق میں طرفین ہر اعتبار سے ایک دوسرے کے اتنا قریب ہو جاتے ہیں ، جس کو ایک روح دو قالب ہونے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ عشق کا جنسی تصور ہی ایک ایسا تصّور ہے ، جس میں عشق کے دوسرے تصورات گھل مل جاتے ہیں۔ یا اس محور کے گرد گھومتے رہتے ہیں ۔

عشق کا یہ تصور مغرب میں تو خیر برسوں سے ایک مخصوص طبقے میں رائج رہا ہے ۔ ہمارے یہاں یہ تصور موجودہ دور میں پہنچا ہے لیکن اس وقت بھی مخصوص معاشرتی اور تہذیبی روایات اور مخصوص اخلاقی اقدار نے اس کو عام نہیں ہونے دیا ہے ۔ چاہے لوگ اس کو صحیح سمجھتے ہوں لیکن معاشرتی بندشیں انہیں اس کا اظہار نہیں کرنے دیتیں ۔ غالب کا زمانہ آج سے تقریباً سو سال پہلے کا زمانہ ہے ۔ اس زمانے میں تو اخلاق کی

گرفت اتنی سخت تھی کہ اس کا اظہار کرنا تو درکنار ، کوئی اس کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا ۔

حالانکہ جاگیردارانہ ماحول نے ہر فرد کے دل میں لذت پرستی کی خواہشات چھپا رکھی تھیں ۔ لیکن چونکہ زندگی میں ایک دورنگی کا دور دورہ تھا ، اس لیے لوگ اس کا اظہار نہیں کرتے تھے ۔ بلکہ اس معاملے میں بھی ان کی طرف سے دورنگی کا اظہار ہوتا تھا ۔

غالب اپنے ماحول کی پیداوار تھے ۔ ان پر اپنے گرد و پیش کے اثرات بھی پڑے تھے ۔ مروجہ روایات اور اخلاقی اقدار سے بھی ان کا پیچھا چھڑانا مشکل تھا ۔ لیکن ان کی شخصیت میں دورنگی کی خصوصیت نام کو نہیں تھی ۔ وہ جو کچھ سوچتے تھے ، اس کو چھپاتے نہیں تھے ۔ بلکہ اس کا اظہار کر دیتے تھے ۔ چنانچہ ان کی عشقیہ شاعری کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ انھوں نے جو کچھ جذبۂ عشق کے متعلق سوچا ہے ، اس کا اظہار بغیر کسی جھجک کے کر دیا ہے ۔ غالب کا نقطۂ نظر ہر معاملے میں جذباتی ہونے کے بجائے عقلی ہوتا تھا ۔ وہ چیزوں پر غور کرنے کے عادی تھے ۔ چنانچہ اپنے نظریۂ عشق کو پیش کرنے کے سلسلے میں بھی انھوں نے یہی کیا ہے ۔ وہ جنسی نظریۂ عشق کے قائل تھے ، کیوں کہ وہ عقلی تھا ۔ اس لیے روایتی تصور عشق کی ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں تھی ۔ ان کا خلوص انھیں اس پر ایمان لانے سے باز رکھتا تھا ۔ صداقت اور صاف گوئی ، جو ان کی شخصیت کا حصہ تھی ، انھیں اس روایتی تصور عشق کو اپنانے کی اجازت نہیں دیتی تھی ۔ چنانچہ جب وہ یہ کہتے ہیں :

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہر نظریۂ عشق کے متعلق ان کا یہ خیال ہے ۔ بلکہ مروجہ روایتی تصور عشق ان کو 'دماغ کا خلل' معلوم ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس عشق میں جو عجیب غریب باتیں ہوتی ہیں ، ان کو اگر عقل و شعور کی روشنی میں جذبات سے الگ ہو کر دیکھا جائے ، تو ان کا خلل دماغ معلوم ہونا یقینی ہے ۔ ان پر تو بے اختیار ہنسنے کو جی چاہتا ہے ۔ غالب پر بھی اس کا یہی رد عمل ہوا ہے ۔

حالانکہ ویسے جہاں تک عشق کے عقلی تصّور کا تعلق ہے ، وہ اس کی اہمیت کے قائل ہیں ۔ ان کے خیال میں عشق خانہ ویراں ساز کی وجہ سے زندگی میں ایک رونق رہتی ہے :

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

وہ اس بات کا احساس بھی رکھتے ہیں کہ بغیر عشق کے زندگی بےکار ہے ۔ اس کی تکلیفوں کے باوجود وہ اس کے وجود کو زندگی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں ۔ ان کے خیال میں بغیر اس کے عمر کٹ ہی نہیں سکتی ۔

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں

عشق میں آزار کے قائل ہیں ۔ اس کا ہونا ان کے نزدیک لازمی ہے 'اندوہ عشق' کی کشمکش سے ، ان کے خیال میں عاشق کو کسی وقت بھی نجات نہیں مل سکتی ۔

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ عشق پر کسی کا زور نہیں ۔ اس دنیا میں آ کر انسان بے بس ہو جاتا ہے ۔ یہ آگ نہ لگائے لگتی ہے اور نہ بجھائے بجھتی ہے :

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

وہ اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ عشق ہی زندگی میں سب کچھ ہے ۔ اس سے طبیعت کو جو مزا ملتا ہے اس کی مثال دنیا کے پردے پر موجود نہیں ۔ وہ 'درد کی دوا' بھی ہے اور 'درد لادوا' بھی ۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی ، درد لا دوا پایا

غالب کے خیال میں عشق کی منزل میں قدم رکھنا معمولی انسان کے بس کی بات نہیں ۔ اس کے لیے تو پتھر کا کلیجا رکھنے کی ضرورت ہے ۔ ایک ایسا انسان محبت کر سکتا ہے، جس میں اس کی تمام مصیبتوں کو اٹھانے

کی سکت ہو ۔ کیوں کہ عشق 'نبرد پیشہ' ہوتا ہے ۔ اس کو ' مرد کی طلب' ہوتی ہے ۔ ورنہ معمولی انسان کو تو صرف اس کی 'دھمکی' ہی فنا کی نیند سلا دیتی ہے :

دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

اور اس عشق کے لیے وہ صرف اپنے آپ کو مناسب سمجھتے ہیں ۔ کیونکہ ان میں اس کا مقابلہ کرنے کی وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جن کا مطالبہ عشق کرتا ہے :

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرّر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

غرض یہ کہ غالب عشق کی اہمیت ، اور اس کی بڑائی کے قائل ہیں ۔ اور انہیں اس بات کا احساس ہے کہ عشق کے ان تمام مطالبات کو ان کی شخصیت ہی پورا کرتی ہے ۔ وہی اس پر پورے اترتے ہیں ۔

بہر حال ان کے عشق کا یہ تصوّر ایک مخصوص تصوّر ہے ۔ اس میں جذباتیت سے زیادہ عقلیت ہے ، روحانیت سے زیادہ مادیت ہے ۔ رومانیت سے زیادہ حقیقت ہے ، عینیت سے زیادہ واقفیت ہے ۔ غالب کے نزدیک عشق کا ایک مقصد ہوتا ہے ۔ اس کی تان ایک خواہش پر ٹوٹتی ہے ۔ وہ معشوق اور اس کے حسن کو صرف پوجنے کے قائل نہیں ہیں ۔ بلکہ ایک خواہش انہیں اس کی طرف راغب کرتی ہے اور وہ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے عشق نبرد پیشہ کے ہاتھوں مقابلہ کرتے ہوئے فنا ہو جانا تک پسند کرتے ہیں ۔ جو لوگ ان کی اس خواہش کو پرستش شمار کرتے ہیں ، وہ ان کے خیال میں احمق ہیں :

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بت بیدار گر کو میں

یہ 'خواہش' کیا ہے؟ — ظاہر ہے کہ یہ معشوق کے ساتھ لذت حاصل کرنے کی خواہش ہے ۔ غالب اپنے عشق میں اس خواہش کو بڑی اہمیت دیتے ہیں ۔ ان کے سارے عشق کی بنیاد اسی پر استوار ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کا تصوّر عشق روایتی نہیں رہا ہے ۔ اس میں جدّت پائی جاتی ہے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج اس کو حقیقت سے ہم آہنگ کہا جاتا ہے ۔

غالب کے اس تصوّر عشق کی تشکیل ، جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے ، ان کی مادیت اور جنسیت، خود پرستی اور انانیت، دوسروں کو زیر اور اپنے آپ کو زبر رکھنے کی خواہش ، عیش و نشاط کی تلاش اور لذت کے شدید احساس کے ہاتھوں ہوئی ہے ۔ یہی ان کے اس تصوّر عشق کے محرکات ہیں اور ان خصوصیات کو ان کے نسلی و خاندانی امتیاز کے احساس اور ماحول و گرد و پیش کے اثرات نے پیدا کیا ہے ۔ لیکن اس کے علاوہ عقل پرستی اور شعور کی بیداری نے، سادگی اور صاف گوئی اور روایت سے بغاوت کے خیال اور اپنے آپ کو اپنے اصلی روپ میں پیش کرنے کی آرزو کو ان کی زندگی کا حصہ بنا دیا تھا ۔ چنانچہ غالب کی شخصیت کی یہ خصوصیات ان کے تصوّر عشق کی تشکیل میں مد و معاون ثابت ہوئی ہیں اور عشق کے معاملے میں پیش کیے ہوئے تمام خیالات میں ان کے اثرات کا پتہ چلتاہے ۔

غالب کی شخصیت میں انانیت اور خود پسندی کا رنگ سب سےزیادہ نمایاں تھا ۔ یہی وجہ ہےکہ اس کے اثرات ان کے تصور عشق میں بھی اپنی جھلک دکھاتے ہیں ۔ وہ اپنی ذات کے سامنے معسوق تک کو کچھ نہیں سمجھتے ۔ حالانکہ معشوق سے زیادہ انھیں کوئی اور چیز عزیز نہیں تھی ۔ معشوق کا وصل ان کے نزدیک زندگی کی معراج ہے ۔ لیکن 'حجاب پاس‌وضع' ان‌کو معشوق تک پہنچنے سے باز رکھتا ہے ۔ اور معشوق کا 'غرورعزّ و ناز' اس کو ان کے پاس آنے نہیں دیتا ۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

واں وہ غرور عزّ و ناز ، یاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں ، بزم میں وہ بلائیں کیوں

اسی قسم کے حالات ان کی شاعری میں کہیں کہیں ہجر و فراق کی کیفیت کے بیان کو جگہ دیتے ہیں ، ورنہ ان کی ساری شاعری اس قسم کے بیانات سے خالی ہے ۔ اور ان کی انانیت کہیں پر بس نہیں کرتی بلکہ اس کے زیر اثر وہ بہت آگے جاتے ہیں ۔ وہ انھیں 'عشق' میں سر پھوڑنے سے باز رکھتی ہے اور اگر سر پھوڑنا ہی عشق میں ضروری ہو جائے تو پھر

وہ کسی ایک کے 'سنگ در' پر سر پھوڑنے کو ضروری خیال نہیں کرتے!

وفا کیسی ؟ کہاں کا عشق ؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل! تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو ؟

اس شعر کے انداز بیان میں ان کی انانیت کے اثرات صاف نظر آتے ہیں ۔ اور نہ صرف اس شعر میں بلکہ ان کے کلام میں جگہ جگہ ان کی انانیت اپنا اثر دکھاتی ہے :

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

تماشا کر اے محو آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
رکھتا ہوں تجھ کو بے سبب آزار دیکھ کر

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

غرض یہ کہ غالب کی عشقیہ شاعری میں ان کی انانیت کے اثرات خاصے گہرے نظر آتے ہیں ۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ نہ صرف عشق اور شاعری میں بلکہ زندگی میں خود شناسی اور خود پرستی کو بڑی اہمیت دیتے تھے ۔ ایک جگہ کہتے ہیں :

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

جز عام نہیں صورت عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستی اشیا مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

غرض عشق میں اپنی ذات کی اہمیت کا احساس بھی ان کے یہاں ان کی اسی خصوصیت نے پیدا کیا ہے ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عشق کا بھرم ان کے دم سے قائم ہے ۔ معشوق ، اس کی ادائیں اور عشوے ، ناز اور غمزے سب کچھ ان کی وجہ سے ہیں ۔ ان کے لیے ہیں ۔ ان کے بعد یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا ۔ یہ غزل ان کے اسی میلان کی صحیح عکاسی کرتی ہے :

عشق غمزے کی کشاکش سے چھٹا ، میرے بعد
بارے ، آرام سے ہیں اہل جفا ، میرے بعد

منصب شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیٔ انداز و ادا ، میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا ، میرے بعد

خوں ہے دل خاک میں احوال بتاں پر ، یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاج حنا ، میرے بعد

در خور عرض نہیں ، جوہر بیداد کو جا
نگہہ ناز ہے سرمے سے خفا ، میرے بعد

ہے جنوں اہل جنوں کے لیے آغوش وداع
چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا ، میرے بعد

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق
ہے مکرّر لب ساقی پہ صلا ، میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت مہر و وفا ، میرے بعد

تھی نگہہ میری نہاں خانۂ دل کی نقّاب
بے خطر جیتے ہیں ارباب ریا ، میرے بعد

آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا ، میرے بعد

اور عشق کی دنیا میں اپنی اہمیت کے اسی احساس نے غالب کے یہاں جذبۂ رشک کو سب سے زیادہ بیدار کیا ہے - چنانچہ ان کی شاعری کا ایک خاصاحصہ عشق میں جذبۂ رشک کی ترجمانی سے بھرا پڑا ہے۔ اردو شاعری میں جذبۂ رشک کی ترجمانی یوں تو تقریباً ہر دور کے ہر شاعر کے یہاں نظر آتی ہے ، لیکن اس کا انداز کچھ روایتی ہی سا رہا ہے - چنانچہ اسی وجہ سے ان میں اکثر جگہ ابتذال کی کیفیت بھی پیدا ہو گئی ہے - لیکن غالب کے یہاں یہ جذبۂ رشک کی ترجمانی روایتی انداز میں نہیں ہے - بلکہ اس کی محرک ان کے کردار کی بعض بنیادی خصوصیات ہوتی ہیں - غالب کے یہاں خاندانی وجاہت کا جو شدید احساس تھا ، اپنے آپ کو ہر اعتبار سے بلند رکھنے کی جو خواہش تھی اور جس کے نتیجے میں انانیت نے جنم لیا تھا ، ان تمام باتوں کے اثرات ان پر یہ ہوئے تھے کہ وہ دنیا کی ہر چیز کو اپنے لیے سمجھتے تھے - ان کو یہ گوارا نہیں تھا کہ کوئی دوسرا بھی اس میں شریک ہو - چنانچہ معاملات حسن و عشق میں بھی ان کے یہاں یہی جذبہ کام کرتا تھا - ان معاملات میں ایک حد تک تو یہ جذبہ نفسیاتی حقیقت پر مبنی ہے - لیکن غالب کے یہاں آگے بڑھ کر یہ خود پسندی بلکہ خود غرضی کے حدود میں داخل ہوگیا ہے اور اس طرح اس نے ان کے یہاں کہیں کہیں ایک مرض کی صورت اختیار کر لی ہے - لیکن غالب کے کردار اور افتاد طبع کے پس منظر میں رشک کا یہ بیان حقیقت نظر آتا ہے - وہ صرف رقیب ہی پر رشک نہیں کرتے ، خود معشوق اور اپنی ذات تک پر رشک کرنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں :

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اُسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں ولے اُن کی تمنا نہیں کرتے

رشک کہتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

ہم نشینیٔ رقیباں گرچہ ہے سامان رشک
لیکن اس سے نا گوارا تر ہے بد نامی تری

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفت رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لیے

نفرت کا گماں گزرے ہے، میں رشک سے گزرا
کیوں کر کہوں لو نام نہ اُن کا مرے آگے

اُبھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کی ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر، تھا جو راز داں اپنا

بس کہ وہ چشم و چراغ محفل اغیار ہے
چپکے جلتے ہیں جوں شمع ماتم خانہ ہم

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو

یہ اور اسی قسم کے دوسرے اشعار، اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ غالب کے یہاں معاملات عشق میں یہ رشک کتنی شدت اختیار کر گیا تھا۔ غور سے دیکھا جائے تو یہ رشک کے معاملات بھی بنیادی طور پر ان کے اُس تصور عشق کی پیداوار ہیں، جس کی بنیادیں لذت پسندی پر اُستوار نہیں اور جس کی تہہ میں جنسی جذبے کا ہاتھ تھا۔

غالب کے تصور عشق کی نوعیت، اس میں شبہ نہیں کہ جنسی ہے لیکن یہ جرأت، انشاء اور رنگین کے تصور عشق سے مختلف ہے۔ غالب

کے یہاں یہ نظریۂ عشق کہیں بھی ایک ذہنی تعیش کی صورت اختیار نہیں کرتا ۔ ابتذال کے عناصر بھی اُس میں پیدا نہیں ہوتے ۔ وہ جرأت کی طرح معاملہ بندی کے قائل نہیں ہیں ۔ وہ جنسی معاملات کی ترجمانی ضرور کرتے ہیں لیکن اس میں بڑی لطافت کا احساس ہوتا ہے اور لیے دیے رہنے والی کیفیت نظر آتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عشق و ہوس میں امتیاز کرتے ہیں ۔ اُن کے نزدیک عشق و ہوس میں زمین آسمان کا فرق ہے ۔ غالب عشق کے قائل ہیں اور ہوس کو بری چیز سمجھتے ہیں :

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

اہل ہوس کی فتح ہے ، ترک نبرد عشق
جو پاؤں اٹھ گئے، وہی اُن کے علم ہوئے

فروغ شعلۂ خس یک نفس ہے
ہوس کو پاس ناموس وفا کیا

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ عشق و ہوس غالب کے نزدیک دو مختلف چیزیں ہیں ۔ عشق کی سطح بلند ہے اور ہوس کی سطح پست ۔ یہ دونوں کبھی ایک جگہ پر جمع نہیں ہو سکتے ۔ ہوس اُن کے نزدیک عشق کی موت ہے ۔

یہ خیالات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ غالب کے تصور عشق میں ایک امتیازی شان تھی ۔ اُس کی نوعیت جنسی ضرور ہے لیکن اس کے باوجود ہوس سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے پیش نظر کچھ اخلاق اقدار ضرور ہیں ، جن کو وہ نظر انداز کرنا نہیں چاہتے ۔

اس صورت حال ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ غالب کی شاعری میں عشق کے اس مادی اور جنسی تصور کی ترجمانی کے باوجود عشق اور اُس کی مختلف اور متنوع واردات و کیفیات کی رنگا رنگ تصویریں ملتی ہیں ۔ عاشق جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے ، اُس کے دل پر جو کچھ گزرتی ہے ، جن معاملات سے اُسے دو چار ہونا پڑتا ہے ، جتنی منزلیں بھی راہ عشق میں اُسے طے کرنی پڑتی ہیں ، اُن سب کی ترجمانی غالب نے اپنی شاعری میں

بڑے سلیقے سے کی ہے ۔ اور اس صورت حال نے اُن کی عشقیہ شاعری کو عشقیہ معاملات اور واردات و کیفیات کا ایک نہایت ہی حسین اور دلاویز مرقع بنا دیا ہے ۔ غالب نے عشق کے کسی پہلو کو چھوڑا نہیں ہے ، ایک ایک جذبے اور ایک ایک کیفیت کی ترجمانی کی ہے :

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

سادگی و پرکاری ، بےخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

کم جانتے تھے ہم بھی غم عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غم روزگار تھا

غم فراق میں تکلیف سیر گل مت دو
مجھے دماغ نہیں ، خندہ ہائے جا کا

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتن گل ہائے ناز کا

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ترے وعدے پر جیے ہم ، تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے ، اگر اعتبار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے، ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی ، جو جگر کے پار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق اگر نہ ہوتا ، غم روزگار ہوتا

نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دل گم گشتہ ، مگر ، یاد آیا

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلا
اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

بے داد عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسد
جس دل پہ ناز تھا مجھے ، وہ دل نہیں رہا

درد دل لکھوں کیوں کر، جاؤں اُن کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی ، خامہ خوں چکاں اپنا

گھِیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سر رہگزار تھا

تو اور آرائش خم کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

مر گیا پھوڑ کے سر غالب وحشی ہے ہے
بیٹھنا اُس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

ہم پر وفا سے ترک وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے وگر نہ مراد امتحاں نہیں

راز معشوق نہ رسوا ہو جائے
ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

وفا کیسی ، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا!
تو پھر اے سنگدل! تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

شرم اک ادائے ناز ہے ، اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو، کبھی جاناں کے دامن کو

خدا یا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچیے

وہ شوخ اپنے حسن پہ مغرور ہے اسدؔ
دکھلا کے اس کو آئینہ توڑا کرے کوئی

رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف بر طرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا ! کوئی دیوار بھی نہیں

مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

بیکاریٔ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

رونے سے اے ندیم ! ملامت نہ کر مجھے
آخر کبھی تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

ان اشعار سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ غالب کی زندگی اور شخصیت میں عشق و عاشقی کا رنگ پوری طرح رچا ہوا تھا ۔ اس راہ میں جو منزلیں آتی ہیں ، وہ ان سب سے گذرے تھے ۔ اس راہ کے مسافر کو جو تجربات بھی ہوتے ہیں ، ان سب کا وہ گہرا احساس و شعور رکھتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان اشعار میں ان تجربات کی تمام تفصیلات موجودہیں اور ان میں سے ہر تجربہ انسانی نفسیات کے کسی نہ کسی پہلو کی تصویر پیش کرتا ہے ۔ اسی لیے اس کی بنیاد حقیقت و واقعیت پر استوار نظر آتی ہے اور اس میں انسانی اور آفاقی رنگ و آہنگ کا احساس بھی ہوتا ۔

غالب کی عشقیہ شاعری اس اعتبار سے اُردو شاعری کی روایت میں ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے !

غالب کی شاعری
کا
جمالیاتی پہلو

غالب ایک عظیم شاعر ہیں ۔ ان کی شاعری میں انسانی زندگی کے جذباتی معاملات کی بڑی ہی حسین مصوری ہے ۔ ان معاملات کو انھوں نے فکری اور فلسفیانہ ، لیکن انسانی زاویۂ نظر سے دیکھا ہے ۔ ان کے یہاں فلسفیانہ خیالات زندگی سے الگ نہیں ہیں ۔ انھوں نے مابعد الطبیعاتی ، اخلاق اور جمالیاتی معاملات کے اسرار و رموز کی بڑی خوبی سے نقاب کشائی کی ہے ۔ لیکن ان سب کو زندگی سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا ہے ۔ ان کی فکر ماورائی نہیں ہے ۔ وہ آس پاس اور گرد و پیش کی زندگی سے گہرا تعلق رکھتی ہے ۔ وہ انسان کی عظمت کے قائل ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود ان کے خیال میں وہ مجبور محض ہے اور اس کو کائنات کی کسی چیز پر کوئی اختیار حاصل نہیں ۔ وہ محبت اور اخوت کے علم بردار ہیں ۔ وہ موحد ہیں اور ترک رسوم ان کا مسلک ہے ۔ ملتوں کے مٹ جانے کو وہ اجزائے ایماں سمجھتے ہیں ۔ ان کے پاس انسانی زندگی کے اجتماعی پہلو کا گہرا شعور موجود ہے اور انھوں نے اپنی شاعری میں اس کے نشیب و فراز کی حقیقت سے بڑی ہی بھرپور تصویر کشی کی ہے ۔ ان تمام پہلوؤں نے مل کر ان کی شاعری کو عظیم بنایا ہے لیکن ان پہلوؤں کو حسین اور دل آویز بنا کر پیش کرنے میں بھی وہ ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں اور اس صورت‌حال نے بھی ان کی شاعری کو عظمت سے ہم کنار کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے ۔

ان کا بنیادی سبب تو یہ ہے کہ غالب کے یہاں ہر شاعرانہ خیال نے ایک تجربے کی صورت اختیار کی ہے ۔ وہ محض قافیہ پیمائی کی پیداوار

نہیں ہے - اس میں آورد کا شائبہ تک نہیں ہوتا - اسی لیے اس میں ان کی پوری شخصیت کسی نہ کسی زاویے سے اپنی جھلک دکھاتی ہے - یہ شخصیت بڑی پہلو دار ہے - اس میں بڑی ہی رنگینی اور پرکاری ہے - اس میں روایت کا رنگ رچا ہوا ہے - ماحول کے اثرات بھی اس پر بڑے گہرے ہیں - ان کی شخصیت کی یہ خصوصیات ان کے شاعرانہ تجربات میں بھی نمایاں نظر آتی ہیں - غالب پر فارسی کا اثر بہت گہرا ہے - وہ فارسی کی روایت میں پوری طرح رنگے ہوئے ہیں - یہ فارسی ہی کی روایت کا اثر ہے کہ ان کی شاعری میں جگہ جگہ گل کاریاں سی ملتی ہیں - فارسی کے مزاج کو انھوں نے اردو کے ساتھ کچھ اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ اس میں بڑی ہی شاداب اور شگفتہ سی فضا پیدا ہو گئی ہے - ان کی شاعری میں ہر جگہ جگمگاہٹ کا احساس ہوتا ہے - بڑی ہی تابندگی نظر آتی ہے - فارسی کی جو ان گنت ترکیبیں انھوں نے تراشی ہیں، ان کو دیکھ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جھاڑ فانوس سے روشن ہیں یا جگہ جگہ پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی ہیں - بات یہ ہے کہ ان کی تراشی ہوئی فارسی کی یہ ان گنت ترکیبیں محض الفاظ کا مجموعہ نہیں ہیں - ان میں اس رنگین و پرکار تہذیب کا لہو ہے ، جس نے غالب کو پیدا کیا تھا اور جس کی رنگینی و پرکاری ان کے ایک ایک انداز سے پھوٹتی ہے - یہ اشعار اس صورت حال کے صحیح ترجمان اور عکس ہیں :

ہوائے سیر گل ، آئینہ ٔ بے مہری قاتل
کہ انداز بہ خوں غلطیدن بسمل پسند آیا

رنگ شکستہ ، صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتن گل ہائے ناز کا

ہیں بس کہ جوش بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشہ ٔ بساط ہے سر شیشہ باز کا

شب ہوئی، پھر انجم رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بت کدے کا در کھلا

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

نوازش ہائے بے جا ، دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا ؟

کم نہیں نازش ہم نامئ چشم خوباں
تیرا بیمار برا کیا ہے ، گر اچھا نہ ہوا

بےؑ نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
بہ خوں غلتیدۂ صد رنگ دعوئِ پارسائی کا

وہی اک بات ہے جو یاں نفس، واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا
نہ دے نامے کو اتنا طول، غالب مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جدائی کا

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ، ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ ، صبا آوارہ ، گل نا آشنا

غافل ، بہ وہمِ ناز خود آرا ہے ، ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں ، طرہ گیاہ کا

بخشے ہے جلوۂ گل ، ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے ، موج مے تری رفتار دیکھ کر

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ باز خیال
ہیں ورق گردانیٔ نیرنگ یک بت خانہ ہم

لے گئی ساقی کی نخوت، قلزم آشامی مری
موج مے کی آج رگ، مینا کی گردن میں نہیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے ؟
کہ غیر جلوۂ گل رہگذر میں خاک نہیں

جب وہ جمال دل فروز، صورت مہر نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں منہ چھپائے کیوں

پرسش طرز دلبری کیجیے کیا ؟ کہ بن کہے
اس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دود شعلۂ آواز ہے

ڈھونڈے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

جلوہ زار آتش دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شور قیامت کس کی آب و گل میں ہے

دیکھو تو دل فریبیٔ انداز نقش پا
موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

دل ہوائے خرام ناز سے پھر
محشرستان بے قراری ہے

ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامان باغبان و کف گل فروش ہے
لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ
یہ جنت نگاہ، وہ فردوس گوش ہے

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے
اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے

یہ حقیقت ہے کہ غالب کی شاعری میں ابہام کا رنگ خاصا گہرا ہے۔ لیکن اس کا سبب صرف ان کی مشکل پسندی نہیں ہے۔ یہ رنگ تو ان کے تجربے کی تہہ در تہہ کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس میں تو ان کے فکر کی گہرائی اپنے آپ کو رونما کرتی ہے۔ بعض لوگوں نے یہ کہہ دیا ہے کہ بیدل کے اثر سے انھوں نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں ایسے اشعار زیادہ کہے، جن میں ابہام کا پہلو نمایاں ہے۔ اس میں کسی حد تک صداقت ضرور ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غالب نے ابہام کو پیدا کرنے میں صرف تقلید سے کام لیا ہے۔ دراصل یہ ان کا مزاج ہے اور اس کا منبع ان کے احساس کی شدت، جذبے کی پر پیچ کیفیت، ان کے شعور کی گہرائی اور فکر کی بلند پروازی ہے۔ بیدل کا اثر اس حد تک تو اس میں ہے کہ اس کی انسان دوستی کے نظریے سے متاثر ہو کر وہ انسان کی عظمت اور کائنات میں اس کی حیثیت پر غور و فکر کرنے لگے ہیں اور جب انھوں نے اس کا شاعرانہ اظہار کیا ہے تو ان کے یہاں ابہام کی خصوصیت نمایاں ہو گئی ہے۔ کیوں کہ اس ابہام کو انھوں نے اپنے حدود میں رکھا ہے۔ اس کی حدیں اشاریت سے ملی ہوئی ہیں اور ان کا یہ ابہام درحقیقت اشاریت ہی کا دوسرا روپ ہے۔ غالب چونکہ بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

اسی لیے انھوں نے اپنی باتیں اشاروں کنایوں میں کہی ہیں اور اس طرح بہت کم کہہ کر بہت کچھ مراد لیا ہے۔ انھوں نے مشاہدۂ حق کی گفتگو بادہ و ساغر میں اور ناز و غمزہ کی گفتگو دشنہ و خنجر میں کی ہے اور اس انداز نے ان کی شاعری میں حسن و جمال کا ایک نیا عالم پیدا کردیا ہے۔ یہ اشعار ان کے اس میلان فن کی صحیح نمایندگی کرتے ہیں:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ، ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش، زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

دل تا جگر کے ساحل دریائے خوں ہے اب
اس رہگذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

دل گزرگاہ خیال مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سر منزل تقویٰ نہ ہوا

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتن گل ہائے ناز کا

رگ سنگ سے ٹپکتا، وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

وہی اک بات ہے جو یاں نفس، واں نکہت گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوام کلفت خاطر ہے عیش دنیا کا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقت سفر یاد آیا

غافل بہ وہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شانۂ صبا نہیں طرہ گیاہ کا

بخشے ہے جلوۂ گل ، ذوق تماشا غالب !
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہوجانا

ہوں گرفتار اُلفت صیاد
ورنہ باقی ہے طاقت پرواز

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں ؟ خون جگر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

خزاں کیا ، فصل گل کہتے ہیں کس کو ، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں ، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر ، سو خموش ہے

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

ہے موجزن اک قلزم خوں دیکھیے کیا ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوت چمن و خوبیٔ ادا کہیے

مدعا محو تماشائے شکست دل ہے
آئینہ خانے میں کوئی لیے جاتا ہے مجھے

غالب علامتوں اور اشاروں کے شاعر ہیں۔ انھوں نے روایتی علامتوں اور اشاروں سے بڑا کام لیا ہے۔ اور ان کو استعال کر کے اپنی شاعری میں بڑی مانوس سی فضا پیدا کی ہے ۔ انھوں نے گل، بلبل ، قفس ، آشیانہ، صیاد ، گلچیں ، شمع ، پروانہ ، محفل ، مجلس ، صحرا ، جنوں ، باغبان ، گل فروش اور اس طرح کی بے شمار علامتیں استعال کی ہیں اور ان کے ذریعے سے اپنے شاعرانہ تجربے کے نشیب و فراز کو واضح کیا ہے ، اور اس طرح ان کے یہاں بڑی حسین اور دل آویز سی فضا پیدا ہوئی ہے لیکن انھوں نے اپنے آپ کو صرف انھیں علامتوں اور اشاروں تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ بعض نئی علامتوں اور اشاروں کی داغ بیل بھی ڈالی ہے۔ ان کے یہاں سحر ، رات ، زنجیر ، آگ ، دھواں ، شعلہ ، شرر اور اس قسم کی بے شمار علامتیں ملتی ہیں ۔ ان اشاروں اور علامتوں کے ذریعے ان کی معنویت اپنے آپ کو اس طرح ظاہر کرتی ہے کہ اس میں حسن و جال کی اقدار بھی رونما ہو جاتی ہیں ۔ ان کا اثر براہ راست حواس پر ہوتا ہے اور یہ احساس جال اور ذوق حسن کی تسکین کا سامان فراہم کرتی ہے ۔

اس میں شبہ نہیں کہ غالب ظرف تنگنائے غزل کے شکوہ سنج تھے اور اپنے بیان کے لیے کچھ اور وسعتوں کی تمنا رکھتے تھے ۔ یہ وسعتیں ان کے لیے رمزیت اور ایمائیت نے فراہم کیں ۔ غالب کی شاعری میں رمز و ایما کی فراوانی نظر آتی ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ غزل کے مزاج سے واقف ہیں اور اس کے جالیاتی پہلو کا صحیح شعور رکھتے ہیں ۔ اس لیے انھوں نے غزل کے رمز و ایما کو بڑے سلیقے سے برتا ہے ۔ اس کام میں علامتوں ، اشاروں اور تلمیحوں نے ان کی بڑی مدد کی ہے ۔ لیکن اس رمزیت اور ایمائیت کو انھوں نے اپنی شاعری میں صرف اسی طرح پیدا نہیں کیا ہے بلکہ کہیں ایک مخصوص لہجے نے اس کی تشکیل کی ہے ، کہیں ایک مخصوص انداز بیان نے اس کا ہیولا تیار کیا ہے ، کہیں

بعض خاص تیروں نے اس کی عمارت تعمیر کی ہے اور اس طرح اس رمزیت اور ایمائیت نے ان کی شاعری میں جالیاتی پہلو کو ابھارا ہے ۔

غالب کی شاعری اپنی ایک شگفتہ اور شاداب فضا سے پہچانی جاتی ہے ۔ وہ غزل کے شاعر ہیں اور انھوں نے غزل کی شاعری کے بنیادی مقتضیات کو پورا کیا ہے ۔ غزل کی ایک اہم خصوصیت سوز و گداز بھی ہے ، غالب کے یہاں غزل کا یہ سوز و گداز بھی موجود ہے لیکن اس سوز و گداز کے ساتھ ساتھ انھوں نے انسانی زندگی کے نشاطیہ پہلو کو نمایاں کر کے اپنی شاعری میں بڑی شگفتگی اور شادابی پیدا کی ہے ۔ شوخی اور ظرافت ، طنز اور مزاح نے شگفتگی اور شادابی کے رنگ کو کچھ اور گھرا کر دیا ہے ۔ غالب زندگی کی مسرتوں کے شاعر ہیں اور ان مسرتوں سے متعلق مختلف پہلوؤں کی ترجمانی وہ بڑی خوبی سے کرتے ہیں ۔ اس ترجمانی ہی کا یہ اثر ہے کہ ان کی شاعری میں جگہ جگہ رنگ و نور کے فوارے سے چھوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں اور حد نظر تک چاندنی سی چھٹکی ہوئی دکھائی دیتی ہے ۔ غالب ایک رنگین اور پرکار تہذیب کے علم بردار ہیں ۔ وہ اس تہذیب کی جالیاتی اقدار کا گھرا شعور رکھتے ہیں ۔ انھیں ان اقدار کے ساتھ ایک جذباتی وابستگی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس تہذیب کی تمام رنگینی اور پرکاری سمٹ کر ان کی شاعری میں آ گئی ہے ۔ اس تہذیب کی جالیاتی اقدار کا عکس ان کی شاعری کے آئینے میں دکھائی دیتا ہے ۔ غالب کے مزاج میں ایک حساس مزاج بھی موجود تھا ۔ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر دل کھول کر ہنس سکتے تھے ۔ انھیں ناسازگار حالات کا مذاق اڑانا بھی آتا تھا ۔ اسی لیے ان کے یہاں رونے اور منہ بسورنے کے بجائے مسکرانے اور ہنسنے کی فضا خاصی نمایاں نظر آتی ہے اور اس فضا نے بھی ان کی شاعری میں شگفتگی اور شادابی کے رنگ کو نمایاں کیا ہے ۔ غالب اس فضا کے بڑے ہی چابک دست مصور ہیں ۔

غالب
کی
تصویر کاری

انیسویں صدی میں ہندوستانی مسلمانوں کی ثقافتی روایت نے جو صورت اختیار کی تھی ، غالب کی شخصیت اس کی صحیح آئینہ داری کرتی ہے ۔ اس ثقافتی روایت میں باوجود انحطاط و زوال کے ، وہ جو ایک جولانی اور تابانی تھی ، اس کے اثرات غالب کی شخصیت میں بھی نظر آتے ہیں ۔ غالب کے یہاں غم کے باوجود زندہ رہنے کی جو خواہش ہے اور رواں دواں رہنے کی جو آرزو ہے ، وہ اسی ثقافتی روایت کا پرتو ہے—اور ان کی اس شخصیت کے اثرات ان کی شاعری میں بھی اپنی جھلک دکھاتے ہیں ۔ بلکہ شاید یہ کہنا بے جا نہیں کہ ان کی ساری شاعری اسی ثقافتی روایت اور اس کے زیر اثر تشکیل پانے والی ان کی شخصیت کی عکاسی کرتی ہے ۔ معنوی اور فنی دونوں اعتبار سے ان کی شاعری اس ثقافتی روایت کی صحیح آئینہ دار ہے ۔ اس زمانے کے خارجی حالات ، داخلی تجربات ، ذہنی واردات اور جذباتی کیفیات—ان سب کا مجموعی امتزاج ان کی شاعری میں مختلف زاویوں سے اپنے آپ کو رونما کرتا ہے ۔

شاعری معنوی اور فنی دونوں اعتبار سے، جیسا کہ بعض اہم نقادوں نے کہا ہے ، تصویروں اور پیکروں کے مجموعے کا نام ہے ۔ شاعر کا تجربہ تصویروں اور پیکروں سے عبارت ہے ۔ وہ جب ان تہہ در تہہ اور پیچیدہ تجربات کو ظاہر کرتا ہے ، تو اس کا اظہار ان تصویروں اور پیکروں کی صورت اختیار کر لیتا ہے ۔ خاص طور پر شاعری کے فنی اور جمالیاتی پہلو میں تو یہ تصویر کاری اور پیکر تراشی بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا ہیولا شاعر کے ذاتی تجربات اور اجتماعی احساسات کے ہاتھوں تیار ہوتا ہے ۔

غالب کی شاعری میں جو امیجری یا تصویرکاری اور پیکر تراشی ملتی ہے ، وہ بھی ان کے ذاتی تجربات اور اجتماعی احساسات کی صحیح آئینہ دار ہے اور اس میں ان کی شخصیت اور ماحول کی ایسی رنگا رنگ تصویریں نظر آتی ہیں، جو حقیقت سے بھرپور ہیں ۔

یہ وہ زمانہ تھا، جب زندگی پر انحطاط و زوال کے بادل منڈلا رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ثقافتی زندگی اس زمانے میں اپنے معراج کمال پر پہنچ گئی تھی ۔ کئی سو سال میں مغلوں کی تہذیب نے ایک ایسی ثقافتی روایت کو پروان چڑھایا تھا ، جس کی اہمیت کا خیال اور عظمت کا احساس، افراد کے مزاجوں کا جزو بن گیا تھا ۔ اس انحطاط و زوال کے زمانے میں بھی اس احساس و خیال کے نقوش دھندلے نہیں ہوئے تھے، بلکہ اس عالم میں تو یہ احساس و خیال کچھ زیادہ ہی شدید ہوگیا تھا ۔ چنانچہ وہ رنگینی اور رعنائی، جو مغلوں کی تہذیبی اور ثقافتی روایت میں بنیادی حیثیت رکھتی تھی، اس کو اس زمانے کے افراد نے اپنے لیے معیار بنا لیا تھا ۔ شمشیر و سناں کو اولیت حاصل نہیں رہی تھی ۔ طاؤس و رباب کا خیال زندگی پر سر خوشی بن کر چھا گیا تھا ۔ رامش و رنگ کی دنیائیں آباد تھیں ۔ رقص و سرور کی بزم آرائیوں نے جنت نگاہ اور فردوس گوش بن جانے کے تمام سامان فراہم کر دیے تھے ۔

غالب کی تصویرکاری اور شاعرانہ پیکر تراشی میں بھی اس صورت حال کا اثر واضح طور پر نظر آتا ہے ۔ اُن کے ہاں بزم مئے، گردش پیمانہ، ساغر، محفل رقص و سرود ، مغنی آتش نفس اور اس قبیل کی جو بے شمار تصویریں ملتی ہیں ، اس کی محرک یہی صورت حال ہے ۔ یہ اشعار زندگی کی اس کیفیت کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں :

دل گزر گاہ خیال مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سر منزل تقویٰ نہ ہوا

ہیں بس کہ جوش بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

نفس موج محیط بے خودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا ؟

میں اور بزم مے سے ، یوں تشنہ کام آؤں !
گر میں نے کی تھی توبہ ، ساقی کو کیا ہوا تھا؟

ہے مئے کسے ہے طاقت آشوب آگہی؟
کھینچا ہے عجز حوصلہ نے خط ایاغ کا

شب کہ وہ مجلس فروز خلوت ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع ، خار کسوت فانوس تھا

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ باز خیال
ہیں ورق گردانیٔ نیرنگ یک بت خانہ ہم

ہم سے کھل جاؤ بہ وقت مئے پرستی ، ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے، رکھ کر عذر مستی، ایک دن
قرض کی پیتے تھے مئے، لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ، ایک دن

لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری
موج مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

غالب چھٹی شراب، پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں

جاں فزا ہے بادہ ، جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی ، گویا ، رگ جاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

جب مے کدہ چھٹا ، تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو ، مدرسہ ہو ، کوئی خانقاہ ہو

مے سے غرض نشاط ہے ، کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

رندان در مے کدہ ، گستاخ ہیں زاہد !
زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں کے

میں نے کہا کہ : 'بزم ناز چاہیے غیر سے تہی'
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ : 'یوں ؟'

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا ، اگرچہ اشارے ہوا کیے

گرچہ ہے کس کس برائی سے ، ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے ؟

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامان باغبان و کف گل فروش ہے
لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ
یہ جنّت نگاہ ، وہ فردوس گوش ہے

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے ، باد پیمائی

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے درد تہ جام بہت ہے

ڈھونڈے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

مے پرستاں خم مے منہ سے لگائے ہی بنے
ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

ان اشعار میں غالب نے ، ساغر ، جام ، مینا خم ، جوش بادہ ۔ گوشۂ بساط ، محفل ، شمع ، فانوس ، دامان باغباں ، کف گل فروش ، مغنی آتش نفس ، وغیرہ کی جو تصویریں بنائی ہیں اور پیکر تراشے ہیں ، ان کی جڑیں ان کی ثقافتی روایت میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں ۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان میں نہ صرف معنوی گہرائی کا پتہ چلتا ہے بلکہ صوری گہرائی کی بے وجہ مانوس اور دل موہ لینے والی فضا نظر آتی ہے ۔

غالب اس فضا کے شیدائی ہی نہیں ہیں ۔ یہ فضا تو ان کے مزاج اور شخصیت کا بنیادی جزو ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعرانہ تصویر کاری اور پیکر تراشی میں اس کا رنگ اتنا گہرا اور رچا ہوا نظر آتا ہے ۔ اس کا ایک سبب تو ، جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے ، یہ ہے کہ غالب نے اسی تہذیبی اور ثقافتی روایت کی آغوش میں آنکھ کھولی تھی اور اسی کے سائے میں ان کی ذہنی ، جذباتی اور جمالیاتی نشو و نما ہوئی تھی ۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ سیاسی انحطاط اور معاشی معاشرتی زوال کے باعث اس تہذیبی اور ثقافتی روایت کی اہمیت کا احساس افراد میں شدید سے شدید تر ہوگیا تھا ۔ غالب کے یہاں بھی یہی صورت حال ملتی ہے ۔ غالب کو چونکہ اس بات کا احساس تھا کہ یہ قدریں انحطاط و زوال کی وجہ سے آندھیوں کی زد پر ہیں ، اس لیے وہ انھیں غیر شعوری طور پر کچھ زیادہ ہی عزیز رکھتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شاعرانہ تجربہ جب جمالیاتی اظہار کی صورت اختیار کرتا ہے ، تو اس تہذیبی روایت کا رنگ ان تصویروں اور پیکروں میں بہت گہرا ہو جاتا ہے ۔

یہ تہذیبی روایت غالب کو بہت عزیز تھی اور ان کی شخصیت اسی سے عبارت تھی ۔ لیکن انھوں نے اس روایت کو مٹتے ہوئے بھی دیکھا ہے ۔ انھیں یہ روایت آندھیوں کی زد پر بھی نظر آئی ہے اور اس کو انھوں نے نہ صرف اپنی انفرادی زندگی بلکہ اس وقت کی اجتماعی زندگی کو بھی ایک بہت بڑا المیہ تصوّر کیا ہے ۔ معنوی اعتبار سے دیکھا جائے ، تو انھوں نے اس صورت حال پر خون کے آنسو بہائے ہیں اور فنی اعتبار سے اس کیفیت کے اظہار کے لیے ایسی تصویریں بنائی ہیں اور اس قسم کے پیکر تراشے ہیں ، جن میں آگ ، شرر ، شعلہ ، دھواں ، شمع ، برق ، بجلی وغیرہ کے نمایاں پیکر نظر آتے ہیں ۔ غالب نے ان سب سے اپنے شاعرانہ اظہار و ابلاغ میں بڑا کام

لیا ہے ۔ ان اشعار میں دیکھیے ، کہ آگ اور اس کے متعلقات نے کیا کیا روپ اختیار کیے ہیں اور کیسی کیسی عجیب تصویریں بنائی ہیں :

بس کہ ہوں غالب ! اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے ، حلقہ مری زنجیر کا

آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

دل مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا
آتش خاموش کی مانند گویا ، جل گیا

بوئے گل ، نالۂ دل ، دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا ، سو پریشاں نکلا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولا برق خرمن کا ہے ، خون گرم دہقاں کا

خموشی میں نہاں ، خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغ مردہ ہوں ، میں بے زباں ، گور غریباں کا

سراپا رہن عشق و ناگزیر اُلفت ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

رگ سنگ سے ٹپکتا ، وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو ، یہ اگر شرار ہوتا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لیے ہوئے
ہوں شمع کشتہ ، در خور محفل نہیں رہا

شمع جلتی ہے تو اُس میں سے دھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا ، میرے بعد

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقت گفتار دیکھ کر
آتش پرست کہتے ہیں ، اہل جہاں مجھے
سر گرم نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر

مجھے اب دیکھ کر ابر شفق آلودہ ، یاد آیا
کہ فرقت میں تری، آتش برستی تھی گلستاں پر

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی ، غافل !
گرمیٔ بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک
غم ہستی کا اسدؔ ! کس سے ہو جز مرگ علاج ؟
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے ، سحر ہونے تک

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو، بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن ، شمع ماتم خانہ ہم

اک شرر دل میں ہے، اس سے کوئی گھبرائے گا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو، جو ہوا کہتے ہیں

رونق ہستی ہے ، عشق خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

غالبؔ کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے ، اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم !
گری ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشیاں کیوں ہو ؟

اُس شمع کی طرح سے، جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ، ہوں داغ نا تمامی

رحم کر ظالم کہ کیا بود چراغ کشتہ ہے
نبض بیمار وفا ، دود چراغ کشتہ ہے

سایہ میرا مجھ سے مثل دود بھاگے ہے اسد!
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

جلوہ زار آتش دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شور قیامت کس کی آب و گل میں ہے؟

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر، سو خموش ہے

پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کیے ہوئے

ظاہر ہے کہ ان اشعار میں آگ ہی آگ ہے - جہاں آگ نہیں ہے وہاں آگ کا کوئی اور روپ ہے - یعنی شعلہ ہے، شرر ہے، دھواں ہے، شمع ہے، شمع کشتہ ہے، برق ہے، بجلی ہے - غرض یہ کہ اس طرح کی بہت سے چیزیں جن سے غالب نے شاعرانہ پیکر تراشے ہیں لیکن ان کی معنویت محدود نہیں ہے - اُن کے پردے میں تو غالب نے نہ جانے کیا کیا کچھ کہنے کی کوشش کی ہے - آتش زیر پا، موئے آتش دیدہ، دود چراغ محفل، سوز نہاں، آتش خاموش، برق خرمن، خون گرم دہقاں، چراغ مردہ، برق، شرار، شمع کشتہ، وغیرہ محض الفاظ کا مجموعہ نہیں ہیں - یہ تو باقاعدہ بنائی ہوئی تصویریں ہیں جن کو غالب کے شاعرانہ تجربے نے تخلیق کیا ہے اور یہ تصویریں زندگی سے بھرپور اور منہ سے بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں کیوں کہ اُن میں غالب کے انفرادی اور اجتماعی تجربات کا لہو ہے -

یہ تصویریں غالب کی شاعری میں بہت عام ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ اُنھوں نے زندگی بھر خود اپنے آپ کو اور اپنے آس پاس اور گرد و پیش کی پوری زندگی کو آگ میں جلتا ہوا دیکھا ہے - انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ایک ایک پہلو میں انھیں شعلے سے بھڑکتے نظر آتے ہیں اور ایک ایک گوشے سے دھواں سا اُٹھتا ہوا دکھائی دیا ہے - اور اس صورت حال نے خود انھیں ایک شمع کشتہ اور چراغ مردہ بنا دیا ہے -

آگ اور اس کے متعلقات کی تصویروں کے ساتھ ساتھ غالب کی شاعری

میں خون اور خون کی سرخی کی تصویریں بھی نمایاں نظر آتی ہیں ۔ ان تصویروں اور پیکروں کی تخلیق بھی غالب کی مخصوص ذہنی کیفیت نے کی ہے ۔ غالب مزاج اور اُفتاد طبع کے اعتبار سے رومانی تھے ۔ مثالیت پسندی کا خیال اُن کی گھٹی میں پڑا تھا ۔ دنیا کی تمام نعمتوں سے بھی اُن کا مطمئن ہونا ناممکن تھا ۔ اُن کی زندگی میں ہزاروں خواہشیں ایسی تھیں کہ ہر خواہش پر اُن کا دم نکلتا تھا اور بے شمار ارمانوں کے نکلنے کے بعد بھی وہ یہی سمجھتے تھے کہ اُن کے ارمان کم نکلے ہیں ۔ وہ طرزِ تپاک اہلِ دنیا کو دیکھ کر افسردگی کی آرزو کرتے تھے ۔ زندگی کا ہر نقش انھیں فریادی نظر آتا تھا اور اُن کی نظریں ہر پیکر تصویر کے پیرہن کو کاغذی دیکھتی تھیں ۔ نا آسودگی ایسے شخص کا مقدّر ہوتی ہے اور یہ سب کچھ رومانیت پسندی کا کرشمہ ہے ۔ غالب کے مزاج میں اس رومانیت پسندی کا رنگ رچا ہوا تھا اور اس رومانیت پسندی کا یہ نتیجہ ہے کہ انھوں نے انسانی زندگی اور خصوصاً اپنے زمانے کی انسانی زندگی میں خون کے دریاؤں کو موجزن دیکھا ہے ۔ خصوصاً اپنے آس پاس اور گرد و پیش کی زندگی تو انہیں سر سے پاؤں تک لہو لہان نظر آتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں بھی خون کی تصویریں اتنی نمایاں ہیں ۔ ان اشعار میں اسی صورت حال کی ترجمانی ہے :

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہگذر میں جلوۂ گل ، آگے گرد تھا

غنچہ پھر لگا کھلنے ، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا ، گم کیا ہوا پایا

نہیں معلوم ، کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا
مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے ، خونِ گرم دہقاں کا

باغ میں مجھ کو نہ لے جا، ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ، ہو جائے گا

دردِ دل لکھوں کب تک، جاؤں، اُن کو دکھلاؤں
اُنگلیاں فگار اپنی ، خامہ خوں چکاں اپنا

خوں ہے دل خاک میں احوال بتاں پر، یعنی
اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا ، میرے بعد

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر

ہے خونِ جگر جوش میں، دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں ، اسدؔ
جانتے ہیں سینۂ پر خوں کو زنداں خانہ ہم

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں، وہ بھی

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

کارگاہِ ہستی میں ، لالہ داغ ساماں ہے
برقِ خرمنِ راحت ، خونِ گرمِ دہقاں ہے

خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ
دیکھ خوننابہ فشانی میری

اچھا ہے سر انگشتِ حنائی کا تصوّر
دل میں نظر آتی تو ہے اک، بوند لہو کی

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں ، اے مرگ !
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگاں خوں فشاں کے لیے

غالب نے یہاں ساحل دریائے خوں ، خوں کیا ہوا دیکھا ، سر شک آلود ہوتا ، خون گرم دہقاں، چشم خوں فشاں، خامہ خوں فشاں ، خون جگاں ، خون خلق، دیدۂ خونناہہ فشاں ، سینہ پر خوں ، جوئے خوں ، موج خوں ، تشنۂ خوں اور مژگاں خوں فشاں وغیرہ کی جو تصویریں بنائی ہیں ، ان میں خون کا رنگ بہت گہرا ہے ۔ ان اشعار میں انھوں نے جو پیکر تراشے ہیں ، ان میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بعض خوں چکاں حقائق کو پیش کیا ہے ۔ خون کی ان تصویروں نے ان کے شاعرانہ اظہار و ابلاغ میں شدت پیدا کی ہے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کا تاثر نسبتاً گہرا ہوتا ہے۔ ناسازگار حالات کے نتیجے میں غالب نے اپنی انفرادی زندگی اور اپنے زمانے کی اجتماعی زندگی، دونوں میں دریائے خوں کو موجزن دیکھا ہے۔ اور اس کے ایک ایک پہلو سے انھیں جوئے خون بہتی ہوئی نظر آتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ خون کا تصوّر ان کے احساس و شعور میں کچھ اس طرح رس بس گیا ہے کہ وہ جب بھی کوئی بات کرتے ہیں تو خون کا پیکر کسی نہ کسی روپ میں ان کے سامنے آجاتا ہے ۔ اور زندگی کے مختلف اور متنوع حقائق کے اظہار کے لیے اس سے کام لیتے ہیں ۔ غالب نے خون کی تصویروں سے شاعرانہ اظہار و ابلاغ میں جو کام لیا ہے، وہ انھیں کے ساتھ مخصوص ہے اور اردو غزل کی روایت میں کہیں اور اس کی یہ صورت نظر نہیں آتی ۔

جہاں تک شاعرانہ فن کاری اور اس میں تصویر کاری اور پیکرتراشی کا تعلق ہے ، غالب نے اس میں بڑی حد تک روایت سے بغاوت کی ہے ۔ اور اس طرح اردو غزل کی روایت کو بعض نئے تجربات سے آشنا کیا ہے ۔ لیکن وہ اس روایت کو پوری طرح نظر انداز نہیں کر سکے ہیں ۔ انھوں نے غزل کی روایتی تصویروں اور پیکروں سے بھی اظہار و ابلاغ میں بڑا کام لیا ہے ۔ لیکن انھوں نے اپنے نئے احساس اور نئے شعور سے کام لے کر ان روایتی تصویروں اور پیکروں میں نیا خون دوڑا دیا ہے ۔ اور اس طرح

ان میں ایک نئی زندگی پیدا کی ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ ان کا بہت بڑا فنی کارنامہ ہے ۔ انھوں نے غزل کے پورے فنّی نظام کو اسی طرح برتنے کی کوشش کی ہے ، جس طرح ان کے پیشروں نے اس کو برتا ہے۔ لیکن ان کے یہاں غزل کی روایت کا یہ پورا نظام زندگی اور جولانی سے ہمکنار نظر آتا ہے۔ اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اس میں زندگی کے احساس و شعور کا لہو ہے ۔ یہ اشعار اس حقیقت کی وضاحت کرتے ہیں :

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن ، اسد
سر گشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

شور پند ناصح نے ، زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے ' تم نے کیا مزا پایا ؟'

احباب چارہ سازئ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال ، بیاباں نورد تھا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر ، نقاب اس شوخ کے رخ پر کھلا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا ، کوئی غم گسار ہوتا

شوق ہر رنگ ، رقیب سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

بغل میں غیر کی ، آپ آج سوئے ہیں کہیں ، ورنہ
سبب کیا خواب میں آ کر تبسّم ہائے پنہاں کا

محبت تھی چمن سے ، لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

بقدر ظرف ہے ساقی ! خمار تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سر رہگذار تھا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
عشرت قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

مانع وحشت خرامی ہائے لیلیٰ کون ہے ؟
خانۂ مجنون صحرا گرد ، بے دروازہ تھا

حضرت ناصح گر آئیں ، دیدۂ و دل فرش راہ
کوئی مجھکو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا؟
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا ؟
گر کیا ناصح نے ہم کو قید ، اچھا ! یوں سہی
یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا ؟
خانہ زاد زلف ہیں ، زنجیر سے بھاگیں گے کیوں ؟
ہیں گرفتار وفا ، زنداں سے گھبرائیں گے کیا ؟

کوئی میرے دل سے پوچھے ، ترے تیر نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی ، جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح ؟
کوئی چارہ ساز ہوتا ، کوئی غم گسار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ، ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا ، نہ کہیں مزار ہوتا

وہی اک بات ہے جو یاں نفس، واں نکہت گل ہے
چمن کا جلوہ ، باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو ؟
اک تماشا ہوا ، گلا نہ ہوا

گھر ہمارا ، جو نہ روتے بھی ، تو ویراں ہوتا
بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے !
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

رشک کہتا ہے کہ 'اُس کا غیر سے اخلاص حیف'
عقل کہتی ہے کہ 'وہ بے مہر کس کا آشنا'

ربط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ ، صبا آوارہ ، گل نا آشنا

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اُس نے شدّت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

ہوں گرفتار اُلفتِ صیاد
ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

مر گیا پھوڑ کے سر غالبؔ وحشی ، ہے ، ہے
بیٹھنا اُس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

آبرو کیا خاک، اُس گل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگ پیراہن ، جو دامن میں نہیں

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں ، زنجیر نہیں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں، جو وہ لکھیں گے جواب میں

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

وفا کیسی، کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل! تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو؟

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر، ہمدم!
گری تھی جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟

مے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک، دو، چار، جام واژگوں وہ بھی

خزاں کیا؟ فصل گل کہتے ہیں کو کس؟ کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی
میری وحشت، تری شہرت ہی سہی

اُڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں
بارے اب اے ہوا! ہوس بال و پر گئی

اے ساکنان کوچۂ دلدار! دیکھنا
تم کو کہیں جو غالب آشفتہ سر ملے

پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمد فصل لالہ کاری ہے

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں، مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے گریباں، مجھ سے

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے
طراوت چمن و خوبیٔ ہوا کہیے

اے عندلیب! یک کف خس بہر آشیاں
طوفان آمد آمد فصل بہار ہے

ان اشعار میں جو تصویریں غالب نے پیش کی ہیں ، وہ غزل اور تغزل کی روایت سے تعلق رکھتی ہیں اور ان تصویروں کو کئی سو سال تک فارسی اور اُردو کے شاعروں نے اپنے اظہار و ابلاغ کے لیے استعمال کیا ہے ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہ تصویریں دوسرے شعراء کے یہاں کچھ فرسودہ سی نظر آتی ہیں لیکن غالب نے ان تصویروں میں ایک تازگی اور تازہ کاری پیدا کی ہے ۔ اسی لیے ان میں یہ نیا احساس اور نیا شعور جب جمالیاتی اظہار کا روپ اختیار کرتا ہے تو ان پرانی تصویروں میں بھی نئی زندگی پیدا کرکے انھیں جدت سے ہم کنار کر دیتا ہے ۔ ان اشعار میں فرہاد کوہکن ، مجنوں صحرا گرد ، ناصح ، رقیب ، محبوب ، کوچۂ یار ، بیاباں ، زنداں ، زنجیر ، تیغ ، کفن ، دار و رسن، در و دیوار ، صیاد ، گلشن ، دام ، قفس، آشیانہ ، بجلی، بال و پر ، عندلیب ، فصل بہار وغیرہ کی جو تصویریں ہیں ، وہ اس حقیقت کو صاف طور پر واضح کرتی ہیں کہ اُن میں ایک جدت اور اچھوتا پن ہے اور وہ ایک نئے احساس اور نئے شعور کی وجہ سے ایک نئی معنویت سے مالا مال ہیں ۔

یہ غالب کے فنی اجتہاد کی ساحری ہے کہ انھوں نے ان سب کو نیا رنگ دیا ہے اور ان کو نئے سانچوں میں ڈھال دیا ہے ۔

غرض غالب کی شاعرانہ تصویر کاری اور پیکر تراشی اُردو غزل کی روایت میں ایک نئی شان سے جلوہ گر نظر آتی ہے ۔ اُن کے نئے احساس و شعور اور نئے فکر و خیال نے غزل کی روایتی تصویروں میں نئی زندگی کی لہر دوڑائی ہے اور بعض ایسی تصویریں بھی بنائی ہیں اور ایسے پیکروں کو بھی تراشا ہے، جو اُردو غزل کی روایت میں بالکل اچھوتے اور نئے ہیں ۔

غالب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ان سب کو غزل کی روایت کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کر دیا ہے کہ اُن کے جنسی اور نا مانوس ہونے کا احساس نہیں ہوتا اور اس کا سبب تجربے کی وہ صداقت اور اخلاص مندی ہے ، جو غالب کی شاعری کی جان اور اُن کی شاعرانہ فن کاری کا ایمان ہے !

غالب
کے
فنی اضافے

غالب کے فن کی تحلیل اور اس کے مختلف پہلوؤں کے تجزیے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے خالق جمال اور ایک بہت بڑے فن کار تھے۔ انہوں نے فن کی اہمیت کو سمجھا تھا اور اس کے بنیادی اصولوں کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ ان اصولوں کو برتنا ان کے پیش نظر تھا۔ چنانچہ انہوں نے ان بنیادی اصولوں کو عملی طور پر بڑے سلیقے سے برتا ہے۔ وہ فن کی روایت کے پرستار تھے، لیکن اس روایت کو تجربے کے ساتھ ہم آہنگ کرنا بھی ان کے پیش نظر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں روایت اور تجربے کا ایک حسین اور متوازن امتزاج ملتا ہے۔ وہ حسن و جمال کے شیدائی تھے اور زندگی اور فن دونوں میں اس حسن کی تلاش و جستجو ان کے پیش نظر تھی۔ چنانچہ وہ اس حسن و جمال کی تلاش و جستجو میں سرگرداں رہے ہیں اور انہوں نے اس کی تخلیق کو بھی اپنا شعار بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں حسن و جمال کی تخلیق مختلف طریقوں سے ہوتی ہے اور وہ اس میں مختلف زاویوں سے اپنے آپ کو رونما کرتا ہے۔ وہ ایک تہذیب کی پیداوار ہیں اور اس تہذیب کا جمال ان کے فن میں اپنی تمام رنگینیوں اور رعنائیوں کے ساتھ بے نقاب نظر آتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ غالب کے مزاج میں بغاوت کے عناصر پوری طرح موجود تھے اور طبیعت اور اُفتاد طبع کے اعتبار سے وہ ایک انقلابی تھے۔ اس کی ایک بہت بڑی وجہ ان کی رومانیت اور رومان پسندی بھی تھی۔ ہر رومانی مزاج فن کار اپنے ماضی سے مطمئن نہیں ہوتا۔ خیال سے مطابقت پیدا کرنا بھی اس کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ وہ تو مستقبل میں حسین

دنیائیں بساتا ہے اور ان دنیاؤں کو اپنے تخیل کے رنگوں سے سجاتا ہے۔ وہ صرف سہانے خواب دیکھتا ہے اور انھیں خوابوں کے سہارے اس کی زندگی بسر ہوتی ہے۔ غالب نے بھی اپنی رومانیت پسندی کی وجہ سے بہی سب کچھ کیا ہے۔ وہ کسی چیز سے مطمئن نہیں ہوئے خوب سے خوب تر کی تلاش میں اُنھوں نے زندگی اور فن کے ان گنت صحراؤں کی خاک چھانی ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اُنھوں نے ماضی اور حال سے اپنا رشتہ توڑا نہیں ہے۔ انھوں نے روایت سے بغاوت ضرور کی ہے لیکن وہ روایت کے بعض پہلوؤں کی پرستش میں بھی پیش پیش رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رومانیت اور رومان پسندی کے باوجود، روایت کا رچاؤ اور اس کی رنگینی ان کے فن میں اپنی تمام تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ غالب کے فن کا یہ بڑا کمال ہے کہ اس میں روایت کے اثرات صحت مندی کے ساتھ اپنے آپ کو رونما کرتے ہیں۔

روایت کے اثرات میں جو چیز سب سے زیادہ اُن کے یہاں نمایاں نظر آتی ہے، وہ فارسی شاعری کی روایت اور خاص طور پر اس روایت کے ان علم برداروں کے اثرات ہیں، جن کی شاعری نے خود اس روایت کو رنگین اور پرکار بنانے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ بیدل، عرفی، نظیری اور ظہوری کے اثرات ان کے فن میں بہت نمایاں ہیں۔ ان شاعروں نے فارسی شاعری کی روایت کو جس رنگینی اور پرکاری سے آشنا کیا ہے، وہ مجموعی طور پر سمٹ کر غالب کے فن میں کچھ اس طرح سرایت کر گئی ہے، جیسے کسی صحت مند اور توانا جسم میں تازہ اور رخشاں لہو دوڑتا ہے۔ غالب نے فارسی شاعری کی روایت سے رنگینی اور رچاؤ کی خصوصیات حاصل کی ہیں اور انھیں اُردو شاعری کی فنی روایت کا جزو بنا دیا ہے۔ ان سے قبل اُردو شاعری میں معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے وہ شگفتگی اور شادابی نہیں تھی، جو ان کے ہاتھوں پیدا ہوئی۔ غالب کے فن کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے اُردو شاعری کی روایت کو ان خصوصیات سے آشنا کیا۔

غالب کے فن میں ایک نشاطیہ رنگ اور طربیہ آہنگ بھی خاصا نمایاں نظر آتا ہے۔ بظاہر تو یہ رنگ و آہنگ ان کی شخصیت اور افتاد طبع کا ترجمان اور عکاس ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فارسی شاعری کی روایت کے اثرات بھی ان کے فن میں اس رنگ و آہنگ کو

نمایاں کرنے میں برابر کے شریک ہیں ۔ غالب سے قبل اس رنگ و آہنگ کی روایت اُردو شاعری میں موجود نہیں تھی ۔ البتہ فارسی شاعری میں اس کا ایک سلسلہ ملتا ہے اور خاصی تعداد میں شاعر اس رجحان کے علم بردار نظر آتے ہیں ۔ غالب کا فن اس رجحان سے متاثر ہوا ہے اور اس میں نشاط و طرب کی وہ جو ایک چاندنی سی مسکراتی ہوئی نظر آتی ہے ، اس کا سبب فارسی کی یہی روایت ہے، جس کو غالب نے اپنے فن میں کچھ اس طرح داخل کیا ہے کہ اس نے اُردو شاعری کی دنیا ہی بدل دی ہے ۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُردو شاعری کی روایت سے غالب کا کوئی رشتہ نہیں ہے اور یہ کہ صرف فارسی شاعری کی روایت ہی ان پر اثر انداز ہوئی ہے ۔ ایسا نہیں ہے ۔ غالب نے اُردو شاعری کی روایت سے بھی اثر قبول کیا ہے اور یہ اثرات بھی ان کے فن میں نت نئے روپ اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ سب سے اہم بات جو اس سلسلے میں نظر آتی ہے ، وہ یہ ہے کہ انھوں نے فارسی اور اردو کی روایات کے باہمی امتزاج سے ایک تیسری روایت کو پیدا کیا ہے، جو ان کا ایک اہم فنی کارنامہ ہے ۔ اس امتزاج نے اُن کے فن میں نشاطیہ اور المیہ رنگ کی دھوپ چھاؤں کو جمع دیا ہے ۔ غالب نے ان دونوں کو اس طرح ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ اُن کے فن میں شعلہ و شبنم ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

غالب کے فن میں روایت کے اثر سے شوخی کا پہلو بھی نمایاں ہوا ہے ۔ یہ شوخی ظاہر ہے کہ صنف غزل کے مزاج کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی، لیکن غالب کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس شوخی کو اور اس شوخی کے اثر سے پیدا ہونے والے ایک مزاحیہ اور طنزیہ انداز کو غزل کے مزاج میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کو غزل کے مزاج کا جزو بنا دیا ہے ۔ اس شوخی اور طنز و مزاح کے عناصر، غزل کی روایت میں شیخ، واعظ اور زاہد کے بیان میں تو ملتے تھے لیکن حسن و عشق اور عاشق و معشوق کے معاملات کے بیان میں یہ رنگ ذرا مشکل ہی سے نظر آتا تھا ۔ غالب پہلے شاعر ہیں ، جنھوں نے ان معاملات کے بیان میں بھی اس رنگ کو پیدا کر دکھایا ۔ وہ اس طرح کہ غزل کی روایت میں عاشق اور معشوق کے معاملات سے متعلق ایسے مضامین، جو فرسودہ ہو چکے تھے اور مضحکہ خیز معلوم ہوتے تھے ، غالب نے ان کو اپنی غزل میں جگہ تو دی لیکن

اس طرح جیسے وہ ان کا خاکہ اُڑا رہے ہیں ۔ غالب کے اس انداز سے جو شاعری پیدا ہوئی ہے، وہ بہ ذات خود بھی اہم ہے ۔ کیونکہ اس میں بڑی شگفتگی کا احساس ہوتا ہے ۔ لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس انداز سے غزل کی روایت کو ایک نیا میدان ملا ہے اور اس میدان میں اس کو ایک اہم صنف سخن کی حیثیت سے اپنے جوہر دکھانے کے مواقع نصیب ہوئے ہیں ۔ یہ صحیح ہے کہ غالب کے بعد آنے والے غزل کے فن کار غالب کے اس انداز فن کو پوری طرح برتنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں ۔ لیکن غالب نے انہیں وہ راستے ضرور دکھا دیے ہیں ، جن پر چل کر غزل کی صنف اپنے آپ کو فنی اعتبار سے نئی وسعتوں سے ہم‌کنار کر سکتی ہے ۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ غالب نے روایت سے بہت استفادہ کیا ہے ۔ اور اس کے اثر سے اپنے فن میں نہ صرف رنگینی اور رچاؤ کی خصوصیات پیدا کی ہیں بلکہ بعض ایسے پہلو بھی اس میں نمایاں ہوگئے ہیں، جن کی وجہ سے نہ صرف غالب کے فن میں بلکہ خود صنف غزل کے فن میں ایک نئے رنگ و آہنگ نے اپنی جگہ بنا لی ہے ۔ لیکن غالب اس روایت کے پرستار نہیں ہیں ۔ اُنھوں نے اپنے فن کو اس روایت کی لکیر کا فقیر نہیں بنایا ہے ۔ وہ تو اس روایت کے بندھنوں کو توڑ کر اس کے حدود سے باہر بھی نکلے ہیں اور انھوں نے اپنے فن کو بعض نئے تجربات سے بھی آشنا کیا ہے ۔ ان تجربات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُن میں توازن ہے اور اُن کی جڑیں روایت کی زمین میں پوری طرح پیوست ہیں ۔ تجربہ جب روایت کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہوتا ہے، اُسی وقت فن کی دنیا میں اُسے حیات جاوداں ملتی ہے ۔ غالب نے اپنے تجربے کو روایت کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ کیا ہے ۔ اسی لیے اس کے فن میں اس کی ایک مستقل حیثیت نظر آتی ہے ۔

بات یہ ہے کہ غالب نے اپنے فن میں تجربے کے یہ چراغ صرف تجربے ہی کی خاطر روشن نہیں کیے، ان کے پیچھے تو ان کے نئے احساسات اور نئے شعور کا ہاتھ ہے اور ان نئے احساسات و شعور کی وجہ سے، ان کے یہاں موضوعات و مضامین پیدا ہوئے ہیں، جن کے اظہار و ابلاغ کے لیے انھیں ان تجربات سے کام لینا پڑا ہے ۔ یہی سبب ہے کہ ان تجربات میں اختراع کا رنگ نظر نہیں آتا اور صرف صناعی کی صورت دکھائی نہیں دیتی ۔ وہ اپنی ایک بنیاد رکھتے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کو شاعر کے خیال ،

مواد اور موضوع اور اس کے صحیح جالیاتی اظہار کے شعور نے پیدا کیا ہے ۔ غالب نے بدلتے ہوئے حالات ، نئے افکار و خیالات اور نئے جالیاتی تصوّرات سے ان تجربات کا خمیر اٹھایا ہے۔ اسی لیےاُن کے ہاں ایک استواری نظر آتی ہے اور ایک موانست کا احساس ہوتا ہے ۔

غالب کے ان تجربات کی جھلک سب سے پہلے تو ان کی شاعری کے وزن و آہنگ میں دکھائی دیتی ہے ۔ غالب نے اپنے موضوعات کی مناسبت سے وزن و آہنگ کو استعال کیا اور ان میں ایک مکمل ہم آہنگی پیدا کی ۔ ان کی شاعری میں بحروں کا انتخاب ، بعض خاص زمینوں کا استعال ، الفاظ کی مخصوص در و بست ، ترکیبوں کی تراش ان سب میں تجرباتی مزاج اپنی جھلک دکھاتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ غالب نے یہ سب کچھ اپنے موضوع کے اظہار و ابلاغ کے لیے کیا ہے ۔ غالب نے اپنے وزن و آہنگ میں جو شگفتگی ، شادابی اور بلند آہنگی پیدا کی ، اپنی شاعری کو جس نغمگی اور موسیقیت سے روشناس کیا ہے ، اُس کی مثال اُردو شاعری میں اُن سے قبل نہیں ملتی ۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے فن میں ترنم کے چشمے پھوٹ رہے ہیں اور نغموں کے دریا سے موجزن ہیں ۔ غالب کا کہال یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں اس صورت حال کو پیدا کرکے ، اس تجربے کے صوتی آہنگ کو سامنے لا کر کھڑا کر دیتے ہیں ، جس کی گہرائی کا کوئی ٹھکانا نہیں ۔ اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے موضوع کی مکمل تصویر، مع ایک وسیع پس منظر کے، آنکھوں کےسامنےآ کر کھڑی ہو جاتی ہے ۔

وزن و آہنگ کے اس نئے تجربے کے ساتھ ساتھ ، غالب نے اپنے فن میں علامتوں اور اشاروں کے استعال کا بھی ایک اہم تجربہ کیا ہے ۔ علامتوں اور اشاروں کا استعال تو غالب سے قبل بھی اُردو شاعری کی روایت میں عام تھا ۔ خصوصیت کے ساتھ غزل کے فن میں اس کی ایک روایت موجود تھی لیکن غالب نے اس روایت کو کچھ اور بھی اُستوار کیا ۔ اُنھوں نے غزل کی روایتی علامتوں اور اشاروں میں نیا خون زندگی دوڑایا اور اپنے وسیع اور ہمہگیر موضوعات کو ان کے ذریعے سے ظاہر کرنے کی کوشش کی ۔ اس طرح یہ روایتی علامات و اشارات نئی معنویت سے آشنا ہوئے اور ان کے دامن میں نئی وسعتیں پیدا ہوئیں ۔ لیکن غالب اپنے

موضوعات کی گہرائی اور گیرائی کے پیش نظر اپنے اظہار و ابلاغ کو صرف ان علامتوں اور اشاروں ہی تک محدود نہیں کر سکتے تھے ۔ انہیں تو اپنے اظہار و ابلاغ کے لیے کچھ نئے اشاروں اور علامتوں کی ضرورت بھی تھی ۔ چنانچہ انھوں نے نئی علامتوں اور اشاروں کو تخلیق بھی کیا ۔ لیکن اس میں بھی ان کی صنّاعی اور ایجاد پسندی کو دخل نہیں تھا ۔ اس کا منبع بھی ان کے موضوعات کا اظہار و ابلاغ اور اس اظہار و ابلاغ کا جمالیاتی احساس و شعور تھا ۔ اسی احساس و شعور کے زیر اثر، انھوں نے بعض ایسی علامتوں سے کام لیا ، جو ان کی جذباتی اور ذہنی کیفیت کے ساتھ مناسبت رکھتی تھیں ۔ غالب زمانے کے زخم خوردہ تھے ۔ ان کی زندگی میں باوجود شگفتگی اور شادابی، تیزی اور تندی، جولانی اور طرّاری کے ایک سلگنے والی کیفیت تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس صورت حالات کی مناسبت سے خون ، آگ ، دھواں اور شرر وغیرہ کے نئے اشاروں اور علامتوں سے کام لیا اور ان کے ذریعے سے اپنے فن میں اظہار و ابلاغ کا ایک نیا عالم پیدا کیا ۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اپنی اس ذہنی کیفیت کے باوجود وہ زندگی سے مایوس نہیں تھے ۔ ان کی نگاہیں تو ایک نئی دنیا کے پیدا ہونے کا منظر دیکھ رہی تھیں ۔ چنانچہ اس صورت حال نے انھیں سحر ، زنجیر ، خواب، بیداری ، ستارے، ماہتاب اور اسی طرح کے بہت سے اشاروں اور علامتوں کی تخلیق کی طرف راغب کیا اور ان علامتوں اور اشاروں میں ایسا جادو تھا کہ غالب کے بعد اردو شاعری میں ان کے استعمال کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور موجودہ دور میں جدید سے جدید اردو شاعروں نے ان سے اظہار و ابلاغ کے سلسلے میں بڑے بڑے کام لیے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو شاعری کی دنیا ہی بدل گئی ۔

یہ سب کچھ غالب کا فنّی کارنامہ تھا ۔ اُنھوں نے اُردو شاعری میں علامت نگاری کو ایک اسلوب کی حیثیت سے مستقل حیثیت دی اور نہ صرف ابلاغ بلکہ جمالیاتی اظہار کے لیے بھی اس کو اس طرح استعمال کیا کہ اُردو شاعری میں اس نے ایک رجحان کی حیثیت اختیار کر لی ۔ اور غالب جمالیاتی اظہار کے لیے اس رجحان کو برتنے اور عام کرنے میں اس وجہ سے کامیاب ہوئے کہ وہ اس کی اہمیت کا گہرا شعور رکھتے تھے اور ان کے خیال میں ناز و غمزہ کی بات دشنہ و خنجر میں اور مشاہدۂ حق کی گفتگو بادۂ و ساغر میں کرنا شاعر کے لیے ناگزیر ہے ۔

غالب نے اپنے فن میں رمزیت اور ایمائیت کے ایک نئے انداز کو وجود میں لانے کا تجربہ بھی کیا ہے۔ غالب سے قبل اُردو شاعری میں رمز و ایما کی روایت تو موجود تھی لیکن اس میں یہ بانکپن نہیں تھا، جو ان کے ہاتھوں پیدا ہوا۔ وہ تہہ داری کی کیفیت نہیں تھی، جو ان کے ہاتھوں وجود میں آئی۔ غالب نے اپنے فکر کی نسبت سے اس رمز و ایما کو زیادہ تہہ دار بلکہ کسی حد تک پیچ دار بنا دیا اور اس طرح اس کی حدیں ابہام سے جا ملیں۔ یہ ابہام آج کی شاعری کے لیے ایک اسلوب کی حیثیت رکھتا ہے۔ غالب نے آج سے سو سال قبل اس ابہام کو ایک اسلوب بنا دیا۔ لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ ابہام کو انھوں نے اپنے حدود میں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں ابہام سے زیادہ اس کی لطافت کا احساس ہوتا ہے اور جو ابہام ان کے یہاں نظر آتا ہے، اس کو ایک لطیف ابہام کہنا چاہیے۔ یہ لطیف ابہام اس رمزیت اور ایمائیت ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے، جس کو غالب نے بڑی چابکدستی کے ساتھ اپنے فن میں برتا ہے۔

اس رمزیت، ایمائیت اور لطیف ابہام کی وجہ سے اُردو شاعری کو ایک نیا اسلوب ملا۔ یہ اسلوب غالب کے ساتھ مخصوص ہے اور ان کا فن اس اسلوب ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ اس اسلوب نے انھیں اپنے زمانے میں بڑی حد تک اجنبی بنا دیا اور اسی لیے وہ اس زمانے میں عام نہ ہو سکا۔ شاید اس وجہ سے کہ غالب ایک عظیم شاعر اور فن کار کی حیثیت سے اپنے زمانے سے تقریباً سو سال قبل پیدا ہوئے۔ وہ اپنے زمانے میں شاعرِ فردا تھے۔ انھیں تو موجودہ دور میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔ اُن کا احساس و شعور اور جمالیاتی اظہار، موجودہ دور سے مناسبت رکھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ موجودہ دور میں اس اسلوب نے تقریباً تمام جدید شاعروں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی اور ان کے فن کا عام معیار یہی اسلوب قرار پایا۔ اس اعتبار سے غالب کی حیثیت ایک ایسے پہاڑی سلسلے کی ہے، جس کے دامن میں پرورش پانے والی ہر چیز اس کی مخصوص آب و ہوا سے متاثر ہوتی ہے۔

زبان و بیان کو غالب نے بہ ذات خود ایک فن بنا دیا ہے۔ زبان، اس میں شبہ نہیں، کہ اظہار کا ذریعہ ہے۔ لیکن ایک عظیم شاعر کے ہاتھ میں اُس کی حیثیت ایک فن کی ہو جاتی ہے۔ ایک ایسا فن، جو اظہار و ابلاغ کے ساتھ ساتھ حسن و جمال کے نور کو بکھیرتا ہے اور شاعری میں ایک

چراغاں کی سی کیفیت کو پیدا کر دیتا ہے ۔ غالب نے زبان میں ایک اجتہادی شان پیدا کی ہے ۔ اس کو رنگین اور پرکار بنایا ہے ۔ اس میں گل بوٹے سے کھلائے ہیں ۔ اس میں ایک عجب طرح کی جگمگاہٹ اور تابانی سی پیدا کی ہے ۔ اس کو ہیرے کی طرح تراشا ہے ۔ اس میں نئے رنگ بکھیرے ہیں۔نئے پہلو پیدا کیے ہیں ۔ الفاظ کو آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں کی طرح یک جا کیا ہے ۔ اس میں تزئین اور آرائش نہیں ہے ، فطرت کا حسن زیادہ ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ حسن کی فطرت اس میں قدم قدم پر اپنا جلوہ دکھاتی ہے ۔ غالب نے زبان کی اصلاح نہیں کی ہے لیکن ایک نئی زبان کو پیدا کیا ہے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کی یہ زبان عام لوگوں کی زبان نہیں ، اس میں تو ایک ادبی رنگ و آہنگ ہے اور اس کو صحیح معنوں میں شاعری کی زبان کہا جا سکتا ہے ۔ غالب سے قبل شاعری کی زبان میں یہ ادبی رنگ و آہنگ کم تھا ۔ وہ بولنے کی زبان سے زیادہ قریب تھی ۔ فارسی کے اثرات غالب کی پیدا کی ہوئی زبان میں غالب ہیں لیکن ان اثرات کو پیدا کرنے میں ان کی کسی شعوری کوشش کو دخل نہیں تھا ۔ فارسی تو ان کے مزاج کا جزو تھی ۔ اس کا رنگ تو ان کی شخصیت میں رچا ہوا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی کا رنگ و آہنگ ان کی زبان میں اجنبی اور نا مانوس نہیں معلوم ہوتا ۔ بر خلاف اس کے وہ تو اس تہذیب کی تمام رنگینیوں اور رعنائیوں کو سامنے لاکر کھڑا کر دیتا ہے، جس نے غالب کو پیدا کیا تھا اور جس کی رنگینیاں اور رعنائیاں ان سے قبل کئی سو سال تک اس سر زمین پر رنگ بکھیرتی رہی تھیں ۔

غالب نے اُردو شاعری کو ایک ایسی زبان دی ، جو صرف رنگین اور پرکار ہی نہیں تھی ۔ اس میں احساس کی شدت ، جذبے کی صداقت ، شعور کی گہرائی ، فکر کی گیرائی اور نظریے کی پختگی کے مکمل اظہار و ابلاغ کی بڑی صلاحیتیں تھیں ۔ غالب کی شاعری انہیں تمام عناصر سے عبارت تھی ۔ چنانچہ یہی عناصر اس مخصوص زبان کی تخلیق کے محرک ہوئے ، جو غالب کا ایک اجتہادی کارنامہ ہے ۔ گذشتہ سو سال میں اردو کے ان تمام شاعروں کے یہاں یہ زبان اپنی جھلک دکھاتی ہے ، جن کی شاعری میں احساس کی شدت ، جذبے کی صداقت ، شعور کی گہرائی ، فکر کی گیرائی اور نظریے کی پختگی کا امتزاج صحیح جمالیاتی اظہار کا تقاضا کرتا ہے ۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو غالب جدید شاعری اور اس کے مختلف فنی رجحانات اور جمالیاتی میلانات کے پیش رو نظر آتے ہیں اور ان کے فنی اور جمالیاتی اجتہاد کے اثرات کا رنگ و آہنگ نہ صرف جدید شاعروں کی شاعری ، بلکہ اعلیٰ درجے کے نثر نگاروں کی نثری تخلیقات میں بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے ۔

غرض غالب بڑے ہی پہلو دار فن کار تھے ۔ اُردو شاعری میں وہ ایک ادائے خاص سے نکتہ سرا ہوئے اور ان کا فن یاران نکتہ داں کے لیے صلائے عام کا پیغام ثابت ہوا ۔ اُنھوں نے اپنے فن سے جمالیاتی اقدار کی نئی دنیائیں ہی پیدا نہیں کیں ، ان اقدار کو موجودہ دور کے مزاج کا جزو بنا دیا ۔ چنانچہ موجودہ زمانے میں غالب کے فن کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ، وہ کسی دوسرے شاعر کے فن کو حاصل نہ ہو سکی ۔ دور جدید میں مختلف خیالات و نظریات اور مختلف اسالیب و انداز بیان رکھنے والے شاعروں اور ادیبوں کو جس طرح غالب کے فن نے متاثر کیا ہے ، شاید کسی دور میں کسی دوسرے فن کار نے اس طرح متاثر کیا ہو ۔

اس لیے شاید یہ کہنا بے جا نہیں کہ اُردو شاعری کی روایت میں غالب کے فن کی حیثیت وہی ہے ، جو جغرافیائی اعتبار سے کسی ملک میں ایک سر بہ فلک پہاڑ کی ہوتی ہے ۔

غالب
اور
آن کے خطوط

مغلوں کا دور آخر اگرچہ سیاسی ، ، معاشرتی اور معاشی اعتبار سے انحطاط و زوال، کا زمانہ ہے لیکن اس کے باوجود دلی کی سر زمین پر ایک دفعہ پھر اس زمانے میں علم و ادب کی محفلیں جم جاتی ہیں ۔ میر و سودا جس دلی کو ناسازگار حالات کے باعث چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے ، اب اس نے ایک بار پھر غالب ، مومن ، ذوق ، ظفر اور شیفتہ کے نغموں سے اپنی محفلوں میں گرمی پیدا کر لی تھی ۔ علم و ادب کے چرچے بھی نظر آتے تھے ۔ بہت سے باکمالوں کا ان دنوں دلی میں مجمع تھا ۔ مولانا سید احمد بریلوی ، مولانا اسماعیل شہید ، مولانا فضل حق خیر آبادی ، نواب صدر الدین خاں آزردہ ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور امام بخش صہبائی وغیرہ نے علم و عمل کی ایک فضا بھی پیدا کر دی تھی ۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے میدانوں میں اس طرح کمال حاصل کیا کہ ہر ایک کی شخصیت میں اجتہادی شان نظر آتی ہے ۔ غالب بھی ان میں سے ایک تھے ۔ انھوں نے نہ صرف اردو شاعری کو نئے انداز سے آشنا کیا بلکہ اردو نثر کو بھی ایک نیا اسلوب دیا ۔ اس اعتبار سے وہ ہماری نظم و نثر دونوں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں ۔

غالب ۸ رجب ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ع کو آکبر آباد میں پیدا ہوئے ۔ ان کا نام اسد اللہ بیگ خاں اور عرف مرزا نوشہ تھا ۔ نجم الدولہ ، دبیر الملک ، نظام جنگ خطابات تھے ۔ انھوں نے جس خاندان میں آنکھ کھولی ، وہ ایبک ترکوں کا مشہور خاندان تھا ۔ اس خاندان کا

پیشہ سپہ گری تھا اور وہ ہمیشہ سے یہی کام کرتے آئے تھے ۔ غالب نے خود ایک جگہ اس کا اظہار کیا ہے :

سو پشت سے ہے پیشۂ آباء سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزّت نہیں مجھے

لیکن عجیب اتفاق ہے کہ غالب سپہ گری اختیار نہ کر سکے اور شاعری ان کے لیے ذریعۂ عزت بن گئی ۔ البتہ سپہ گری کی جو بنیادی خصوصیات ہوتی ہیں ، وہ ہمیشہ غالب کے دم کے ساتھ رہیں ۔

غالب کے دادا ، محمد شاہ کے زمانے میں ہندوستان آئے اور لاہور میں معین الملک میر منّو کی ملازمت اختیار کی ۔ لاہور سے وہ دلی گئے اور وہاں ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں کی سرکار میں انھیں ایک معقول ملازمت مل گئی اور پھانسو کا پرگنہ بطور جاگیر کے عطا ہوا ۔ انھیں کی اولاد میں مرزا غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں عرف مرزا دولھا تھے ۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی بیٹی سے ہوئی اور ان کے دو بیٹے ہوئے ۔ ایک تو مرزا اسد اللہ خاں غالب ، جنھوں نے فارسی اور اردو نظم و نثر میں نام پیدا کیا اور دوسرے مرزا یوسف خاں ، جو جوانی میں دیوانے ہو گئے اور اسی عالم دیوانگی میں ایام غدر میں ان کا انتقال ہو گیا ۔

مرزا غالب ابھی کم سن ہی تھے کہ ان کے والد عبداللہ بیگ خاں کا انتقال ہو گیا اور ان کے چچا نصر اللہ بیگ خاں نے انھیں پالا ۔ نصراللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد میں صوبہ دار تھے ، لیکن بعد میں اُنھوں نے انگریزوں کی ملازمت اختیار کر لی تھی ۔ ۱۸۰۶ع میں ان کا بھی انتقال ہو گیا ۔ غالب اس وقت نو برس کے تھے ۔

چچا کے انتقال کے بعد غالب کی پرورش ننھیال میں ہوئی ۔ ان کی ننھیال خاصی فارغ البال تھی ، اس لیے بچپن اور عنفوان شباب میں غالب کو جو ماحول ملا ، وہ امیرانہ ماحول تھا ۔ اس ماحول کی جو خصوصیات ہوتی ہیں ، غالب ان سے دو چار ہوئے اور اِس کا اثر یہ ہوا کہ ان کی زندگی کا ابتدائی زمانہ رنگینیوں اور سرمستیوں میں گزرا ۔ اس زمانے کے متعلق غالب ایک جگہ خود لکھتے ہیں کہ : ''میں لہو و لعب اور آگے بڑھ کر فسق و فجور اور عیش و عشرت میں منہمک ہو گیا ۔'' یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی ۔ امارت اور ریاست کے ماحول میں اس صورت حال کو پیدا ہونا ہی چاہیے تھا ۔

کسی حد تک غالب کی یتیمی کو بھی اس میں دخل ہے ۔ بہر حال اس زمانے کے نقوش غالب کی شخصیت پر بڑے گہرے ہیں ۔ زندگی بھر ان کا اثر باقی رہا ہے ۔ بے فکری ، شراب نوشی ، یار باشی ، تعیش پسندی اور خود پرستی کی خصوصیات ان کی شخصیت میں اسی ماحول نے پیدا کی ہیں ۔

غالب کا بچپن اور عنفوان شباب اگرچہ لہو و لعب اور عیش و عشرت میں گذرا لیکن ان کی تعلیم کسی قدر با قاعدگی کے ساتھ ہوئی ۔ آگرے میں انھوں نے شیخ معظم سے ابتدائی تعلیم حاصل کی ۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ نظیر اکبر آبادی سے بھی انھیں تلمذ حاصل تھا ۔ ملا عبدالصمد سے بھی انھوں نے بہت کچھ حاصل کیا ۔ ملا عبدالصمد پارسی تھا اور اس کا اصلی نا ہرمزد تھا لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد وہ عبدالصمد کے نام سے مشہور ہوا ۔ وہ ۱۸۱۰ع میں سیاحت کی غرض سے آگرے آیا ۔ غالب دو سال اس کے ساتھ رہے اور انھوں نے اس سے بہت کچھ حاصل کیا ۔ اپنے خطوط میں غالب نے اس بات کی کئی جگہ وضاحت کی ہے ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی علمی استعداد خاصی تھی ۔ وہ فارسی زبان سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے اور انھیں فارسی ادب کے مطالعے کا شوق تھا ۔ عربی کی استعداد اگرچہ فارسی کے برابر نہیں تھی لیکن پھر بھی اس کے متعلق خاصی معلومات رکھتے تھے ۔ اس کے علاوہ فلسفہ ، تصوف ، طب ، منطق معانی و بیان سے بھی انھیں دلچسپی تھی ۔

مرزا غالب کی شخصیت میں ان کی شادی شدہ زندگی کو بھی خاصا دخل ہے ۔ ان کی شادی ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ع میں الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے ہوئی ۔ اس وقت غالب کی عمر تیرہ سال تھی ۔ غالب نے اس نسبت کے بعد مستقل طور پر دلی میں سکونت اختیار کر لی ۔

دلی میں غالب کو ادب و شعر کا ماحول ملا ۔ نواب الٰہی بخش خاں معروف خود اچھے شاعر تھے ۔ تصوّف سے بھی انھیں دلچسپی تھی ۔ غالب پر ان کا اثر ہوا ۔ اس کے علاوہ دلی کے دوران قیام میں وہ مولانا فضل حق خیر آبادی کے زیر اثر بھی آئے ۔ مولانا فضل حق خیر آبادی اپنے زمانے کے مشہور عالم تھے اور شعر و سخن کا بھی نہایت ستھرا ذوق رکھتے تھے ۔ غالب پر ان کی شخصیت کا بھی اثر ہوا ، اور ان تمام اثرات نے مل کر

غالب کو بے راہ روی سے روکا اور ان کی شخصیت میں ایک سنبھلا ہوا انداز پیدا کیا ۔

دلی کے دوران قیام میں مالی مشکلات ہمیشہ غالب کے دم کے ساتھ رہیں ۔ پنشن بند ہوئی اور اس سلسلے میں انھیں کلکتے کا سفر کرنا پڑا ۔ ۱۸۲۲ء میں وہ دلی سے کلکتے روانہ ہوئے اور لکھنئو میں سال بھر قیام کرنے کے بعد کان پور، بنارس، پٹنہ اور مرشد آباد ہوتے، ہوئے ۱۸۲۸ء میں دلی واپس آئے ۔ جہاں تک پنشن کا تعلق ہے ، کلکتے کے سفر کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا ۔ کیوں کہ انھیں اس معاملے میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی لیکن اس سفر سے ایک فائدہ غالب کو ضرور ہوا وہ یہ کہ انھیں مختلف مقامات کو دیکھنے اور مختلف قسم کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا ، اور اس سے ان کی شخصیت میں وسعت نظر کی خصوصیت پیدا ہوئی ۔

غالب کی مالی حالت جب زیادہ خراب ہوئی تو انھوں نے ملازمت کرنے کی ٹھانی ۔ ۱۸۳۲ء میں دلی کالج میں فارسی کی مدرسی خالی ہوئی ۔ غالب بھی فنس میں سوار ہو کر اس سلسلے میں پرنسپل سے ملنے گئے ۔ لیکن کوئی ان کی پذیرائی کو نہیں آیا ۔ اس لیے کہ وہ ملازمت کے لیے آئے تھے ۔ مسٹر ٹامسن جو ان دنوں دلی کالج کے پرنسپل تھے، انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ چونکہ مرزا غالب رسمی ملاقات کے لیے نہیں آئے، بلکہ ملازمت کے لیے آئے ہیں، اس لیے پذیرائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ مرزا غالب نے اس پر یہ کہا کہ : ''خیال تھا ملازمت سے عزّ و وقار میں اضافہ ہوگا ۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ جو وقار رہا سہا ہے، اس میں بھی کمی آ جائے گی ۔ اس لیے اس ملازمت کو میرا دور ہی سے سلام ہے ۔'' اور یہ کہہ کر واپس چلے آئے ۔

اس کے بعد مالی مشکلات کا سلسلہ برابر جاری رہا ۔ اسی دوران میں مرزا غالب پر ایک بلائے ناگہانی بھی آئی ۔ یعنی وہ قمار بازی کے الزام میں گرفتار کر لیے گئے اور انھیں کچھ عرصے قید خانے میں رہنا پڑا ۔ چھوٹ کر آئے تو مالی حالت اور بھی خراب ہو گئی ۔ کل باسٹھ روپے مہینے کی پنشن میں کیا ہو سکتا تھا ۔

جب یہ مالی مشکلات انتہا کو پہنچ گئیں ، تو غالب کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ وہ قلعے سے متعلق ہو جائیں ۔ چنانچہ

یہ تعلق انھوں نے پیدا کیا۔ لیکن ابتدا میں مستقل ملازمت اختیار نہیں کی۔ گاہے گاہے قصیدے پڑھ دیتے تھے اور وظیفہ انھیں ملتا تھا۔ ذوق کے انتقال کے بعد وہ بادشاہ کی غزلیں بھی بنانے لگے اور اس طرح باقاعدہ قلعے سے منسلک ہو گئے۔ غدر سے کچھ عرصہ قبل دربار رام پور سے بھی انھوں نے وابستگی پیدا کرلی تھی—اور وہاں سے بھی انھیں وظیفہ ملتارہا۔

غدر کا ہنگامہ غالب کے سامنے ہوا۔ اس نے سارے نظام کو درہم برہم کر دیا۔ غالب اس زمانے میں اپنے مکان کے اندر مقید رہے۔ اس زمانے میں ان کا قیام بلی ماروں کے محلے میں تھا۔ جب ہنگامہ زیادہ بڑھا تو شریف خانی حکیموں کی حفاظت کے لیے مہاراجہ پٹیالہ نے کچھ فوجی دستے بھجوا دیے۔ اور ان کی وجہ سے یہ محلہ بچ گیا۔ لیکن غالب کو سب کے ساتھ بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ ان کے بھائی مرزا یوسف کا انتقال بھی انھیں حالات میں ہوا—غالب نے غدر کے مفصل حالات اپنی کتاب 'دستنبو' میں لکھے ہیں۔

غدر کے بعد غالب کی پنشن بھی بند کر دی گئی۔ کیونکہ ان پر بھی انگریزوں کو شبہ تھا۔ لیکن ۱۸۵۹ع میں پھر پنشن جاری کر دی گئی۔ غدر کے بعد دربار رام پور سے ان کے تعلقات بہت بڑھ گئے اور وہاں ان کی آمد و رفت برابر جاری رہی۔ غالب نے وہاں کچھ عرصہ قیام بھی کیا۔ وظیفہ بھی وہاں سے ملتا رہا۔

غالب کی وفات ۱۸۶۹ع میں ہوئی۔

یہ حالات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ غالب کی زندگی ایک کشمکش کی کہانی ہے—زندگی ان کا ساتھ نہ دے سکی لیکن انھوں نے ہمیشہ زندگی کا ساتھ دیا۔ وہ زندگی کے حالات سے خوش نہیں تھے لیکن اسے بسر کرنا جانتے تھے۔ چنانچہ ان کی زندگی کے تمام حالات سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی اور اس کے بدلتے ہوئے حالات سے بڑی حد تک مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان حالات کو سمجھا بھی ہے اور ان کو سمجھ کر برتا بھی ہے۔ وہ زندگی کے گہرے نبّاض تھے۔ اس کے ہر پہلو پر ان کی نظر گہرائی کے ساتھ پڑتی تھی اور وہ اس میں نئے پہلو نکالتے بھی تھے۔ ان کے مزاج میں گہرائی کے ساتھ جدت‌پسندی بھی شامل تھی۔ حرکت اور عمل کی خصوصیات بھی ان کی شخصیت میں

خاصی نمایاں تھیں ۔ کسی چیز کا نہ ہونا انھیں اداس اور غمگین ضرور کر دیتا تھا لیکن وہ اس کے حاصل کرنے میں تھک کر نہیں بیٹھ جاتے تھے ۔ اس کو حاصل کرنے کی دھن میں لگے رہتے تھے ۔

غالب نے ایک امیرانہ ماحول میں پرورش پائی ۔ اس لیے اس امیرانہ ماحول کی خصوصیات ان کی شخصیت میں بھی اپنی جھلک دکھاتی ہیں ۔ اس امیرانہ ماحول کے افراد میں برتری کا احساس تھا ، جس کی حدیں خود پرستی سے جا ملتی ہیں ۔ یہ احساس خود پرستی غالب کے یہاں بھی نظر آتا ہے ۔ انحطاط و زوال کے زمانے میں یہ احساس اس طبقے کے افراد میں کچھ اور بھی بڑھ جاتا ہے ۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ افراد اس بڑھے ہوئے احساس کی نمائش زیادہ کرتے ہیں ۔ غالب کے یہاں بھی یہ صورت حال ملتی ہے ۔ غالب کو اپنی خاندانی برتری کا گہرا احساس تھا ۔ وہ بار بار اس کا اظہار کرتے ہیں لیکن یہ اظہار غالب سے بہت کچھ کراتا بھی ہے ۔ وہ اس کی نمائش ہی نہیں کرتے ، اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے عمل بھی کرتے ہیں ۔ یہی اس ماحول میں پرورش پانے کا ایک اچھا پہلو ہے ۔ ورنہ اس ماحول سے انھیں بہت سی ایسی باتیں بھی ملی ہیں ، جن کو کسی حال میں بھی مستحسن نہیں کہا جا سکتا ۔

امیرانہ ماحول میں پرورش پانے کے باوجود یہ حرکت اور عمل کی خصوصیات ، جو غالب کی شخصیت میں ملتی ہیں اور جن کا مظاہرہ برابر ان کی زندگی میں ہوتا رہا ہے ، اس میں اس عام فضا کو بھی دخل ہے ، جو ان دنوں ہندوستان اور خصوصاً دلی میں مولانا سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد نے پیدا کر دی تھی ۔ غالب اس تحریک کے ساتھ نہیں تھے ۔ وہ تو مولانا فضل حق خیر آبادی کے ہم مشرب اور ہم نوا تھے ، جن کو مولانا سید احمد بریلوی سے نظریاتی اختلاف تھا ۔ لیکن غیر شعوری طور پر یہ علم و عمل کی فضا ان پر اثر انداز ہوئی ۔ ان کی شخصیت میں حرکت اور عمل کی جو خصوصیت ملتی ہے ، وہ اسی اثر کا نتیجہ ہے ۔

غالب کا زمانہ اگرچہ انحطاط و زوال کا زمانہ تھا لیکن یہ انحطاط و زوال میر و سودا کے زمانے کے انحطاط و زوال سے مختلف ہے ۔ غالب کے زمانے میں انحطاطی کیفیت تھی لیکن انگریزوں کے حکمراں ہو جانے سے افراتفری باقی نہیں رہی تھی ۔ اب نسبتاً زیادہ تسلّط تھا ۔ اس صورت حال

نے اس زمانے کی دلی میں ایک علمی فضا بھی پیدا کر دی تھی ۔ بڑے بڑے علماء اور شعراء ان دنوں دلی میں جمع تھے ۔ علماء میں شاہ عبدالعزیز، شاہ اسماعیل شہید، مولانا سید احمد بریلوی اور مولانا فضل حق خیرآبادی نے ایک علمی ماحول پیدا کر دیا تھا ۔ مومن، ذوق اور شیفتہ وغیرہ نے شعر و ادب کی ایک فضا پیدا کی تھی ۔ غالب اس علمی ماحول سے بھی متاثر ہوئے ۔ علمی مسائل سے ان کی دلچسپی بڑھی اور مختلف علمی و ادبی مسائل پر گہرائی کے ساتھ غور کرنے کا شعور ان کے یہاں عام ہوا ۔ انھوں نے ان معاملات میں اجتہادی شان پیدا کی ۔ اجتہاد کے ساتھ جدت اور اپج تو وجود میں آنی ہی چاہیے ۔ چنانچہ غالب کے یہاں جدت اور اپج اسی صورت حال کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے ۔

علم و عمل کے اس ماحول نے غالب کی شخصیت میں شگفتگی اور جولانی کی خصوصیات کو بھی پیدا کیا ہے ۔ اور اسی شگفتگی اور جولانی کا یہ اثر ہے کہ غالب کے یہاں لطیفہ سنجی بہت نمایاں نظر آتی ہے ۔ ان کی بات بات میں لطف ملتا ہے ۔ غالب فطرتاً بھی بذلہ سنج اور شگفتہ مزاج تھے ۔ ماحول کی اس کیفیت نے اس بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی کو کچھ اور بھی نکھارا ۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی شخصیت میں اس شگفتگی اور جولانی کا رنگ رچا ہوا نظر آتا ہے ۔

ادیب اور شاعر کی شخصیت اس کی تخلیقات میں پوری طرح بے نقاب ہوتی ہے ۔ غالب پر بھی یہ کلیہ صادق آتا ہے ۔ ان کی تصانیف ان کی شخصیت کی آئینہ دار ہیں ۔ ہر جگہ اس شخصیت کی بنیادی خصوصیت کے اثرات ان کی نظم و نثر دونوں میں جھلکتے ہیں ۔ نظم میں یہ اثر بالواسطہ طور پر نمایاں ہوتا ہے کیوں کہ غالب نے غزل کی صنف کو اپنایا ۔ اور غزل کی صنف میں بات براہ راست نہیں کی جا سکتی—اس لیے ان کی نثر میں ان کی شخصیت براہ راست اپنا اثر دکھاتی ہے ۔ اس شخصیت کے نقوش ان کی نثر میں اس قدر نمایاں ہیں کہ ان کو سامنے رکھ کر ان کی زندگی کے حالات، ان کے اخلاق و عادات، ان کے افکار و خیالات کو بڑی خوبی سے ترتیب دیا جا سکتا ہے ۔

غالب کی اُردو نثر اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے ۔ یہ نثر ان خطوط پر مشتمل ہے، جو غالب نے وقتاً فوقتاً اپنے مختلف احباب کو لکھے۔

غالب کی زندگی کا ہر پہلو اور ان کے مزاج کی ہر خصوصیت ان خطوط میں موجود ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اعتبار سے یہ خطوط ان کی شاعری کے مقابلے میں بھی بلند مرتبہ ہیں ۔ مولانا حالی نے ٹھیک لکھا ہے کہ : ''مرزا کی عام شہرت جس قدر ان کی اُردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ، ویسی نظم اُردو اور فارسی سے نہیں ہوئی ۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان خطوں میں غالب چلتے پھرتے ، ہنستے بولتے ، ملتے جلتے ، شاگردوں کے کلام پر اصلاح دیتے ، علمی و ادبی بحثوں میں شریک ہوتے اور زمانے کو دیکھتے اور سمجھتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

ان خطوط کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۔

خطوط غالب کا پہلا مجموعہ ، 'عود ہندی' کے نام سے شائع ہوا ۔ ان کے اُردو خطوط کو جمع کرنے کا خیال سب سے پہلے ممتاز علی خان میرٹھی کو پیدا ہوا ۔ چنانچہ انھوں نے چودہری عبدالغفور سرور اور خواجہ غلام غوث بے خبر کے توسّط سے کچھ خطوط جمع کیے ۔ ان کے ساتھ چند تقریظیں بھی جمع کیں اور ان سب کا مجموعہ 'عود ہندی' کے نام سے مطبع مجتبائی میرٹھ سے ۱۸۶۸ع میں شائع کر دیا ۔ مرزا کے خطوط کا دوسرا مجموعہ 'اُردوئے معلّیٰ' کے نام سے ۱۸۶۹ع میں شائع ہوا ۔ یہ 'اُردوئے معلّیٰ' کا پہلا حصّہ تھا ۔ ۱۸۹۹ع میں مولانا حالی کی فرمائش پر مطبع مجتبائی سے پہلا اور دوسرا حصہ یک جا کرکے شائع کیا گیا ۔ ایک اور مجموعہ 'مکاتیب غالب' کے نام سے امتیاز علی خاں صاحب عرشی ناظم کتب خانۂ رام پور نے ۱۹۳۷ع میں شائع کیا ۔ 'مکاتیب غالب' میں مرزا کے وہ خطوط ہیں، جو انھوں نے والیان رام پور کو لکھے تھے ۔ مرزا کے خطوط کا ایک اور مجموعہ 'نادرات غالب' کے نام سے ۱۹۴۹ع میں بھی شائع ہوا ہے ۔ اس میں آفاق حسین صاحب دہلوی نے وہ خطوط جمع کیے ہیں ، جو غالب نے منشی نبی بخش حقیر اکبر آبادی کے نام لکھے تھے ۔ منشی مہیش پرشاد کو بھی غالب کے ان تمام خطوط کو یکجا کرنے کا خیال پیدا ہوا ۔ چنانچہ ان کی مرتب کی ہوئی پہلی جلد'خطوط غالب' کے نام سے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے شائع ہوئی ۔ دوسری جلد شائع نہ ہو سکی ۔

حالی کے خیال کے مطابق : ''مرزا غالب ۱۸۵۰ع تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے ۔ مگر سنہ مذکور میں جب کہ وہ تاریخ نویسی

کی خدمت پر مامور کیے گئے اور ہمہ تن 'مہر نیم روز' کے لکھنے میں مصروف ہوگئے ۔ اس وقت ان کو بہ ضرورت اُردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہوگی ۔ وہ فارسی نثریں اور اکثر خطوط، جن میں قوت متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے ، نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب ان کی ہمت 'مہر نیم روز' کی ترتیب و انشاء میں مصروف تھی، ضرور ہے کہ اس وقت ان کو فارسی زبان میں خط و کتابت کرنی اور وہ بھی اپنی طرز خاص میں ، شاق معلوم ہوتی ہوگی ۔ اس لیے قیاس کہتا ہے کہ انھوں نے غالباً ۵۰ء کے بعد سے اُردو زبان میں خط لکھنے شروع کیے ہیں ۔'' لیکن شیخ محمد اکرام اور مولانا غلام رسول مہر کو اس سے اختلاف ہے ۔ اکرام صاحب کا خیال ہے کہ: ''غالب کے خطوط کی نسبت عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ سب کے سب بے تکلف دوستانہ خطوط ہیں اور انھیں لکھتے وقت مرزا کو یہ سان گان نہ تھا کہ کبھی ان کی اشاعت کی نوبت آئے گی ۔ نومبر ۱۸۵۸ء سے پہلے جو خطوط مرزا نے لکھے، ان کے بارے میں تو یہ خیال صحیح ہے لیکن بعد کے خطوط کے بارے میں نہیں ۔'' اور اس سلسلے میں انھوں نے غالب کے اس خط کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھا تھا اور جس میں اس بات کی وضاحت کی تھی کہ : ''رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے ۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو ۔ اور اگر تمھاری اسی میں خوشی ہے، تو مجھ سے نہ پوچھو ۔ تم کو اختیار ہے ۔'' اکرام صاحب نے اس خط کی روشنی میں یہ خیال قائم کیا ہے کہ: ''اس کے بعد جو رقعات مرزا نے لکھے ہوں گے، ان کی اشاعت کو وہ ضرور ممکن الوقوع سمجھتے ہوں گے۔ اور اس وقت سے پہلے اور بعد کے خطوط میں فرق ہے ۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے پہلے کی نسبت بعد میں بہت زیادہ رقعات قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھے ۔''

مولانا غلام رسول مہر نے مولانا حالی کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے : ''مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں اس لیے کہ اول 'مہر نیم روز' کوئی بڑی کتاب نہیں، جس کی ترتیب میں غالب کے بیشتر حصہ صرف ہوتا ہوگا ۔ یہ کتاب انھوں نے کم از کم دو برس میں مرتب کی ۔ موجودہ مطبوعہ صورت میں اس کے کل ۱۱۸ صفحے ہیں ۔ اس سے ظاہر ہے کہ

باعتبار اوسط وہ سال بھر میں زیادہ سے زیادہ پچپن ساٹھ صفحات لکھتے رہے۔ اور یہ غالب جیسے قادرالکلام اور مشاق نثر نگار کے لیے کوئی بہت بڑا کام نہیں تھا ، جس کی تکمیل کے سلسلے میں انھیں فارسی خط و کتابت ترک کرنی پڑی ہو ۔ ہمارا خیال یہی ہے کہ غالب ۱۸۵۰ع سے قبل اُردو خط و کتابت کر چکے تھے لیکن چونکہ اس زمانے میں اُردو نثر کو اہل علم چنداں وقیع نہیں سمجھتے تھے ، اس لیے وہ خط محفوظ نہ رہ سکے ۔ بعد میں جیسے جیسے اُردو کا رواج بڑھتا گیا اور فارسی کا تداول کم ہوتا گیا ، غالب فارسی کے بجائے زیادہ تر اُردو میں خط لکھتے رہے۔''

ان میں سے کون سا خیال صحیح ہے، ہمیں اس سے بحث نہیں ۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ غالب نے اُردو میں خطوط لکھے اور ۵۰ع کے بعد تو مستقل طور پر اُردو خط و کتابت کی ۔ لیکن ان خطوط کو چھپوانے کا خیال ان کے دل میں کبھی بھی پیدا نہیں ہوا ۔ بلکہ جن احباب نے ان کو چھاپنے کی کوشش کی ، غالب نے انھیں منع کیا ۔ منشی شیو نرائن پہلے شخص ہیں جنھوں نے غالب کے خطوط شائع کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں ان سے اجازت مانگی ۔ اس کے جواب میں غالب نے لکھا :

''اردو خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں، یہ بھی زائد بات ہے، کوئی رقعہ ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا ورنہ صرف تحریر سرسری ہے ۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے منافی ہے ۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں ۔ خلاصہ یہ کہ اس کا چھاپنا میرے خلاف طبع ہے ۔''

لیکن بعض دوسرے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعد میں وہ ان کو چھپوانے کے لیے تیار ہو گئے تھے اور جب انھیں یقین ہو گیا تھا کہ خطوط شائع ہوں گے تو وہ خطوط دل لگا کر اور قلم سنبھال کر لکھنے لگے تھے ۔ لیکن اس خیال نے ان کے خطوط کو ان خصوصیات سے محروم نہیں رکھا جو نجی خطوط میں پائی جاتی ہیں ۔ یعنی بے تکلفی اور بے باکی ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ غالب کی شخصیت میں دو رنگی نہیں تھی ۔ ان کی شخصیت میں ایک خلوص تھا ۔ ایک صداقت تھی ، ایک بے تکلفی تھی ، ایک بے باکی تھی ، ایک برجستگی تھی چنانچہ یہ خصوصیات ان خطوں میں بھی پائی جاتی ہیں، جو نجی ضرور تھے ۔ لیکن جن کو لکھتے وقت یہ خیال ان کے پیش نظر تھا کہ وہ چھپیں گے ضرور !

غالب کے خطوط کی یہ بنیادی اور سب سے اہم خصوصیت ہے کہ ان میں بے پناہ خلوص اور بے اندازہ صداقت ہے ۔ وہ ایک ایسے انسان کے قلم سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ، جو کسی بات کو چھپا نہیں سکتا تھا ۔ جس میں مبالغہ آرائی نام کو نہیں تھی ۔ تکلف جسے چھو بھی نہیں گیا تھا ۔ تصنع سے جس کو کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ ان خطوط میں ایک مانوس فضا ملتی ہے ، ایک دلکش ماحول نظر آتا ہے اور غالب نے جو باتیں کی ہیں ، وہ کسی نہ کسی نسبت سے ہمیں اپنی باتیں معلوم ہوتی ہیں ۔ جن خیالات کا اظہار کیا ہے ، وہ اپنے خیالات نظر آتے ہیں ۔ ماحول کی جو تصویریں بھی پیش کی ہیں ، وہ اپنی تصویریں دکھائی دیتی ہیں ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ غالب جن لوگوں کو خطوط لکھتے ہیں ، ان سے اس درجہ قریب ہو جاتے ہیں اور ان کی شخصیت میں اس درجہ گھل مل جاتے ہیں کہ ان کی یہ بات دلوں کو بہت بھاتی ہے اور ہر شخص ان سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ اس آئینے میں اسے اپنی صورت نظر آنے لگتی ہے ۔

خطوط غالب کے موضوعات متنوع اور مختلف ہیں ۔ ان خطوں میں ان کی شخصیت سے متعلق عام باتیں موجود ہیں ۔ پیدائش کے وقت سے لے کر وفات تک کے واقعات کا ان خطوں سے اندازہ ہوتا ہے ۔ بچپن کے حالات ، تعلیم و تربیت ، شادی اور اس کے اثرات ، احباب اور متعلقین ، مالی الجھنیں اور پریشانیاں اور پھر اس سلسلے میں دور دراز علاقوں کا سفر ؛ پنشن اور اس کی ساری تفصیل ، دلی کی حالت ، قید کا واقعہ ، غدر اور اس کے مفصل حالات ، ان تمام موضوعات پر ان خطوط سے روشنی پڑتی ہے ۔ لیکن ان موضوعات کی صرف تفصیل ہی ان خطوط میں درج نہیں ہے ، غالب نے ان سب پر روشنی ڈالتے ہوئے ، اپنے ذہنی رجحان اور افتاد طبع کو بھی سامنے رکھا ہے ۔ ہر چیز کے بارے میں وہ ایک صائب رائے رکھتے ہیں اور اسی کا اظہار ان خطوط سے ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی شخصیت اور ان کا نظریۂ حیات ، ان خطوط میں پوری طرح بے نقاب ہے ۔

غالب کے ان خطوط سے اس زمانے کے سیاسی ، معاشرتی اور معاشی ماحول کی بھی وضاحت ہوتی ہے ۔ انیسویں صدی کی دلی میں لوگ کس طرح رہتے تھے ؟ ان کے آداب اور طور طریقے کیا تھے ؟ ان کی الجھنیں اور پریشانیاں کس قسم کی تھیں ؟ پرانی روایات کے ساتھ ساتھ نئی روایات کا اثر معاشرت

پر کس طرح چھانے لگا تھا ؟ افراد زندگی کے بارے میں کیا سوچتے تھے ؟ ماحول نے انھیں کس طرح اسیر کر لیا تھا ؟ مختلف طبقوں اور فرقوں کے تعلقات آپس میں کیسے تھے ؟ ان کا نظریۂ حیات کیا تھا ؟ معاشی بد حالی اخلاق کو کس طرح بگاڑ رہی تھی ؟ــــــ بے عملی نے کس طرح معاشرت میں گھر کر لیا تھا ؟ امراء اور شرفاء کی زندگی کس طرح وبال جان بن گئی تھی ؟ــــــ لوگ کس طرح ایک دوسرے سے ملتے تھے ؟ درباروں کی حالت کیا تھی؟ــــــ درباروں نے زندگی کو کس طرح بگاڑا تھا ؟ مغلوں کی کمزوری اور انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے کیا صورت پیدا کی تھی ؟ سیاسی تبدیلیوں نے معاشی، معاشرتی زندگی کو کن راہوں پر لا کر کھڑا کر دیا تھا؟ کون سے حالات اور افکار و خیالات زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھال رہے تھے ؟ــــــ کون سی علمی، ادبی اور سیاسی تحریکیں تھیں، جن کا اثر زندگی اور معاشرت پر ہو رہا تھا ؟ــــــ کون سے ادبی مباحث تھے ، جن کا ان دنوں چرچا تھا ؟ــــــ شاعرانہ ماحول کی کیا خصوصیات تھیں ؟ــــــ کون کون سے شاعر تھے ، جن کا اثر ماحول قبول کر رہا تھا ؟ــــــ یہ اور اسی طرح کے سیکڑوں معاملات و مسائل ہیں، جن کی صحیح تصویریں، غالب کے یہ خطوط پیش کرتے ہیں ۔

یہ خطوط جس انداز سے لکھے گئے ہیں ، اس کو بھی خاصی اہمیت حاصل ہے ۔ ان خطوط سے اردو میں خطوط نویسی کا ایک نیا معیار قائم ہوتا ہے اور ایک اچھوتے طرز کی ابتدا ہوتی ہے ۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ : ''مرزا کی اردو خط و کتابت کا طریقہ فی‌الواقع سب سے نرالا ہے ۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط و کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا اور نہ ان کے بعد کسی سے پوری پوری تقلید ہوسکی ۔'' اور یہ خیال بالکل صحیح ہے ۔ کیوں کہ جس وقت مرزا غالب نے یہ خطوط لکھے ہیں، اس وقت عام طور پر فارسی میں خطوط لکھے جاتے تھے ۔ اردو بولنے کا رواج عام تھا لیکن لکھنے کی زبان فارسی تھی ۔ فارسی میں جو خطوط لکھے جاتے تھے ، وہ 'رقعات بیدل' اور 'انشائے مادھو رام' کو معیار بنا کر لکھے جاتے تھے ۔ اس لیے فارسی خطوط نویسی میں کسی نمایاں تبدیلی کی توقع کم تھی ۔ مرزا نے نہ صرف فارسی میں خطوط لکھنے کی روایت کو توڑا ، بلکہ اردو خطوط کو نئے اور نرالے انداز سے بھی آشنا کیا ۔ غالب کی بڑائی کا راز اسی میں مضمر ہے ۔

غالب کے زمانے میں خطوط نویسی کا جو معیار تھا، اس میں القاب و آداب کو خاص اہمیت دی جاتی تھی ۔ خط کا ایک اچھا خاصا حصہ، القاب و آداب پر مشتمل ہوتا تھا ۔ لیکن یہ بڑے بڑے اور لمبے لمبے القاب و آداب بے مقصد معلوم ہوتے تھے اور ان کو استعمال کرنے کے لیے خاصی عبارت آرائی کرنی پڑتی تھی ۔ غالب نے اس کو چھوڑا اور ایک زیادہ فطری اور زیادہ حقیقی طریقہ اختیار کیا ۔ بقول حالی : ''انھوں نے القاب و آداب کا پرانا اور فرسودہ طریقہ اور بہت سی باتیں جس کو متوسلین نے لوازم نامہ نگاری میں سے قرار دے رکھا تھا مگر درحقیقت فضول اور دور ازکار تھیں اڑا دیں ۔ وہ خط کو کبھی میاں ، کبھی برخوردار ، کبھی بھائی ، کبھی مہاراج ، کبھی کسی اور مناسب لفظ سے آغاز کرتے ہیں ۔ اس کے بعد مطلب لکھتے ہیں اور اکثر بغیر اس قسم کے الفاظ کے سرے ہی سے مدعا لکھنا شروع کر دیتے ہیں''—لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انھوں نے اپنے خطوط سے یکسر القاب و آداب کو خارج کر دیا ہے ۔ ایسا نہیں ہے ۔ وہ القاب کہیں کہیں استعمال ضرور کرتے ہیں لیکن وہاں جہاں ان کو استعمال کیے بغیر چارہ نہیں ہوتا ۔

غالب نے ان القاب و آداب کو مرتبے کی مناسبت سے استعمال کیا ہے ۔ بلکہ یہی خیال القاب و آداب کے استعمال کرنے کا باعث بنا ہے ۔ جب وہ اپنے سے بڑے کو خط لکھتے ہیں تو القاب و آداب ضرور استعمال کرتے ہیں ۔ مثلاً نوابان رام پور کے خطوط کو انھوں نے ہمیشہ ''حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت'' سے شروع کیا ہے اور نواب میر غلام بابا خان کو ''جمیل المناقب عمیم الاحسان'' لکھ کر مخاطب کیا ہے ۔ لیکن ویسے ان کا عام انداز یہی ہے کہ بغیر کسی القاب کے خط شروع کر دیتے ہیں ۔ بہرحال اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالب نے روایتی القاب و آداب کے استعمال سے احتراز کیا اور جو القاب و آداب استعمال کیے ، ان میں کچھ جدتیں پیدا کیں اور اسی وجہ سے ان کے القاب و آداب بذات خود بھی دلچسپ بن گئے ۔

القاب و آداب کو زیادہ اہمیت نہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ غالب خط لکھنے کو بات کرنے کے مترادف سمجھتے تھے ۔ چنانچہ کئی جگہ انھوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے ۔ ایک جگہ لکھتے ہیں : ''پیر و مرشد ! یہ

خط لکھنا نہیں ہے، باتیں کرنی ہیں - اور یہی سبب ہے کہ میں القاب و آداب نہیں لکھتا۔'' —ایک اور جگہ اسی خیال کا اظہار اس طرح کیا ہے : ''مرزا صاحب ! میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے ۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو ۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو ۔ کیا تم نے مجھ سے بات کرنے کی قسم کھا لی ہے ۔ اتنا تو کہو کہ یہ کیا بات تمہارے جی میں آئی ہے۔''—اور یہ بات کرنے کا انداز انھوں نے اپنے خطوط میں شعوری طور پر پیدا کیا ہے - یہی وجہ ہے کہ ان کے خطوط میں بات کرنے کی ایک فضا ملتی ہے ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ ان کے سامنے موجود ہے اور غالب اس کے سامنے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں ۔ یہ باتیں کرنے کی فضا غالب کے خطوط کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے -

جدت اور اپچ گویا غالب کی گھٹی میں پڑی تھی ۔ اس کا اظہار ان کے خطوط میں جگہ جگہ ہوتا ہے ۔ خصوصاً خطوط شروع کرنے میں انھوں نے بڑی جدتوں سے کام لیا ہے ۔ ہر خط کے آغاز میں ایک ڈرامائی کیفیت نظر آتی ہے بلکہ جہاں القاب و آداب نہیں ہوتا ، اور جہاں وہ براہ راست مکتوب الیہ کو مخاطب نہیں کرتے ، وہاں یہ خصوصیت کچھ اور بھی نمایاں ہوتی ہے ۔ مثلاً یوسف مرزا کے نام ایک خط کو اس طرح شروع کرتے ہیں : ''کوئی ہے ذرا یوسف مرزا کو بلائیو ۔ لو صاحب وہ آئے ۔ میاں ! میں نے خط تم کو بھیجا ہے مگر تمہارے ایک سوال کا جواب رہ گیا ہے'' —اسی طرح میر مہدی کو ایک خط میں لکھنا چاہتے ہیں کہ میرن صاحب آئے اور ان سے یہ باتیں ہوئیں ۔ اس کو اس طرح شروع کرتے ہیں : ''اے میرن صاحب ! السلام و علیکم ۔ حضرت ! آداب ، کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی ؟ حضور میں کیا منع کرتا ہوں ۔ مگر میں انہیں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں ۔ پھر آپ کیوں تکلیف کریں ۔ نہیں میرن صاحب ! اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں ۔ وہ خفا ہوا ہوگا ۔ جواب لکھنا ضرور ہے ۔ حضرت ! وہ آپ کے فرزند ہیں ، آپ سے کیا خفا ہوں گے ۔ بھائی آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو ؟ سبحان اللہ ! اے لو حضرت ! آ . خط نہیں لکھنے اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے ۔

اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ کہو تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میرمہدی کو خط لکھوں ۔ کیا عرض کروں ؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا ۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے ۔ میں اب پنج شنبہ کو روانہ ہوتا ہوں ۔ میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا ۔ میاں ! ہیٹھو ہوش کی خبر لو ۔ تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ ۔ میں بوڑھا آدمی بھولا آدمی ، تمہاری باتوں میں آ گیا اور آج تک اپ خط نہ لکھا ۔ لاحول و لا قوۃ"— اور اس تمہید کے بعد جو باتیں لکھنی چاہتے ہیں لکھتے ہیں— اس خط کی اصل خوبی اس کے ڈرامائی انداز میں ہے ۔ اس ڈرامائی انداز سے غالب کے خطوط بھرے پڑے ہیں ۔

غالب کے مزاج میں بلا کی شوخی اور شگفتگی تھی ۔ بات میں بات پیدا کرنا وہ خوب جانتے تھے ۔ بلکہ بغیر شوخی اور شگفتگی کے وہ بات کر ہی نہیں سکتے تھے ۔ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ : "مرزا کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری تھی ، جیسے ستار کے تار میں سر بھرے ہوتے ہیں اور قوت متخیلہ جو شاعری اور ظرافت کی خلاق ہے ، اس کو مرزا کے دماغ کے ساتھ وہی نسبت تھی ، جو قوت پرواز کو طائر کے ساتھ "—یہ شوخی اور شگفتگی کی خصوصیات ان کے خطوط میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں ۔ لیکن ہر جگہ اس شوخی اور شگفتگی سے کوئی نہ کوئی نکتہ پیدا ہوتا ہے اور اسی طرح ان کی یہ شوخی اور شگفتگی، ان کے خطوط میں لطیفہ سنجی کی خصوصیت پیدا کر دیتی ہے ۔ لیکن غالب کی بڑائی اس میں ہے کہ اس لطیفہ سنجی میں بھی وہ حفظ مراتب کا خیال رکھتے ہیں اور ان خطوط میں لطیفہ سنجی سے جو مزاح پیدا ہوتا ہے ، اس میں بڑی لطافت ہوتی ہے ۔ ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے ان کی لڑکی کو جو بچپن میں مرزا کے سامنے آتی تھی اور اب جوان ہو گئی ہے ، اس طرح مخاطب کرتے ہیں :

"کیوں بھئی ! اگر ہم کول آئے بھی تو تم کو کیوں کر دیکھیں گے ؟ کیا تمہارے ملک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں ؟"

ایک اور دوست کو رمضان کے بارے میں لکھا ہے :

"دھوپ بہت تیز ہے ۔ روزہ رکھتا ہوں ۔ مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں ۔ کبھی پانی پی لیا ۔ کبھی حقہ پی لیا ۔ کبھی کوئی ٹکڑا

روٹی کا کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجیب قسم کا فہم رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔"

مرزا حاتم علی بیگ مہر کو ایک تعزیتی خط اس انداز میں لکھتے ہیں:

"مرزا صاحب ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے۔ پچاس برس عالم رنگ و بو کی سیر کی۔ ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں۔ ہم مانع فسق و فجور نہیں، پیو کھاؤ مزے اڑاؤ۔ مگر یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو۔ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے کسی کے مرنے کا غم وہ کرے جو آپ نہ مرے۔ کیسی اشک فشانی؟ کہاں کی مرثیہ خوانی؟ آزادی کا شکر بجا لاؤ۔ غم نہ کھاؤ، اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنّاں جان نہ سہی منّا جان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا اور حور ملی اقامت جاودانی ہے۔ اور اسی نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجا منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے وہ حور اجیرن ہو جائےگی۔ وہی زمرّدیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ۔ چشم بد دور وہی ایک حور۔ بھائی ہوش میں آؤ کہیں اور دل لگاؤ۔"

ایک اور خط میں اس موضوع پر یوں قلم اٹھاتے ہیں:

"عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی۔ تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری۔ بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں، اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک کو میں نے بھی مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی زخم دوست کھائے ہوئے مغفرت کرے۔"

ان خطوط میں جو شوخی اور شگفتگی ہے، وہ مزاح کو پیدا کرتی ہے، اور لطافت اس مزاح کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ

تعزیت نازک موقع پر بھی وہ مزاح کو پیدا کرتے ہیں اور اس لطافت کو برقرار رکھتے ہیں ۔ تعزیت کے ایسے نازک موضوع پر خط لکھتے ہوئے بھی انہوں نے اپنے اس مخصوص رنگ کو قائم کر رکھا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ خطوط دلوں میں گھر کر لیتے ہیں اور ان کا لطیف انداز ظرافت روح میں بالیدگی پیدا کرتا ہے ۔

غالب کے فکر و خیال کی پرواز بہت اونچی تھی ۔ وادی خیال کو مستانہ وار طے کرنا ، ان کا محبوب مشغلہ تھا ۔ لیکن وہ زندگی کو بہت قریب سے دیکھتے بھی تھے ۔ اس کی گہرائیوں تک پہنچنا اور اصل حقیقت کو معلوم کرنا ، ان کی شخصیت کا جزو تھا ۔ لیکن مشاہدۂ حق کی گفتگو ، وہ بادہ و ساغر کے بغیر نہیں کر سکتے تھے ۔ یہ خصوصیت ان کے خطوط میں بھی نمایاں ہے ۔ ان میں جگہ جگہ تخیل کی بلند پروازی نظر آتی ہے اور تخیل کی اس بلند پروازی کے سہارے وہ زندگی کے بنیادی حقائق تک پہنچتے ہیں ۔ لیکن ان حقائق کو بادہ و ساغر کے روپ میں پیش کرتے ہیں ۔ ایسے مقامات پر ان کے خطوط میں حد درجہ شاعرانہ انداز پیدا ہو جاتا ہے ۔ مثال کے طور پر اس خط کو دیکھیے جس میں انہوں نے اپنی زندگی کے مد و جذر کو پیش کیا ہے اور خانہ داری کے موضوع پر روشنی ڈالی ہے ۔ لکھتے ہیں :

”سنو ! عالم دو ہیں ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل ۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ہے ، جو خود فرماتا ہے : ”لمن الملک الیوم“ اور پھر آپ ہی جواب دیتا ہے ”للہ الواحد القہار ۔“ ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں ۔ لیکن یوں بھی ہوا کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں ۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے بھیجا گیا (یعنی پیدا ہوا) تیرہ برس حوالات میں رہا ۔ ساتویں رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس (یعنی نکاح) صادر ہوا ۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا ۔ اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا ۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا ۔ برسوں کے بعد جب جیل خانے سے بھاگا ، تین بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا ۔ پایان کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اس مجلس میں بٹھا دیا

جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے ، دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں ۔ پاؤں بیڑی سے فگار ، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار ، مشقت مقرری اور مشکل ہوگئی ۔ طاقت یک قلم زائل ہوگئی ، بے حیا ہوں ۔ سال گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑا ، مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا ۔ میرٹھ ، مراد آباد ہوتا ہوا ، رام پور پہنچا ۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا ۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا ۔ بھاگوں کیا بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی ۔ حکم رہائی دیکھیے کہ کب صادر ہو ؟ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اس ماہ ذی الحجہ میں چھوٹ جاؤں ۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا ۔ میں بھی بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا ۔"

یا پھر یہ خط جس میں اپنے آخری وقت کی حالت کا بیان اور زندگی کی بے ثباتی کا تذکرہ ہے :

"ناتوانی زور پر ہے، بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے ۔ ضعف ، کاہلی ، سستی ، گراں جانی ، رکاب میں پاؤں ہے ۔ باگ پر ہاتھ ہے ۔ بڑا سفر دور و دراز در پیش ہے ۔ زاد راہ موجود نہیں ۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں اگر نا پرسیدہ بخش دیا تو خیر ۔ اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے ۔"

اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ غالب کے تخیل کی پرواز بہت بلند تھی ، اور اس تخیل کی پرواز کے ذریعے ان کے انداز تمثیل نگاری کی خصوصیت بھی پیدا ہو جاتی تھی ۔ جیسے کہ ان خطوط میں موجود ہے اور یہ کہ وہ زندگی کا شعور رکھتے تھے ۔ زندگی کے بنیادی حقائق پر ان کی نظر رہتی تھی ۔ لیکن وہ اس کو بڑے ہی دلکش انداز میں پیش کرتے تھے ۔ غالب کی زندگی کی تصویر اس بیان سے جب اُبھرکر سامنے آتی ہے ، اس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی ۔ غالب کو اس میں کمال حاصل تھا ۔ ان کے خطوط میں اکثر جگہ اس خصوصیت کے اثرات جھلکتے ہیں ۔ اور اسی کا اثر ہے کہ ان کے خطوط میں ایک رفعت ملتی ہے ۔ ایک گہرائی کا احساس ہوتا ہے اور ایک رچی ہوئی کیفیت نظر آتی ہے ۔

اُردو نثر کی روایت میں غالب کے خطوط امتیازی حیثیت رکھتے ہیں ۔

ان خطوط نے اُردو نثر کو ایک نیا انداز دیا ہے ، اس کو نئی راہیں دکھائی ہیں اور ان راہوں پر اس کو گامزن بھی کیا ہے۔

غالب کے زمانے میں اُردو نثر کا رواج عام نہیں تھا ۔ عام طور پر لکھنے کی زبان فارسی تھی ۔ اس لیے فارسی نثر کے اثرات ہر طرف چھائے ہوئے تھے۔ اور جب کبھی کوئی اُردو نثر لکھتا بھی تھا ، تو وہ فارسی نثر کی نقل ہوتی تھی ۔ مسجّع ، مقفیٰ اور پر تکلف عبارت کا رواج عام تھا ۔ اگرچہ فورٹ ولیم کالج نے اُردو میں سادہ اور آسان نثر کے اچھے نمونے پیش کیے تھے ، لیکن ابھی تک فارسی کا اثر اتنا گہرا تھا کہ آسان اور سادہ نثر اپنے اثرات کو عام نہیں کر سکتی تھی ۔ فورٹ ولیم کالج نے میر امن دہلوی، میرشیر علی افسوس، سید حیدر بخش حیدری، خلیل علی خاں اشک ، مرزا کاظم علی جوان اور بینی ناراثن جہاں وغیرہ کو پیدا کیا ۔ لیکن ان کے اثرات ابھی تک محدود تھے۔ بلکہ بعضوں نے تو اس آسان نثر کا مضحکہ اُڑانا شروع کر دیا تھا اور ان پر پھبتیاں کسنا شروع کر دی تھیں ۔ رجب علی بیگ سرور کی 'فسانۂ عجائب' اس کی ایک مثال ہے ۔ غرض یہ کہ غالب سے قبل اُردو نثر میں قدامت اور جدت ، تصنّع اور سادگی ، تکلف اور سلاست میں ایک کشمکش کا سلسلہ جاری تھا ۔ غالب نے اپنے خطوط لکھ کر سادگی اور سلاست کی تحریک کو سہارا دیا اور اسی کا یہ اثر ہے کہ اُردو نثر میں اس تحریک نے ترقی کی ، یہ رجحان عام ہوا اور اس نے ایک مستقل روایت کی صورت اختیار کرلی ۔

خطوط غالب اُردو نثر کے بہت اچھے نمونے پیش کرتے ہیں ۔ اس نثر میں سادگی اور سلاست ہے ۔ لیکن اس سادگی اور سلاست کے باوجود وہ پرکار بھی ہے ، جو غالب کی شخصیت کا حصہ تھی ۔ غالب فارسی زبان کا رچا ہوا مذاق رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی کے اثرات ان کی اُردو نثر میں بھی نظر آتے ہیں ۔ لیکن فارسی کے یہ اثرات غالب کی اُردو نثر کو بھی بوجھل نہیں بناتے ۔ برخلاف اس کے اس میں ایک رنگین اور پرکار فضا کو پیدا کرتے ہیں۔ اس فضا میں ایک بانکپن اور طرحداری ملتی ہے ۔ غالب فارسی کی نئی نئی ترکیبیں تراشتے ہیں ۔ لیکن یہ ترکیبیں نامانوس نہیں ہوتیں ۔ ان ترکیبوں میں ایک شان و شکوہ ہوتا ہے ۔ غالب کی نثر میں یہ شان و شکوہ، یہ بانکپن اور طرحداری موجود ہے۔ لیکن یہ شعوری

کوشش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ فطری معلوم ہوتا ہے۔ ان کی نثر میں کہیں کہیں عبارت آرائی کی خصوصیت ملتی ضرور ہے، کیونکہ وہ کہیں کہیں مرصع نثر بھی لکھتے ہیں لیکن یہ خصوصیت موضوع سے ہم آہنگی کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ جہاں وہ شدت کے ساتھ کوئی بات کہنا چاہتے ہیں، وہاں اس صورت حال کا وجود ہوتا ہے۔ لیکن غالب کے خطوط میں ایسے مواقع کم ہی آئے ہیں۔ البتہ ان کے تخیل کی بلند پروازی، ان کی نثر میں ایک شاعرانہ انداز کو ضرور پیدا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جگہ جگہ ان کی نثر میں ایسے مقامات آئے ہیں، جن میں ایسی چونکا دینے والی کیفیت ہوتی ہے جو اپنی رنگینی اور رعنائی کے باعث دلوں میں اتر جاتے ہیں۔ غالب کی اُردو نثر میں ایسا اسلوب نہیں ملتا جو محنت سے پیدا ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے ایک فطری روانی نظر آتی ہے۔ ایک فطری بہاؤ کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن اس روانی اور بہاؤ میں پرشور کیفیت نہیں پائی جاتی۔ بلکہ ایک نغمگی اور غنائی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ اور یہ سب چیزیں مل کر غالب کی اُردو نثر کو ایک نئے اسلوب سے آشنا کرتی ہیں۔ یہ اسلوب غالب ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان سے قبل تو خیر اس کا وجود ہی نہیں تھا لیکن ان کے بعد بھی کوئی اسے اپنا نہ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی جگہ منفرد ہے۔

اُردو ادب میں غالب کے خطوط کی ایک نمایاں حیثیت ہے۔ ان سے غالب کی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس ماحول کے تمام پہلوؤں کی تصویریں نظر آتی ہیں، جس میں غالب نے پرورش پائی اور جس نے ان کے اسلوب کو پیدا کیا۔ یہ اسلوب بھی ان خطوں میں اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔

غالب کے خطوط
کی
ادبی اہمیت

غالب ایک عظیم شاعر ہی نہیں تھے، ایک نثر نگار کی حیثیت سے بھی ان کی عظمت مسلم ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انھوں نے نثر کی طرف کسی باقاعدگی کے ساتھ توجہ نہیں کی۔ یہ ٹھیک ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کا بہت کم وقت اس پر صرف کیا۔ لیکن اس کے باوجود نثر کی جو روایت انھوں نے قائم کی اور جو مخصوص لہجہ اس میں پیدا کیا، وہ اپنی جگہ ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں غالب کی شاعری ہی کی طرح دل کشی اور دل آویزی نظر آتی ہے——اور اس دل کشی اور دل آویزی کو پیدا کرنے میں صرف فنی اور جمالیاتی پہلو ہی کا ہاتھ نہیں ہے——موضوع اور مواد کا پہلو بھی اس میں برابر کا شریک ہے——جس طرح ان کی شاعری میں ان پہلوؤں کا ایک حسین اور متوازن امتزاج ملتا ہے، اسی طرح ان کی نثر میں بھی یہ دونوں پہلو ایک دوسرے کے ساتھ گلے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں——اور یہی صورت حال اس کو دل کش اور دل آویز بناتی ہے۔

اردو نثر میں غالب نے جو سرمایہ چھوڑا ہے، وہ صرف ان کے خطوط پر مشتمل ہے——یہ خطوط بھی کسی منصوبے کے ماتحت نہیں لکھے گئے ہیں اور کوئی واضح ادبی تجربہ بھی ان کی تخلیق کا باعث نہیں بنا ہے——وہ تو نجی خطوط ہیں اور ان میں صرف نجی اور ذاتی باتیں دوسروں تک پہنچائی گئی ہیں——اس لیے بظاہر ان خطوط میں وہ خصوصیات پیدا نہیں ہو سکتی تھیں، جن کی بدولت نثر میں ایک ادبی اسلوب رو نما ہوتا ہے——لیکن غالب کی عظیم اور پہلو دار، رنگا رنگ اور ہرکار شخصیت نے

ان نجی خطوط میں ادبی نثر کی وہ شان پیدا کر دی ہے ، جس کی حیثیت اپنی جگہ منفرد ہے ـــــ یہ خطوط اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔ ان میں جگہ جگہ ادبی تجربے کی بہت اچھی مثالیں ملتی ہیں ـــــ اور اس تجربے کو غالب کے مخصوص مزاج نے پیدا کیا ہے ـــــ ان کے مزاج کی نمایاں ترین خصوصیت یہ تھی کہ وہ عام زندگی کی معمولی معمولی باتوں کو ادبی تجربے میں ڈھال دیتے تھے ۔ بات یہ ہے کہ غالب کی شخصیت صحیح معنوں میں ایک ادبی شخصیت تھی ۔ اسی لیے ان کا احساس ہمیشہ ایک ادبی تجربے کا روپ اختیار کر لیتا تھا ـــــ اس کے لیے انھیں کوئی کاوش نہیں کرنی پڑتی تھی ـــــ کسی قسم کا منصوبہ نہیں بنانا پڑتا تھا ـــــ ان کی ذہنی کیفیت ہی کچھ ایسی تھی کہ جو کچھ وہ محسوس کرتے اور سوچتے تھے ، اس کا اظہار کچھ اس طرح ہوتا تھا کہ اس میں ادبی تجربے کے تمام عناصر کی جھلک نظر آنے لگتی تھی ـــــ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہ خطوط نجی ہونے کے باوجود ایک ادبی رنگ و آہنگ رکھتے ہیں ـــــ غالب کی ادبی شخصیت نے انھیں ادبی تخلیق کا اعلیٰ نمونہ بنا دیا ہے ۔

یہ خطوط چونکہ نجی اور ذاتی ہیں اور انھیں اس احساس کے ساتھ نہیں لکھا گیا ہے کہ ان کا شمار ادبی تخلیق کے تحت ہو گا ۔ پڑھنے والے انھیں ادبی تخلیق کے معیاروں کو سامنے رکھ کر دیکھیں گے اور ان سے نثر کی روایت میں کوئی اضافہ ہو گا ، اس لیے ان میں تکلف اور تصنع کا شائبہ تک نہیں ہوتا ـــــ برخلاف اس کے بڑی بے ساختگی اور برجستگی نظر آتی ہے ـــــ ان میں تو اس حسن کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں ، جو زندگی میں بغیر کسی کوشش اور کاوش کے از خود پیدا ہوتا ہے ـــــ ظاہر ہے کہ اس حسن میں انسان کی صنّاعی اور دست کاری شامل نہیں ہوتی ـــــ بلکہ فطرت کا ہاتھ اسے سنوارتا اور نکھارتا ہے اور زندگی خود اس کی مشاطگی میں پیش پیش رہتی ہے ـــــ غالب کے یہ خطوط ، اسی حسن کی دولت سے مالا مال ہیں ـــــ ان میں بڑی وسعت اور کشادگی ہے ۔ بڑی ہی شگفتگی اور شادابی ہے ۔ بڑی ہی سادگی اور صفائی ہے ۔ بڑی ہی رنگینی اور پرکاری ہے ـــــ یہ زندگی سے بھرپور ہیں ـــــ ان میں بڑی جولانی کا احساس ہوتا ہے ـــــ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں صناعی نام کو بھی نہیں ہے ـــــ ان کی تخلیق میں تو صرف فطرت کا ہاتھ ہے ـــــ یہ صرف خطوں کی

طرح لکھے گئے ہیں ، لیکن انھوں نے اعلیٰ درجے کی ادبی تخلیق کا روپ اختیار کر لیا ہے ـــــ اور اس طرح اردو کی ادبی نثر میں بیش بہا اضافے کا باعث بنے ہیں ۔

ان سے قبل نہ تو اردو میں خطوط ہی لکھے جاتے تھے اور نہ اس میں نثر لکھنے ہی کی کوئی عظیم روایت موجود تھی ۔ غالب کے خطوط سے ایک تو اردو میں خطوط نویسی کے فن کا آغاز ہوا اور دوسرے اردو میں باقاعدہ آسان اور سادہ ادبی نثر لکھنے کی ایک روایت قائم ہوئی ـــــ لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں ان تمام پہلوؤں کا نہایت حسین آئینہ نظر آتا ہے ، جو ادبی تخلیق کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں ـــــ موضوع اور مواد ، اسلوب اور فن ، دونوں اعتبار سے ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے ـــــ ادبی تخلیق مجموعی طور پر انھی دونوں پہلوؤں کے امتزاج کا نام ہے ـــــ انھی دونوں سے اس کی تشکیل ہوتی ہے ـــــ غالب کے خطوط میں انھی دونوں پہلوؤں نے مل کر ادبی تخلیق کا رنگ و آہنگ پیدا کیا ہے ۔

غالب کے ان خطوں کا سب سے اہم موضوع تو غالب کی رنگا رنگ اور پہلو دار شخصیت کے مختلف گوشوں کی ترجمانی اور عکاسی ہے ـــــ ان خطوں میں غالب نہ صرف چلتے پھرتے اور ہنستے بولتے نظر آتے ہیں بلکہ جو کچھ انھوں نے محسوس کیا ہے ، جو کچھ ان پر بیتی ہے ، جو کچھ وہ سوچتے رہے ہیں ، جن معاملات پر انھوں نے غور کیا ہے ، جو نتائج نکالے ہیں اور جن خیالات و نظریات کی توضیح و تشریح کی ہے ، ان سب کی تفصیل و جزئیات ان خطوں میں موجود ہے ـــــ یہ گویا غالب کی انفرادی داخلی زندگی اور ان کے آس پاس کی اجتماعی خارجی زندگی کے نشیب و فراز کے مرقعے ہیں ـــــ غالب نے زندگی کے ان تمام پہلوؤں کو شدت کے ساتھ محسوس کرکے پیش کیا ہے ـــــ اس لیے ان میں جذبے کی اخلاص مندی نظر آتی ہے اور ساتھ ہی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو دیکھنے اور جاننے کا شعور بھی کار فرما دکھائی دیتا ہے ـــــ پھر ان میں اس بات کی وضاحت بھی موجود ہے کہ غالب نے زندگی کے ان پہلوؤں کو کس زاویۂ نظر سے دیکھا اور ان پر اس کے کیا اثرات ہوئے ـــــ اس کے علاوہ غالب کی جو دلچسپیاں تھیں ، ان کا جو مذاق تھا ، جو معیار انھیں عزیز تھے ، جن

قدروں کی ان کے نزدیک اہمیت تھی ، ان سب کی تفصیل بھی ان خطوں میں جگہ جگہ مل جاتی ہے —— غالب نے ان خطوں میں اپنا ذکر کیا ہے —— اپنے عزیزوں ، رشتے داروں اور دوستوں کی زندگیوں کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی ہے —— اپنے زمانے کی عام سیاسی اور معاشرتی ، معاشی اور اقتصادی اور ثقافتی زندگی کے مختلف معاملات و مسائل کو پیش کیا ہے —— ان میں انسان اور اس کی جذباتی زندگی کے ان گنت پہلوؤں کی تصویر کشی بھی ہے - اس کی مسرتوں اور شادمانیوں ، محرومیوں اور ناکامیوں کا بیان بھی جگہ جگہ ملتا ہے —— ایسے ہی مقامات پر ان خطوط میں آفاقیت کا رنگ و آہنگ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ باتیں جو غالب نے صرف اپنے اور اپنے بعض عزیزوں اور دوستوں کے بارے میں کہی ہیں ، ان کا اطلاق تمام انسانوں پر ہو سکتا ہے —— اسی لیے ان کی یہ باتیں ہر انسان کو اپنی باتیں باتیں معلوم ہوتی ہیں اور وہ اس آئینے میں اپنی ہی صورت دیکھتا ہے -

ایک خط غالب نے چودھری عبدالغفور کو لکھا ہے ، جس میں اپنی زندگی کے نشیب و فراز کی وضاحت کی ہے اور اپنی پریشانی اور زبوں حالی کا نقشہ کھینچا ہے لیکن اس میں اس زمانے کی اجتماعی زندگی کی زبوں حالی کی تفصیل نسبتاً زیادہ نمایاں ہوتی ہے - لکھتے ہیں :

میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا - نو برس کا تھا کہ چچا مرا - اس کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکاء کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے ، انھوں نے نہ دیے ، مگر تین سال - اس میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپے سال ، میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا - کول بروک صاحب بہادر ریذیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکریٹر گورنمنٹ متفق ہوئے ، میرا حق دلانے پر - ریذیڈنٹ معزول ہوئے - سکریٹر گورنمنٹ ناگاہ مر گئے - بعد ایک زمانے کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپے ماہانہ مقرر کیا - ان کے ولی عہد نے چار سو روپے سال دیے - ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے ، واجد علی شاہ کی سرکار سے بہ صلہٗ مدح گستری ، پانچ سو روپے سال مقرر ہوئے - وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیے ، یعنی اگرچہ ابھی تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی

رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی ۔ دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی ، سات برس بجھ کو روٹی دے کر بگڑی ۔ ایسے طالع مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں ۔ اب جو میں والی دکن کی طرف رجوع کروں ، یاد رہے کہ متوسط یا تو مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا ۔ اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع ہو جائے گی اور والی شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اس نے یہ سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے ـــــ اے خدا وند ، بندہ پرور ! ـــــ یہ سب باتیں وقوعی اور واقعی ہیں ۔''

ایک اور خط میں یوسف مرزا کو اپنا حال لکھا ہے ۔ اس سے بھی اس زمانے کی عام معاشی افراتفری پر روشنی پڑتی ہے ـــــ لکھتے ہیں :

''میری جان ! خدا تیرا نگہبان ـــــ جانتے ہو کہ علی کا بندہ ہوں ـــــ اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا ـــــ اس وقت کلو کے پاس ایک روپیہ سات آنے باقی ہیں ۔ اس کے بعد نہ کہیں سے قرض کی امید ہے اور نہ کوئی چیز رہن و بیع کے قابل ہے ـــــ اگر رام پور سے کچھ آیا تو خیر ، ورنہ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔''

غالب کے بیشتر خطوط کا یہی انداز ہے ـــــ بظاہر ان میں انھوں نے اپنا رونا رویا ہے لیکن ان میں سلطنتوں کے مٹنے کا ذکر بھی ہے ۔ شاہان وقت کے معزول ہونے کا بیان بھی ہے ۔ جاگیروں کے ختم ہونے کی تفصیل بھی ہے ـــــ ان سب باتوں کو پیش کرکے غالب نے در حقیقت اس زمانے کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اس تمام افراتفری اور انتشار کو پیش کیا ہے ، جس کے محرک یہ حالات تھے ـــــ یہ خطوط صرف غالب ہی کا نہیں ، اس پورے دور کا مرثیہ ہیں ، کیونکہ اس وقت صرف غالب ہی ان حالات سے دو چار نہیں تھے ـــــ ساری زندگی کا یہی حال تھا ـــــ غالب کے سر سے یہاں جو موج خوں گذرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ، وہ ان کے زمانے میں ہر انسان کے سر سے گزر رہی تھی ـــــ غرض ان خطوط میں گہرے سماجی شعور کے ساتھ وہ آفاقیت بھی نظر آتی ہے ، جس کو ایک انسانی زاویۂ نظر ہی پیدا کر سکتا ہے ـــــ غالب انسانی زندگی کے بہت بڑے نباض اور اس کے مختلف پہلوؤں کے بہت بڑے مزاج داں تھے ـــــ ان کے پاس

ذہن تھا——وہ محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ سوچ بھی سکتے تھے—— اسی لیے ان خطوط میں ایک ذہن بھی ملتا ہے——غالب کی بڑائی اس میں ہے کہ انھوں نے اس ذہنی اور فکری پہلو کو احساس اور جذبے کے ساتھ کچھ اس طرح ہم آہنگ کیا ہے کہ ان میں ادبی موضوع کی شان پیدا ہو گئی ہے۔

یہ خطوط جمالیاتی اور فنی اعتبار سے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں—— ان میں نہ صرف خطوط نویسی کے فن کا ایک نیا اور اچھوتا انداز ملتا ہے، بلکہ ادبی نثر کی بھی ان میں ایک نئی صورت شکل نظر آتی ہے——یہ خطوط سیدھے سادے انداز میں لکھے گئے ہیں۔ اسی لیے ان میں ایک اچھوتا پن نظر آتا ہے——غالب کے سامنے صرف فارسی خطوط نویسی کی روایت تھی اور اس میں تکلف اور تصنع کا پہلو غالب تھا——وہ بندھے ٹکے اصولوں کے ماتحت لکھے جاتے تھے۔ ان کے القاب و آداب تک معین تھے ——خط لکھنے والے کے لیے ان کا توڑنا یا ان حدود سے باہر نکلنا مشکل تھا——عبارت آرائی کو اس روایت میں حسن سمجھا جاتا تھا——صناعی کو لوگ اس کا زیور خیال کرتے تھے اور ایک عام تصور یہ تھا کہ اس سے حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں——غالب نے اس روایت سے بغاوت کی اور سب سے پہلے سیدھے سادے انداز میں خطوط لکھنے کی داغ بیل ڈالی ——القاب و آداب تک کو انھوں نے خیر باد کہہ دیا——عبارت آرائی ختم کر دی——اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے خطوط میں سادگی کا حسن پیدا ہو گیا——یہ حسن تکلف سے بری ہے اور اس قبائے گل میں گل بوٹا نہیں ہے——لیکن اس سادگی کے خیال نے غالب کے احساس و فکر میں آزادی کا احساس پیدا کیا ہے اور ان کے تخیل کو جولانیاں دکھانے کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ اسی لیے ان خطوط میں ایسی گل کاریاں نظر آتی ہیں، جن کو احساس اور تخیل کے مو قلم نے بنایا ہے——ان میں بڑی شگفتگی اور شادابی ہے——یہ زندگی سے بھرپور ہیں اور ان میں بڑی ہی رنگینی اور رعنائی کا احساس ہوتا ہے——ان میں جگہ جگہ ڈرامائی شان بھی ملتی ہے لیکن یہ ڈرامائی شان صرف مکالمہ نگاری ہی کے ہاتھوں پیدا نہیں ہوتی——غالب کا حسیاتی مزاج اس پہلو کو ان خطوط میں پیدا کرتا ہے ——ویسے مکالمہ نگاری بذات خود ان خطوط کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

اور اس پہلو نے انھیں زندگی سے زیادہ قریب کیا ہے اور ان میں جولانی کی لہر ڈوڑائی ہے——غالب نے ان خطوط میں آسان اور سادہ ادبی نثر لکھنے کا ایک اہم اور قابل قدر تجربہ کیا ہے——اس نثر میں سادگی اور صفائی ہے——روانی اور بہاؤ ہے——اس میں مجموعی طور پر بڑی شگفتگی اور شادابی کا احساس ہوتا ہے——اس میں سادگی کا حسن بھی ہے اور حسن کی سادگی بھی——لیکن اس کے باوجود یہ رنگین اور پرکار نظر آتی ہے۔——یہ کوشش اور کاوش کی پیداوار نہیں ہے——اسی لیے اس میں کاری گری کا پہلو نمایاں نہیں ہوتا——اس کی تشکیل تو خیال اور موضوع کے ہاتھوں ہوتی ہے——اسی لیے اس میں فطرت کا حسن نظر آتا ہے——اور حسن کی فطرت بھی۔

غالب ایک عظیم ادبی شخصیت کے مالک تھے——یہ خطوط ان کی اسی ادبی شخصیت کا آئینہ ہیں اور ان میں اس شخصیت کے خد و خال اپنی تمام جلوہ سامانیوں کے ساتھ، بے نقاب نظر آتے ہیں——یہی وجہ ہے کہ غالب کی شاعری کی طرح، ان کی ادبی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے اور غالب کو ایک عظیم ادبی شخصیت بنانے میں ان کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔

غالب
کا
ایک اہم خط
نامۂ غالب

'نامۂ غالب' اگرچہ غالب کا ایک طویل خط ہے لیکن اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے ۔ یہ خط غالب نے ۱۸۶۵ء میں مرزا رحیم بیگ کے نام لکھا اور دلی کے مطبع مجدی میں اس کے تین سو نسخے اپنے خرچ پر چھپوا کر احباب کو تقسیم کیے ۔ یہ 'نامۂ غالب' کا پہلا اڈیشن تھا ۔ اس کے آخر میں مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے :

'الحمد للہ کہ نجم الدولہ ، اسد اللہ خاں ، غالب کا خط موسومہ مرزا رحیم بخش صاحب کا مطبع مجدی مرزا خاں میں بیچ کنمپ دہلی اندرون کوچۂ چیلہ گذر فیض حد چھاؤنی کے اہتمام عبدالرزاق بیگ سے چھپا ، ۱۸۶۵'۱ ۔

اس اڈیشن میں کل سولہ صفحے تھے ۔ اس وقت اس کی اشاعت بھی محدود رہی ۔ یہ عام اس وقت ہوا جب ۱۸۶۹ء میں اِس کا متن 'اودھ اخبار' میں بالاقساط شائع ہوا ۔ پہلی قسط ۱ اکتوبر ۱۸۶۹ء کے اخبار میں اور دوسری قسط ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۹ء کے اخبار میں شائع ہوئی ۔ بعد میں اس کو 'عود ہندی' میں شامل کر لیا گیا اور 'عود ہندی' میں شامل ہونے کی وجہ سے لوگ اس کو ایک مستقل تصنیف کی حیثیت سے فراموش کر بیٹھے ۔ اس مجموعے میں یہ خط دب کر رہ گیا اور لوگ اس کی اہمیت سے

۱- غالب : نامۂ غالب (پہلا ایڈیشن) : صفحہ ۱۶
۲- غلام رسول مہر : خطوط غالب : صفحہ ۶۱۳

بے خبر ہو گئے - حالانکہ جہاں تک اس کے موضوع کا تعلق ہے ، یہ خط اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتا ہے- اس سے غالب کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور ان کے کچھ خیالات و نظریات کی وضاحت بھی ہوتی ہے -

در اصل یہ خط 'برہان قاطع' اور 'قاطع برہان' کے قضیئے کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے - غالب کی زندگی کے آخری ایام میں اس قضیئے نے بڑی اہمیت اختیار کر لی تھی اور اس سلسلے میں کئی کتابیں چھپ کر شائع ہوئی تھیں - غالب کا 'قاطع برہان' لکھنا گویا بھڑوں کے چھتّے کو چھیڑنا تھا - یہ کتاب انھوں نے 'برہان قاطع' کی رد میں لکھی تھی اور اس میں اس کے مؤلف محمد حسین دکنی پر اعتراضات کیے تھے- اس کا پہلا اڈیشن ۱۸۶۲ع میں مطبع نول کشور سے شائع ہوا تھا - اس کے شائع ہونے کے بعد غالب پر مختلف لوگوں نے اعتراضات کیے اور ان کو کتابی صورت میں شائع کیا - بقول غالب : ''قاطع برہان کا لکھنا کیا ہوا گویا باسی کڑھی میں اُبال آیا - لکھنا کیا تھا کہ سہام ملامت کا ہدف ہوا—معتقدان 'برہان قاطع' برچھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑکر اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں - غرض خاصا ہنگامہ برپا ہوا اور اس کے نتیجے میں کئی کتابیں چھپ کر منظر عام پر آئیں - ان میں 'محرق قاطع برہان' ، 'ساطع برہان' ، 'مؤید برہان' ، 'قاطع القاطع' وغیرہ خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں -

'محرق قاطع برہان' منشی سعادت علی دہلوی نے لکھی - یہ کتاب ۱۸۶۳ع میں مطبع احمدی شاہدرہ میں چھپی - 'مؤید برہان' مولوی احمد علی مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ کی تالیف ہے اور یہ کلکتہ کے مظہرالعجائب پریس میں ۱۸۶۶ع میں چھپ کر شائع ہوئی - 'قاطع القاطع' مولوی محمد امین نے لکھی - یہ ۱۸۶۹ع میں مطبع مصطفائی میں چھپی تھی - اس میں ۲۶۸ صفحات تھے - 'ساطع برہان' مولوی رحیم بیگ کی تصنیف تھی ، جو ۱۸۶۵ع میں مطبع ہاشمی میں چھپ کر شائع ہوئی تھی - یہ تمام کتابیں 'برہان قاطع' کی

۱- مہیش پرشاد 'برہان قاطع' اور 'قاطع برہان' کا قضیہ : (علی گڑھ میگزین غالب نمبر : صفحہ ۱۲۱)

حمایت میں لکھی گئی تھیں - اور ان میں غالب کے اعتراضات کے جواب دیے گئے تھے -

جب یہ کتابیں شائع ہوئیں ، تو غالب اور ان کے احباب کی طرف سے بھی ان کا جواب دیا گیا - اور اس کے نتیجے میں 'لطائف غیبی' ، 'دافع ہذیان' ، 'سوالات عبدالکریم' ، 'محرق قاطع برہان' ، 'تیغ تیز' ، 'شمشیر تیز تر' ، 'ہنگامۂ دل آشوب' ، 'مؤید برہان' ، 'نامۂ غالب' وغیرہ منظر عام پر آئیں[۱] -

'لطائف غیبی' ۴۴ صفحے پر مشتمل ہے - یہ کتاب دہلی کے اکمل المطابع میں ۱۸۶۴ع میں چھپی - اس میں منشی سعادت علی کی کتاب 'محرق قاطع برہان' کے جواب دیے گئے ہیں - یہ کتاب میاں داد خاں سیاح کی تصنیف ہے - لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کتاب خود غالب نے لکھی تھی اور میاں داد خاں سیاح کے نام سے اس کو چھپوایا تھا - اگر غالب نے خود یہ کتاب نہیں لکھی تو کم از کم ان کے اشارے سے ضرور لکھی گئی ہے اور انھوں نے اس کا مواد بھی مہیا کیا ہے -

'دافع ہذیان'مولوی نجف علی کی تصنیف ہے اور ۱۸۶۵ع میں اکمل المطابع سے چھپ کر شائع ہوئی - اس میں کل ۲۸ صفحات ہیں - 'سوالات عبدالکریم' ایک طالب علم کی تصنیف ہے - اس میں سترہ سوالات ہیں جو 'محرق قاطع برہان' کی تردید میں ہیں - یہ کتاب ۱۶ صفحات پر مشتمل ہے -

'تیغ تیز' ، 'مؤید برہان' کے جواب میں ہے - یہ کتاب ۱۸۶۶ع میں اکمل المطابع دہلی سے شائع ہوئی - اس میں کل ۳۲ صفحات ہیں 'شمشیر تیز تر' مولوی نبی بخش کے مطبع نبوی کلکتہ میں ۱۸۶۸ع میں شائع ہوئی - اس کتاب میں 'تیغ تیز' کا جواب دیا گیا ہے - ضخامت ۱۸۲ صفحات ہے -

'نامۂ غالب' خود غالب کی تصنیف ہے ، اور جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے ، یہ کتاب انھوں نے خود مطبع محمدی میں چھپوائی تھی - غالب ، میاں داد خاں سیاح کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

'نامۂ غالب' صاحب مطبع نے اپنی بکری کے واسطے نہیں چھاپی

۱- مہیش پرشاد : 'برہان قاطع' اور 'قاطع برہان' کا قضیہ : (علی گڑھ میگزین ، غالب نمبر : صفحہ ۱۳۲

جو میں مول لے کر بھیجوں اور تم سے اس کی رقم مانگ لوں ۔ میں نے آپ تین سو جلدیں چھپوائیں ۔ دور و نزدیک بانٹ دیں ۔ آج یک شنبہ ہے ۔ پارسل روانہ نہ ہوگا جتنے یہ نسخے اب میرے پاس باقی ہیں ، کل تمھیں بھیج دوں گا۔"[1]

'برہان قاطع' اور 'قاطع برہان' کے قضیئے سے متعلق موافقت اور مخالفت میں جو کتابیں شائع ہوئیں ، ان کی تفصیل اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اس قضیئے نے اس وقت کے ادبی ماحول میں اچھا خاصا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا ۔ غالب کو اس ہنگامے سے گہری دلچسپی تھی، اور وہ اپنی ضعیفی کے باوجود ، اس ہنگامے میں پیش پیش تھے ۔ ان کے بعض خطوں سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اس قضیئے سے کتنی دلچسپی تھی اور وہ ان مطبوعات کو کتنی اہمیت دیتے تھے، جو اس کے متعلق شائع ہوئی تھیں ، لکھتے ہیں :

"صاحب ! یہ تم نے پانچ روپے کے ٹکٹ کیوں بھیجے ؟ میں نہ کتب فروش ، نہ دلال ۔ یہ حرکت مجھے پسند نہ آئی ۔ اور تم نے برا کیا ۔ حضرت ! سولہ جلدیں 'لطائف غیبی' کی بھیج کر ، اس کے پانچ سات دن کے بعد بیس 'نامۂ غالب' کا پارسل ارسال کیا ہے ۔ 'لطائف' کی رسید تم نے بھیج دی ۔ یقین ہے کہ 'نامۂ غالب' کا پارسل بھی پہنچ جائے گا۔"[2]

(خط بہ نام میاں داد خاں سیاح)

"ہا ہا ہا ! 'محرق قاطع' کا تمھارے پاس پہنچنا :

کاسے کہ خواستم ز خدا شد میسّرم

میں اس خرافات کا جواب کیا لکھتا ۔ مگر ہاں سخن فہم دوستوں کو غصّہ آ گیا ۔ ایک صاحب نے فارسی عبارت میں اس کے عیوب ظاہر کیے ۔ دو طالب علموں نے اُردو زبان میں دو رسالے جدا جدا لکھے دانا ہو اور منصف ہو ۔ 'محرق' کو دیکھ کر جانو گے کہ مؤلف اس کا احمق ہے اور جب وہ احمق 'دافع ہذیان' و 'سوالات عبدالکریم' اور

۱- غلام رسول مہر : خطوط غالب : صفحہ ۳۳۲
۲- ایضاً : صفحہ ۳۳۳

'لطائف غیبی' کو پڑھ کر متنبہ نہ ہوا اور 'محرق' کو دھو نہ ڈالا تو معلوم ہوا کہ بے حیا بھی ہے ۔ 'دافع ہذیان' 'سوالات' 'لطائف‌غیبی' تینوں نسخے ایک پارسل میں اس خط کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں ۔ یقینی ہے کہ بہ تقدیم و تاخیر ایک دو روز نظر انور سے گذریں گے'' (خط بہ نام منشی حبیب اللہ خاں)

''صاحب ! میں بعین عنایت الٰہی کثیر الاحباب ہوں۔ ایک دوست نے کلکتہ سے مجھے اطلاع دی ہے کہ مولوی احمد علی مدرس مدرسہ' کلکتہ نے ایک رسالہ لکھا ہے ۔ نام اس کا 'مؤید برہان' ہے ۔ اس رسالہ میں دفع کیے ہیں تیرے وہ اعتراض جو تو نے دکنی پر کیے ہیں اور تحریر پر کچھ اعتراضات وارد کیے ہیں اور اہل مدرسہ اور شعرائے کلکتہ نے تقریظیں اور تاریخیں بڑی دھوم سے لکھی ہیں ۔ بس بھائی ! میں نے اتنے علم پر ایک قطعہ لکھ کر چھپوایا اور کئی ورق اس دوست کو اور دو چار جلدیں 'درفش کاویانی' علاوہ اوراق مذکور بھیج دئے ۔ اسی زمانے میں تین چار ورق ، خوب یاد ہے کہ 'درفش' کی جلد میں رکھ کر تم کو بھیجے ہیں ۔ یا تو مجھ کو غلط یاد ہے یا تم نے 'درفش' کو کھول کر دیکھا نہیں ۔ وہ اوراق مع 'درفش' زینت طاق نسیاں ہیں ۔ وہ ورق اس لفافے میں مکرّر بھیجتا ہوں ۔ تم بھی دیکھو اور صاحب زادہ بھی دیکھے اور یہ جانے کہ فی الحال نظم فارسی یہی ہے اور بس[۲]۔''

(خط بہ نام منشی حبیب اللہ خاں)

''پیر و مرشد ! آداب ، غلط نامہ' 'قاطع برہان' کو بھیجے ہوئے تین اور آپ کی خیر و عافیت مولوی حافظ عزیزالدین کی زبانی سنے ہوئے دو دن ہوئے تھے کہ کل آپ کا نوازش نامہ پہنچا ۔ 'قاطع برہان' کے پہنچنے سے اطلاع پائی ۔ معتقدان 'برہان قاطع' برچھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور ہنوز دو اعتراض مجھ تک پہنچے ہیں ۔ ایک تو یہ کہ 'قاطع برہان' غلط ہے ، یعنی ترکیب خلاف قاعدہ ہے ۔

۱- غلام رسول مہر : خطوط غالب : صفحہ ۳۵۸

۲- ایضاً : صفحہ ۳۶۲ - ۳۶۳

کلام قطع کیا جاتا ہے ۔ برہان قطع نہیں ہو سکتی ہے ۔ لو صاحب ! 'برہان قاطع' صحیح اور 'قاطع برہان' غلط مگر برہان قطع کی فاعل ہو سکتی ہے اور قطع کا فعل آپ نہیں قبول کرتی ۔ 'قاطع برہان' میں جو برہان کا لفظ ہے ، یہ مخفف 'برہان قاطع' ہے ۔ 'برہان قاطع' کے رد کو قطع کر سمجھ 'قاطع برہان' نام رکھا گیا تو کیا گناہ ہوا؟ "[1]

(خط بہ نام انوار الدولہ شفق)

ظاہر ہے کہ اس قضیئے کی نوعیت علمی ، ادبی اور لسانی تھی غالب کو ان تینوں پہلوؤں سے گہرا لگاؤ تھا ، اس لگاؤ نے ان سے 'نامۂ غالب' لکھوائی ۔ ان کی یہ کتاب اگرچہ مختصر ہے لیکن اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس کو پڑھ کر اس ادبی بحث کی ایک تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے ۔

'نامۂ غالب' جیسا کہ اس سے قبل بھی لکھا جا چکا ہے ، مولوی رحیم بیگ کی کتاب 'ساطع برہان' کے جواب میں لکھی گئی ہے ۔ مولوی رحیم بیگ کا وطن تو دلی تھا لیکن ان کے والد مرزا پیر بیگ دلی کو چھوڑ کر سردھنہ میں آباد ہو گئے تھے ۔ مرزا رحیم بیگ کی ولادت سردھنہ میں ہوئی لیکن ان کی تعلیم و تربیت میرٹھ میں ہوئی ۔ حکیم بو علی سے انھوں نے مختلف علوم حاصل کیے ۔ شاعری کا شوق تھا ۔ مولوی مجد بخش نادان کے شاگرد ہوئے ۔ پہلے شرر تخلّص تھا ، بعد میں رحم تخلص اختیار کیا ۔ حکم احسن اللہ خاں کی فرمائش پر انھوں نے 'قصص الا انبیاء' کو نظم کا جامہ پہنایا تھا ۔ 'دعوت حاتم' کے نام سے ایک مثنوی کبھی لکھی تھی ۔ پیشہ معلمی تھا ، میرٹھ میں لڑکوں کو پڑھاتے تھے ۔ 'ساطع برہان' لکھ کر 'قاطع برہان' کے قضیئے میں انھوں نے بھی شرکت کی[2] ۔ غالب نے 'نامۂ غالب' میں تو ان کے متعلق سخت لہجہ اختیار نہیں کیا لیکن اپنے ایک اور خط میں ان کے متعلق خاصے سخت الفاظ استعمال کیے ہیں ۔ میاں داد خاں سیّاح کو ایک خط میں لکھتے ہیں :

"وہ جو ایک کتاب کا تم نے ذکر لکھا ہے ، وہ ایک لڑکے پڑھانے

۱- غلام رسول مہر : خطوط غالب : صفحہ ۳۶۵

۲- ایضاً صفحہ ۳۱۳

والے ملائے مکتب کا خبط ہے - رحیم بیگ اس کا نام ، میرٹھ کا رہنے والا ، کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے ۔ باوجود نا بینائی کے احمق بھی ہے - اس کی تحریر میں نے دیکھی - تم کو بھی بھیجوں گا - مگر ایک بڑے مزے کی بات یہ ہے کہ اس میں بیشتر وہ باتیں ہیں ، جن کو 'لطائف غیبی' میں رد کر چکے ہو - بہر حال اس کے جواب کی فکر نہ کرنا'' -

غالب کے اس لب و لہجہ سے صاف ظاہر ہے - کہ مرزا رحیم بیگ پر ان کو غصہ تھا اور وہ ان سے ناراض تھے - اس عبارت کے ایک ایک لفظ سے غصہ ٹپکتا ہے -

اگرچہ غالب کے خیال کے مطابق مرزا رحم بیگ کے اعتراضات کے جواب 'لطائف غیبی' میں دیے جا چکے تھے لیکن اس کے باوجود انھوں نے ان کی 'ساطع برہان' کے جواب میں 'نامہ' غالب' لکھا - لیکن اس میں اور 'لطائف غیبی' کے انداز اور لب و لہجہ میں زمین آسمان کا فرق ہے - 'لطائف غیبی' کے انداز میں سنجیدگی کم ہے بلکہ کہیں کہیں تو اس کی حدیں پھکڑ پن سے جا ملتی ہیں - لیکن 'نامہ غالب' کا انداز اور لب و لہجہ شروع سے آخر تک سنجیدہ ہے اور اس میں ایک عالمانہ شان پائی جاتی ہے - شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ 'لطائف غیبی' غالب کے ایک شاگرد کے نام سے شائع ہوئی ہے - اس میں انھیں غیر سنجیدہ لب و لہجہ اختیار کرنے کی پوری آزادی تھی - لیکن 'نامہ' غالب' چونکہ خود ان کے نام سے شائع ہوئی ، اس لیے ظاہر ہے کہ وہ اس میں غیر سنجیدہ لہجہ اختیار نہیں کر سکتے تھے - بعض لکھنے والوں کا خیال ہے کہ 'لطائف غیبی' غالب نے خود لکھ کر میاں داد خاں سیّاح کے نام سے چھپوائی تھی - ہو سکتا ہے اس میں پوری طرح صداقت نہ ہو - لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے اس میں خاصی دلچسپی لی تھی - بلکہ چھپنے سے قبل اس کو بہ غور دیکھا تھا اور چھپنے کے بعد بھی اس کی تصحیح کی تھی- میاں داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں:

''سعادت و اقبال نشان ، سیف الحق منشی میاں داد خاں سیاح کو فقیر غالب کی دعا پہنچے - خط میں آپ نے بہت سے مطالب لکھے مگر نیس کتابوں کے دو پارسلوں کی رسید نہیں لکھی - یہ ایک پارسل جو بعد دو پارسلوں کے بھیجا گیا ہے ، اس میں وہی 'لطائف غیبی'

ہے ، جس کو میں نے اپنے مطالعے میں رکھ کر صحیح کیا ہے ۔ اس کے بھیجنے سے یہ مدعا ہے کہ تم ان تیس رسالوں کو اس کے مطابق صحیح کر لو اور اگر چھوٹے صاحب نے رکھ لیا ہے تو ان سے مستعار لے کر اپنی سب کتابیں صحیح کر لو ، اور وہ نسخہ ان کی نذر کر دو ۔

صاحب ! میں نے اپنے صرف زر سے 'لطائف غیبی' کی جلدیں نہیں چھپوائیں ۔ مالک مطبع نے اپنی بکری کو چھاپیں ۔ بیس میں نے مول لیں، تیس تم کو دلوا دیں ۔ بیس بھائی ضیاء الدین نے لیں ۔ دس مصطفیٰ خاں صاحب نے لیں ۔ باقی کا حال مجھے معلوم نہیں'۔"

بہرحال 'لطائف غیبی' اگر غالب نے نہیں لکھی ، تو ان کے ایما پر ضرور لکھی گئی اور انھوں نے اس کی تیاری میں خاصا حصہ لیا ۔ اس کا انداز اور لب و لہجہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے صاف ظاہر ہے :

"اہل نظر 'قاطع' و 'محرق' کو جب باہم دیکھیں گے تو 'قاطع' کی عبارتیں موتی کی لڑیاں نظر آئیں گی۔ اور 'محرق' کی نثریں ماش کی بڑیاں نظر آئیں گی ۔ ہمارے منشی صاحب از روئے علم و فن منشی نہیں ہیں ۔ از روئے پیشہ و حرفت منشی ہیں ۔ جیسے منشی بھیروں ناتھ اور منشی گینڈامل ۔ اے صاحب فہم و انصاف ! عبارت 'محرق قاطع برہان' کو دیکھنا چاہیے ۔ غلط مبحث ، اطناب مہمل ، سوء ترکیب ، تباہی روز مرہ ، غلطی فہم ۔ اس سے مجھے کچھ کام نہیں ۔ خلا حامیان مفلوج الدین کی نثر اور کیسی ہوگی ۔ خالصاً للہ یہ بتاؤ کہ یہ مناظرہ ہے یا پھکڑ ۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہیجڑا تالیاں بجا بجا کر گالیاں دیتا ہے ۔ یا ایک سڑی کو کسی نے چھیڑ دیا ہے ۔ وہ نحش بک رہا ہے"۲

ظاہرا صاحب تپ محرق نے یہ بحث بحران کے دن لکھی ہے کہ بے تکلف و بے مبالغہ سراسر ہذیان ہے ۔ منشی جی خود نہ سمجھے ہوں گے کہ میں کیا بک رہا ہوں ۔ آیات و احادیث عبارت میں درج

۱- مہر : خطوط غالب : صفحہ ۳۳۹

۲- لطائف غیبی (علی گڑھ میگزین غالب نمبر) صفحہ ۱۲۴

کیے ہیں ۔ حالانکہ ان کے اندراج کا نہ موقع نہ محل ، نہ فائدہ ۔ معہذا عبارت بھونڈی ۔ روز مرہ فارسی نصیب اعدا ۔ روابط ایسے مفقود ، جیسے گدھے کےسر سے سینگ ۔ ایک فقرے کا مفہوم، دوسرے فقرے کے نقیض''۔

ظاہر ہے کہ اس انداز اور لب و لہجہ میں سنجیدگی نہیں ہے اور اس میں وہ خاص طرز بھی مفقود ہے، جو علمی مباحث کے لیےضروری ہوتا ہے ۔ اسی لیے 'لطائف غیبی' اپنے علمی نکات کے باوجود مجموعی طور پر علمی انداز سے عاری ہے ۔

'نامۂ غالب' اس کے برخلاف ہر لحاظ سے ایک عالمانہ تصنیف ہے اور اس میں شروع سے آخر تک ایک عالمانہ سنجیدگی کی لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے ۔ اس میں معاندانہ انداز نہیں ہے ۔ برخلاف اس کے دوستانہ انداز میں چند نکتوں کی وضاحت ہے ۔ چنانچہ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

بخدمت مشفقی مکرمی مرزا رحیم بیگ صاحب نور اللہ علیہ بالاسرار و عینہ بالانوار سخنے چند گفتہ می شود :

فسے در منطق پارسی و دری
ہمیں ہندیؔ سادہ و سرسری

جس طرح توحید میں نفی ماسوائے اللہ دستور ہے ، مجھ کو تحریر میں حذف زوائد منظور ہے ۔ عزم مقابلہ نہیں ، قصد مجادلہ نہیں ، سر تا سر دوستانہ حکایت ہے ۔ خاتمے میں ایک شکایت ہے ۔ شکوۂ درد مندانہ سیوہ ادب نہیں ۔ معہذا درد دل مراد ہے ۔ کوئی بات جواب طلب نہیں ۔ احسان مند ہوں آپ کا کہ آپ نے منشی سعادت علی کی طرح آدھا نام میرا نہ لکھا ۔ ان کے حسن ظن کے مطابق مجھ کو معشوق میرے استاد کا نہ لکھا ، اور اگر ایک جگہ یہ الفاظ کہ بہ قول غالب ، باکدام خرس در جوال شدہ ام ، بہم کیے ، یا اور چار جگہ کلمۂ توہین رقم کیے ، میں نے اپنے لطیف طبع اور حسن عقیدت سے پہلے فقرے کا مفہوم یوں اپنے دلنشین کیا کہ حضرت نے محمد حسین

۱- لطائف غیبی : علی گڑھ میگزین غالب نمبر : صفحہ ۱۲۶

دکنی جامع برہان کے موافق میرے قول کے خرس یقین کیا باد خرس در جوال شدن ، عبارت ہے صحبت سے ۔ خواہی مدافعت کے واسطے ہو خواہی محبت سے ۔ مجھ کو اس کا قرب بہ سبیل آویزش ہے ، تم کو اس کا قرب از روئے آمیزش ہے ۔ دوسرے فقرے کے یہ معنی ٹھہرائے بلکہ بے تکلف میرے ضمیر میں آئے کہ خرس کو مدد دینے سے کوفت حاصل ہوئی اور وہ کوفت باعث درد دل ہوئی ۔ شدید درد میں آدمی چیختا ہے ۔ چلاتا ہے ، ہائے وائے کرتا ہے ، غل مچاتا ہے ۔ جیسا کہ سعدی 'بوستاں' کی اس حکایت میں، جس کا پہلا مصرع یہ ہے : فرماتا ہے :

شبے زیت فکرت ہمی سو ختم
کہ ناچار فریاد خیزد ز درد'

اس عبارت میں تلخی نہیں ہے بلکہ شفقت کے ساتھ شائستگی کے انداز میں اپنی بات کہنے کی کوشش ہے ۔ یہاں غالب نے بڑے سلیقے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور بڑے منطقی انداز میں اپنے نظریات کی وضاحت کی ہے ۔

اس کے بعد غالب نے اس نقطے کو واضح کیا ہے کہ دینی معاملات اور ادبی و لسانی مسائل دونوں میں اختلاف ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیے ۔ بلکہ یہ اختلاف ہمیشہ ہوتا رہا ہے ۔ اس لیے اگر انھوں نے 'برہان قاطع' کی غلطیوں پر قلم اُٹھایا تو کون سا گناہ کیا ۔ اس خیال کی وضاحت غالب نے کیسے سیدھے لیکن دل کش انداز میں کی ہے ۔ لکھتے ہیں :

"جناب مرزا صاحب ! کیا تم نہیں جانتے ؟ بے شبہ جانتے ہو گے کہ اکابر امت کو امور دینی میں کیا کیا منازعتیں باہم واقع ہوئی ہیں کہ نوبت بہ تکفیر یک دگر پہنچی ہے ۔ اگر فن لغت میں ایک شخص دوسرے شخص کا معتقد نہ ہوا ۔ یہاں تک کہ اس کی تحقیق بھی کی تو اور مدعیان علم و عقل اس مسکین کے جگر تشنہ خوں کیوں ہو جائیں ۔ اور جب تک اس کا نقش ہستی صفحۂ دہر سے نہ مٹائیں ، آرام نہ پائیں ۔ ظلم تو یہ ہے کہ جو کچھ میں نے

۱۔ نامۂ غالب (پہلا ایڈیشن) : صفحہ ۱

'قاطع برہان' میں لکھا ، ہے نہ اُس کو سمجھتے ہیں اور جو کچھ آپ لکھتے ہیں، نہ اُس کے معنی سمجھتے ہیں۔ 'سوال دیگر جواب دیگر' پر مدار ہے - خارج از بحث اقوال کی تکرار ہے - 'برہان قاطع' والے کی محبت سے دل بےقرار ہے۔ فرط غیظ و غضب سے بدن رعشہ دار ہے - منشی سعادت علی نہ ناظم ہے ، نہ نثار ہے - بہ موجب اس مصرع کے :

مقتضائے طبیعتش ایں است

ناچار تم کو معرض تحریر میں تامّل چاہیے ، نہ سخن پروری و جانب داری میں توغل چاہیے - بہ حسب اختلاف طبائع مانو یا نہ مانو مگر پہلے یہ تو جانو کہ غالب سوختہ اختر کا فرہنگ نویسوں کے باب میں عقیدہ کیا ہے"؟[۱]

اور پھر فارسی کے فرہنگ نویسوں کے بارے میں اپنے خیالات کی وضاحت اس طرح کی ہے :

''اگرچہ 'قاطع برہان' میں جا بجا لکھتا آیا ہوں، مگر اب ہندی کی چندی کرکے لکھتا ہوں کہ یہ عقیدہ میرا ہے کہ فرہنگ لکھنے والے جتنے گزرے ہیں ، سب ہندی نژاد ہیں۔ ہاں علم صرف و نحو عربی میں بقدر تحصیل مسلّم اور استاد ہیں - علم صرف و نحو کی کتب درسی موجود ہیں، جس نے چاہا ، اُس نے استاد سے ان کتب کو پڑھ لیا ہے - فارسی کے جو فرہنگ ان حضرات نے لکھے ہیں ، مطالب مندرجہ کس اصول پر منضبط کیے ہیں اور اُس کا علم کس اُستاد سے حاصل کیا ہے؟ آخر مقاصد صرف و نحو عربی بھی تو صرف مطالعہ' کتب سے نہیں نکالے ہیں - پہلے تعلیم و تعلّم ہے ، پھر کتب قواعد کے جا بجا حوالے ہیں - قواعد فارسی کا رسالہ اہل زبان میں سے کس نے لکھا ہے اور ان ہوس پیشہ فرہنگ لکھنے والوں نے وہ رسالہ کس فاضل عجم سے پڑھا ہے -

شیدائے ہندی سیکروی نے حاجی محمد جان قدسی علیہ الرحمۃ کے ایک شعر پر اعتراض کیا ہے - مرزا جلا لائے طبا طبائی علیہ الرحمۃ

۱- نامہ' غالب (پہلا ایڈیشن) صفحہ ۲

نے شیدا کو خط لکھا ہے ۔ سر آغاز خط کا ایک قطعہ ، جس میں 'صحرا' و 'دریا' قافیہ اور برسانده' ردیف ہے ۔ شعر اخیر کا مصرع ثانی یاد رہ گیا ہے :

یعنی بہ مہا دیو مقوی برساند

خلاصہ مضمون خط یہ کہ تو صاحب زبان نہیں ہے ۔ زبان داں ہے ۔ یعنی مقلّد اور کاسہ لیس اہل ایران ہے۔ حاجی محمد جان کے کلام کو سند پکڑ ۔ تجھے کس نے کہا ہے کہ اُس سے لڑ ؟ کیا تو نے سنا نہیں جو عرفی اور فیضی میں گفتگو ہوئی ہے اور سو تمن الدولہ شیخ ابوالفضل کے رو برو ہوئی ہے ۔ لغات فارسی اور ترکیب الفاظ میر کلام تھا ۔ مولانا جمال الدین عرفی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اور نطق آشنا ہوا ہوں، اپنے گھر کی بڑھی بوڑھیوں سے لغت فارسی اور ترکیبیں سنتا رہا ہوں ۔ فیضیؔ بولا کہ جو کچھ تم نے اپنے گھر کی بڑھیوں سے سیکھا ہے ، وہ ہم نے خاقانی اور انوری سے اخذ کیا ہے ۔ حضرت عرفی نے فرمایا کہ 'تقصیر معاف ، خاقانی، انوری کا ماخذ بھی تو منطق گھر کی پیرزالوں کا ہے ۔ ہائے تمیز کہاں سے لاؤں کہ یہ حال قلرو ہند کے صاحب کمالوں کا ہے ۔ قیاس مع الفارق کی بہار دیکھو ۔ مجرّد تقدم زمانہ کا اعتبار دیکھو ۔ مانا کہ عرفی تحصیل علوم عربیہ میں اُن سے کم تر ہے ۔ صاحب زبان اور ایرانی ہونے میں برابر ہے ۔ کیا عرفی کیا انوری کیا خاقانی ، ایک شیرازی ، ایک خاوری ، ایک شروانی ۔ اگر مجھ سے کوئی کہے کہ غالب تیرا بھی مولد ہندوستان ہے ۔ میری طرف سے جواب یہ ہے کہ بندہ ہندی مولد اور پارسی زبان ہے :

ہر چہ از دستگہ پارس بہ یغما بردند
تابنالم ہم ازاں جملہ زبانم دردند

زبان دانی فارسی میری ازلی دستگاہ اور یہ عطیہ خاص منجانب اللہ ہے ۔ فارسی زبان کا ملکہ مجھ کو خدا نے دیا ہے ۔ مشق کا کمال میں نے استاد سے حاصل کیا ہے ۔ ہند کے شاعروں میں اچھے اچھے خوش گو اور معنی یاب ہیں ۔ لیکن یہ کون احمق کہے گا کہ یہ لوگ دعوائے زبان دانی کے باب ہیں ؟ رہے فرہنگ لکھنے والے ، خدا ان کے پیچ

سے نکالے۔ اشعار قدما آگے دھر لیے اور اپنے قیاس کے مطابق چل دیے۔ وہ بھی نہ کوئی ہم قدم ، نہ کوئی ہمراہ بلکہ سو بسو پراگندہ و تباہ ۔ رہنما ہو تو راہ بتائے ، استاد ہو تو شعر کے معنی سمجھائے ۔ نہ آپ شیرازی نہ استاذ اصفہانی ، زہے رگ گردن ، خہے دعوائے زبان دانی میرا یہ قول خاص ہے نہ عام ہے ۔ مجموع فرہنگ نگاروں کے محقق ہونے میں کلام ہے ۔ یہ کیا بات ہے کہ 'جامع برہان' کا ماخذ فرہنگ رشیدی و جہانگیری ہے ۔ عبدالرشید کی کیا شیخی اور میاں انجو کی کیا پیری ہے ؟ قطب شاہ و جہانگیر کے عہد میں ہونا اگر منشائے برتری ہے ، تو بے چارہ جعفر زٹلی بھی فرخ سیری ہے ۔''[1]

یہاں غالب نے مدلل اور منطقی انداز میں ادبی مباحث کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور اس میں عام طور پر مخاصمت جس صورت حال کو پیدا کرتی ہے ، اُس کا شکوہ کیا ہے ۔ اور اس طرح اپنے زمانے کے غیر صحت مندانہ رویے پر روشنی ڈالی ہے ۔ ان کے خیال میں 'قاطع برہان' میں انھوں نے جوکچھ لکھا ہے، اُس کو لوگ سمجھے نہیں اور بغیر سمجھے ہوئے صرف اس وجہ سے اُن پر اعتراضات کی بوچھار کرتے ہیں کہ انھیں 'برہان قاطع' کے مؤلف محمد حسین دکنی سے جذباتی لگاؤ ہے ۔ اس سلسلے میں انھوں نے فرہنگ نگاروں کے بارے میں جو اصولی باتیں کہی ہیں، وہ بڑی اہمیت رکھتی ہیں ۔ ان خیالات میں در اصل ایک شاعر اور ایک تخلیقی فن کار کی آواز صاف سنائی دیتی ہے ۔ غالب نے یہاں اپنا اور اپنی فارسی دانی کا ذکر بھی اختصار کے ساتھ کیا ہے لیکن اس میں تعلی نام کو نہیں ۔ بلکہ انھوں نے اس سلسلے میں جوکچھ کیا ہے ، وہ اظہار حقیقت ہے اور اس سے اُن کی باتوں میں وزن پیدا ہوتا ہے ۔

غالب فرہنگ نویسوں سے بعض بنیادی اختلافات رکھتے ہیں ۔ اس لیے انھوں نے اُن کو در خور اعتنا نہیں سمجھا ہے ۔ اُن کے محقق ہونے میں انھیں کلام ہے ۔ کیونکہ وہ اپنے قیاس کے مطابق چلتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ قیاس کو تحقیق کی بنیاد نہیں سمجھا جا سکتا ۔ خاص طور پر محمد حسین

۱۔ نامۂ غالب(پہلا ایڈیشن) : صفحہ ۲–۳

دکنی جامع 'برہان قاطع' کو مرزا رحیم بیگ اور دوسرے لکھنے والوں نے جن دلائل کو پیش کرکے ایک بلند پایہ فرہنگ نویس ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اس سے انھوں نے اختلاف کیا ہے۔

اس سلسلے میں آگے چل کر غالب نے فرہنگ نویسوں کے بارے میں ایک بڑے مزے کی بات کہی ہے۔ لکھتے ہیں :

"ایک لطیفہ لکھتا ہوں۔ اگر خفا نہ ہو جاؤ گے تو حظ اٹھاؤ گے۔ جتنی فرہنگیں اور فرہنگ طراز ہیں ، یہ سب کتابیں اور سب جامع مانند پیاز ہیں تو بتو اور لباس در لباس ، وہم در وہم اور قیاس در قیاس۔ پیاز کے چھلکے جس قدر اُتارتے جاؤ گے ، چھلکوں کا ڈھیر لگ جائے گا، مغز نہ پاؤ گے۔ فرہنگ لکھنے والوں کے پردے کھولتے جاؤ، لباس ہی لباس دیکھو گے، شخص معدوم۔ فرہنگوں کی ورق گردانی کرتے رہو ، ورق ہی ورق نظر آئیں گے ، معنی موہوم۔"[1]

اس لطیفے کا مقصد در اصل اس خیال کی وضاحت ہے کہ لغت لکھنے والوں کے پاس ایک عام خیال کے مطابق ذہن اور تخیل نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا بھی ہے تو وہ اُس سے کام نہیں لیتے، بلکہ لغت نویسی کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ اُس سے کام لے ہی نہیں سکتے۔ چنانچہ آگے چل کر اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں :

"ظرافت پر مدار تحقیق نہیں ہے۔ آپ کے خاطر نشین کرتا ہوں جو میرے دل نشین ہے۔ فرہنگ نویسوں کا قیاس، معنی لغات میں نہ سراسر غلط ہے۔ البتہ کمتر صحیح اور بیشتر غلط ہے۔ خصوصاً دکنی تو عجیب جانانہ ہے، لغو ہے ، پوچ ہے ، پاگل ہے ، دیوانہ ہے ، وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ یائے اصلی کیا ہے اور یائے زائد کیا۔ حیران ہوں کہ اُس کی جانب داری میں فائدہ کیا ہے؟ خدا جانتا ہے کہ میں یک رنگ ہوں۔ مگر دکنی کے جانب داروں میں چو رنگ ہوں۔ مجھے جو چاہو کہو۔ اوروں سے تم کیوں لڑتے ہو؟"[2]

۱۔ نامۂ غالب (پہلا ایڈیشن) : صفحہ ۴ - ۵

۲۔ ایضاً : صفحہ ۵

غالب نے یہاں اپنے مؤلف 'برہان قاطع' کے لیے سخت الفاظ ضرور استعمال کیے ہیں لیکن ایسا کرکے انھوں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کی لغت نویسی دوسرے لغت نویسوں کے مقابلے میں ادنیٰ درجے کی ہے اور وہ اُس کے اس انداز سے اختلاف رکھتے ہیں ۔ 'نامۂ غالب' میں صرف یہی ایک مقام ایسا ہے ، جہاں غالب اپنےحدود سے باہر نکل گئے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہیں غصہ آ گیا ہے ۔ آگے چل کر جہاں الفاظ کی بحث کی ہے اور 'برہان قاطع' کے مؤلف کی غلطیاں نکالی ہیں ، وہاں بھی کچھ اسی قسم کا لب و لہجہ پیدا ہوگیا ہے لیکن ۔ اس قسم کے مباحث میں اس صورت حال کا پیدا ہونا ایسا کچھ عجیب نہیں ۔

'نامۂ غالب' اس اعتبار سے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں غالب نے اپنی انانیت کے باوجود ایک جگہ اپنے سہو کا اعتراف کیا ہے اور اُن سے جو غلطیاں ہوئی ہیں ، اُن کو تسلیم کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

''سچ ہے غالب آگندہ گوش ہے ۔ کسی کی نہیں سنتا ۔ امی آپ کے مقرر کیے ہوئے قاعدے کے مطابق ، بہ حلف کہتا ہوں کہ تم نے 'قاطع برہان' و 'دافع ہذیان' و 'لطائف غیبی' کو ہرگز نہیں دیکھا 'آویزہ' و 'افسوس' کے بیان میں مجھ سے وہ سہو ہوا کہ مجھے اس کا اقرار اور میرا دوست میاں داد خاں شرمسار ہے، جوکچھ اس مصنّف نے اس باب میں لکھا، وہ قول فیصل اور کافی ہے ۔ مانیں یا نہ مانیں ناظرین کو اختیار ہے''[1]

اور اس سے بھی بڑی بات یہ کہ ان تمام اعتراضات اور گلے شکووں کے باوجود آخر میں دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے ۔ اور عشق و محبت ، جو اُن کا مسلک ہے ، اُس کی وضاحت کی ہے ۔ چنانچہ اپنی اس تصنیف کو ان جملوں پر ختم کیا ہے :

''میں اب قطع کلام کرتا ہوں اور آپ کو بہ کہال تعظیم سلام کرتا ہوں ۔ پیمبر کی تحقیر کو مسلّم رکھتے ہوئے ۔ تم جانو اور سید ابرار ۔ خاقانی پر بہتان کرتے ہو ۔ تم جانو اور وہ میدان معنی کا شہ سوار ۔

۱۔ نامۂ غالب (پہلا ایڈیشن) صفحہ ۵ ۔ ۶

مجھ کو جس قدر تم نے لکھا ہے یا کوئی اور لکھ رہا ہے ۔ اگرچہ وہ سب لغو اور جھوٹ ہے ، معقول اور راست نہیں ، لیکن واللہ مجھ کو عرصۂ محشر میں اُس کی باز خواست نہیں :

زیمن عشق بہ کونین صلح کل کردیم
تو خصم باش و زما دوستی تماشا کن¹

غرض 'نامۂ غالب' 'برہان قاطع' اور 'قاطع برہان' کے قضیئے سے متعلق غالب کی سب سے اہم تصنیف ہے ۔ اختصار کے باوجود یہ ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتی ہے ۔ غالب نے اس میں بعض اہم ادبی و لسانی مباحث کو چھیڑا ہے اور اس طرح ان موضوعات سے متعلق اپنے بعض بنیادی خیالات و نظریات کی وضاحت کی ہے ۔ اس کا انداز اور لب و لہجہ عالمانہ سنجیدگی کے ساتھ ہم آہنگ ہے ۔ لیکن اس کے باوجود غالب کی ذہانت اور ان کی شخصیت کی پہلو دار کیفیت نے اس میں جگہ جگہ وہ رنگ و آہنگ بھی پیدا کر دیا ہے ، جو ایک شمشیر جوہر دار میں ہوتا ہے ۔

۱- نامۂ غالب (پہلا ایڈیشن) : صفحہ ۱۶

غالب
کے
اہم نقاد

غالب اردو کے اہم شاعر تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے زمانے میں ان کی اہمیت کو صحیح طور پر محسوس نہیں کیا گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے فن کے لیے ایک نئی دنیا پیدا کرنا چاہتے تھے اور جو راستے انھوں نے اپنے لیے بنائے تھے، ان کی فضا اس زمانے کے افراد کے لیے نا مانوس تھی اور وہ اس کے ساتھ مطابقت پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ غالب کو ان کے زمانے میں سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی اور ان کی شاعری کی تحسین کا حق ادا نہیں کیا گیا۔ ان کے زمانے کے بعض تذکرہ نگاروں نے ان کی شاعری کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ان کی پہلو دار شاعری کو سمجھتے تھے بلکہ ان کی شاعری کے اس انداز کو اہمیت دیتے تھے۔ چنانچہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، اعظم الدولہ سرور، مرزا قادر بخش صابر اور آگے چل کر محمد حسین آزاد نے اپنے اپنے تذکروں میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچتی ہے کہ غالب کے فن نے اپنے ہم عصروں کے دلوں میں ایک جگہ بنا لی تھی اور وہ اس کی اندازہ دانی کے لیے ذہنی طور پر تیار تھے۔ ان تذکروں کا انداز ظاہر ہے کہ روایتی ہے۔ اس لیے ان میں غالب پر بھی جن تنقیدی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، وہ بھی اس خاص انداز میں کیا گیا ہے، جو تذکروں کے ساتھ مخصوص تھا۔ مجموعی طور پر ان تذکروں میں جو تنقیدی رائیں دی گئی ہیں، ان میں اختصار کے ساتھ اسی خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ غالب اپنے زمانے کے اہم شاعر تھے۔ ان کا کلام معنویت سے بھرپور تھا۔ وہ نئے نئے خیالات کو

اپنی شاعری میں پیش کرتے تھے اور ان کے پیش کرنے کا انداز بھی نیا تھا۔ ان کے ہاں تخیل کی فراوانی تھی اور وہ اس تخیل سے اپنی شاعری کو رنگین و پرکار بناتے تھے۔ فارسی شاعری کی روایت کے اثرات ان پر بڑے گہرے ہیں اور انھوں نے اس روایت سے بہت استفادہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تذکروں سے کسی تفصیل یا تجزیاتی انداز کی توقع نامناسب ہے کیوں کہ بہر حال یہ تذکرے ہیں ؛ تنقید کی کتابیں نہیں ہیں۔ پھر بھی ان میں سے شیفتہ کو غالب کا ایک اہم نقاد کہا جا سکتا ہے کیوں کہ انھوں نے اختصار کے ساتھ جو کچھ غالب کے بارے میں کہا ہے ، اس میں ان کے کلام کی مزاج دانی کا صحیح شعور اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ شیفتہ نے جو خیالات پیش کیے ہیں ، اُن کو باقاعدہ تنقید کے تحت نہیں رکھا جا سکتا۔

غالب کے متعلق با قاعدہ تنقید کا آغاز توحالی سے ہوتا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ غالب کے انتقال کے بعد، حالی نے جو مرثیہ لکھا ہے، اس میں بھی بعض اہم تنقیدی اشارے ملتے ہیں اور غالب کی شاعرانہ اور فن کارانہ شخصیت کی صحیح تصویر سامنے آتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ حالی کا یہ مرثیہ تو اُن کا ایک شعری کارنامہ ہے ، تنقیدی کارنامہ نہیں۔ حالی کا تنقیدی کارنامہ تو 'یاد گار غالب' ہے جس میں انھوں نے غالب کی زندگی اور شخصیت کی زندگی سے بھرپور اور بڑی ہی دلآویز تصویر کھینچی ہے اور ساتھ ہی ان کی شاعری اور نثر نگاری دونوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اس جائزے میں جو تنقیدی خیالات پیش کیے گئے ہیں، ان کی بنیاد گہرے تنقیدی شعور پر استوار ہے۔

حالی نے اس تنقیدی جائزے میں غالب کے ماحول اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ان کے فن کی اندازہ دانی کی ہے۔ حالی کی تنقید کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ غالب اپنے حالات کی پیداوار تھے۔ ان پر بعض شخصیتوں نے گہرا اثر ڈالا تھا۔ یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں ابتدائی زمانے میں فارسی کا اثر نمایاں ہوا اور مشکل پسندی ان کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت بن گئی۔ اس سلسلے میں حالی نے ملا عبدالصمد کا ذکر کیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ غالب نے ابتدا میں فارسی کے گہرے اثرات قبول کیے ہیں اور اس سلسلے میں عبدالصمد

کی شخصیت نے غالب پر نمایاں اثر ڈالا ہے۔ پھر حالات کے زیر اثر غالب نے اپنا راستہ الگ بنانے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں بھی فارسی کا سہارا لیا۔ ان سے قبل اردو شاعری کی روایت میں سادگی کو معیار تصور کیا جاتا تھا۔ غالب اس راستے سے ہٹے اور انہوں نے سادگی کی بجائے مشکل پسندی کو اپنا معیار بنا لیا۔ حالی نے غالب کے اس انداز کو کچھ پسند نہیں کیا، بلکہ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ ناموانست اور اجنبیت جو ان کے کلام میں ظاہر ہوئی، اس کو مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن پھر اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ "ان کے اس قسم کے اشعار کو مہمل کہو یا بے معنی لیکن اس میں شک نہیں کہ مرزا نے نہایت جانکاہی اور جگر کاوی سے سر انجام دیے ہوں گے" اس صورت حال کے عوامل اور محرکات کا ذکر کرتے ہوئے حالی نے اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ غالب کا بچپن اور عنفوان شباب کا زمانہ کچھ اس طرح گذرا کہ ان کے ہاں آزادی، جدت پسندی اور مطلق العنانی کے رجحانات پیدا ہو گئے اور اس کی جھلک ان کے فن میں بھی نمایاں ہوئی۔ حالی نے لکھا ہے:
"آغاز شباب میں جب سر پر کوئی مربی نہ ہو تو دولت و آسودگی کے سوا کوئی چیز خانہ برانداز نہیں ہو سکتی۔ مرزا کی نوجوانی کے ساتھ اس آسودگی نے وہ کام کیا، جو آگ بارود کے ساتھ کرتی ہے۔ جس آزادی اور مطلق العنانی میں مرزا کی جوانی گذری ہے، اس کی کیفیت کا خود انھیں کے الفاظ سے اندازہ ہو سکتا ہے۔" در اصل حالی اس قسم کے بیانات سے یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ غالب کی شخصیت کا یہ رنگ ان کی زندگی اور فن دونوں میں ہمیشہ کسی نہ کسی زاویے سے اثر انداز ہوتا رہا اور اس نے وقت کے ساتھ ساتھ مختلف صورتیں اختیار کیں۔ ان میں سے ایک صورت یہی مشکل پسندی، آزاد روی اور مطلق العنانی بھی تھی، جس کے زیر اثر انہوں نے ایک نیا راستہ بنانے کی کوشش کی اور اپنے فن کو اس پر گامزن کرنے کی ارادہ کیا۔

حالی نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ غالب کا یہ انداز اپنے زمانے میں اس وجہ سے مقبول نہ ہو سکا کہ اس وقت میر، سودا، درد، جرأت اور مصحفی وغیرہ کے شعری انداز کو عام طور پر پسند کیا جاتا تھا اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں سادگی اور سلاست تھی اور اسی

سلاست اور سادگی کو لوگ معیار تصور کرتے تھے ۔ اس لیے خیال اور فنی باریکی کی تہوں تک پہنچنا اُن کے لیے مشکل تھا ۔ ان حالات میں جب غالب نے اپنی نئی فکر کو نئی طرز میں پیش کیا تو یہ دونوں پہلو ایسے لوگوں کے لیے اجنبی اور نامانوس ثابت ہوا ۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے ابتدائی زمانے میں مقبولیت حاصل نہ کرسکے، لیکن حالی کے تنقیدی شعور نے غالب کے اس انداز میں جدت اور اپج کی جھلک دیکھی ہے ۔ لکھتے ہیں :

”مرزا کے ابتدائی کلام کو مہمل اور بے معنی کہو یا اس کو اردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو لیکن اس میں شک نہیں کہ اس سے ان کی اوریجنلٹی اور غیر معمولی اپج کا خاطر خواہ سراغ ملتا ہے اور یہ ان کی ٹیڑھی ترچھی چالیں ان کی بلند فطرتی اور غیر معمولی قابلیت و استعداد پر شہادت دیتی ہیں ۔ معمولی قابلیت و استعداد کی معراج یہ ہے کہ جس پگڈنڈی پر اگلی بھیڑوں کا گلا چلتا جاتا ہے ، اس پر آنکھیں بند کرکے گلے کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ لیکن لیک سے ادھر اُدھر آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا——برخلاف اس کے جن کی طبیعت میں اوریجنلٹی اور غیر معمولی اپج کا مادہ ہوتا ہے، وہ اپنے میں ایک ایسی چیز پاتے ہیں، جو اگلوں کی پیروی پر ان کو مجبور نہیں ہونے دیتی——مرزا کی طبیعت اسی قسم کی واقع ہوئی تھی ۔ وہ عام روش پر چلنے سے ہمیشہ ناک چڑھاتے تھے ۔“

حالی کی یہ بات تنقیدی اعتبار سے بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ غالب کی شخصیت کو سامنے رکھا جائے تو ان کی اس اپج اور جدت کی بہت سی مثالیں اس زندگی کے واقعات میں مل جاتی ہیں ۔ ان کی شخصیت کے اس پہلو کی جھلک ان کے فن میں بھی نظر آتی ہے ۔ حالی نے اس کا صحیح تجزیہ کیا ہے ۔

اس سلسلے میں حالی نے اپنے اُس تنقیدی نقطہٗ نظر کی وضاحت بھی کی ہے ، جس نے انھیں جدید شاعری کی تنقید کے ساتھ وابستہ کیا ہے ۔ ان کے خیال میں غالب نے یہ نئی روش اس وجہ سے بھی اختیار کی کہ پرانی روش میں اب ان لوگوں کے لیے کوئی ایسی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی ، جو نئی زندگی کی پیداوار تھے اور جن کے سامنے تاریخی حالات نے زندگی کے نئے امکانات کے چراغ روشن کر دیے تھے ۔ حالی لکھتے ہیں :

"جب میر و سودا اور ان کے متبعین کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اُکتا جاتا ہے اور اس کے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں ہمیں ایک دوسرا آدمی دکھائی دیتا ہے اور جس طرح کہ ایک خشکی کے سیاح سمندر میں یا ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جا کر ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے، اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے۔" اس کیفیت کو حالی نے کلام غالب کے مختلف مضامین اور ان کے پیش کرنے کے انداز میں دیکھا ہے اور مثالیں دے کر ان کی وضاحت کی ہے۔ غالب نے اخلاق معاملات، انسانی فطرت، انسان کی بڑائی، عشق و عاشقی اور تصوف وغیرہ پر جو اشعار کہے ہیں، ان کو سامنے رکھ کر حالی اپنے اس تنقیدی خیال کو صحیح ثابت کرتے ہیں۔

حالی کے خیال میں غالب کے کلام کی دوسری اہم خصوصیت وہ ہے جس کو ہم آج کی تنقیدی اصطلاح میں رمزیت، ایمائیت یا لطیف ابہام کہتے ہیں اور جس کو موجودہ دور میں بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ حالی کے تنقیدی شعور نے غالب کی شاعری کے اس پہلو کو اس طرح واضح کیا ہے کہ ان کی شاعری کے انداز کی صحیح کیفیت آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ اس سلسلے میں حالی لکھتے ہیں: "مرزا نے استعارہ و کنایہ اور تلمیح و تشبیہ کی طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ ریختے میں بھی نسبتاً اپنے فارسی کلام سے کم استعمال نہیں کیا اور شعراء نے استعارے کو صرف محاورات اردو میں بلا شبہ استعمال کیا ہے، لیکن استعارے کی قصد سے نہیں بلکہ محاورہ بندی کے شوق میں استعارے بلا قصد ان کے قلم سے ٹپک پڑے۔" اور پھر حالی نے اپنے اس تنقیدی خیال کو بہت سی مثالوں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

غالب کے کلام کی تیسری خصوصیت حالی کی نظر میں شوخی اور ظرافت ہے۔ یہ شوخی اور ظرافت واقعی غالب کی غزل کی بہت نمایاں خصوصیت ہے۔ اس کی وجہ سے اُن کے کلام میں چاندنی کی مسکراہٹ کا سا سماں نظر آتا ہے اور شگفتگی اور شادابی کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اگرچہ یہ صورت حال تغزل کی صحیح کیفیت کے منافی ہے۔ کیوں کہ عام طور پر اردو غزل کی روایت میں المیہ اور حزنیہ انداز کو

تغزل کے لیے ضروری قرار دیا جاتا ہے ، لیکن غالب نے اس روایت سے انحراف کیا اور اپنی شوخی اور ظرافت سے اس میں نئی زندگی پیدا کی ۔ حالی لکھتے ہیں ''کیا نظم میں اور کیا نثر میں باوجود سنجیدگی و متانت کے شوخی و ظرافت ہے جس سے غالب کا کلام پہچانا جاتا ہے ۔'' حالی نے اس پر تفصیلی بحث نہیں کی ۔ صرف اس کی طرف اشارہ کیا ہے ۔

حالی نے غالب کے کلام کی چوتھی خصوصیت کے تحت اس بات کو واضح کیا ہے کہ غالب کے کلام میں تہہ در تہہ معنویت موجود ہے اور وہ اشاروں اور کنایوں میں انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بڑی ہی بلیغ باتیں کرتے ہیں ۔ بظاہر اس میں ایک معنویت نظر آتی ہے ، لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو اس کی تہہ میں معنویت کا دوسرا پہلو بھی نظر آتا ہے ۔ حالی نے اس کو مابہ الامتیاز کہا ہے اور لکھا ہے کہ ''ان کے اکثر اشعار کا بیان پہلو دار ہے اور بادی النظر میں اس سے کچھ اور معنی واضح ہوتے ہیں لیکن غور کرنے کے بعد اس میں ایک دوسرے معنی انتہائی لطیف پیدا ہوتے ہیں، جن سے وہ لوگ جو ظاہری معنوں پر کفایت کر لیتے ہیں ، لطف نہیں اٹھاتے'' حالی کا یہ تنقیدی خیال اپنی جگہ بالکل درست ہے اور انھوں نے غالب کے کلام سے جو مثالیں اس خیال کو واضح کرنے کے لیے پیش کی ہیں، وہ ان کے تنقیدی خیال کو پوری طرح واضح کر دیتی ہیں۔ پھر حالی نے فارسی شاعری کی روایت کو سامنے رکھ کر غالب کی شاعری کے ایسے پہلوؤں کا پوری طرح تجزیہ کیا ہے ۔ اس تجزیے سے کلام غالب کے بہت سے نئے پہلو آنکھوں کے سامنے آتے ہیں ۔

اس میں شبہ نہیں کہ حالی کی تنقید غالب کا انداز بڑی حد تک تشریحی ہے اور انھوں نے مختلف تنقیدی خیالات کے تحت غالب کے اشعار کا مطلب اس طرح لکھا ہے کہ اس میں کلام غالب کی تشریح کا سا انداز پیدا ہو جاتا ہے ۔ لیکن حالی ایسا کرنے کے لیے مجبور تھے ۔ کیوں کہ تنقید لکھتے وقت ان کے پیش نظر یہ خیال تھا کہ غالب کے اس کلام کو جو رمز و ایما کا حامل ، پہلو دار اور کسی حد تک مبہم ہے، اس کی توضیح و تشریح کی جائے تاکہ اس کے شعری محاسن پوری طرح واضح ہو سکیں ۔ حالی اس میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں اور انھوں نے اس تشریح و توضیح

کے پردے میں غالب کے متعلق جو تنقیدی باتیں کہی ہیں ، وہ اپنے اندر گہرائی رکھتی ہیں ۔

حالی کی انداز اور تنقید ، اس اعتبار سے نئی ہے کہ اس میں کلام غالب کے بعض ایسے پہلوؤں کا سراغ لگایا گیا ہے، جو ان کے فن میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔ حالی نے شخصی اور اجتماعی حالات کو عوامل و محرکات قرار دے کر، غالب کی شاعری کے ان پہلوؤں کی وضاحت کی ہے ۔ اسی لیے ان کے اس انداز تنقید میں گہرائی کا احساس ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ غالب کے کلام پر ان کی تنقید آج بھی اہمیت رکھتی ہے ۔

حالی کے بعد اردو تنقید میں ایک رومانی رجحان کی ابتدا ہوتی ہے ۔ دراصل یہ رومانی رجحان سرسید کی اُس ادبی تحریک کا رد عمل تھا، جس میں افادیت کو خاص طور پر اہمیت دی گئی تھی ۔ حالی اس افادی رجحان کی ترجمانی کرتے ہیں ۔ اسی لیے جو تنقید انھوں نے غالب کے کلام پر کی ہے، اس میں بھی جگہ جگہ اس افادی رجحان کی جھلکیاں نظر آتی ہیں ۔ لیکن ان کے بعد غالب کی تنقید میں بعض ایسے لوگ بھی سامنے آتے ہیں، جو اُس رومانی رجحان کے تحت غالب کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہیں ، جو اس افادی رجحان کے رد عمل کے طور پر پیدا ہوا تھا ۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اس رجحان کے سب سے بڑے علم بردار ہیں اور ان کی کتاب 'محاسن کلام غالب' ان کے اس تنقیدی نقطۂ نظر کی صحیح طور پر عکاسی کرتی ہے ۔ بجنوری نے اپنے اس تنقیدی مطالعے کا آغاز ہی اس طرح کیا ہے :

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ، مقدس وید اور دیوان غالب ۔ لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے، جو یہاں حاضر نہیں ۔ کون سا نغمہ ہے، جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا پوشیدہ نہیں ہے ؟" ان چند جملوں سے ان کی اس کتاب کا مجموعی انداز پوری طرح نمایاں ہوجاتا ہے ۔ آگے چل کر انھوں نے اس کتاب میں اس خیال کی تفسیر پیش کی ہے اور مختلف زاویوں سے کلام غالب کی اہمیت کا اندازہ لگایا ہے ۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :"غالب نے بزم ہستی میں جو فانوس خیال روشن کیا ہے، کون سا پیکر تصویر ہے ، جو اس کاغذی پیرہن پر منازل زیست قطع کرتا ہوا نظر

نہیں آتا ؟" بجنوری در حقیقت اس کتاب میں یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ غالب کا کلام انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے اور اس کی بے شمار چھپی ہوئی حقیقتوں کی نقاب کشائی اس کا خاص میدان ہے ۔ اس سلسلے میں انہوں نے غالب کا مقابلہ الہانوی شاعر گویٹے سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ "دنیا میں اگر کسی شاعر سے غالب کا مقابلہ ہو سکتا ہے ، تو وہ شعراء الہانیہ کا سرتاج گویٹے ہے ۔ غالب اور گویٹے دونوں کی حیثیت انسانی تصوّر کی آخری حدود کا پتہ دیتی ہے ۔ شاعری کا دونوں پر خاتمہ ہو گیا ہے ۔ عمیق اور جدید خیالات ، حقیقت اور مجاز ، قدرت اور حیات کی کثرت ، ان کے دماغوں میں وحدت میں منتقل ہو کر وجود پاتی ہے ۔ دونوں اقلیم سخن کے شہنشاہ ہیں ۔ تہذیب ، تمدن ، تعلیم و تربیت ، فطرت کوئی زندگی کا ایسا پہلو نہیں ، جس پر دونوں کا اثر نہیں پڑا ہو ۔" بجنوری نے ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر غالب کی شخصیت اور شاعری کا بہت اچھا جائزہ لیا ہے ۔ اس جائزے میں زیادہ زور اس بات پر ہے کہ غالب زندگی کے شاعر ہیں اور انہوں نے اس کے مختلف پہلوؤں پر بڑی ہی فکری گہرائی اور جمالیاتی نزاکت کے ساتھ روشنی ڈالی ہیں ۔ بجنوری کا مزاج خود بھی فلسفیانہ تھا اسی لیے غالب کی شاعری کے فلسفیانہ پہلوؤں پر ان کی نظر بہت گہری پڑی ۔ اور ان کا یہ تنقیدی جائزہ در حقیقت کلام غالب کی ایک فلسفیانہ تحلیل ہے ۔ اس سلسلے میں انہوں نے گویٹے کے علاوہ بعض دوسرے مغربی شاعروں اور مفکروں سے ان کا مقابلہ اور موازنہ کیا ہے ۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ : "غالب کا فلسفہ سپنوزا ، ہیگل ، برکلے اور نٹشے سے ملتا ہے ۔" ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ :"مرزا غالب کا فلسفہ" حیات ابن رشد سے مساوی ہے ۔ اندلسی فلسفی نے بیان کیا ہے کہ مادہ ہمیشہ ہیولا کا محتاج ہے ۔ بے صورت مادے کا تصور نا ممکن ہے ۔" غالب کے ہاں بھی انہوں نے یہی صورت دیکھی ہے ۔ اس کے علاوہ ڈارون ، برگسان ، ہیگل ، کانٹ اور بعض دوسرے مغربی فلسفیوں سے بھی انہوں نے غالب کے فلسفے کا مقابلہ کیا ہے ۔ ان کے تنقیدی مطالعے کا یہ حصّہ ، جس میں ان فلسفیوں سے غالب کا مقابلہ کیا گیا ہے ، بڑی اہمیت رکھتا ہے ۔ کیوں کہ ان میں وہ معلومات کا خزانہ ہی فراہم نہیں کرتے ، اس معلومات کو غالب کے فکر و فلسفہ کے ساتھ اس طرح ملاتے ہیں کہ اس کے صحیح خد و خال آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں ۔ یہی بجنوری کا سب سے بڑا تنقیدی کارنامہ ہے ۔

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے غالب کی شاعری کے انسانی اور تہذیبی پہلوؤں پر خاص طور پر توجہ کی ہے اور ایسی قدروں کو ان کی شاعری میں تلاش کیا ہے، جو فرد و معاشرہ دونوں کے لیے خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتی ہیں - ان پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے غالب کے تصّوف کو خاص طور پر اپنے پیش نظر رکھا ہے، اس کا بڑا ہی عالمانہ تجزیہ کیا ہے اور یہ نتائج نکالے ہیں کہ غالب کے تصوف سے دلچسپی در حقیقت انسانی زندگی کو سمجھنے اور اس کو برتنے اور بسر کرنے کے ساتھ تعلق رکھتی ہے - یہاں بھی بجنوری نے غالب کو ایک فلسفی ثابت کیا ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ غالب ایک صوفی صافی سے کہیں زیادہ تصوف کے فلسفی ہیں - بجنوری لکھتے ہیں: ''خالق غالب کے دل کا ایک آئینہ ہے، جس میں مظہر الٰہی اور مناظر قدرت کا جلوہ موجود ہے۔ اس کی زبان ترجمان حقیقت ہے۔ اس کے پرکار تخیّل کا دائرہ امکان سے ہم کنار ہے - عالم کون و فساد میں ایک ذرے کی جنبش بھی، اس کے حلقۂ غور سے باہر ہے - غالب فلسفی ہیں، جو شاعری کا جامہ زیب تن کیے ہوئے ہیں۔'' بجنوری نے اس سلسلے میں وحدت الوجود کے تصور پر بڑی دلچسپ بحث کی ہے۔

غالب کی انسان دوستی پر بھی بجنوری نے ایک نئے زاویے سے روشنی ڈالی ہے - وہ لکھتے ہیں: ''مرزا غالب کی عبادت گاہ عرش و کرسی کے سائے میں ہے - وہ تسبیح جس پر وہ اسمائے الٰہی کا وظیفہ پڑھتے ہیں، صد ہزار دانہ ہے اور وہ دانے اجرام فلکی اور اجسام ساوی ہیں - کعبہ اور تیغ کلیسا اور کیش اس رفیع بارگاہ سے یکساں نظر آتی ہیں - جہاں عوام و خواص کا مذہب منتہی ہو جاتا ہے، مرزا کے مذہب کا آغاز ہوتا ہے -'' اس کا مطلب یہی ہے کہ بجنوری نے غالب کے ہاں انسانیت کی آواز سنی ہے اور مختلف عقائد نے انسانوں کے ذہنوں میں جو گھروندے بنا رکھے ہیں اور جن کی آوز سے اختلافات کا بیج بویا گیا ہے، اس کو صحیح طور پر محسوس کیا ہے اور اس کی روشنی میں غالب کے کلام کی تنقید کی ہے -

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، بجنوری کا مزاج رومانیت پسندی کی طرف مائل ہے - اس رومانیت پسندی نے غالب کی شاعری اور شخصیت کے بعض نئے گوشے ان کی آنکھوں کے سامنے بے نقاب کیے ہیں۔ کیونکہ غالب خود

ایک رومانی مزاج شاعر ہیں اور ان کو سمجھنے کے لیے ایک رومانی مزاج نقاد کی ضرورت ہے ۔ بجنوری کا تخیل کلام غالب کے بعض بالکل نئے پہلوؤں تک پہنچا ہے اور اس نے بعض ایسے نکتوں تک رسائی حاصل کی ہے جن تک کسی اور کا پہنچنا مشکل ہے ۔ مثلاً ایک پتے کی بات بجنوری نے غالب کے بارے میں یہ کہی ہے کہ غالب کو مناظر فطرت سے کہیں زیادہ شہروں کے پر شور کیفیت اور اس کی رنگا رنگی سے دلچسپی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں : ''غالب کے مشاہدات کنار دریا ، دامن کوہ ، لب جو سے بہت کم متعلق ہیں ۔ مرزا کا جی لب دریا ، خاموش مرغزاروں سے زیادہ شہروں کے پرشور کوچوں میں لگتا ہے ۔ جہاں زندگی شعاع منتشر کی طرح ہفت رنگ جلوہ دکھاتی ہے ۔'' یہ ایک اہم تنقیدی نکتہ ہے کیونکہ غالب کی ساری شاعری تہذیب و تمدن کی ان رنگینیوں اور تابانیوں کی ترجمانی کرتی ہے ، جس کو وہ عزیز رکھتے ہیں ۔ ان کی دنیا بڑی حد تک ایک تہذیبی روایت تک محدود معلوم ہوتی ہے ۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس دائرے سے باہر نکل کر زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر نظر نہیں ڈالتے ، ایسا نہیں ہے ۔ اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو اسی زاویے سے دیکھتے ہیں اور یہی ان کا معیار ہے ۔ در اصل بجنوری یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ ایک تہذیبی روایت کی پیداوار تھے اور یہ تہذیبی روایت شہر کے ایوانوں اور شبستانوں ہی میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے ۔ غالب نے اس کی صحیح مصوری کی ہے ۔ بجنوری کا تنقیدی نقطۂ نظر غالب کی شاعری کے جمالیاتی پہلوؤں کی طرف بھی جاتی ہے اور وہ اس کی تصویرکاری ، کلام کی پہلو دار کیفیت ، الفاظ کی حسین تراش اور رمز و ایما کی خصوصیت کا بھی تنقیدی جائزہ لیتے ہیں ۔ بجنوری نے اس سلسلے میں غالب کے تخیل کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور ان تمام پہلوؤں کو اس تخیل کے تابع بتایا ہے ۔

ظاہر ہے کہ بجنوری کی تنقیدی نظر کلام غالب کے تمام پہلوؤں پر پڑتی ہے اور وہ اس کا صحیح جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں ۔ ان کی تنقید میں ایک عالمانہ انداز ہے لیکن اس عالمانہ انداز کے ساتھ ایک تاثراتی رنگ و آہنگ بھی اس میں نمایاں نظر آتا ہے ۔ ان سے کسی مربوط قسم کے تجزیے کی توقع نہیں کی جا سکتی ۔ اس وجہ سے کہ وہ طبیعت کے اعتبار

سے ایک رومانی مزاج نقاد ہیں ۔ لیکن تخیّل کے توسط سے حقائق تک رسائی ان کا اہم تنقیدی کارنامہ ہے ۔ اور اس اعتبار سے ان کا تنقیدی جائزہ تاثراتی اور رومانی ہونے کے باوجود اپنے اندر گہرائی رکھتا ہے ۔

حالی اور بجنوری نے غالب کے تنقیدی مطالعے کا ایک ماحول پیدا کر دیا ، جس کے نتیجے میں غالب کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کی ایک فضا پیدا ہوئی ۔ حالی اور بجنوری نے غالب کی تنقیدیں تحسین اور تعارف کے پہلو کو خاص طور پر اپنے پیش نظر رکھا تھا اور غالباً یہ اس صورت حال کا فطری ردعمل تھا جو غالب کو اپنے زمانے میں پیش آئی تھی ۔ یعنی غالب کے تنقیدی مطالعے کی طرف جیسی توجہ ہونی چاہیے تھی ، وہ ان کے زمانے میں نہیں کی گئی تھی ۔ اس خلاء کو حالی اور بجنوری نے پر کیا ۔ اور ان کی پہلودار شخصیت اور وسیع اور ہمہ گیر شاعری کا جائزہ لیا ۔ اس مقصد سے کہ ان کی پہلودار شخصیت اور شاعری کی اہمیت کا اندازہ ہو ۔

لیکن حالی اور بجنوری نے جس انداز میں غالب کی شخصیت اور شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا ، اس کا ردعمل بھی ہوا اور بعض مغربی تعلیم یافتہ ایسے بھی سامنے آئے جنھوں نے مغربی اصول تنقید کی روشنی میں ان کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس ردعمل میں مغرب کی بڑائی اور برتری کا وہ احساس یقیناً موجود تھا ، جو ایک زمانے میں ہماری زندگی میں داخل ہو گیا تھا ۔ خود حالی اور خاص طور پر بجنوری کے ہاں اس کے اثرات ملتے ہیں ۔ لیکن بجنوری نے مغرب کو سامنے رکھ کر غالب کی عظمت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ان کے بعد ڈاکٹر عبداللطیف نے غالب کا جو مطالعہ پیش کیا ہے ، اس میں سختی سے مغربی تنقید کے اصولوں کو سامنے رکھ کر غالب کی شخصیت اور شاعری کا جائزہ لیا ہے اور تعریف و تحسین کی بجائے ان کی شخصیت اور شاعری کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی تنقید میں کہیں کہیں تھوڑی سی انتہا پسندی بھی پیدا ہوجاتی ہے اور غالب کا تنقیدی جائزہ پوری طرح مکمل نہیں ہو پاتا ۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ڈاکٹر عبداللطیف نے جو مختصر سی کتاب غالب کے بارے میں لکھی ہے ، وہ ان کی دقت نظر پر دلالت

کرتی ہے اور اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شعر و شاعری کو سمجھنے کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور اس کے بنیادی اصولوں کو سامنے رکھ کر اپنے شاعروں کا جائزہ لینے کی صلاحیت ان کے اندر بدرجۂ اتم موجود ہے ۔

ڈاکٹر لطیف نے اپنی کتاب "غالب" میں حالی اور بجنوری کی تنقید کا ذکر کر کے ، غالب کے مطالعے کی طرف توجہ کی اور کلامِ غالب اور اس کے تاریخی پس منظر ، غالب کے مطالعے کے بنیادی مسائل ، غالب کا نظریۂ حیات ، غالب کی شاعرانہ عظمت اور غالب کی شاعری کے ایسے اہم موضوعات پر بہت اچھی بحث کی ہے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ کہیں کہیں ان کا لہجہ سخت ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں غالب کی بعض خوبیاں پوری طرح واضح نہیں ہوتیں ۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اس لہجے کی وجہ سے غالب کی شاعری کے وہ پہلو جو درحقیقت ان کو اہم بنانے ہیں ، وہ پس منظر میں جا پڑتے ہیں ۔ مثلاً ڈاکٹر لطیف کا بنیادی خیال یہ ہے کہ غالب کی شاعری میں احساس اور جذبے سے زیادہ ذہن اور شعور ملتا ہے ۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے لیکن جس طرح انھوں نے اس موضوع پر بحث کی ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذہن و شعور شاید شاعری کے لیے ضروری نہیں ۔ غالب اُن کے نزدیک اسی وجہ سے اہم شاعری نہیں ہیں کہ انھوں نے غیر ضروری چیزوں کو اپنی شاعری کی بنیاد بنایا ۔ لیکن ڈاکٹر لطیف اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ شاعری ذہن و شعور ہی سے عظیم بنتی ہے ۔ غالب کا کمال یہی ہے کہ انھوں نے اس ذہن و شعور کو اپنے ان تجربات کے سانچے میں ڈھالا ہے، جو صحیح شاعری کے لیے ضروری ہوتے ہیں ۔ غالب کے ہاں فکری پہلو نمایاں ہے اور وہ انسانی زندگی کے بنیادی معاملات و مسائل کو فکری زاویۂ نظر سے اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں ۔ انسان ، اس کے مختلف جذبات ، حیات و کائنات اور اس کا پورا نظام ان کی شاعری کے خاص موضوعات ہیں ۔ ان سب کو پیش کرنے میں ان کے ہاں فکری اور فلسفیانہ پہلو یقیناً غالب ہیں لیکن یہ تمام موضوعات غالب کے ہاں ان کے شاعرانہ تجربے کا جزو معلوم ہوتے ہیں ، اور اسی میں ان کی بڑائی ہے ۔

ڈاکٹر لطیف نے غالب کی نجی زندگی ، ان کے معاشرتی اور تہذیبی

ماحول ، اس زمانے کے مختلف واقعات و حادثات کو خاص طور پر اپنے پیش نظر رکھا ہے ۔ اس طرح ان کا یہ تنقیدی جائزہ سماجی اور عمرانی حیثیت اختیار کر لیتا ہے ۔ لیکن ان کی طبیعت کی انتہا پسندی ، ان کے اس جائزے کو پوری طرح سماجی اور عمرانی تنقید کا اچھا نمونہ نہیں بناتی ۔

کلام غالب کو ڈاکٹر لطیف نے تین حصوں میں تقسیم کر کے دیکھا ہے ۔ ایک تو ان کے کلام کا وہ حصہ ہے، جو ان کے خیال میں ذہنی مشق کا نتیجہ ہے اور جس میں وہی بلند پروازیاں ہیں جو غزل گو شاعروں کے ہاں عام طور پر پائی جاتی ہیں ۔ دوسرا وہ حصہ ہے، جن میں بیشتر اشعار غالب کے احساسات کے ترجمان ہیں ، لیکن جو ڈاکٹر عبداللطیف کے خیال میں شاعر کے ذہن کے لیے نیم محسوس تھے۔ ان اشعار میں غالب کا مخصوص نظریۂ حیات نظر آتا ہے ۔ لیکن یہاں بھی ڈاکٹر لطیف نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ وہ روایتی الفاظ اور ترکیبوں کے پردے میں اپنے خیالات و نظریات کی وضاحت کرتے ہیں ۔ تیسرے حصے میں ایسے اشعار ہیں ، جن میں شاعر کے تجربے مکمل ہیں اور وہ پوری طرح محسوس کرکے بعض موضوعات کو پیش کرتے ہیں ۔ اس تیسرے حصے میں صنعت گری نہیں ہے اور اس میں گہرے شخصی اثرات کا رنگ و آہنگ نظر آتا ہے ۔

ڈاکٹر لطیف نے غالب کے کلام کے ان تینوں پہلوؤں کو تنقیدی عمل کے سلسلے میں اپنے پیش نظر رکھا ہے ۔ اس کے بعد ڈاکٹر لطیف نے غالب کی شاعری کے فلسفیانہ پہلو پر بحث کی ہے اور بعض الفاظ کو نقل کرکے ایک ایسے لہجے میں تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے کہ اس سے خود ان کے بنیادی خیال کی نفی ہو جاتی ہے۔ اور وہ بنیادی خیال یہ ہے کہ غالب کی شاعری میں ذہن و شعور ملتا ہے اور فلسفیانہ رنگ و آہنگ ان کے ہاں بہت نمایاں ہے ۔ مثلاً ان کا یہ لہجہ ''ذیل کے اشعار بہت سے معصوم دماغوں میں ہیجان پیدا کرتے ہیں ۔ پھر ایک شور اٹھے گا کہ یہاں نہ صرف فلسفہ بلکہ ایک عظیم فلسفہ موجود ہے ، جو فلسفے کی تاریخ میں اب تک کسی پر روشن نہیں ہوا تھا ۔ لیکن کیا واقعی ان اشعار میں فلسفہ یا کوئی نئی چیز ہے یا پھر ان کا یہ فکر بتلایئے اس شعر میں کون سا فلسفہ ہے'' یا پھر یہ انداز کہ ''کیا اس میں کوئی نئی بات پائی جاتی ہے؟'' حالانکہ جن اشعار کو سامنے

رکھ کر انھوں نے اس قسم کے فقرے لکھے ہیں ان میں گہرے فلسفیانہ نکتے موجود ہیں۔ مثلاً یہ اشعار :

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

منظر ایک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

ڈاکٹر لطیف کا خیال یہ ہے کہ غالب کو وہ ہم آہنگی کبھی حاصل نہیں ہوئی ، جو شاعرانہ تجربے کی بنیاد ہے اور جو عظیم شاعر کے لیے ضروری ہے ۔ انھوں نے بعض مثالوں کو سامنے رکھ کر اس پر بحث کی ہے ۔ لیکن ان کے ان خیالات سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا ۔ کیونکہ ان کے اندر تضاد ہے ۔ ایک طرف تو وہ غالب کو ذہن و شعور کا شاعر کہتے ہیں اور یہ لکھتے ہیں کہ غالب نے عظمت کبھی حاصل نہیں کی ۔ اس کے لیے خود غالب ہی مورد الزام ہے ۔ عظمت اس میں موجود تھی لیکن اس نے اپنی خود سری اور زندگی کے تنگ زاویۂ نظر سے اس عظمت کو کچل ڈالا ۔ اس کی بے اطمینانی خود اس بات کی مظہر ہے کہ وہ دنیا کو سمجھنے ، زندگی کو برتنے اور کائنات کی محدود چیزوں کو تاڑنے کی قابلیت نہیں رکھتا تھا" ۔ ان خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور غالب کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ایسی باتیں کہی جاسکتی ہیں ، جن سے غالب کی عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور جن سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ وہ زندگی کو سمجھنے اور کائنات کو دیکھنے کا گہرا شعور رکھتے تھے ۔ اور یہ کہ انھوں نے اپنے آپ کو صرف اپنی ذات تک محدود نہیں کیا تھا بلکہ اپنے آپ سے باہر نکل کر زندگی اور کائنات کے مختلف مظاہر کو دیکھنے کی کوشش بھی کی ہے ۔ ڈاکٹر لطیف

نے یہ نتیجہ نکالا بھی ہے کہ غالب نے ایک منتشر زاویے کے سائے میں منتشر زندگی بسر کی اور ہمارے لیے ایسی شاعری چھوڑی ، جو خود ہم آہنگی سے معرا ہے جس کا شمار مشاہیر عالم میں نہیں ہو سکتا ۔ اس خیال کو خود وقت نے غلط ثابت کر دیا ہے ۔ غالب کا شمار اس وقت ، ایک شاعر کی حیثیت سے ، مشاہیر عالم میں ہوتا ہے اور ہر زاویۂ خیال رکھنے والا نقاد اس بات پر متفق ہے کہ ان کی شاعری ہم آہنگی سے معرا نہیں ہے ۔ اس میں گہرا احساس اور جذبہ پایا جاتا ہے اور ذہن و فکر کی بھی بہت اچھی مثالیں ملتی ہیں ۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی شاعری فنی اعتبار سے ایک نہایت ہی حسین نگار خانہ ہے اور ان کا فن ان کے موضوع کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے ۔

حالی ، بجنوری اور لطیف کی تنقیدوں سے غالب کے تنقیدی مطالعے کا ایک ماحول پیدا ہوا اور کئی اہم نقاد اردو تنقید میں ایسے سامنے آئے جنہوں نے غالب کی شاعری اور ان کے فن کے اہم پہلوؤں کو نئے زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی ۔ اس سلسلے میں شیخ محمد اکرام خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں ۔ ان کی کتاب 'غالب نامہ' جو بعد میں 'آثار غالب'، 'ارمغان غالب' اور 'حکیم فرزانہ' کے نام سے بھی شائع ہوئی اگرچہ پوری طرح تنقیدی کتاب نہیں ہے لیکن اس میں جگہ جگہ تنقید کے بعض اچھے نمونے نظر آتے ہیں ۔ اکرام صاحب کا رجحان اس کتاب میں تحقیق کی طرف بھی معلوم ہوتا ہے ، اور انہوں نے تحقیق اور تنقید دونوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش کی ہے ۔ ان کے اس انداز تنقید سے غالب کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور ان کے تنقیدی مطالعے کے لیے نئے امکانات سامنے آتے ہیں ۔

اکرام صاحب نے غالب کی شاعری کا جائزہ لیا ہے اور اس سلسلے میں ان کے تغزل اور عشقیہ کیفیت پر اچھی بحث کی ہے ۔ وہ غالب کو نفسیات محبت کا شاعر قرار دیتے ہیں اور اس نفسیات محبت کی ترجمانی میں جو مختلف مقامات آتے ہیں ، ان کو سامنے رکھ کر غالب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ اس سلسلے میں انھوں نے غالب کی نجی زندگی اور ذاتی معاملات کا بھی جگہ جگہ ذکر کیا ہے ۔ اس سے ان کے بنیادی نقطۂ نظر اور انداز تنقید دونوں کی وضاحت ہوتی ہے ۔ دراصل وہ

اسی پس منظر میں غالب کی شاعری اور اس کے بنیادی خد و خال کو دیکھتے ہیں ۔ اسی لیے ان کے سامنے بعض ایسی تصویریں آتی ہیں ، جو غالب کے دوسرے نقادوں کے سامنے نہیں آتیں ۔ مثلاً غالب کی محبت اور غالب کی عشقیہ شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں : ''غالب کی جوانی جس طرح حسن پرستی میں بسر ہوئی ہے ، اس کا اندازہ کئی شہادتوں سے ہو سکتا ہے'' اور پھر مثالیں دے کر اس واقعے کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ پھر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ''صحت مند محبت نہ وفور جذبات ہے نہ فقط دل لگی بلکہ اس میں دونوں چیزیں ہوتی ہیں ۔ غالب کی سلیم الخیالی کی داد دینی چاہیے کہ ان کی محبت میں دونوں اجزاء موجود ہیں ۔ روایتی طرز کی رومانوی شاعری بھی ہے اور محبت کو ایک سمجھنے کے حق میں جو موثر اظہار خیال انھوں نے حاتم علی مہر کے خط میں کیا ہے ، اس کی مثال بھی اردو ادب میں نہیں ملتی لیکن ہمارا خیال ہے کہ ان کا بنیادی نقطۂ نظر رومانوی تھا اور دل لگی کے مضامین ان کے کلام میں اسی لیے آتے ہیں کہ ان کے متوازن تحت الشعور کو یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ وفور جذبات رہے حسن تناسب جاتا رہے'' ۔ اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اکرام صاحب نے غالب کی شاعری کو نفسیاتی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے ۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں : ''غالب کی سلیم الخیالی قابل داد ہے لیکن معاشرے کے جو آئین تھے ، ان کے تحت ایک ذکی الحس شاعر کے لیے صبر و قرار حاصل کرنا آسان نہیں تھا ۔ بدقسمتی سے اپنے گھر میں انھیں وہ دل بستگی میسر نہیں تھی ، جو ایک سے وابستہ کرکے دوسری تمام الجھنوں سے نجات دے دیتی ۔ انھوں نے جو گہری محبت کی ، اس کا سلسلہ موت نے منقطع کر دیا ۔ اب معاشرہ جو کچھ انھیں پیش کرتا تھا ، وہ یا تو روایتی شاعرانہ مشرقی رومانیت تھی یا محض دل لگی ۔ غالب کی زندگی میں یہ دونوں چیزیں موجود تھیں اور دونوں میں ذہنی کشمکش کا سامنا تھا ۔ اب ان کی محبت ایک طوفان تھی ۔ جس سے وہ پہلی فرصت میں گلوخلاصی کرانا چاہتے تھے ۔ یہ کشمکش تھی جس کی وجہ سے انھیں نوازش خانہ کی صورت میں بھی بے قراری رہتی تھی'' ۔ اس بیان سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اکرام صاحب کا رجحان تنقید کے نفسیاتی دبستان کی طرف ہے اور

انھوں نے غالب کی عشقیہ شاعری کو دیکھتے ہوئے اسی زاویہ نظر کو اپنے پیش نظر رکھا ہے۔

اکرام صاحب نے مجموعی طور پر غالب کا بہت اچھا تنقیدی مطالعہ اپنی کتاب میں پیش کیا ہے۔ اور ہرچندکہ بعض جگہ اس مطالعے کی کڑیاں بہت مربوط نظر نہیں آتیں لیکن جستہ جستہ اُنھوں نے، جو تنقیدی خیالات غالب کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر ظاہر کیے ہیں، وہ مطالعۂ غالب کے سلسلے میں بعض نئے راستوں کو بنانے اور نئی منزلوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد سے ۱۹۵۳ع تک کا زمانہ ایسا ہے، جب غالب کے تنقیدی مطالعے میں اعتدال اور توازن پیدا ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال اکرام صاحب کی تنقید بھی ہے، جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اکرام صاحب کی توجہ تمام تر تنقید کی طرف نہیں ہے۔ وہ تحقیق کی طرف بھی اپنا رجحان ظاہر کرتے ہیں اور غالب پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا مقصد بھی بنیادی طور پر تحقیق ہے۔ اس تحقیق کو بنیاد بنا کر انھوں نے غالب کی زندگی، شخصیت اور کلام پر بحث کی ہے۔ ضمنی طور پر اس میں تنقیدی پہلو بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ اکرام صاحب کے ساتھ ساتھ اسی زمانے میں ایسے لکھنے والوں نے بھی غالب پر تنقیدی مضامین لکھے، جن کا میدان بنیادی طور پر تنقید تھا۔ ان میں پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر حمید احمد خاں، پروفیسر کلیم الدین احمد، پروفیسر احتشام حسین، خورشید الاسلام ممتاز حسین، آفتاب احمد خاں اور محمد حسن وغیرہ کے نام سر فہرست ہیں، ان لکھنے والوں کے یہاں غالب کا مطالعہ مختلف تنقیدی زاویہ ہائے نظر سے ہوا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر ان سب نے غالب کے تنقیدی مطالعے کو بہت آگے بڑھایا ہے اور اس میں نئے امکانات کو تلاش کیا ہے۔

رشید صاحب نے کئی مضمون غالب کے بارے میں لکھے ہیں اور اس میں ان کا مخصوص تنقیدی اسلوب ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔ رشید صاحب کے ہاں تنقید کے تاثراتی، تاریخی اور تہذیبی رجحانات کا ایک نہایت ہی حسین امتزاج موجود ہے۔ غالب کے مطالعے میں بھی ان کا یہی انداز تنقید اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ اور اس انداز سے، اس میں شبہ نہیں

کہ غالب کو سمجھنے کا ایک نیا راستہ ملتا ہے ۔ رشید صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں :"مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا ہے تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا ۔ غالب ، اردو اور تاج محل ۔ یہ ہندوستان کی تہذیبی پیداوار ہیں اور ہندوستان کے سوا کہیں اور ظہور نہیں پا سکتے تھے ۔ ان تینوں میں ہندوستان کے صوری اور معنوی امتیازات جھلکتے ہیں" ۔ ظاہر ہے کہ اس بیان میں تاثراتی انداز بھی ہے ۔ تاریخی اور تہذیبی شعور بھی ۔ رشید صاحب نے ان چند جملوں میں غالب کو ایک تہذیب کا ترجمان اور ایک تہذیب کی جمالیاتی اقدار کا عکس ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنے مخصوص تنقیدی اسلوب سے اس کو پوری طرح ثابت کر دکھایا ہے ۔

اس میں شبہ نہیں کہ رشید صاحب کا انداز تنقید بڑی حد تک تاثراتی ہے لیکن ان کا تہذیبی اور معاشرتی شعور انہیں کہیں کہیں ایسی باتیں کرنے پر بھی مجبور کرتا ہے، جن میں تجزیاتی رنگ و آہنگ کی جھلک بھی نظر آ جاتی ہے ۔ مثلاً لکھتے ہیں :

"وہ "فارسی" کے بڑے دلدادہ تھے ۔ فارسی کے اپنے ذوق و زبان پر بھروسہ اور فخر کرتے تھے ۔ لیکن ان کا مزاج جتنا تورانی تھا اتنا ایرانی نہ تھا ۔ جس طرح ان کی شاعری مسلّم ہے ۔ اسی طرح ان کی 'سپہ گری' بھی مسلم ہے ۔ ان کی شاعری کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات آسانی سے دریافت کی جا سکے گی کہ شاعری میں ان کا موضوع کچھ ہی ہو، ان کا لہجہ اور تیور سپاہیانہ ہوتا تھا ۔ اکثر باغیانہ ! یہی نہیں کہ وہ ہار نہیں مانتے نہ خدا سے ، نہ حریفوں سے ، نہ زمانے سے بلکہ ہمیشہ ان سے نبردآزما ہونے پر آمادہ رہتے تھے ۔ ان میں سے کہیں ہار مانتے بھی تھے تو کچھ اس طرح کہ جیت غالب ہی کی معلوم ہوتی تھی ! اب یہاں ان کے اردو فارسی کے کلام کی کون اوراق گردانی کرے اور ثبوت میں بے شمار اشعار نقل کرے ۔ البتہ غالب کے طالب علم کے لیے یہ ایک اچھا اور مفید مشغلہ ہوگا ۔

"غالب کو بیدل سے عقیدت تھی ۔ غالب کے کلام میں ایسے اشعار کافی تعداد میں مل جائیں گے، جہاں یہ معلوم ہوگا کہ انھوں نے

بیدل کو سامنے رکھ کر یا بیدل سے متاثر ہو کر شعر کہے ہیں ۔ بیدل غالب سے زیادہ مشکل پسند ہیں - لیکن میرے نزدیک غالب ، بیدل سے یوں ممتاز ہیں کہ وہ بیدل کی مانند اپنی تخیل یا فکر میں کھوئے نہیں جاتے ۔ غالب کہیں ہوں ، ان کا ناؤں زمین ہی پر رہتا ہے ۔ کسی حال میں وہ ہم سے جدا ہونا یا جدا رہنا گوارا نہیں کرتے ۔ غالب کی ارضیت میں ماورائیت اور ماورائیت میں ارضیت ملتی ہے، جس سے ان کے کلام میں دل آویزی اور رفعت پیدا ہوگئی ہے ۔بیدل نے شاعری کے سب سے موٹے اصول کو نظر انداز کر دیا کہ شاعری حقیقت کی آسان اور دل کش ترجمانی ہے نہ یہ کہ آسان اور دل کش کو بھی درد سر بنا کر پیش کیا جائے۔"

ان اقتباسات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ رشید صاحب کا رجحان تاثراتی ہونے کے باوجود تجزیے کی طرف ہے ، اس تجربے میں وہ معاشرت ، تہذیب ، تاریخ ، ادب و شعر کے مختلف رجحانات ، ان سب کو اپنے پیش نظر رکھتے ہیں اور ان کی روشنی میں غالب کی شخصیت اور شاعری کا جائزہ لیتے ہیں ۔ اگرچہ ان کے اس تجربے میں تفصیل نہیں ہے لیکن بہرحال وہ اس اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ غالب کا ایک تجزیاتی مطالعہ ہے ۔

رشید صاحب کے ساتھ ساتھ پروفیسر آل احمد سرور نے بھی غالب پر چند بہت اچھے تنقیدی مطالعے لکھے ہیں ۔ سرور صاحب پر رشید صاحب کے اسلوب اور انداز تنقید دونوں کے اثرات موجود ہیں لیکن جہاں تک تنقید کا تعلق ہے ، سرور صاحب کے ہاں رشید صاحب کے مقابلے میں زیادہ باقاعدگی اور زیادہ گہرائی اور بجزیے میں تفصیل کا پتہ چلتا ہے ۔ اس کا سبب شاید یہ ہے کہ سرور صاحب بنیادی طور پر تنقید ہی کو اپنا میدان سمجھتے ہیں ۔ اس لیے تنقیدی معاملات کی طرف انھوں نے زیادہ باقاعدگی سے توجہ کی ہے ۔ اُن کی تنقید میں تاثراتی انداز نہیں ہے ۔ البتہ اسلوب میں ایک رنگینی اور پرکاری ہے ، جو ان کے رومانی مزاج کو ظاہر کرتی ہے ۔ اس سے سرور صاحب کی تنقید میں بڑا ہی فن کارانہ انداز پیدا ہو گیا ہے اور وہ ہر جگہ بہت ہی دل نشین اور دل آویز نظر آتی ہے ۔ اس کو پڑھ کر

ایک مسرت کا احساس بھی ہوتا ہے اور ساتھ ہی تنقیدی حقائق بھی دل نشیں ہوتے ہیں ۔ سرور صاحب اردو میں واحد نقاد ہیں جو تنقید میں رس اور رعنائی پیدا کرنے میں پیش پیش رہے ہیں ۔ غالب پر جو تنقیدیں انھوں نے لکھی ہیں ، ان میں بھی وہی رس اور رعنائی کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں ۔

لیکن سرور صاحب کا یہ انداز تنقید در حقیقت ان کے گہرے تہذیبی شعور کی پیداوار ہے ۔ انھوں نے غالب کو بھی اسی تہذیبی پس منظر میں دیکھا ہے اور ان کی شاعری کو اس تہذیب کی مختلف صورتوں اور کیفیتوں کا آئینہ دار ثابت کیا ہے ۔ ان کے مندرجہ ذیل تنقیدی خیالات غالب کے تنقیدی مطالعے میں ہمیشہ اہم تصور کیے جائیں گے :

''ابتدائی دور کو چھوڑ کر، جب ان کی زود رنجی ان کی بے نیازی پر اکثر فتح پا جاتی ہے، غالب کے ہاں زندگی کا ایک طرح کا فلسفیانہ احساس ملتا ہے، جس میں رنج و راحت دونوں کے لیے گنجائش ہی نہیں بلکہ طلب بھی ملتی ہے ، جیسے وہ اس کے قائل ہوں کہ ہنگامے ہی سے گھر کی رونق ہے زندگی کے تمام پہلو ظہور پاتے ہیں اور زندگی کے ثبوت بہم پہنچاتے ہیں ۔ نیز یہ کہ زندگی سے بیزار یا پریشان ہونا اتنی ہی پست خیالی اور دون ہمتی ہے، جتنا کہ اس پر ہنس سکنے اور ہنگامے میں جمیعت خاطر دیکھ سکنے اور پالینے کی صلاحیت پیدا کرنا ، ایک اعلیٰ اور قابل عمل نظریۂ حیات ہے ۔ یہی احساس ہے ، جس نے رد و قدح ، کرختگی اور دل شکستگی کی تنگ و تاریک اور نمناک گلیوں سے نکال کر انہیں ان کی شاعری کے فلسفیانہ توازن اور بے نیازانہ خوش طبعی کی شاہراہ پر لا ڈالا ہے ۔''

اس اقتباس سے سرور صاحب کی انداز تنقید کی پوری طرح وضاحت ہو جاتی ہے ۔ ان کی تنقید میں تجزیے کا عنصر غالب ہے اور تجربہ کرتے ہوئے ان کی نظر ان عوامل اور محرکات کی تہ تک پہنچتی ہے، جو غالب کی شخصیت اور شاعری کو بنانے میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں ۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ سرور صاحب کے تنقیدی انداز میں ایک شگفتگی اور شادابی نظر آتی ہے ، جو اُن کے تخلیقی اور فن کارانہ مزاج کا نتیجہ ہے ۔ سرور صاحب غالب کے بلند پایہ نقاد ہیں کیوں کہ ان کے مزاج کو سمجھنے میں جس

تخلیقی مزاج کا ہونا ضروری ہے ، وہ خصوصیت سرور صاحب کے مزاج میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے اور ان کے مضامین اسی وجہ سے اردو تنقید میں غالب کے بہترین تنقیدی مطالعے تسلیم کیے جاتے ہیں ۔

سرور صاحب کے ساتھ ساتھ بعض ایسے نقاد بھی غالب کے مطالعے میں پیش پیش نظر آتے ہیں، جن کا زاویۂ نظر ترقی پسندانہ ہے ۔ ان نقادوں میں سب سے زیادہ نمایاں نام پروفیسر سید احتشام حسین کا ہے ۔

احتشام صاحب نے غالب کے بارے میں بعض بڑے ہی اہم تنقیدی مضامین لکھے ہیں اور ان مضامین میں غالب کی شخصیت کے عوامل اور ان کی شاعری اور فن کے محرکات کو عمرانی زاویۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے ۔ ان کے مضامین میں 'غالب کی بت شکنی' اور 'غالب کا تفکر' اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔ ان مضامین میں انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ غالب اپنے زمانے کی پیداوار اور ایک عظیم تہذیبی روایت کے علم بردار ہونے کے باوجود اپنے زمانے کے باغی تھے اور یہ بغاوت ان کے فکر اور فن دونوں میں نمایاں نظر آتی ہے ۔ احتشام صاحب نے غالب کے مطالعے میں اس پورے تہذیبی ، معاشرتی اور معاشی پس منظر کو اپنے سامنے رکھا ہے، جو غالب کےزمانے میں موجود تھا اور ان کو انھی تمام حالات کی پیداوار ثابت کیا ہے ۔ غالب کے مطالعے کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''غالب کے مطالعے کے سلسلے میں چند نظریاتی مباحث پر غور کرنا نہ صرف مفید ہوگا بلکہ ضروری بھی ہے کیوں کہ غالب انیسویں صدی کے اس ہندوستان میں پیدا ہوئے ، جو مخصوص روایات کا حامل تھا ۔ خاص طرح کا طبقاتی نظام رکھتا تھا ۔ تاریخ ، مذہب اور فلسفے میں پوری طرح اس زمانے کی جھلک نہ تھی، جو اس وقت کے معاشی اور معاشرتی انحطاط نے پیدا کی تھی ۔ بلکہ کچھ عقیدے روایت بن کر طرز فکر پر اثر انداز ہو رہے تھے ۔ یہ عقیدے اس زوال اور انحطاط کے زمانے میں پیدا نہیں ہوئے تھے ، جو غالب کا تھا بلکہ دوسرے تاریخی حالات اور مختلف نظام معاشرت نے انھیں جنم دیا تھا ۔ صدیوں نے ان میں طرح طرح کے خیالات اور افکار کی آمیزش کی تھی ۔ مختلف مذہبی اور فلسفیانہ تصورات ایک دوسرے میں پیوست ہوئے تھے ،

رد و قدح کی بہت سی منزلیں آئی تھیں اور کوئی ایسا نظریہٴ حیات اس وقت موجود نہیں تھا ، جو کسی ایک مذہب ، طبقہ ، گروہ یا مکتب خیال سے وابستہ کیا جا سکے ۔ ان حالات میں ایک روایت پرست شاعر یا ادیب کے لیے تو یہ ممکن ہے کہ وہ کسی مخصوص عقیدے کا سہارا لے کر اپنا رشتہ اس سے جوڑے اور بدلتی ہوئی زندگی سے پیدا ہونے والے سوالات سے منہ موڑ کر گذر جائے ۔ لیکن غالب کے سے شاعر کے لیے یہ خیال درست نہ ہوگا ۔ ان کے شعور کا مطالعہ اسی وجہ سے پیچیدگی پیدا کرتا ہے اور آسانی سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ چونکہ جاگیردار یا فوجی جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور مسلمان تھے ، اس لیے ان کے افکار و خیالات وہی ہوں گے ، جو اس گروہ اور مذہب سے تعلق رکھنے والوں کے ہوا کرتے ہیں ۔ تنقید اور تجزیہ کا یہ میکانکی طریقہ صحیح نتائج تک رہنمائی نہیں کر سکتا ۔''

اس اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ احتشام صاحب غالب کو عمرانی بلکہ مارکسی زاویہٴ نظر سے دیکھنےکی کوشش کرتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں نے غالب کا مطالعہ صرف انفرادی نفسیات کی روشنی میں کیاہے، ان سے احتشام صاحب نے اختلاف کیا ہے ۔کیونکہ ان کےخیال میں :

''نفسیات خود خارجی عوامل کا نتیجہ ہے اور زبردست سے زبردست انفرادیت بھی مثبت یا منفی شکل میں ایک سماجی بنیاد رکھتی ہے ۔ نفسیاتی کیفیت خارجی حالات سے باہر کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتی ۔ اس لیے محمد اکرام کا غالب کی ساری تحریک اور کامیابی کو محض احساس کمتری کا نتیجہ قرار دینا ، نہ تو غالب کے شعور کا صحیح تجزیہ ہے اور نہ اصول تنقید ہی کے لحاظ سے درست ہے ۔''

احتشام صاحب نے غالب کی زندگی کے تمام واقعات کو سامنے رکھ کر تجزیاتی انداز میں ان کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کا سراغ لگایا ہے اور بعض ایسے حقائق کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے ، جو ایک صحیح مارکسی نقاد ہی کر سکتا ہے ۔

پرفیسر حمید احمد خاں نے غالب کی نجی زندگی ، شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بعض بہت ہی قابل قدر مضامین لکھے ہیں ۔ ان

مضامین سے غالب کی شخصیت اور شاعری کے بعض نئے پہلوؤں کی نشان دہی ہوتی ہے - انھوں نے بعض ایسے لوگوں سے جنھوں نے غالب کو دیکھا تھا ، کچھ ایسی معلومات فراہم کی ہیں اور ان معلومات سے استفادہ کر کے ان کی شخصیت کا مطالعہ اس طرح کیا ہے کہ اس سے غالب کو سمجھنے کے بعض نئے راستے ملتے ہیں - غالب کی شاعری میں حسن اور عشق کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور ان کے بہت سے خیالات و تصورات انہیں کے گرد گھومتے ہیں - حمید احمد خاں صاحب نے ان دونوں پہلوؤں پر تنقیدی نظر ڈالی ہے اور ان کے عوامل اور محرکات کا سراغ لگایا ہے - اس سلسلے میں انھوں نے برعظیم کے مسلمانوں کی تہذیبی روایت کے ذوق جمال اور فکری پہلوؤں کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے اور انھی کی روشنی میں غالب کے تصورات حسن و عشق کو دیکھنے کی کوشش کی ہے لکھتے ہیں :

”غالب کے کلام میں اجتہاد کے پہلو بہ پہلو روایت کی پاسداری سے جو شغف ہے ، وہ عشقیہ شاعری میں بھی نظر آتا ہے - غزل کے عاشق مجنوں سے لے کر پروانے تک اور روایتی معشوق لیلیٰ سے لے کر شمع محفل تک ، سبھی یہاں موجود ہیں - ان اشعار کا پس منظر مغلیہ دور کی وہ معاشرت ہے ، جو غالب کے معاصرین کے کلام میں بھی جھلکتی ہے - اس سے استفسار کہ غالب کے کلام میں اس سے زیادہ وسعت اور وضاحت مہیا ہوئی ہے لیکن یہ درجے کا فرق ہے ، کیفیت کا نہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ معاشرتی پس منظر کے لحاظ سے غالب اور اس کے ہم عصر شعراء میں ایک بنیادی اشتراک ہے - اس مشترک کیفیت کے ہوتے ہوئے بھی ، غالب کی شاعری میں حسن و عشق کا ایک الگ مقام ہے - اس کی وجہ یہی ہے کہ شاعر کی اپنی شخصیت اور اس کی شخصیت کے عکس نے حصہ کلام کو بھی ایک دوسری سطح پر پہنچا دیا ہے -“

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ حمید احمد خاں صاحب غالب کی شاعری کو ایک تہذیبی پس منظر میں دیکھتے ہیں اور ان کو اس روایت کا علم بردار سمجھتے ہیں ، جو اس برعظیم کے مسلمانوں کی عظیم تہذیبی روایت

تھی ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے غالب کو ایسے ماحول میں بھی دیکھا ہے ، جو انیسویں صدی کی دلی میں موجود تھا ۔ اس ماحول میں جو اجتہاد کی کیفیت تھی ، اس کی جھلک انھیں غالب کی اس انفرادیت میں بھی نظر آتی ہے جو ان کا طرۂ امتیاز ہے ۔

حمید احمد خاں صاحب نے غالب کے تنقیدی مطالعے میں اردو کے بعض دوسرے شاعروں کو بھی اپنے سامنے رکھا ہے ۔ مثلاً میر حسن ، جرأت یا ذوق وغیرہ کو سامنے رکھ کر انھوں نے غالب کے تصورات حسن و عشق پر تنقیدی بحث کی ہے اور اس طرح غالب کی انفرادیت کے نقوش کو زیادہ ابھارا ہے ۔ اس کے علاوہ غالب کی زندگی کے نجی حالات اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ذہنی رجحانات اور جذباتی میلانات کو بھی انھوں نے غالب کے تنقیدی مطالعے کی بنیاد بنایا ہے اور ان کی فارسی اور اردو شاعری دونوں کو سامنے رکھ کر اپنے بنیادی تنقیدی خیالات کی وضاحت کی ہے ۔ ان تمام بحثوں میں حمید احمد خاں صاحب اپنی تنقیدی بصیرت کا اظہار کرتے ہیں اور جگہ جگہ ان کے ہاں انسانی نفسیات کو سمجھنے اور اس کی روشنی میں شعر و شاعری کو دیکھنے کا رجحان ملتا ہے لیکن انسانی نفسیات کی باتیں کرتے ہوئے وہ صرف اپنے آپ کو نفسیات تک ہی محدود نہیں رکھتے بلکہ اس نفسیات کو بھی ایک تہذیبی روایات اور ماحول کے اثرات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں ۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید زیادہ متوازن اور جان دار نظر آتی ہے اور اس سے غالب کی شاعری کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے ۔

(ناتمام)

مطالعۂ غالب
کے
سو سال

گذشتہ سو سال میں غالب کی شخصیت اور شاعری کا تنقیدی مطالعہ مختلف لکھنے والوں نے مختلف زاویہ ہائے نظر سے ، مختلف انداز میں کیا ہے، اور مختلف نتائج نکالے ہیں ۔ یہاں ان مختلف لکھنے والوں کے کچھ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں تاکہ یہ اندازہ ہو کہ گذشتہ ایک صدی میں اس تنقیدی مطالعے نے کیا کیا صورتیں اختیار کی ہیں ۔ اس میں کون کون سے رجحانات پیدا ہوئے ہیں اور اس نے کس کس طرح غالب کی سخصیت اورشاعری کے خد و خال کو نمایاں کرکے پیش کیا ہے ۔

ان اقتباسات کے متعلق کوئی بات اپنی طرف سے جان کر نہیں کہی گئی ہے ۔کیونکہ ان کو پیش کرنے کا مقصد تنقید نہیں ہے ، صرف ان تنقیدی خیالات کو یک جا کرنا ہے، جو غالب کے متعلق مختلف لکھنےوالوں نے مختلف اوقات میں پیش کیے ہیں ۔ اس خیال سے کہ گذشتہ سو سال میں غالب کا جو تنقیدی مطالعہ کیا گیا ہے ، اس کی صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے آ سکے ۔

———

''اسد تخلص ، اسد اللہ خاں نام ، عرف میرزا نوشہ۔

آبا و اجداد کا وطن سمرقند تھا ۔ مستقر الخلافہ اکبر آباد میں پیدا ہوئے ۔ قابل ، یار باش اور درد مند جوان ہیں ۔ بسر اوقات ہمیشہ خوش معاشی سے رہی ہے ۔ خاطر میں ریختہ گوئی کا ذوق متمکن ہے ۔ غمہائے عشق مجاز سینے میں موجود اور تربیت یافتۂ خم کدۂ نیاز ۔ فن سخن سنجی میں میرزا عبدالقادر بیدل علیہ الرحمۃ کے محاوروں کا اتباع کرتے ہیں

اور ریختہ محاورات فارسی میں موزوں کرتے ہیں ۔ بالجملہ اپنی طرز کے موجد ہیں اور راقم کے ساتھ یک جہتی کا رابطہ مستحکم رکھتے ہیں ۔ ان کے اکثر اشعار نازک مضامین کے ساتھ زمین سنگلاخ میں موزوں ہوتے ہیں ۔ بیش از بیش خیال بندی کا رویہ پیش نہاد خاطر ہوتا ہے ۔"
نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور : عمدۂ منتخبہ تذکرہ سرور اردو ترجمہ ۱۸۶۱ء)

مرزا نوشہ کے نام سے مشہور ہیں ۔ بڑے معزز خاندان اور پرانے رئیسوں کے گھرانے سے ہیں ۔ اکبر آباد آپ کے قیام سے سر بلند تھا ۔ اب دارالسلطنت شاہجہان آباد آپ کے قیام کی بدولت رشک اصفہان و شیراز ہے ۔ چمن معانی کے طوطی بلند پرواز ، اور گلشن رنگین بیانی کے بلبل نغمہ پرداز ۔ آپ کی بند خیالی کے مقابلے میں بلند آسمان پستی زمین ہے اور ان کی گہرائی فکر کے سامنے قارون کرسی نشین معلوم ہوتا ہے ۔ ان کا شاہین تخیل سوائے عنقا کے کسی کا شکار نہیں کرتا اور فرس طبیعت میدان فلک کے علاوہ جولانی نہیں دکھاتا ۔ اگر آج کل قیمتی سرمائے کی تلاش مقصود ہو تو ان ہی کی دکان میں ملے گا ۔ ایک مدت سے دائرۂ شعر و شاعری میں قدم ہے ۔ شروع شروع میں اپنی دشوار پسند طبیعت کی بنا پر مرزا عبدالقادر بیدل کے رنگ میں دقت آفرینیاں کیں ۔ آخر میں آ کر یہ رنگ چھوڑا اور دوسرا پسندیدہ رخ اختیار کیا ۔ اپنے دیوان کو بعد تکمیل و ترتیب کے نظر انداز کر دیا اور اس میں سے بہت سے اشعار کو نکال دیا اور تھوڑا حصہ انتخاب کیا ہے ۔ بہت عرصے سے ریختہ کی طرف توجہ نہیں کی ہے ۔ فارسی زبان میں بہت قدرت رکھتے ہیں ۔ ان کا مرتبہ بڑے استادوں سے کم نہیں ہے ۔ ان کی غزل مثل نظیری ہوتی ہے اور ان کا قصیدہ مثل عرفی کے قصیدے کے بہت دل پسند ہوتا ہے ۔ شعر کے مضامین کو پورے طور پر سمجھتے ہیں اور تمام نکات اور لطافتوں کی تہہ کو پہنچ جاتے ہیں اور یہ وہ فضیلت ہے ۔ جو صرف چند اہل سخن کو حاصل ہے ۔ اگر نکتہ رس ہو تو یہ بات سمجھوگے کہ اگرچہ اچھا کہنے والے کمیاب ہیں لیکن شعر فہمی کا ملکہ رکھنے والے اس سے بھی کم ہیں ۔ کیا کہنا اس شخص کا جس

کو یہ دونوں باتیں حاصل ہوں ۔ مگر ایسے لوگ کم دکھائی دیتے ہیں ۔ اگرچہ ان سے ملاقات صرف کبھی کبھی ہوتی ہے ، لیکن حقیقی تعلق مستحکم ہے ۔''

(نواب محمد مصطفےٰ خان شیفتہ گلشن بے خار اردو ترجمہ)

''اسد تخلص ، اسم شریف ان کا نواب اسد اللہ خاں بہادر معروف بہ مرزا نوشہ خاندان ضخیم اور رئیسائے قدیم ، اکبر آباد نیک بنیاد کے مدت سے وارد شاہ جہان آباد خجستہ نہاد کے ہیں ۔ ادیب لبیب اس مرتبے کے ہیں کہ سحبان ابن وائل مقابل اوج بلند خیالی ان کے حضیض جہل کا مبتلا ، مشہور سخن فہم و سخن دان ۔ اس پایہ پر متنبی و کعب باوجود بلند ہ ئگی کے مانند بچوں گھٹنوں چلنے والوں کے ۔ ان کے حضور اشعار عاشقانہ اور مضامین آزادانہ جملت دہ دیوان نظیری ، رجز بے باکانہ اور نثر بے پروایانہ اس کی رشک دہ عبارت ظہوری ۔ خوانِ یغما اس کے سے انوری ایک ادنیٰ زلہ ربا ، خاقانی بجاروب کشی مستعد بسر و پائے ، فیضی سے کیوں کر لوگ فیض کو نہ پہچے جب کہ وہ اس کے ایک ادنیٰ شاگرد سے فیض کو پہنچا ۔ صاحب دیوان و تصانیف ہے ۔ مگر مدت سے فکر ریختہ گوئی زبان اردو کا ترک کیا ۔ مگر ایک دیوان چھوٹا سا قریب پانچ جزو کے تصانیف نواب ممدوح سے نظر عاجز سے گزرا ۔ اسی سے یہ چند اشعار بطور یادگار مندرج گلدستہ ہذا کے کیے گئے ۔ مگر چونکہ نواب ممدوح حالت صبا سے آج تک شوق زبان فارسی کا رکھتے ہیں اور اشعار فارسی میں غالب تخلص لکھتے ہیں ۔ چنانکہ ایک دیوان چالیس جزو کا زبان مذکور میں شاعر ممدوح کا قالب طبع میں آ چکا ہے ۔ اس لیے اب فکر اشعار اُردو کا نہیں کرتے ۔''

(مولوی کریم الدین : گلدستۂ نازنیناں : ۱۸۴۵ء)

یہ (مراد دیوان غالب) فکر کے قدسی خاندان کی سرو قد حسینہ ہے ، جو سر بلند کرکے اپنا جلوہ دکھا رہی ہے ۔ لا اُبالیانہ انداز میں خرام کرنے والی ایک پردہ دار ہے ، جس نے چہرے سے مقنع اُٹھا دیا ہے اور پردہ دری کے انداز میں دامن کمر تک لے آئی ہے ۔ یہ

یوسف ثانی ہے اور حور نژاد معانی اس میں دوش بدوش دکھائی دیتے ہیں ۔ یہ ایسا نرگس زار ہے ، جس کے جلوے کو دیکھ کر لوگ ہوش باختہ اور حیرت زدہ ہو جاتے ہیں ۔ یا آب اسے دور تک پھیلا ہوا ایک نفیس ریشمی کپڑا سمجھیں ، موتیوں سے مزین، جیسے آسمان پر ستارے ٹکے ہوئے ہوں ۔ ایسا محل ہے ، جو ملک بھر کے شہروں کے لیے رونق کا موجب ہے اور جو چین کے سینکڑوں نگار خانوں کی شان و شوکت کو ملیامیٹ کرنے والا ہے ، یا اسے روشن چراغ کہا جائے، جس کے ارد گرد ذہن اور طباع لوگ پروانوں کی طرح طواف کرتے ہیں ۔ ہاں یہ آسمان سے آترا ہوا ہیکل ہے، جو فرزانوں کے لیے حرز بازو کا کام دیتا ہے ۔ اب آپ کہہ اٹھیں گے یہ حضرت میکائیل جیسا پاک سیرت موکل ہے ، جس نے ایک فراخ فرش بچھا دیا ہے اور شعر و سخن کے گرسنہ چشموں کو صلائے عام دی ہے ۔ بیت اللہ کی طرح ایک مقدس معبد ہے، جس کی کلید فہم درست کے ہاتھ میں دے دی گئی ہے اور اس کے دروازے نے مزدلفہ کے احرام بندوں کے دل کو کشادگی عطا کی ہے ۔ یا اسے منات خیال کیجیے، جو زنار بندان خیال اور جبیں سائی کرنے والوں کے لیے ایک صنم کدہ ہے ۔ ہاں یا پھر یہ ارتنگ ہے ، جو بدیع و غریب نقوش کی نمائش کر رہا ہے، جسے دیکھ کر مانی و اوژنگ اظہار عجز کے طور پر اپنی پشت دست زمین پر رگڑتے ہیں ۔ ان اوراق کے ایک ایک صفحہ کو وید مقدس پڑھنے والا برہمن سمجھیے ۔ اس کتاب کا ہر ورق ایک موبد ہے ۔ ایک جہاں نما آئینہ خانہ، ایک مصفّا مقام ، جس میں مریم کردار پردہ نشیں خیموں میں بیٹھے ہوئے ہیں ۔ اس میں ایسے شوخ چشم بھی ہیں، جو شاہدان بازاری سے بھی زیادہ پردہ دری کرتے ہیں ۔ یہاں تہی دست بھی ملیں گے، جو تونگر دل ہیں اور ایسے آزاد فطرت لوگ بھی نظر آئیں گے ، جو پا در گل ہیں ۔ اپنے آپ پر شیدا عشاق طینت ، حسین دل رکھنے والے سادہ پیکر، زہرہ فن، ہاروت پیشہ ماہ جبیں ، بابل میں مسکن رکھنے والے، سر تا پا گوہر آمود پریرو ، یہ سب یہاں دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں آپ کو قلزم آشام سمندر (آتشیں کیڑے) بھی ملیں گے اور آگ سے بھرا ہوا سینہ رکھنے والے نہنگ بھی ۔ بڑے پختہ مغز محبوب ، جن کا مغز پختہ ہے تو پوست لطیف ۔ مست بادہ آشام ، از خود رفتہ لیکن دامن شکیبائی ہاتھ میں لیے ہوئے ۔ ہندی صنم مگر پارسیوں کی خو بو رکھنے والے ،

دہلی نژاد لیکن اصفہان والوں کی طرح پر درد ۔ ہاں ہاں امید و بیم کی کیفیت دل میں لے کر میں کہتا ہوں کہ جو کچھ میں نے پورے احساس ذمہ‌داری کے ساتھ تحریر کیا ہے. بالیقین اُردو زبان کے اُس منتخب اُردو دیوان کے متعلق ہے، جو اعجاز مسیحائی رکھنے والی کلک کا پاکیزہ ترشح ہے اور اس قلم کو چلانے والا عقل کے لیے ترازوے عدل ہے اور بصیرت کے لیے اصطرلاب ہے، جس سے وہ اجرام فلکی کے احکام معلوم کرتی ہے ۔ اسے جوہر آئینۂ آفرینش ، معیار نقد گرا تمائگی اور بلند پائگی کے نردبان کا معراج کہیے تو بجا ہے ۔ فی الواقعہ یہ شاعر گرامی منزلت قلمرو معنی بروری پر متصرف ہے ، سخنوری کی ولایت کا فرماں روا ہے ، نو آئین نگاری کے جہان کا مالک ہے ۔ تازہ گفتاری کے جہان کا سالار، سخن گستری کے وجود کو حیات نو بخشنے والا ، دیدہ وری کی آنکھ کو بینائی بخشنے والا ، جس کی وجہ سے قلم کی شان و شوکت بلند ہوئی اور دوات کے خانوادے کا چراغ روشن ہوا ۔ وہ آیت اللہ جس نے دوسرے شاعروں کی شہرت کو منسوخ کر دیا ۔ ہاں ہاں وہی جو سرخیل انجمن نکتہ داناں ہے ۔“

سرسید احمد خاں : آثار الصنادید : ۱۸۴۷ء (اُردو ترجمہ)

غالب تخلص ۔ شیر نیستان سخنوری ، ببر بیشۂ معنی پروری ، یکہ تاز عرصۂ کمال ، یگانۂ کشور افضال ، سیاح زمین سخن دانائے نوادر فن ، زبدۂ کملائے جہاں ، مرزا اسد اللہ خاں معروف بہ مرزا نوشہ ملمہ الرحمٰن ۔ سخن سنج بے مثل و نظیر اور صاحب طرز دل پذیر ہے ۔ خامۂ گوہر بار سے اقلیم سخن میں لوائے جہانگیری بلند کیا ہے اور یوسف معنی کو اس ہجوم بے تمیزی میں زلیخا منشان مصر سخن کی نظر میں ارجمند کیا ہے ۔ فضائل اگر اس قدوۂ افاضل کی ذات پر تکیہ نہ کرتے ، فضیلت نہ رکھتے اور کمالات اگر اسی زبدۂ کملا سے مدد نہ لیتے ، عالم کی تکمیل کا سبب نہ ہوتے ۔ سیاہئی رقوم اس کی رنگینئی معنی سے ہم شکل طاؤس ، صفحۂ قرطاس اس کے فروغ مضامین سے ہم رنگ فانوس ۔ برق طور اگر اس کی تجلئی معنی کے مقابل ہوتی ، سرمہ ہو جاتی ۔ شمع ایمن اگر اس کے شعلۂ فکر کے سامنے آتی ، فروغ نہ پاتی ۔ ایوان سخن اس کے فکر معنری سے آسمان کے ساتھ ہم رفعت ، بنائے کلام اسی کی طبیعت کی مدد سے قاف

کے ساتھ ہم متانت ۔ وصف بزم میں رفتار قلم رقص ناہید کے برابر ، بیان رزم میں صریر خامہ نعرۂ شیر سے ہمسر ۔ فکر اگرچہ حوصلہ ہمت کے لائق جہد کرے ، مضائے لامکاں مرحلہ مقصود کے رو برو دیدہ مور سے تنگ تر نظر آئے ۔ خیال اگر اندازۂ قدرت کے موافق بلندی پر جائے ، خزانہ تحت العرش کو اس جائے گاہ رفیع سے گنج قارون سے پست تر ہو جائے ۔ سخن کی فراوانی اور ہجوم معانی اور متانت تراکیب اور رشاقت اسالیب اور شوخی اشارات اور چستی عبارات ۔ گاہ اجمال کی رعایت سے آفتاب کو لباس ذرہ میں جلوہ دینا اور گاہ تفصیل کے اقتضا سے تخم کو نہال کی صورت میں نشو و نما بخشنا ۔ جدائی کو فصل اور ملاقات کو وصل کے قبیل سے ٹھہرا کر مباحث سخن میں بلاغت کے ساتھ ادا اور حشو و زواید سے بزم کلام میں مثل صحبت زہاد اجتناب کرنا ۔ اور اسی طرح اور باتیں جو لوازم سخن اور مقتضیات فن سے ہیں ، جیسے اس ناظم کشور کمال میں مشاہدہ ہوئی ہیں ، کم کسی میں دیکھی گئیں ۔ ابیات ریختہ ، عبارت ریختہ ، دقائق فارسی جواہر قدس کا ریختہ ۔ ہر چند اشعار ریختہ حد حصر سے خارج اور اندازۂ شمار سے افزوں تھے ۔ لیکن از بس کہ کمر یار اور دہان دلدار کا مضمون زیب اشعار ہوتا ہے ، انہیں مضامین کی رعایت سے اختصار کو پسند کیا اور چند بیتیں دلبروں کے لب کے مانند نقطۂ انتخاب کے خال سے مزین کرکے ایک دیوان مختصر مرتب کیا ۔ اور مجموعہ فارسی کا تو دیوان محشر سے بھی زیادہ اور پر غوغا اور ابیات بلند صدا سے مملو اور مشحون ہے ۔"

(مرزا قادر بخش صابر : گلستان سخن : ۱۸۵۵ء)

فخر عرفی و غیرت طالب میرزا نوشہ اسد اللہ خان المخاطب بہ نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ بہادر ۔ افراسیاب کی نسل سے تھے ۔ اکبر آباد میں مولد تھا اور دہلی مسکن ۔ لفظ "غریب" تاریخ ولادت ہے ۔ وفات ۱۲۸۵ھ میں واقع ہوئی ۔ 'پنج آہنگ' ، 'دستنبو' ، 'مہر نیم روز' اور 'قاطع برہان' ان کی تالیفات میں سے ہیں ۔ فارسی زبان میں بھی ایک دیوان رکھتے ہیں ۔ ابیات کا مجموعہ ۴۳۲ ہے ۔ اول اول مرزا بیدل کی روش اختیار کی ۔ آخرالامر بڑا پسندیدہ انداز ایجاد کیا ۔ اپنے دیوان ریختہ میں

سے بہت سے اشعار نکال دیے ہیں اور قلیل تعداد میں انتخاب کر لیے ہیں ۔ پہلے اسد تخلص کرتے تھے، جو غزلیات کے بعض مقطعوں میں اب بھی موجود ہے ۔ پچاس سال ان کی مدت مشق ہے ۔ فارسی گوئی میں ان کا پایہ فحول شعراء سے کم نہیں اور ریختہ کی حالت بھی یہ ہے کہ اگر ان کا کوئی ہم مرتبہ ہے تو لائیں ۔ اگر حدیقۂ نظم کے لیے نوبہار ہیں تو عرصۂ نثر میں بھی مردکار ہیں ۔ جمیع اصناف سخن پر جو قدرت انہیں حاصل ہے، بیان سے باہر ہے ۔ کیا ہر شخص نہیں جانتا کہ بعض سخنور اپنی توجہ صرف غزل کی طرف معطوف رکھتے ہیں اور غزل کے بغیر اور کچھ نہیں کہہ سکتے اور بعض کا راس المال تو صرف قصیدہ ہوتا ہے اور قصیدے کے علاوہ اور کسی صنف سخن میں ان کی کوئی چیز قابل توجہ نہیں ہوتی ۔ علیٰ ہذا القیاس لیکن غالب ایسا سحرور ہے کہ اگر زمین غزل کہ دیکھا جائے تو اسے اس نے آسمان پر پہنچا دیا اور اگر مثنوی کا میدان ہے تو اُس کا پامال شدہ ۔ قصیدے میں وہ عرفی کے ہم پایہ ہیں اور ان کی غزل نظیری کی طرح گرانمایہ ہے ۔ اور یہ بات بڑی تعجب انگیز ہے کہ جس وادی میں قدم رکھتے تھے، سرعت تمام سے اسے طے کر لیتے تھے اور اس کے باوجود فروغ مضامین، جستگی ترکیب، شوکت الفاظ، رنگینیٔ معنی، متانت بیان اور شستگی زبان کے اوصاف، جو کم تر شعراء کو بالقوہ میسر تھے، انھیں بالفعل عطا ہوئے تھے ۔ دوسرے شعراء کے سلسلے میں جو مبالغہ کہا جا سکتا ہے ۔ وہ غالب کے معاملے میں حقیقت ہے ۔ انصاف ہمیشہ بالائے طاعت ہوا کرتا ہے ۔ اگر الفضل للمتقدمین کے مطابق میں اسے اساتذۂ قدیم کے ہم سر نہیں کہتا تو دیوانہ بھی نہیں کہ ان سے اسے پست تر کہوں ۔ غالب کمال سخنوری کے ساتھ، کمال سخن فہمی بھی رکھتے تھے اور جیسا کہ چاہیے شعر سے خوب لطف حاصل کرتے تھے ۔ حضرت شیفتہ لکھتے ہیں: ”وہ مضامین شعری کو کما حقہ سمجھتے تھے اور شعر کے تمام نکات اور لطائف تک رسائی حاصل کر لیتے تھے“ اور یہ ایسی فضیلت ہے جو صرف بعض اہل سخن کے لیے مخصوص ہے ۔

(سید نورالحسن خان: طور کلیم: ۱۸۷۸ء، اردو ترجمہ)

اسد اللہ خاں مرزا نوشہ خلف مرزا عبداللہ بیگ خاں عرف مرزا دولہا ؛ قوم ان کی ایبک ہے ۔ اقوام ترک جد اعلیٰ ان کے ماوراء النہر سے ہندوستان

میں آئے اور نواب نجف خاں کے عہد میں منصب دار شاہی رہے ۔ جب ریاست مغلیہ برہم ہوئی، ملازم مہاراجہ جسور ہوئے اور بود د باش شہر آگرہ میں اختیار کی ۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں ان کے والد ماجد غلام حسین خاں کمیدان متوطن شہر آگرہ کے یہاں منسوب ہوئے اور مرزا نوشہ وہیں پیدا ہوئے اور تا سن شعور وہیں مشغول تحصیل کتب درسیہ عربی و فارسی رہے ۔ ابتدا میں شیخ معظم نامی ایک معلم سے کچھ تعلیم پائی ، پھر ایک ایرانی آتش پرست سیاح سے، جس کا نام آتش پرستی میں اُورمزد اور بعد قبول اسلام عبدالصمد تھا ، تلمذ ہوا ۔ دو برس وہ اُن کے مکان پر مقیم رہا اور زبان فارسی سکھائی ۔ جب سن تمیز کو پہنچے مرزا الٰہی بخش خاں معروف دہلوی کے یہاں منسوب ہوئے اور شہر دہلی میں توطن اختیار کیا ۔ معلومات ان کی زبان فارسی میں کالشمس فی رابعة النھار آشکار ہے ، نثر و نظم اردو کی چار دانگ ہندوستان میں پکار ہے۔ تالیفات و تصنیفات کے نام یہاں لکھے جاتے ہیں : فارسی میں کلیات جس میں غزلیں ردیف وار ہیں اور قطعات اور قصائد اور رباعیات اور مثنویاں سب قسم کے اشعار ہیں ۔ 'قادر نامہ' جو خالق باری کی طرز پر موزوں کیا ہے۔ 'مہر نیم روز' اور 'ماہ نیم ماہ' یہ نثر میں دو تاریخیں ہیں ۔ تاریخ اول میں شاہ تیمور سے ہمایوں تک حال لکھا ہے اور تاریخ ثانی میں عہد جلال الدین اکبر بادشاہ سے بہادر شاہ کے عہد تک احوال ضبط کیا ہے ۔ 'دستنبو' جس میں غدر کے واقعات ہیں ۔ 'قاطع برہان' جس میں 'برہان قاطع' کی بعض لغات پر خدشات ہیں ۔ 'پنج آہنگ' اس میں فارسی زبان کی منشآت ہیں ۔ اردو میں ایک دیوان اور 'اردوے معلیٰ' اور 'عود ہندی' ان دونوں میں اردو زبان کے خطوط ہیں ۔ الحاصل مرزا صاحب کی طباعی اور ذکاوت ان کے نتائج افکار سے پیدا ہے ۔ بات سے بات پیدا کرنا تمام کلام سے ہویدا ہے ۔

(منشی امیر احمد امیر مینائی : انتخاب یادگار : ۱۸۷۹ء)

مرزا صاحب کو اصلی شوق فارسی کی نظم و نثر کا تھا اور اسی کمال کو اپنا فخر سمجھتے تھے ، لیکن چونکہ تصانیف ان کی اُردو میں بھی چھپی ہیں اور جس طرح امرا و روسائے اکبر آباد میں علو خاندان سے نامی اور میرزائے فارسی ہیں ، اسی طرح 'اُردوے معلیٰ' کے مالک ہیں ۔ اِس لیے واجب ہوا کہ ان کا ذکر اس تذکرے میں ضرور کیا جائے ۔

اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے نام کی تاثیر سے مضامین و معانی کے بیشے کے شیر تھے - دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھی ہیں - اول ، کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی اُن کا شیوۂ خاص تھا ، دوسرے چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اس سے اُنہیں طبعی تعلق تھا ، اس لیے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں ، لیکن جو شعر صاف صاف نکل گئے ہیں ، وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں رکھتے -

ان کے خطوں کی طرز عبارت بھی ایک خاص قسم کی ہے کہ ظرافت کے چٹکلے اور لطافت کی شوخیاں اس میں خوب ادا ہو سکتی ہیں - یہ انھی کا ایجاد تھا کہ آپ مزا لے لیا اور اوروں کو لطف دے گئے ، دوسرے کا کام نہیں - اگر کوئی چاہے کہ ایک تاریخی حال یا اخلاق خیال یا علمی مطالب یا دنیا کے معاملات خاص میں مراسلے لکھے تو اس انداز میں ممکن نہیں -
(مولانا محمد حسین آزاد : آب حیات : ۱۸۸۰ع)

یہ وہ خوش مذاق شخص گزرا ہے ، جس نے ہندوستان کی فارسی شاعری اور اردو نثر کو تجدید کا خلعت عطا کیا - میرے نزدیک ہندوستان کے کلام فارسی پر ولائتی فارسی کا یقین چار شخصوں کے کلام پر ہوا - اول امیر خسرو ، دوم حسن دہلوی ، سوم مرزا بیدل ، چہارم غالب - اگرچہ ناصر علی سرہندی اور مرزا جانجاناں مظہر اور غنی کشمیری اور غنیمت اور خان آرزو اور آزاد بلگرامی اور میر امامی بلگرامی اور امام بخش صہبائی اور شاہ الفت حسین فریاد یہ سب کے سب خوش گوار اور شاعر بے بدل تھے مگر جامۂ ایجاد ، جو خداداد ہے انھیں چاروں کی راست قامت پر راست آیا اور ان چاروں کے سوا جن کے نام ناسی لکھے گئے ہیں ، ان پر بھی نغز گفتاری کا خاتمہ ہوا - گو ان کے سوا اور بھی شعرائے فارسی ہندوستان میں ہوئے ہیں مگر ان لوگوں کی خوبیوں کو نہیں پاتے اور یہ لوگ ان چاروں کی شہرت ایجاد نہیں حاصل کر سکتے - یہ تو خدا کی دین ہے -

ہندوستان کی فارسی شاعری کا کہ شمس الدین فقیر دہلوی کے وقت سے ایک طرز خاص سلاست آمیز شروع ہوا تھا ، رنگ ہی بدل دیا اور بڑی

ہمت کرکے فارسی کو پھر ولایت کی کرسی پر بٹھایا ۔ ان کے کلام سے ظاہر ہے ۔

اُردو نظم بھی ایک طور خاص کی کہی ۔ اس میں بھی ایجاد خاص ہے ۔ آخر میر تقی کا رنگ بالکل اتار لیا ۔ اوائل میں حضرت نے ناسخ کی ایجاد پر توجہ فرمائی اور فارسی گوئی کی عبارت سے اس کو بلند کر دیا یعنی نہ ناسخ کی طرز رہی نہ دہلی کی ۔ دقت پسندی کے ساتھ ترکیب و بندش فارسی زیادہ کر دی یہاں تک کہ سوائے فعل کے کوئی لفظ ہندی اکثر شعروں میں نہیں آیا ۔

اُردو نثر میں پوری واقعہ نگاری کا ایجاد انھیں کا ہے ، ورنہ اس سے پہلے مرصع اور مسجع غیر واقع نثر لکھی جاتی تھی ۔ 'اُردوئے معلیٰ' انھیں جواہر بھرے خطوط کا مخزن ہے، جس میں اس نئی ایجاد کا رنگ ہے ۔

(سید فرزند احمد صفیر بلگرامی : تذکرۂ جلوۂ خضر : ۱۸۸۳ع)

مرزا نے گل رعنا کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں نے اول اُردو زبان میں شعر کہنا شروع کیا تھا ، اس لیے ہم بھی پہلے اُن کے اُردو دیوان کا ذکر کرتے ہیں ۔ جس روش پر مرزا نے ابتدا میں اُردو شعر کہنا شروع کیا تھا ، قطع نظر اس کے کہ اُس زمانے کا کلام خود ہمارے پاس موجود ہے ، اُس روش کا اندازہ اس حکایت سے بخوبی ہوتا ہے ۔ خود مرزا کی زبانی سنا گیا ہے کہ میر تقی نے جو مرزا کے ہم وطن تھے ، اُن کے لڑکپن کے اشعار سن کر یہ کہا تھا : "کہ اگر اس لڑکے کو کوئی کامل اُستاد مل گیا اور اُس نے اس کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا ۔"

مرزا کے ابتدائی اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ تو طبیعت کی مناسبت سے اور زیادہ تر ملا عبدالصمد کی تعلیم کے سبب فارسیت کا رنگ ابتدا ہی میں مرزا کے بول چال اور اُن کی قوت متخیلہ پر چڑھ گیا تھا ۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکثر ذکی الطبع لڑکے ابتداء میں سیدھے سادے اشعار کی نسبت مشکل اور پیچیدہ اشعار کو جو بغیر غور و فکر کے آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے ، زیادہ شوق سے دیکھتے اور پڑھتے ہیں ، مرزا نے لڑکپن میں بیدل کا کلام زیادہ دیکھا تھا ، چنانچہ جو

روش مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختراع کی تھی، اُسی روش پر مرزا نے اُردو میں چلنا اختیار کیا تھا، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں :

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ہے

مرزا کے حق میں جو پیش گوئی میر تقی نے کی تھی، اس کی دونوں شقیں ان کے حق میں پوری ہوئیں - ظاہر ہے کہ مرزا اول اول ایسے رستے پر پڑ لیے تھے کہ اگر استقامت طبع اور سلامت ذہن اور بعض صحیح المذاق دوستوں کی روک ٹوک اور نکتہ چیں ہم عصروں کی خردہ گیری اور طعن و طعریض سد راہ نہ ہوتی تو وہ شدہ شدہ منزل مقصود سے بہت دور جا پڑتے - سنا گیا ہے کہ اہل دہلی مشاعروں میں، جہاں مرزا بھی ہوتے تھے، تعریضاً ایسی غزلیں لکھ کر لاتے تھے، جو الفاظ و ترکیبوں کے لحاظ سے تو بہت پر شوکت و شان دار معلوم ہوتی تھیں، مگر معنی ندارد، گویا مرزا پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے -

مرزا نے اس قسم کی نکتہ چینیوں پر اردو اور فارسی دیوان میں جا بجا اشارہ کیا ہے - اُردو میں ایک جگہ کہتے ہیں :

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی

ایک اور اُردو غزل کا مطلع ہے :

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

مرزا کے ابتدائی کلام کو مہمل و بے معنی کہو یا اس کو اُردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو، مگر اس میں شک نہیں کہ اس سے اُن کی ارجنیلٹی اور غیر معمولی اُپج کا خاطر خواہ سراغ ملتا ہے اور یہی ان کی ٹیڑھی ترچھی چالیں ان کی بلند فطرتی اور غیر معمولی قابلیت و استعداد پر شہادت دیتی ہیں - معمولی قابلیت و استعداد کے لوگوں کی معراج یہ ہے کہ جس پگ ڈنڈی پر اگلی بھیڑوں کا گلہ چلا جاتا ہے، اسی پر آنکھیں بند کرکے گلے کے پیچھے پیچھے ہو لیں اور لیک سے ادھر اُدھر آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھیں - جو ہنر یا پیشہ اختیار کریں اس میں اگلوں کی چال ڈھال سے

سر مو تجاوز نہ کریں اور ان کے نقش قدم پر قدم رکھتے چلے جائیں ۔ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے ایسا نہیں کرتے ، بلکہ دوسرے رستے پر چلنا اُن کی قدرت سے باہر ہوتا ہے ۔

برخلاف اس کے جن کی طبیعت میں ارجنیلٹی اور غیر معمولی اُپچ کا مادہ ہوتا ہے ، وہ اپنے میں ایک ایسی چیز پاتے ہیں ، جو اگلوں کی پیروی پر اُن کو مجبور نہیں ہونے دیتی ۔ ان کو قوم کی شاہ راہ کے سوا بہت سی راہیں ہر طرف کھلی نظر آتی ہیں ۔ وہ جس عام روش پر اپنے ہم فنوں کو چلتا دیکھتے ہیں، اس پر چلنے سے اُن کی طبیعت ابا کرتی ہے ۔ یہ ممکن ہے کہ جو طریق غیر مسلوک وہ اختیار کریں ، وہ منزل مقصود تک پہنچانے والا نہ ہو ، مگر یہ ممکن نہیں کہ جب تک وہ دائیں بائیں چل پھر کر طبیعت کی جولانیاں نہ دیکھ لیں اور تھک کر چور نہ ہو جائیں ، عام راہ گیروں کی طرح آنکھیں بند کرکے شارع عام پر پڑ جائیں ۔

مرزا کی طبیعت اسی قسم کی واقع ہوئی تھی ۔ وہ عام روش پر چلنے سے ہمیشہ ناک چڑھاتے تھے ۔ وہ خست شرکا کے سبب خود شاعری سے نفرت ظاہر کرتے تھے ، عامیانہ خیالات اور محاورات سے جہاں تک ہو سکتا تھا ، اجتناب کرتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مرزا کے اُردو کلام میں جیسا کہ اُوپر مذکور ہوا ، غزل کے سوا کوئی صنف شمار کے قابل نہیں ہے ۔ مرزا کی موجودہ غزلیات گو بہ مقابلہ بعض شعراء کے تعداد میں کیسی ہی قلیل ہوں، لیکن جس قدر منتخب اور برگزیدہ اشعار مرزا کی غزلیات میں موجود ہیں ، وہ تعداد میں کسی بڑے سے بڑے دیوان کے انتخابی اشعار سے کم نہیں ہیں اور جس قدر بلند اور عالی خیال مرزا کے ریختہ میں سے نکلیں گے ، اس قدر کسی ریختہ کے کلام میں نکلنے کی توقع نہیں ہے ؛ البتہ ہم کو مرزا کے عمدہ اشعار کے جانچنے کے لیے ایک جداگانہ معیار مقرر کرنا پڑے گا ۔ امید ہے کہ اہل انصاف تسلیم کریں گے ۔

میر و سودا اور ان کے مقلدین نے اپنی غزل کی بنیاد اس بات پر رکھی ہے کہ جو عاشقانہ مضامین صدیوں اور قرنوں سے اولاً فارسی اور اس کے بعد اُردو غزل میں بندھتے چلے آتے ہیں ، وہی مضامین بہ تبدیل الفاظ اور بہ تغیر اسالیب بیان عامہ ، اہل زبان کی معمولی بول چال اور

روز مرہ میں ادا کیے جائیں ، چنانچہ میر سے لے کر ذوق ، تک جتنے مشہور غزل گو مرزا کے سوا اہل زبان میں گزرے ہیں ، ان کی غزل میں ایسے مضامین بہت ہی کم نکلیں گے، جو اس محدود دائرے سے خارج ہوں۔ ان کی بڑی کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو مضمون پہلے متعدد طور پر بندھ چکا ہے ، وہی مضمون ایسے بلیغ اسلوب میں ادا کیا جائے کہ تمام اگلی بندشوں سے سبقت لے جائے۔ برخلاف اس کے مرزا نے اپنی غزل کی عمارت دوسری بنیاد پر قائم کی ہے۔ ان کی غزل میں زیادہ تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں ، جن کو اور شعراء کی فکر نے بالکل مس نہیں کیا اور معمولی مضامین ایسے طریقے میں ادا کیے گئے ہیں ، جو سب سے نرالا ہے اور ان میں ایسی نزاکتیں رکھی گئی ہیں، جن سے اکثر اساتذہ کا کلام خالی معلوم ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اور لوگوں نے اول سے آخر تک قوم کی شاہ راہ سے سر مو انحراف نہیں کیا اور جس چال سے کہ اگلوں نے طے کی تھی ، اسی چال سے تمام راستہ طے کیا ہے۔ مرزا نے اول شاہ راہ کا رخ چھوڑ دوسرے رخ چلنا اختیار کیا اور جب راہ کی مشکلات نے مجبور کیا تو ان کو بھی آخر اسی رخ پر چلنا پڑا ، مگر جس لیک پر قافلہ جا رہا تھا ، اس کے سوا ایک اور لیک اسی کے متوازی اپنے لیے نکالی اور جس چال پر اور لوگ چل رہے تھے، اس حال کو چھوڑ کر دوسری چال اختیار کی ؛ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب میر و سودا اور ان کے مقلدین کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اکتا جاتا ہے اور اس کے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں، تو اس میں ہم کو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے اور جس طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں یا ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جاکر ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے، اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے۔"

(مولانا الطاف حسین حالی : یادگار غالب : ۱۸۹۶ء)

"غالب فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کے نام آور شاعر ہیں۔ اُن کی فارسی کی غزل سرائی کی نسبت اظہار خیالات ہو چکا ہے۔ اب اُن کی اُردو

کی غزل سرائی کی کیفیت عرض کرنے کو ہے ۔ غالب اُن شاعروں میں ہیں، جو ہر صنف شاعری سے مناسبت رکھتے تھے مگر یہاں اُن کی اردو کی غزل سرائی زیر بحث ہے ۔ حضرت نے ذوق ، مومن ، ناسخ ، آتش اُن استادوں کے زمانے دیکھے اور ان سب اساتذہ کے بعد رحلت فرمائی ۔ ذوق سے شاعرانہ سابقہ بھی ظہور میں آیا ، مگر مومن سے کیا طور حضرت کا رہا ، فقیر کو نہیں معلوم ۔ ناسخ سے لطف مراسلات حاصل تھا ۔ آتش کے ساتھ موافقت یا مخالفت کی کوئی بات علم راقم میں نہیں ہے ۔ اُردو کی غزل سرائی کے اعتبار سے مرزا نوشہ بہت قابل توجہ شاعر ہیں ۔ اپنی غزل سرائی کی نسبت حضرت فرماتے تھے کہ ''غزل گوئی کی ابتدا نھی کہ ناسخ مرحوم کا دیوان دہلی میں پہلے پہل پہنچا ۔ شیخ کی سخن سنجی کی تمام شہر میں دھوم مچ گئی ۔ میں نے اور مومن نے اُن کا متبع ہونا چاہا ۔ ہم لوگوں نے شیخ مرحوم کے رنگ میں مشق کلام کرنا شروع کیا ، مگر شیخ کا رنگ ہم لوگوں میں نہ آیا ۔ مومن مشق کے بعد ویسے ہو گئے جیسا کہ اُن کا رنگ دیکھا جاتا ہے اور ہم میر کے رنگ میں در آئے ۔'' اس جگہ پر یہ امر قابل لحاظ ہے کہ مومن اور غالب کے عجز اور تتبع کا سبب اور کچھ نہ تھا ، الا یہ کہ دونوں شاعران نامی اقتاد طبیعت سے داخلی شاعری کے برتنے کی قابلیت رکھتے تھے ۔ پس ناسخ کی شاعری جو محض خارجی رنگ رکھتی ہے ، کیونکر اُن کی خلقی صلاحیت کے ساتھ موافق پڑتی ۔ بہر حال غالب کا یہ فرمانا کہ ہم میر کے رنگ میں در آئے ، واقعات کے بہت بعید نہیں ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کی غزل سرائی میں میر کی جھلک نمایاں ہے ۔ لاریب واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کے مضامین غالب قریب قریب میر صاحب کی پر تاثیری کے ساتھ باندھ جاتے ہیں ۔ مگر حالت یہ ہے کہ اُن کے مختصر دیوان میں بہت کم شعر ہیں ، جو میر صاحب کی سادگیٔ کلام کا لطف دکھاتے ہیں ۔ زیادہ حصّہ اُن کے کلام کا استعارات سے بھرا ہوا ہے ۔ اضافتوں کی وہ بھرمار ہے کہ بعض وقت جی گھبرا اُٹھتا ہے کہ اللہی اضافتوں کا سلسلہ کب ختم ہو گا ۔ الفاظ فارسی کی وہ کثرت دیکھی جاتی ہے کہ یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کے اشعار زیر نظر ہیں یا فارسی کے ۔ ان باتوں کے علاوہ کبھی کبھی اخلاق مضامین کا وہ عالم دکھائی دیتا ہے کہ ادراک اپنے فعل میں قاصر ہونے لگتا ہے ۔ بلا شبہ اُن کے ایسے

کلام کوئی لطف غزلیت نہیں رکھتے ۔ اگر اُن کے دیوان کا کوئی انتخاب جدید کیا جائے تو لازم ہے کہ ایسے ایسے مغلق اشعار خارج از دیوان کر دیے جائیں ۔ لیکن ان معائب سے گزر کر اگر اس یکتائے روزگار کے کلام کو انصاف کی نگاہ سے دیکھیے تو بھر حسن کی کوئی انتہا بھی نظر نہیں آتی ۔ واقعی جو سوز ، گداز ، خستگی ، درد ، برشتگی ، نشتریت ، بلند پروازی ، نازک خیالی ، مکنت ، متانت ، جلالت ، تہذیب ، شوخی غالب کے کلام میں ہے ، باستثنائے درد و میر کسی استاد کے کلام میں نہیں پائی ہے ۔ نشتریت تو ایسے غضب کی ہے کہ میر صاحب کے کلام میں بھی اس سے زیادہ نہ ہو گی ۔ پر تاثیری کا کیا کہنا ، دل بے اختیار چلا اٹھتا ہے کہ غزل سرائی اسے کہتے ہیں ۔ شوخی کا وہ عالم ہے کہ طبیعت بے چین ہوئی جاتی ہے ۔ عالی مذاق روح کو عالم بالا کی سیر دکھاتی ہے ۔ واردات قلبیہ کے مضامین کی خوبی جذباتی معاملات کے تماشے پیش نظر کر دیتی ہے اور مختصر یہ ہے کہ حضرت کے کمالات گوناگوں کا وہی قائل نہ ہو گا ، جسے قلبی نعمتوں سے فطرت نے محروم رکھا ہے ۔''

(سید امداد امام اثر : کاشف الحقائق معروف بہ بہارستان سخن : ۱۸۹۷ء)

''. . . غالب کی غیر معمولی شاعری بلا شبہ اس سے زیادہ شہرت کی حق‌دار ہے، جو اسے اب تک نصیب ہوچکی ہے اور یورپ کو بھی یہ جاننا باقی ہے کہ کچھ عرصہ پہلے ۱۸۶۹ء میں ایک ایسے شخص نے انتقال کیا، جس کے قصیدے انوری اور خاقانی کے ہم پلہ ہیں ۔ جس کی غزلیں عرفی اور طالب کی غزلوں سے بڑھ چڑھ کر ہیں ۔ جس کی رباعیاں عمر خیام کی رباعیوں کے برابر رکھنے کے قابل ہیں اور جس کی نثر ابوالفضل اور ظہوری کی نثر سے زیادہ شان دار ہے ۔

آخر ہمارے شاعر (غالب) کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں؟ اس کی نثر اور شاعری ، خودنوشت سوانح عمری کے ایسے ٹکڑے ہیں، جن سے ہمیں اس کی زندگی کے بارے میں بصیرت حاصل ہوتی ہے ، جو سراسر بیزاری اور شدید کشمکش کی زندگی تھی ۔ جہاں تک اس کے معاصرین کا تعلق ہے ، ان کی زندگی تکلیف دہ بے اعتنائی کی زندگی تھی اور جہاں تک اس کے دوستوں کا تعلق ہے ، ان کی امداد میں کم التفاتی کا جذبہ کار فرما تھا ۔ غالب لازماً

خود شناسی کا شاعر ہے ۔ وہ زندگی اور زندگی کے جملہ پہلوؤں کا گیت گاتا ہے ۔ وہ بادۂ ارغوانی اور جام کے گیت گاتا ہے ۔ وہ اپنے دل کو اپنے قارئین کے سامنے چیر کر رکھ دیتا ہے ۔ اور خود اپنی زندگی کی تلخیوں ، اپنی قسمت کی کوتاہیوں ، اپنی سراب نما امیدوں (جو کبھی پوری نہیں ہوئیں) ، اپنی عذاب میں ڈالنے والی فلاکتوں ، اپنی ناکام کوششوں ، اپنے شبہات ، جن میں کبھی کبھی خدا تعالیٰ کی نیکی اور انصاف پسندی کے مسرت بخش اعتقاد کی جھلک نمایاں ہو جاتی ہے ، اپنی شاعری کے لافانی ہونے پر ناقابل تسخیر اعتقاد کے نغمے گاتا ہے ۔ الغرض اس کی نثر اور شاعری اس کے مختلف اور تغیر پذیر حالات کی یاد داشتیں ہیں ۔ اس میں کبھی پر مسرّت توقع کی کیفیت پائی جاتی ہے اور کبھی ایسی تیرگی کی ، جس کی تھاہ نہیں ملتی ۔

غالب اعلیٰ درجے کا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجہ کا نثار بھی ہے ۔ وہ ہمارے دور کا سب سے بڑا نثر نگار ہے ، اتنا بڑا کہ اس کا کوئی مدمقابل نہیں ۔ اس کی دل‌فریب لطافت ، اس کی مسرت بخش سادگی ، اس کی نکتہ سنجی اور ظرافت ، اس کی دل کش روانی ، اس کا ہلکا پھلکا انداز بیان ، اس کی بے ساختگی اور دل ربائی ، یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ ان سے سبقت لے جانے والا توکیا حریف بھی پیدا نہیں ہوا ۔ یہ مبالغہ آمیز تعریف نہیں ہے بلکہ وہ ممتاز رائے ہے ، جو اس کے ممتاز سوانح نگار حالی پانی پتی نے قائم کی ہے ۔ اس کے علاوہ غالب کے کلام کا ایک اور پہلو ہے جس پر ہم یہاں اظہار خیال کر سکتے ہیں ۔ اس کے خیالات نہایت بلند ، دقیق اور نازک ہیں اور وہ اتنے ہی خودرو ہیں، جتنےکہ وہ الفاظ حسین ہیں، جن میں ان کو ادا کیا گیا ہے ۔ اس کے اردو اور فارسی دیوان ادبی جواہرات ہیں ، دودھیا پتھر ، یاقوت رمانی اور نیلم ، سب ایک مرکب کی صورت میں پیش کیے گئے ہیں ۔"

(صلاح‌الدین خدابخش Ghalib : An Appreciation (۱۹۱۲ء) : اردو ترجمہ از ضیاءالدین احمد برنی ، ماہ نو ، کراچی : فروری ۱۹۵۷ء)

"فلسفہ کے نام سے گھبرائیے نہیں ۔ فلسفہ موٹے موٹے نامانوس لغات کا معمہ ثقیل و مغلق اصطلاحات کا نام نہیں ، فلسفہ نام ہے ، خود شناسی

کا ، زینہ ہے خدا شناسی کا ۔ ہم کون ہیں ؟ کیا ہیں ؟ ہمارے گرد و پیش کیا ہے ؟ ہمارے جذبات کیا ہیں ؟ عادات و اطوار کیا ہیں ؟ خدا کیا ہے ؟ ماسوا کیا ہے ؟ بس یہی روزمرہ کے مسئلے ہیں ، جن سے ہم کو ، آپ کو ، سب کو دو چار ہونا پڑتا ہے ، کبھی جان کر ، اور کبھی انجان ۔ انہیں عقلی اصول پر ایک خاص نظام کے ماتحت ترتیب دے لیجیے اور لیجیے آپ فلسفی ہو گئے ۔ پھر غالب غریب ، کانٹ اور ہیگل کے کینڈے کے تو انسان تھے بھی نہیں ۔ ایک خوش باش ، زندہ دل ، خوش فکر ، طبیعت دار آدمی ۔ باتیں کرتے تو ذرا گہری ، نظر سطح کی نہیں ، عمق کی عادی ۔ چھلکے پر پڑ کر پھسل جانے والی نہیں ، مغز تک پہنچ جانے کی خوگر ۔ سوجھ بوجھ غضب کی ۔ اپنے ان حکیمانہ تجربوں اور عارفانہ مشاہدوں کو ادا کرتے ، تو کبھی پیاری نثر میں ، کبھی دل آویز نظم میں ۔ کبھی شعر کا ساز ہاتھ میں اٹھا لیتے ، کبھی نثر کے مائیکروفون کو منہ لگا لیتے ۔ شہرت شاعری کی زیادہ ہو گئی ، ورنہ تحقیق کی زبان سے روایت یہ سننے میں آئی ہے کہ نظم و نثر دونوں کے ماہر تھے ، مالک تھے ، بادشاہ تھے ۔ نثر لکھنے بیٹھے تو قلم میں یہ قدرت کہ جب چاہا روتوں کو ہنسا دیا ۔ جب چاہا ہنستوں کو رلا دیا ۔ شعر کہنے پر آئے تو زبان میں یہ اثر کہ سننے والوں کو لٹا دیا ، مرجھائے دلوں کو کھلا دیا ! فطرت بشری کے راز دار ہی جو ٹھہرے اور حکمت و معرفت کے شیدائی ۔ معنویت کے بول لطافت و ظرافت کے سروں میں الاپتے ۔ ابھی آہ کا رنگ جما دیا ، ابھی واہ کا نقش بٹھا دیا ۔ یہی ان کی حکمت ، یہی ان کا فلسفہ ، یہی ان کی شاعری کا پیام ، یہی ان کی زندگی کا کارنامہ ۔''

(مولانا عبدالماجد دریا آبادی : ادیب ، الہ آباد : ۱۹۱۳ء)

''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ، مقدس وید اور دیوان غالب ۔ لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں ، لیکن کیا ہے ، جو یہاں حاضر نہیں ، کون سا نغمہ ہے ، جو اس کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے ۔ شاعری کو اکثر شعرا نے اپنی اپنی حد نگاہ کے مطابق حقیقت اور مجاز ، جذبہ اور وجدان ، ذہن اور تخیل کے لحاظ سے تقسیم کیا ہے، مگر یہ تقسیم خود ان کی نا رسی کی دلیل ہے ۔ شاعری انکشاف حیات

ہے، جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں، شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعین ہے۔

جمال الٰہی ہر شے میں رونما ہوتا ہے۔ آفرینش کی قدرت جو صفات باری میں سے ہے، شاعر کو بھی ارزانی کی گئی ہے۔ جہاں ملائکہ کارخانۂ ایزدی میں پوشیدہ حسن آفرینی میں مصروف ہیں، شاعر یہ کام علی الاعلان کرتا ہے۔

اس لحاظ سے مرزا کو ایک رب النوع تسلیم کرنا لازم آتا ہے۔ غالب نے بزم ہستی میں جو فانوس خیال روشن کیا ہے، کون سا ''پیکر تصویر'' ہے، جو اس کے ''کاغذی پیراہن'' پر منازل زیست قطع کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔

۰۰۰ مرزا غالب کے الفاظ لعل و جوہر سے بھی گراں ہیں۔ مرزا غالب اس بات سے خوب واقف ہیں کہ مترادفات کو محض مؤلفات لغت نے طلبہ کی سہولت کی غرض سے وضع کر لیا ہے، ورنہ ایک معنی کے دو الفاظ کسی زبان میں نہیں ہیں۔ توام بچے کتنے ہی ہم صورت ہوں، ان کو ایک دوسرے کی عارضی غیر حاضری میں بھی ایک سمجھنا فاش غلطی ہے۔ مرزا الفاظ کے نازک سے نازک فرق کو خوب جانتے ہیں۔ وہ ادیبان فرانس کی طرح عقیدہ (Most Proper) کے پابند اور قایل ہیں۔ دیوان کے مطالعے سے معلوم ہو گا کہ مرزا نے ایک لفظ جہاں تک ہو سکا ہے، دوبارہ استعمال نہیں کیا۔ اس کی وجہ سحبان وائل کی طرح یہ نہیں ہے کہ وہ کسی لفظ کی تکرار نہیں کرتے بلکہ یہ ہے کہ وہ کسی خیال کا اعادہ نہیں کرتے۔

جہاں مرزا نے الفاظ میں نادر اور شستہ تصرفات سے کام لیا ہے، وہیں تشبیہات اور استعارات میں بھی عام پابندی سے گریز کیا ہے۔ تشبیہات اور استعارات کی بنیاد قیاس پر قائم ہے۔ تشبیہ یا استعارے کا پہلا کام معنی آفرینی ہے۔ کسی امر کو کتنا ہی واضح بیان کیا جائے، ذہن مفہوم کے پانے سے قاصر رہتا ہے لیکن ایک مشابہ مثال کام دے جاتی ہے۔ بہت سے دشوار اور غریب اشعار حل نہیں ہوتے لیکن ایک مقابل شعر فوراً مضمون کو آئینہ بنا دیتا ہے۔ تشبیہ یا استعارے کا دوسرا

کام حسن آفرینی ہے۔ تشبیہات اور استعارات تصویر نظام کے بو قلموں الوان ہیں ، جن کی آمیزش بغیر تصویر اکثر تکمیل حیات کو نہیں پہنچتی اور بے رنگ رہ جاتی ہے۔ تشبیہ یا استعارے کا تیسرا کام اختصار اور بلاغت پیدا کرنا ہے۔ جو بات دو لفظوں میں ادا ہو جاتی ہے ، دوسری طرح دو سطروں میں بیان نہیں ہو سکتی۔

مرزا غالب کی چشم بینا قدرت کو تمام نقاط نگاہ سے دیکھتی ہے اور ہر نظر میں ایک نیا جلوہ پاتی ہے۔ جو شعرا قدرت کے ترجمان ہیں ، ان میں سے اکثر سعدی اور ورڈزورتھ (Wordsworth) کی طرح قدرت سے تماشائے بہار و خزاں ، باغ و راغ ، کہسار و آبشار مراد لیتے ہیں۔ غالب کے مشاہدات کنار دریا ، دامن کوہ ، لب جو سے بہت کم متعلق ہیں۔ مرزا کا جی لب دریا ، خاموش مرغزاروں سے زیادہ شہروں کے پر شور کوچوں میں لگتا ہے ، جہاں زندگی شعاع منتشر کی طرح ہفت رنگ جلوہ دکھاتی ہے۔ مرزا کے نزدیک دلی کی گلیوں کی رونق یا ویرانی ، خوش وقتی یا افسردگی ، شورش یا خاموشی خود ان کے اپنے احساسات کی خارجی تصویریں ہیں۔ جو صورتیں ادھر اُدھر رواں دواں نظر آتی ہیں ، وہ مرزا کے نزدیک ان کے اپنے خیالات کے مجسمات ہیں۔ ان کو القا کے لیے سرو و چنار کو شب ماہ ، لب آب ، صحبت یار میں با ساغر و نے دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اگر کسی بنتی ہوئی عمارت پر نصب شدہ جر ثقیل کا آہنی حلقہ بھی رسی میں آویزاں دیکھتے ہیں تو ان کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا سیمرغ اپنا چنگل آسمان سے تارے توڑنے کے لیے دراز کر رہا ہے۔ جن مظاہر قدرت کو مرزا دیکھتے ہیں اور شعرا یا تو ان کو عام خیال کرکے ان پر غور ہی نہیں کرتے یا ان میں اس درجہ شعریت نہیں پاتے کہ ان کی کیفیت کو اپنے کلام میں بیان کریں اور اگر کرتے ہیں تو کامیاب نہیں ہوتے۔"

(ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری : مقدمہ دیوان غالب جدید المعروف بہ نسخہ حمیدیہ مرتبہ مفتی محمد انوار الحق : ۱۹۱۹ع)

"کلام غالب کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہو گا کہ اس کا اصلی رنگ ذہنی اور دماغی ہے۔ زندگی بھر شاعر کی یہ آرزو رہی کہ

وہ فکر و اظہار میں اچھوتا معلوم ہو اور ایک لحاظ سے اس کا یہ مقصد پورا بھی ہوا ، لیکن اس سے اس کی شاعری ماری گئی - اس کے اُردو کلام میں شاعری سے زیادہ فن بلکہ صنعت گری نمایاں ہے اور احساس سے زیادہ فکر و تخیل یا خیال آرائی کے آثار پائے جاتے ہیں - جہاں احساس کے نشان پائے بھی جاتے ہیں ، وہاں عقل کا رنگ چڑھانے کی محسوس کوشش ظاہر ہوتی جاتی ہے - حالی کی اردو تنقیدوں نے غالب کو عجیب و غریب قوتوں سے مالا مال کر دیا - یہ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے شاعرانہ لطف کی خاطر وہ تمام کائنات کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے -

''لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے ، جو یہاں حاضر نہیں ہے - کون سا نغمہ ہے ، جو اس ساز زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ہے -''

یہ چیز رہ رہ کر فضا میں گونجتی رہتی ہے -

رہا دیوان سو اس کی کہانی سیدھی سادی ہے - ہر زمانے میں غزل گو شعرا نے شیخ و برہمن کی پھبتیاں اُڑائیں ، صوفیوں اور فلسفیوں کی شان اختیار کی ، فلک پر شکایتوں کے تیر برسائے ، اپنی شاعرانہ برتری کے گیت گائے ، عاشق کا سوانگ بھرا ، ساغر کے دور چلائے اور اسی قسم کے بہت سے تماشے کیے - غالب نے اس پامال راستے سے کچھ زیادہ کنارہ کشی نہیں کی - وہی پرانے موضوع اس کو اپنی شاعرانہ جولانی کے لیے ہاتھ آئے - البتہ ان پر اس نے عقل کے نئے پردے ڈال دیے - اگر اس نے کوئی نئی زمین تلاش بھی کی ، تو وہ یاس و حرماں کی زمین تھی - نئی زمین تلاش کرنے سے ہماری یہ مراد ہے کہ حرماں نصیبی کے پرانے موضوع نے اس کی اندرونی اطمینانی سے ایک شخصی رنگ اختیار کر لیا - یہ وہ مقام ہے ، جہاں وہ الگ کھڑا ہوا نظر آتا ہے اور ایک ایسے شخص کی تصویر پیش کرتا ہے ، جو زندگی کے مادی پہلو سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے ، لیکن حالات اور دنیاوی خواہشات پر مسلط ہونے والی دیوبان اس کی راہ میں حائل ہیں -

کلام غالب تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے - پہلا حصہ ان اشعار پر مشتمل ہو سکتا ہے ، جو رسمی طرز میں علانیہ ذہنی مشق کا نتیجہ ہیں - یہی وہ بلند پروازیاں ہیں ، جو غزل گوئی کا میدان جیتنے کی

خاطر شاعر نے دکھائیں اور جن کا ذکر حالی نے 'یادگار غالب' میں کیا ہے - یہاں شاعر غزل گوئی کے وہی پرانے ڈگر سے گزرتا نظر آتا ہے - وہ کبھی پھبتیاں اڑانے میں مصروف ہے ، تو کبھی عاشق کے روپ میں جلوہ گر ہے - کبھی صوفی بنتا ہے اور کبھی فلسفی - غرض کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ - لیکن چونکہ وہ جدت طرازی پر تلا ہوا ہے ، اس لیے اپنے ہر رسمی پہلوئے سخن پر عقلی قبا اوڑھا دیتا ہے -

کلام غالب کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ اس کا حیرت انگیز تنوع ، جسے ڈاکٹر عبدالرحمٰن نے نہایت نفیس طریقے سے بیان کیا ہے : "لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں - لیکن کیا ہے، جو یہاں حاضر نہیں - کون سا نغمہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں ۔" مرزا کی شاعری بیشتر عشق و محبت کا بیان ہے - لیکن منطقی آئے تو اس کے لیے یہاں دلائل و براہین ہیں - شگفتہ طبع لوگوں کے لیے شوخی و ظرافت اور انسانی فطرت کی داستان سننا ہو تو یہاں وہ پتے کی باتیں ملیں گی ، جن کا لطف جوں جوں چشم بصیرت کھلتی جائے گی، بڑھتا جائے گا - یہی وجہ ہے کہ دیوان غالب میں ہر شخص اپنی تصویر دیکھتا ہے اور لطف اٹھاتا ہے -

لیکن ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ اس ساز میں نغموں کی فراوانی اور ہر نغمے کی دل آویزی کی وجہ یہ ہے کہ کلام غالب سنی سنائی باتوں کا بیان نہیں ، بلکہ قلب غالب کے مشاہدات کا آئینہ ہے - اس رباب پر دست قدرت نے ایک ایک کرکے سارے سر بجائے ہیں اور دیوان غالب انھی سروں کی صدائے باز گشت ہے :

زخمہ بر تار رگ جاں میزنم
کس چہ داند یا چہ دستاں میزنم

(شیخ محمد اکرام : غالب نامہ : ۱۹۳۶ء)

غالب کے اردو اور فارسی کلام میں حسن و عشق کو ایک نمایاں جگہ حاصل ہے - تعداد کے لحاظ سے پورے کلام میں اس مضمون کے اشعار آدھے تو نہیں مگر ایک تہائی کے قریب ضرور ہوں گے - ان اشعار میں وہی تنوع ، جدت طرازی اور نکتہ آفرینی نظر آتی ہے ، جو دیوان اور کلیات

کے دوسرے مضامین کا امتیاز خاص ہے ۔ اگر مرزا غالب اپنے کلام کا صرف یہی حصہ چھوڑ جاتے تو بھی اُن کا شمار دنیا کے بڑے شاعروں میں ہوتا ۔ ان اشعار میں محض رنگا رنگ طلسمات کے بند دروازے ہی نہیں کھلتے، ان میں شاعری کی ایک نئی دنیا کا انکشاف ہے ۔ اس دنیا کی آب و ہوا ہر طبیعت کو سازگار نہیں ہے اور نہ ہو سکتی تھی ، لیکن اس کی وسعت اور بوقلمونی کا یہ عالم ہے کہ ہر موقع کی مناسبت سے دل کشا مناظر بکثرت ملتے ہیں ۔ انسانی فطرت کے نا محدود پہلو جذبۂ عشق کے ماتحت جس جس طرح سنورتے ، بگڑتے ، پگھلتے اور ڈھلتے ہیں ، اُس کی ترجمانی میں شاعر نے اپنا تمام جوش تخیل اور پورا زور قلم صرف کیا ہے ۔

غالب کے کلام میں اجتہاد کے پہلو بہ پہلو روایت کی پاس داری سے جو شغف ہے، وہ عشقیہ شاعری میں بھی قائم نظر آتا ہے ۔ غزل کے روایتی عاشق ، مجنوں سے لے کر پروانے تک اور روایتی معشوق ، لیلیٰ سے لے کر شمع محفل تک ، سبھی یہاں موجود ہیں ۔ ان اشعار کا پس منظر مغلیہ دور کی وہی معاشرت ہے ، جو غالب کے معاصرین کے کلام میں بھی جھلکتی ہے ، اس فرق کے ساتھ کہ غالب کے بیان میں اسے زیادہ وسعت ، شدت اور وضاحت میسر ہوئی ہے ۔ لیکن یہ درجے کا فرق ہے ، کیفیت کا نہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ معاشرتی پس منظر کے لحاظ سے غالب اور اُس کے ہم عصر شعرا میں ایک بنیادی اشتراک ہے ۔ اس مشترک کیفیت کے ہوتے ہوئے بھی غالب کی شاعری میں حسن و عشق کا ایک الگ مقام ہے - اس کی وجہ یہی ہے کہ شاعر کی اپنی شخصیت کی یکتائی نے اس حصۂ کلام کو بھی ایک بالکل دوسری سطح پر پہنچا دیا ہے ۔

غالب کی ہاتھ انسانیت کی نبض پر ہے اور یہ نبض آج بھی اُسی طرح چلتی ہے، جس طرح سو برس ، پانچ سو برس، ایک ہزار برس پہلے چلتی تھی - عشق کلیوں سے نکل کر محل سراؤں میں پہنچ جائے تو صرف اس کا خول بدل جاتا ہے ، مغز نہیں بدلتا ۔ غالب کی شاعری میں عشق کا جو ڈراما ہمیں ملتا ہے، اُس کا پس منظر چھوٹے چھوٹے اشاروں ، چھپے چھپے کنایوں کی روشنی میں بتدریج واضح ہونے لگتا ہے اور بالآخر گزری ہوئی صدیوں کا وہ نا موجود ماحول اس طرح زندہ ہو جاتا ہے کہ مغلیہ ہندوستان کی زندگی کے عیش و نشاط اور لطافت و کثافت کا پورا ڈراما ہمارے سامنے

آ جاتا ہے ۔ شاعری تاریخ نہیں ہوتی لیکن غالب کا کلام اسلامی ہندوستان کی سماجی اور روحانی تاریخ کا خلاصہ ہے ۔ جس کا جی چاہے آج بھی غالب کے اشعار کے بین السطور میں اس پرانی زندگی کو ایک بار پھر زندہ دیکھ لے ۔ با ایں ہمہ ایک بنیادی حقیقت کبھی نہیں بھولنی چاہیے اور وہ یہ کہ گو غالب کی شاعری میں عہد مغلیہ کے رسم و رواج نے انسان کا چہرہ اپنے مخصوص آب و رنگ سے چمکایا ہے لیکن ان اشعار میں اس چہرے کا پیدائشی نور آج بھی اُسی طرح قائم ہے ، جس طرح ایک سو برس پہلے تھا ۔''

(پروفیسر حمید احمد خاں : ہمایوں ، لاہور : جنوری ، فروری ۱۹۴۹ء)

''مجھ سے اگر یہ پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا : غالب ، اُردو اور تاج محل ۔ یہ ہندوستان کی تہذیبی پیداوار ہیں اور سوا ہندوستان کے کہیں اور ظہور نہیں پا سکتے تھے ۔ ان تینوں میں ہندوستان کی صوری اور معنوی امتیازات جھلکتے ہیں ۔

غالب نے طویل عمر پائی اور اس زمانے میں طویل عمر پائی ، جو دم بہ دم منہدم اور متغیر ہو رہا تھا ۔ وہ میر نہ تھے کہ عہد کے حادثات اور خود اپنے حادثات سے تمام عمر جانبر نہ ہوتے ۔ وہ ذوق نہ تھے کہ شاعری کے ڈھرے سے جدا نہ ہو سکے ۔ وہ مومن نہ تھے کہ حباب بر نقش بناتے رہے ۔ وہ ظفر نہ تھے کہ سلطنت ہاتھ سے نہ جاتی تو شاید شاعری میں کوئی جگہ پیدا نہ کر سکتے ۔ ظاہر ہے ، غالب صرف شاعر نہ رہے ہوں گے ، بہت کچھ اور بھی رہے ہوں گے ۔

وہ ہر چیز کے بڑے دلدادہ تھے ، فارسی کے اپنے ذوق و زبان پر بھروسہ اور فخر کرتے تھے ۔ آگرہ سے دلی آئے تو دلی کے شاعروں اور زبان دانوں سے ٹکر ہوئی ۔ کلکتہ پہنچے تو فارسی دانوں سے پرخاش چھڑی سیاسی داروگیر کی زد میں آئے ۔ خاندان کے نزاعی مقدمات میں الجھے رہے ۔ ایک سلسلے میں جیل خانے کی مصیبت اور رسوائی جھیلی ۔ کلکتہ میں مغرب سے آنے والی طرح طرح کی ہواؤں سے سابقہ رہا ۔ غدر میں لٹے ، تنگ دستی نے مرتے دم تک ساتھ نہ چھوڑا ۔ انگریزوں کی خدمات میں معروضات پیش کیے اور قصیدے گزرانے ، والیانِ ریاست کے حضور میں گڑ گڑائے ، ان قدروں کو مسمار ہوتے دیکھا ، جن کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے ، لیکن نہ وہ میر بنے ، نہ فانی ، نہ یاس چنگیزی وہ تمام حوادث کو :

مرے دریائے بےتابی میں ہے اک موج خوں وہ بھی

کہہ کر بقول حالی حیوان ظریف (ستم ظریف) ہی رہے - ستم ظریف ہونا اور رہنا امتیاز ہے ، جو غالب کے زمانے میں غالب کے سوا اور کہیں نظر نہیں آتا -

غالب نے غزل کو تہذیب کا درجہ دیا - جس سے آج ہمارے اچھے سے اچھے شاعر کو مفر نہیں - غزل اب اتنی صنف کلام نہ رہی جتنی وہ اردو کی تاثیر اور تقریر بن گئی ہے - غالب نے نظم و نثر دونوں کو دلیری بھی دی اور دلبری بھی - غزل کی تقدیر غالب ہی نے متعین کی اور اس کو ایک ایسی فضا دی ، جہاں اردو کے تمام ممکنات شعری و شاعری کو برگ و بار لانے کے سامان اور سہولتیں فراہم ہیں -" ۰

(پروفیسر رشید احمد صدیقی : کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا
(علی گڑھ میگزین غالب نمبر : ۱۹۴۹)

میں اُردو میں غالب کی شخصیت کو پہلی بھرپور اور جاندار ادبی شخصیت کہتا ہوں ، جس کا ہر پہلو ہمارے لیے دلچسپی اور لطف کا سامان رکھتا ہے - اُن کی رومانیت اُنھیں تجربات و کیفیات کی نئی نئی فضاؤں میں لے جاتی ہے - اور اُن کا تنقیدی شعور اس میں کلاسیکل ضبط و نظم پیدا کر دیتا ہے - اُن کی انانیت میں انفرادیت کی بہاریں ہیں - اور برنارڈ شا کی انانیت کی طرح کیف و انبساط کا سامان - اُن کی شاعری میں فکر کا گہرا سرمایہ ہے، جو شاعرانہ لطافتوں کے ساتھ سمویا گیا ہے - وہ ادب کی روایات سے یکسر باغی نہ ہوتے ہوئے بھی ان کے پابند نہیں ہیں - وہ زندگی کے تجربات میں کوئی وحدت تو نہ پیدا کر سکے ، کوئی فلسفۂ زندگی تو پیش نہ کر سکے، مگر ان کا فلسفیانہ اور حکیمانہ مزاج ہمیں زندگی کو سمجھنے اور اس کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے - وہ ادب کو ہمارے یہاں پہلی مرتبہ زندگی میں ایک بڑا مقام دیتے ہیں اور اس طرح زندگی کی ایک اہم خدمت انجام دیتے ہے - وہ گہرے اور ہلکے ، ہر قسم کے نقش تیار کر سکتے ہیں - ان میں دیو زادوں کی وسعت خیال اور جوہریوں کی سی مینا کاری دونوں مل جاتے ہیں - ان کی شاعری ، ہمیں زندگی میں آسودگی ، اطمینان و سکون ، قنوطیت ، انفعالیت کی طرف نہیں لے جاتی -

ایک لطیف ذہنی خلش ، ایک بے چینی ، ایک تجسس ، ایک آزاد انداز نظر کی طرف مائل کرتی ہے ۔ ان خطوط میں ہمیں فن کاری کی وہ جرأت و صداقت ملتی ہے ، جو اپنے سامنے سے ہر حجاب کو اُتارنے کے لیے تیار رہتی ہے ۔ جو ایسی ہی نظر آنا چاہتی ہے ، جیسی وہ ہے ۔

بیسویں صدی کی اُردو نثر و نظم میں غالب کے اشارات سے کیسے کیسے نقش و نگار بنائے گئے ہیں ، اُن کے اجمال کی کیسی کیسی تفصیلات ملتی ہیں ، نثر و نظم دونوں میں گہرائی کے لیے لوگ اب بھی غالب کے کس قدر ممنون احسان ہیں ، اس کے متعلق زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں غالب اب بھی ہمارے شریک غالب ہیں ۔

(آل احمد سرور : علی گڑھ میگزین ، غالب نمبر : ۱۹۴۹ع)

''ادب و شعر میں مرزا کی رفعت و برتری اب کسی شرح کا محتاج نہیں رہی ۔ جامعیت ان کی نمایاں ترین خصوصیت ہے ۔ بے شائبہ مبالغہ ہندوستان نے امیر خسرو کے بعد ان جیسا جامع شخص پیدا نہیں کیا ۔ وہ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں کے یگانہ شاعر تھے ۔ حافظ اور نظیری کی طرح محض غزل اور قصیدے ہی میں نہیں بلکہ تمام اصناف سخن میں ان کی رفعت مرتبت سب کے نزدیک مسلم ہے ۔ غزل ، قصیدہ ، رباعی ، مثنوی ، ترکیب بند ، ترجیع بند ، قطعہ ، مرثیہ ، نوحہ وغیرہ کوئی صنف نظم نہیں ، جس میں ان کا پایہ یکساں بلند اور مختلف اصناف کے مشاہیر اساتذہ کے برابر نہ ہو ۔ اُردو نظم میں اگرچہ ان کا کلام تھوڑا ہے لیکن جتنا ہے ہر لحاظ سے اُردو زبان کا گراں بہا ترین سرمایہ ہے ۔ پھر مرزا فارسی نثر کے یگانہ ادیب تھے ۔ فارسی کلیات نثر میں ہر رنگ اور ہر انداز کی نثریں موجود ہیں ۔ ابوالفضل کا سرمایۂ شہرت صرف نثر نگاری تھا ۔ مرزا نثر میں اس سے پیچھے نہیں اور نثر نگاری ان کے کمالات فطری کی بہار آفرینی کا محض ایک کرشمہ ہے ۔ اُردو نثر میں ان کے صرف مکاتیب ہیں یا چند تقریظیں اور دیباچے ۔ لیکن حسن کلام ، لطف بیان ، روانی و انسجام ، بے ساختگی اور دل آویزی میں نثر کا ایسا جلیل الشان مجموعہ نہیں مل سکتا ۔

(مولانا غلام رسول مہر : خطوط غالب : ۱۹۵۱ع)

''جب بھی غالب کی شاعری کا ذکر آتا ہے تو ہماری نظر سب سے پہلے یا تو ان کے کلام کی آفاقیت پر جاتی ہے ، جہاں وہ پوری انسانیت کے ترجمان ہیں یا پھر ان کے کلام کے ایسے حصوں پر ، جہاں انھوں نے انسان کے عنصری جذبات کی ترجمانی کی ہے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ غالب کی وسیع النظری اور نفسیاتی ژرف بینی دونوں ہی لائق صد تحسین و داد ہیں اور ان کی بقائے دوام کے ضامن ۔ لیکن تاوقتیکہ ہم ان کے کلام کی تاریخی اہمیت کو نہ جانیں ، یا یہ کہ انھیں ایک مخصوص تاریخی تہذیبی ماحول میں لکھ کر نہ دیکھیں ، اس کا خطرہ باقی رہتا ہے کہ کہیں ہماری وہ تحسین ، تحسین ناشناس بن کر نہ رہ جائے کیوں کہ کسی بھی شاعر کے کلام کی عمومیت اور آفاقیت اپنی قوم اور تاریخ زندہ اور ہم عصر تاریخ سے بے نیاز ہونے میں نہیں بلکہ اس سے دست و گریباں ہونے ، اس کی کشمکش کو سمجھنے اور پھر اسے عالمی تہذیب کے ارتقائی رجحانات سے نسبت دینے میں ہے ۔''

(ممتاز حسین : غالب ایک تہذیبی قوت)

''محض نفسیاتی مطالعہ غالب کے شعور کی بنیادوں تک پہنچنے میں پوری طرح مدد نہیں دیتا ، اس سے اس وقت مدد مل سکتی ہے، جب غالب کے ماحول کا مطالعہ صحیح ہو ۔ ان خارجی عوامل کا صحیح یا تقریباً صحیح تجزیہ کر لیا گیا ہو ، جو تجسس پسند ذہن کے انفرادی ، اجتماعی اور طبقاتی شعور کی تشکیل کرتے ہیں ۔

. . . غالب نے نظم و نثر میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی معلومات محض کتابی نہیں ، بلکہ اپنی ذہانت اور ذاتی تجربہ کی وجہ سے وہ تصورات سے آگے جانا چاہتے تھے ۔ نئی باتوں کو سمجھنا اور نئی انجمنوں سے دلچسپی لینا چاہتے تھے ۔ چنانچہ جب ان کی آخری عمر میں دہلی سوسائٹی قائم ہوئی تو اپنی ضعیفی اور معذوری کے باوجود، انھوں نے اس سے دلچسپی لی اور کوشش کی کہ لاہور کی انجمنوں کے متعلق معلومات فراہم کریں ۔ وہ اخبارات پڑھتے اور دنیا کی خبروں سے با خبر رہنا چاہتے تھے ۔ اسی وجہ سے وہ اس بات سے واقف تھے کہ اگر

بے عملی کی زندگی ختم ہو جائے تو کچھ نہ کچھ ہو رہے گا ۔ دنیا امکانات سے بھری ہوئی ہے ۔"

(پروفیسر سید احتشام حسین : غالب کا تفکر ، تنقید اور عملی تنقید : ۱۹۵۵)

"اُردو میں غالب کی آواز پہلی آواز ہے ، جو دل و دماغ دونوں کو مخاطب کرتی ہے ، چونکاتی ہے ، غالب کے اشعار احساس اور فکر دونوں کو چھیڑتے ہیں اور دونوں کو آسودہ کرتے ہیں ۔ غالب کو اُردو کا پہلا مفکر شاعر کہنا غلط نہ ہوگا ۔ اس کے کلام کے مطالعے سے ہم کو یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کی زندگی میں جذبات یا جذباتی سپردگی ہی سب کچھ نہیں ۔ بلکہ ہم کو ہمت کے ساتھ اپنے تمام خارجی حادثات و حالات اور ذہنی کوائف و واردات کا جائزہ لینا چاہیے اور ان کی اصلیت پر عارفانہ عبور حاصل کرنا چاہیے ۔"

(پروفیسر مجنوں گورکھ پوری : دیوان غالب اور اُردو غزل : ۱۹۵۶)

"مرزا (غالب) کی مقبولیت زیادہ تر ریختہ کے مرہون منت ہے ۔ اس کلام کی مقدار بہت کم ہے ۔ لیکن کسی شاعر کا مرتبہ مقدار کلام سے معین نہیں ہوتا ۔ بلکہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کے منتخب اشعار کس درجے کے ہیں ۔ اس دیوان میں کثرت سے بیدلیت کے رنگ کے معانی اشعار موجود ہیں اور کثرت سے ایسے اشعار بھی ہیں ، جو روایتی عاشقانہ شاعری اور اور قافیہ پیمائی کے سوا کوئی اور حیثیت نہیں رکھتے ۔ لیکن جا بجا نایاب موتی بکھرے ہوئے ہیں ، جن کو جمع کیا جائے تو افکار و تاثرات کا ایک گنجینہ بن جاتا ہے ۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ غالب کا کوئی خاص فلسفہ بھی تھا ۔ ہاں یہ دیکھ سکتے ہیں کہ کس قسم کے فلسفیانہ افکار کا اس کے کلام میں غلبہ نظر آتا ہے ۔ اس نے خود کوئی خاص فلسفہ پیدا نہیں کیا ۔ البتہ جو فلسفیانہ نظریات دنیا میں موجود تھے اور جن سے وہ آشنا تھا ، ان میں سے توحید وجودی یا وحدت وجود کا فلسفہ اس کو کسی قدر قرین قیاس اور دلنشیں

معلوم ہوتا ہے کہ اردو اور فارسی کلام میں اس نے اس ایک رنگ کے مضمون کو سو ڈھنگ سے باندھا ہے۔"

(ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم : افکار غالب : ۱۹۵۶ء)

"غالب کی غزل میں ایک عیش دوست مگر سخت کوش امیر زادے، کی تصویر ہمیں ملتی ہے، جسے زندگی سے محبت ہے۔ یہ امیر زادہ عیش دوست ہونے کے باوجود خوش مذاق بھی ہے۔ مگر اس کوچے میں وہ اعلیٰ پسند ہے اور عظمت کا دلدادہ ہے۔ رند مشرب ہے مگر وضع و دستور کو قید کی حد تک نباہنا جانتا ہے۔ اس کی ہر بات میں ذہانت اور ذہن کی شوخی پائی جاتی ہے۔ وہ زندگی سے گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ زندگی کا جو رخ ہو، اُس سے گہرا شغف رکھتا ہے۔ خوشی سے بھی اور غم سے بھی۔ کیونکہ دونوں زندگی کے دو رخ ہیں۔"

(ڈاکٹر سید عبداللہ : ۱۹۵۸ء)

"اردو شاعری کی تاریخ میں غالب کو جو مقام حاصل ہے، اس کی عظمتوں کا اعتراف کرنا اور اس کی شاعری کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا ہمارے گذشتہ تقریباً پون صدی کے تنقیدی شعور کی ایک مسلسل کوشش رہی ہے۔ پرانے دور کے شعرا میں، غالب وہ تنہا شاعر ہے، جو اس تمام عرصے میں ہمارے نقادوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا ہے اور وہ اسے عموماً اردو کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے رہے ہیں۔ اردو تنقید کا جدید ترین دور شاید اس رائے سے اتفاق نہیں کرے گا کیونکہ وہ ہمیں خود غالب کے الفاظ میں یہ یاد کرانے کی کوشش میں ہے :

کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

بلکہ اسے یہ اصرار بھی ہو گا کہ میر غالب سے بڑا شاعر ہے۔ فی الحال اس بحث سے قطع نظر کیجیے اصل بات مجھے صرف یہ کہنی ہے کہ غالب ہماری ادبی تاریخ میں سب سے زیادہ زندہ شاعر ہے اور اس سے شاید میر کے پرساروں کو بھی انکار نہ ہو گا۔ میر کے علاوہ سودا، درد، آتش، مومن انیس، اقبال یہ سب اردو کے بڑے شاعر سمجھے جاتے ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی اس صورت میں زندہ نہیں ہے، جس صورت میں غالب—غالب ہمارے دل و دماغ اور ادبی شعور پر آج بھی حاوی ہے اور ہمارے ادب و شعر

میں کئی لحاظ سے جیتا جاگتا نظر آتا ہے ، غالب ہماری ادبی تاریخ میں "ایک نئے دور اور ایک نئی روایت کا خالق اور پیشوا ہے ۔ اس کے بعد ہمارے ہاں مختلف سیاسی ، سماجی اور فکری اثرات کے ماتحت جو ادبی شعور پیدا ہوا ہے ، اس کی ترتیب اور تعمیر میں غالب ایک بڑے اہم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے اور اگر آج یہ شعور مختلف رنگ بدلتا ہوا کیا سے کیا ہو گیا ہے ، مگر وہ امتیازی خصوصیات ، جو اردو شاعری میں غالب کے ساتھ ظہور میں آئی تھیں ، آج بھی قائم ہیں بلکہ نئی نئی ادبی تحریکات کی پشت پناہ ہیں ۔"

(آفتاب احمد : اردو شاعری میں غالب کی اہمیت : ۱۹۵۸ع)

"غالب کا آرٹ روایتی سہی لیکن اپنی حدود کے اندر اپنی آپ مثال ہے ۔ میر کے آرٹ میں گہرائی ہے اور شاید جہاں تک گہرائی کا تعلق ہے کوئی دوسرا شاعر میر سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے ۔ غالب کے آرٹ میں گہرائی نہیں اس میں وسعت ہے ، تنوع ہے ۔ ایسی وسعت ، جس کا گمان بھی شاید میر کو نہ تھا ۔ یوں کہنے کو میر کے ضخیم دیوانوں میں بھی ہر طرح کے اشعار ملتے ہیں ۔ بہ ظاہر تنوع ہے ، وسعت ہے لیکن میر کے کامیاب شعروں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ میر کی دنیا محدود قسم کی ہے ، جس میں انتہاء گہرائی ہے لیکن وسعت کچھ زیادہ نہیں۔ یہی وسعت غالب کے آرٹ کی نمایاں خوبی ہے۔ غالب کا حلقۂ دام خیال بہت وسیع ہے ۔ اس جال میں سبھی کچھ سمٹ آئے ہیں ، اس لیے وہ تنگی نہیں ، جو میر کے اشعار میں ملتی ہے ۔

غالب کے آرٹ کا اصلی کارنامہ یہ ہے کہ اس میں غزل خصوصاً شعر مفرد کی تنگی کو وسعت میں تبدیل کرنے کی کامیاب کوشش کی ۔ دو مصرعوں کی کیا بساط ہے ، اس میں گنجائش بہت کم ہے ، کسی چیز کو پورے طور پر بیان کرنا نا ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے ، غالب نے اس مشکل کو آسان کرنے میں دوسرے شاعروں کے مقابلے میں زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔ غالب کا قول ہے کہ ہر کام کا آسان ہونا دشوار ہے۔ اسی طرح ایک شعر کا نظم بن جانا دشوار ہی نہیں نا ممکن سا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ آدمی کا انسان ہونا میسر ہو یا نہ ہو ، غالب کے اشعار کو نظمیت میسر ہے ۔

غالب کوشش کرتے ہیں کہ ایک شعر میں مختلف خیالات ، جذبات یا ایک ہی خیال ایک جذبے کے مختلف پہلوؤں کو سمیٹ لائیں۔ اس ارادے میں جامعیت کے ساتھ تو کامیابی ممکن نہیں لیکن وہ ایک ترکیب استعمال کرتے ہیں، جس سے مشکل آسان ہوجاتی ہے۔ چند خیالات تو پوری طرح ایک شعر میں نظم نہیں ہو سکتے لیکن غالب ایک بات کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ دوسری باتوں کی طرف توجہ جا پڑتی ہے اور شعر پڑھ کر ذہن ان باتوں کی جستجو میں لگ جاتا ہے ۔گویا محشرستان خیال کا دروازہ کھل جاتا ہے اور غالب کا شعر اس دروازے کی کلید ہے۔ اگر آپ دریا کے کنارے کھڑے ہوکر دریا کا نظارہ کیجیے تو ممکن ہے دریا کی سطح پر آپ کو بالکل سکون نظر آئے، پھر پتھرکا ٹکڑا اٹھا کر پھینک مارے تو سطح دریا پر ایک لہر نمودار ہو گی ، یہ لہر دوسری لہروں کو بیدار کرے گی، لہروں کا دائرہ بڑھتا جائے گا، ایک بھنور کی سی کیفیت نمایاں ہوگی اور لہریں پھیلتے پھیلتے نظروں سے غائب ہوجائیں گی ۔ غالب کے اشعار دریائے ۔ تخیّل میں اسی قسم کی لہریں پیدا کرتے ہیں ۔"

(کلیم الدین احمد : غالب کا آرٹ : ۱۹۵۸ء)

"غالب سے پہلے اُردو شاعری کے پاس جذبات تھے ، احساسات تھے ، زبان و بیان کے کرشمے تھے۔ لیکن وہ حسین و شوخ ذہانت نہیں تھی جو پیکر الفاظ میں روح پھونک دیتی ہے ۔ یہ میرزا کا عطیہ ہے اور اس پر اُردو جتنا بھی فخر کرے کم ہے ۔ وہ اپنے قدیم سرمائے سے واقف تھے ۔ لیکن اس کی ہر رسم اور قید کے پابند نہیں تھے ۔ اسی لیے اُن کی شاعری افسون و افسانہ نہیں ہے ۔ اس میں نفس گرم کی آمیزش ہے ، خون جگر کی نمود ہے ۔ اُنھوں نے ہمیں نئے نئے خیالات دیے ، ان کے ادا کرنے کا ایک نیا اسلوب دیا اور سوچنے کے لیے حکیمانہ انداز اور جانچنے کے لیے تنقیدی شعور—اس میں مغل قلم کی شگفتگی ہے، اس کا پرمعنی اختصار ہے، اُس کا ترکانہ بانکپن ہے ۔ یہ اسلوب حال اور مستقبل دونوں کے لیے اہم ہے ۔"

(ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی : ۱۹۵۹ء)

''غالب کی فن کاری میں ہمیں جدت و سوز ، تخیل کی پرواز ، ادراک کی قوت وجدان کا حسن ، امید و نا امیدی کی کشمکش ، درد و گداز ، مزاح و طنز اور جدت کی تازہ خیالی و تازہ کاری کے جلوے ملتے ہیں ۔ اس کے یہاں واقعیت کا حسن بھی ہے اور مثالیت کا جال بھی ۔ وہ ایک طرف اگر مصوری اور ٹھوس بت گری کرتا ہے ، تو دوسری جانب اشاریت اور ایمائیت سے بھی کام لیتا ہے ۔ غالب کی شاعری کے کامیاب حصے میں لطافت ، گہرائی ، بلندی اور وسعت پائی جاتی ہے ۔ ان سب خصوصیات کی ترکیب سے غالب کے فن کی انفرادیت کی تشکیل ہوتی ہے ۔ غالب کی ازلی تشنگی ، خودی کے احترام کا جذبہ ، اس کی روح بغاوت و تمنائے انقلاب اور اس کی بھرپور شوخی اس کے آئینہ' انفرادیت کو جلا دیتی ہے ۔ تن اور شخصیت کا رشتہ اتنا سادہ نہیں ۔ فنی شخصیت اور سماجی شخصیت میں یکسانیت بھی ہو سکتی ہے اور مخالفت بھی ۔ کبھی فن میں زندگی کی حسرتیں ، کوتاہیاں اپنا انتقام بھی لیتی ہیں ۔ آرٹ کبھی تو آرٹسٹ کی سماجی شخصیت کا ارتقا اور تکملہ ہوتا ہے اور کبھی حرجانہ ، چور دروازہ یا فن کار کی زندگی کے ترازو کا دوسرا پلا ۔ غالب کی سماجی شخصیت سے ہم اس کی فنی شخصیت کو جا بہ جا مختلف پا سکتے ہیں ۔ علم النفس کے ذریعے اس کی توجیہ بھی کی جا سکتی ہے ۔''

(پروفیسر اختر اورینوی : غالب کی فن کاری : ۱۹۵۹ء)

''غالب کی شاعری اپنے وقتی ابہام، دقت بیان اور قواعد زبان کے نادر استعمال کی وجہ سے چونکاتی اور متحیّر کرتی ہے ۔ غالب کی مشکل پسندی براؤننگ اور ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ کی طرح ہے جس پر قابو پا کر ہمیں ایک قسم کی ذہنی مسرت حاصل ہوتی ہے ۔ جس طرح ہمیں ان شاعروں کی باریک بینیوں ، فکر اور تخیل تک رسائی حاصل کرکے ایک ذہنی طمانیت اور خوشی محسوس ہوتی ہے ، بالکل اسی طرح غالب کے تخیل کی اچانک پروازوں ، یا ان کی مضمون آفرینیوں اور مُبالغہ آرائیوں کی تفہیم سے بھی حاصل ہوتی ہے ، شاید ہی کسی شاعر کی فکر کو ان بلندیوں اور جذبے کی ان گہرائیوں تک رسائی حاصل ہوئی ہو جو غالب کی دسترس میں تھیں ۔ اُنھوں نے جس باریک بینی اور تجزیاتی ادراک سے شعر کہے ہیں ، اس تک

خیال کی رسائی محال ہے ۔ اس کا تعلق ، بعد الطبیعیات کی قلمرو سے ہے ۔ وہ اپنی ذہنی تحقیق پسندی کے ساتھ ساتھ انسانی تجربے کے صوفیانہ ، مادی اور فلسفیانہ پہلوؤں سے وہ ایک خیالی عمل پزیری اور تالیف میں کامیاب ہو جاتے ہیں ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اوروں کے مقابلے میں وہ زیادہ مشکل شاعر ہیں اور اسی لیے ان کے ہم عصروں نے اُنھیں مہمل اور مبہم گو کہہ کر مطعون کیا ۔ لیکن بالآخر وقت کے تغیر اور ان کے جدید قارئین کی عام ذہنی ترقی اور ورزش خیالی نے غالب کے اس دعوے کو درست ثابت کر دیا، جو اُنھوں نے خود اپنی شاعری کے بارے میں کیا تھا کیونکہ کوئی شاعر فکر یا انداز بیان کی عظمت کے اعتبار سے ان کا ہم سر نہیں ہے ۔"

(پروفیسر احمد علی ۱۹۶۶ع)

"غالب بلاشبہ اس دور کے سب سے بڑے غزل گو ہیں ، وہ اپنے اردو مجموعے کو بے رنگ قرار دیتے ہیں اور اپنے پرستاروں کو اپنے فارسی کلام کے مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا مختصر اردو دیوان اردو شاعری کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جس میں پہلی مرتبہ غزل کے عام ہلکے پھلکے مضامین یا تصوف کے متصارف مسائل اور موضوعات کی جگہ دقت خیال اور فکر انگیز مضامین کی دعوت دی گئی ہے ۔

غالب اصطلاحی معنوں میں فلسفی یا مفکر یا حکیم نہ تھے لیکن ان کی افتاد طبع اور اسلوب بیان دونوں میں فلسفے کی دقت نظر ، تحلیل و تجزیہ اور اسی کے مناسب اسلوب بیان ملتا ہے ۔ پھر زندگی کے بارے میں ان کا خاص طرح کا مزاج اور ایک خاص رجحان اور افتاد طبع ہے، جسے ان کا فلسفہ کہہ سکتے ہیں ۔ ان کے تخیل کی بلند پروازی محض شاعرانہ نہیں حکیمانہ بھی ہے ۔"

(ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ۱۹۶۶ع)

"غالب اُردو شاعری میں ایک نادر مظہر ہیں ۔ ان کی انفرادیت اور عظمت اتنے متضاد پہلوؤں میں اجاگر ہوئی ہے کہ ان سب کا احاطہ کسی

ایک شخص کے لیے ایک مضمون کی محدود بساط میں کرنا مشکل ہے۔ فکر و سخن کی محفل میں ان کا مقام اور منصب سب سے الگ ہی نہیں ، سب سے نمایاں اور بلند بھی ہے ۔ غالب کی شاعری کا موضوع اُن کے شدید ذاتی تاثرات میں ان کی امتیازی خصوصیت ان کا تفکر ہے ، یعنی ان تاثرات پر ان کے بے چین اور عمیق ذہن کا رد عمل۔ غالب کا تجربہ حقیقی اور غیر منفعل معلوم ہوتا ہے اور اس میں گونا گوں کیفیات کی جلوہ گری نظر آتی ہے ۔ اس تجربے کی تجسیم کے دوران ان کی شخصیت کے تمام پر اسرار گوشوں میں نفوذ باہمی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے ۔ غالب کے یہاں تفکر ان تمام تجربوں کا اظہار ہے ، جو ذہن اور روح کی گہرائیوں میں جذب ہو کر اُبھرے ہیں ۔ اس فکر کی قدر و قیمت کا تعین ان تجربات کے تجزیے پر منحصر ہے ۔ حسرت بھی اچھے اور دلپذیر شاعر ہیں ۔ ان کے یہاں بھی جذبات کی بوقلمونی اور فراوانی ملتی ہے مگر برنز (Burns) کی طرح وہ خالص تجربے سے آگے نہیں بڑھتے۔ ان کی شاعری صرف احساسات کو آہنگ عطا کرتی اور انہیں آسودگی بخشتی ہے اور اس اعتبار سے کیٹس (Keats) کی نہایت ابتدائی دور کی شاعری ہی تک پہنچ کر رہ جاتی ہے ۔ غالب کے یہاں رنگا رنگی اور فراوانی سے زیادہ ندرت ، پیچیدگی اور تنوع اہم ہیں ۔ ان کے یہاں جذبات کی تندی اور ذہن کی برق رفتاری بہ یک وقت ملتی ہیں ۔ ان کی شاعری میں تعقل کا عنصر تمام دوسرے عناصر پر فوقیت رکھتا ہے ۔''

(اسلوب احمد انصاری : ادب اور تنقید : ۱۹۶۸ء)

غالب اُردو شاعری میں ایک نئی داخلیت کا تصور لے کر داخل ہوئے۔ یہ داخلیت نہ میر کی طرح محدود تھی، نہ میر درد کی طرح متصوفانہ۔ اس کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ مجلسی بلکہ کائناتی شعور بھی اس کے لیے اجنبی نہیں ۔ اپنی شخصیت اور صداقت کو بھولے بغیر غالب نے شاعری میں فکر و کردار کو راہ دی ۔ ان کے نزدیک خیال اور جذبے کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں ۔ فکر و تاثر ، احساس اور ادراک ایک ہی کل کے مختلف اجزاء ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفیانہ آہنگ کے باوجود غالب شاعری کے حسن اور جمالیاتی نکھار سے غافل نہیں رہتے ۔

(ڈاکٹر محمد محسن : فروغ اُردو ، لکھنؤ ، غالب نمبر : دسمبر، ۱۹۶۸ء)

کتابیات

تصانیف غالب (اُردو)

دیوان غالب

طبع اول ، مطبع سید المطابع دہلی ، ۱۸۴۱ع
طبع دوم ، مطبع دارالسلام ، دہلی ، ۱۸۴۷ع
طبع سوم ، مطبع احمدی ، دہلی ، ۱۸۶۱ع
طبع چہارم ، مطبع نظامی ، کان پور ، ۱۸۶۲ع
طبع پنجم ، مطبع مفید خلائق ، آگرہ ، ۱۸۶۳ع

چند قابل ذکر اشاعتیں :

۱- دیوان غالب جدید ، نسخۂ حمیدیہ ، مفید عام اسٹیم پریس، آگرہ، ۱۹۲۱ع
۲- دیوان غالب ، ڈاکٹر ذاکر حسین ، برلن ، جرمنی ، ۱۹۲۵ع
۳- مرقع غالب ، عبدالرحمان چغتائی ، لاہور ، ۱۹۲۸ع
۴- نقش چغتائی ، لاہور ، ۱۹۳۵ع
۵- دیوان غالب ، تاج ایڈیشن ، لاہور ، ۱۹۳۸ع
۶- دیوان غالب ، مالک رام ، آزاد کتاب گھر ، دہلی ، ۱۹۵۷ع
۷- دیوان غالب ، نسخۂ عرشی، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ ، ۱۹۵۸ع
۸- دیوان غالب ہندی ، علی سردار جعفری ، ہندوستانی بک ٹرسٹ، بمبئی ، ۱۹۵۸ع
۹- دیوان غالب، (عکسی) غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ، ۱۹۶۷ع
۱۰ دیوان غالب ، صدی ایڈیشن ، اُردو مرکز ، لاہور ، ۱۹۶۹ع
۱۱- دیوان غالب ، مصور ، صادقین ، ادارہ یادگار غالب ، کراچی ، ۱۹۶۹ع

۱۰- دیوان غالب ، مولانا حامد علی خان ، مجلس یادگار غالب ، پنجاب یونیورسٹی ، لاہور ، ۱۹۶۹ع

خطوط

۱- عود ہندی ، طبع اول ، مطبع مجتبائی ، میرٹھ ، ۱۸۶۸ع
عود ہندی ، طبع اول ، مطبع نرائنی ، دہلی ، ۱۸۷۸ع
عود ہندی ، طبع اول ، مطبع نول کشور ، کان پور ، ۱۸۷۸ع
عود ہندی ، طبع اول ، مدرسۃ العلوم ، علی گڑھ ، ۱۹۱۰ع
عود ہندی ، طبع اول ، مطبع نول کشور ، کان پور ، ۱۹۱۳ع
عود ہندی ، طبع اول ، مطبع مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۲۷ع
عود ہندی ، طبع اول ، مجلس ترقی ادب ، لاہور ، ۱۹۶۵ع

۲- اردوے معلیٰ ، طبع اول ، اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۸۶۹ع
اردوے معلیٰ ، طبع اول ، مطبع اُردو گائڈ ، کلکتہ ، ۱۸۸۳ع
اردوے معلیٰ ، طبع اول ، مطبع اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۸۹۱ع
اردوے معلیٰ ، طبع اول ، مطبع مجتبائی ، دہلی ، ۱۸۹۹ع
اردوے معلیٰ ، طبع اول ، مطبع فاروق ، دہلی ، ۱۹۱۰ع
اردوے معلیٰ ، طبع اول ، مطبع کریمی ، لاہور ، ۱۹۲۲ع
اردوے معلیٰ ، طبع اول ، رفاہ عام اسٹیم پریس ، لاہور، ۱۹۲۷ع
اردوے معلیٰ ، طبع اول ، مجلس ترقی ادب ، لاہور ، ۱۹۶۹ع

۳- ادبی خطوط غالب ، مرزا محمد عسکری ، لکھنؤ ، ۱۹۲۹ع

۴- مکاتیب غالب ، امتیاز علی خان عرشی ، مطبع قیمہ ، بمبئی ، ۱۹۳۷ع

۵- خطوط غالب (۱) مہیش پرشاد ، ہندستانی اکیڈمی ، الہ آباد ، ۱۹۴۱ع

۶- نادرات غالب ، آفاق حسین دہلوی ، کراچی ، ۱۹۳۹ع

۷- خطوط غالب ، مولانا غلام رسول مہر ، ۱۹۵۱ع

۸- انتخاب خطوط غالب ، ڈاکٹر عبادت بریلوی/مشرف انصاری ، کراچی ، ۱۹۵۲ع

۹- خطوط غالب ، مالک رام ، علی گڑھ ، ۱۹۶۳ع
۱۰- خطوط غالب (مکمل) غلام رسول مہر ، لاہور ، ۱۹۶۹ع

تصانیف غالب (فارسی)

۱- دیوان فارسی ، طبع اول ، مطبع دارالسلام ، دہلی ، ۱۹۳۵ع
۲- کلیات غالب ، طبع اول ، مطبع نول کشور ، لکھنئو ، ۱۸۶۳ع
کلیات غالب ، طبع اول ، مطبع نول کشور ، لکھنئو ، ۱۸۷۲ع
کلیات غالب ، طبع اول ، مطبع نول کشور ، لکھنئو ، ۱۸۹۳ع
کلیات غالب ، طبع اول ، شیخ مبارک علی اینڈ سنز ، لاہور ، ۱۹۶۵ع
کلیات غالب ، طبع اول ، مجلس ترقی ادب ، لاہور، ۱۹۶۷ع
کلیات غالب ، طبع اول ، مجلس یادگار غالب ، لاہور ، ۱۹۶۹ع
۳- سبد چین ، طبع اول مطبع محمدی ، دہلی ، ۱۸۵۷ع
سبد چین ، طبع دوم ، مکتبۂ جامعہ ، دہلی ، ۱۹۳۸ع
سبد چین ، طبع جدید ، مجلس یادگار غالب ، لاہور ، ۱۹۶۹ع
۴- باغ دو در ، طبع اول ، اورنٹیل کالج میگزین ، لاہور ، اگست ۱۹۶۰-۶۱ع
باغ دو در، طبع دوم : پنجاب یونیورسٹی لاہور، جولائی، ۹۶۸ ۱ع
۵- مثنوی دعا صباح ، طبع اول ، مطبع نول‌کشور ، لکھنئو ، ۱۸۶۸ع
۶- مثنوی ابرگہر بار ، مطبع اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۸۶۴ع
۷- پنج آہنگ ، طبع اول ، مطبع سلطانی ، دہلی ، ۱۸۴۹ع
پنج آہنگ ، طبع دوم ، مطبع دارالسلام ، دہلی ، ۱۸۵۳ع
پنج آہنگ ، طبع جدید ، مجلس یادگار غالب ، لاہور ، ۱۹۶۹ع
۸- مہر نیمروز ، طبع اول ، مطبع فخر المطابع ، دہلی ، ۱۸۵۴ع
مہر نیمروز ، طبع اول ، مطبع نول‌کشور ، لکھنئو ، ۱۹۱۵ع
مہر نیمروز ، طبع اول ، شیخ مبارک علی اینڈ سنز ، لاہور ، ۱۹۲۵ع
مہر نیمروز ، طبع اول ، مجلس یادگار غالب ، لاہور ، ۱۹۶۹ع

۹- دستنبو ، طبع اول ، مطبع مفید خلائق ، آگرہ ، ۱۸۵۸ء
دستنبو ، طبع دوم ، مطبع لٹریری سوسائٹی ، روہیل کھنڈ، بریلی، ۱۸۶۵ء
دستنبو ، طبع سوم ، روہیل کھنڈ ، بریلی ، ۱۸۷۱ء
دستنبو ، طبع جدید، مجلس یادگار غالب ، لاہور ، ۱۹۶۹ء

۱۰- کلیات نثر غالب، طبع اول ، مطبع نول کشور ، لکھنؤ ، ۱۸۶۸ء
۱۱- نکات و رقعات غالب ، طبع اول ، مطبع سراجی ، دہلی ، ۱۸۶۷ء
۱۲- قادر نامہ غالب ، طبع اول ، مطبع سلطانی ، دہلی ، ۱۸۵۶ء
قادر نامہ غالب ، طبع دوم ، مجبس پریس ، دہلی ، ۱۸۶۳ء
قادر نامہ غالب ، طبع سوم ، مطبع مداری لال ، لاہور، ۱۸۷۳ء
قادر نامہ غالب ، طبع جدید ، مکتبۂ نیا راہی ، کراچی ، ۱۹۵۹ء

۱۳- قاطع برہان ، طبع اول ، مطبع نول کشور ، لکھنؤ ، ۱۸۶۲ء
۱۴- لطائف غیبی ، طبع اول ، اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۸۶۴ء
۱۵- درفش کاویانی، طبع اول ، اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۸۶۵ء
۱۶- نامۂ غالب ، طبع اول ، مطبع محمدی ، دہلی ، ۱۸۶۵ء
۱۷- سوالات عبدالکریم ، طبع اول ، اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۸۶۵ء
۱۸- قطعۂ غالب ، طبع اول ، اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۹۶۶ء
۱۹- تیغ تیز ، طبع اول ، اکمل المطابع ، دہلی ، ۱۸۶۷ء
۲۰- انتخاب غالب ، امتیاز علی خاں عرشی ، رام پور ، ۱۹۴۲ء
۲۱- متفرقات غالب ، مسعود حسن رضوی ادیب ، ہندوستانی پریس ، رام پور ، ۱۹۴۷ء
۲۲- مآثر غالب ، قاضی عبدالودود ، علی گڑھ میگزین ، ۱۹۴۸-۴۹ء
۲۳- غالب کی نادر تحریریں ، ڈاکٹر خلیق انجم ، مکتبۂ شاہراہ ، دہلی، ۱۹۶۱ء
۲۴- مجموعۂ نثر غالب اُردو ، خلیل الرحمان داؤدی ، مجلس ترقی ادب ، لاہور ، ۱۹۶۷ء

غالب پر اہم تصانیف :

۱- یادگار غالب ، حالی ، نامی پریس ، کان پور ، ۱۸۹۷ء

۲- حیات غالب ، سید محمد مرزا موج، نگارستان پریس لکھنؤ ، ۱۸۹۹ع
۳- غالب نام آورم ، نادم سیتاپوری، سرفراز پریس، لکھنؤ، ۱۹۲۲ع
۴- مقام غالب ، محمد موسیٰ خان کلیم ، ادارہ نئی تحریریں ، پشاور ، ۱۹۲۵ع
۵- غالب ، ڈاکٹر سید عبداللطیف ، جام باغ ، حیدرآباد دکن ، ۱۹۲۸ع
۶- مومن و غالب ، معجز سمسوانی ، نظامی پریس ، فیض آباد ، ۱۹۳۱ع
۷- غالب شکن ، یگانہ چنگیزی ، آرسی پریس ، آگرہ ، ۱۹۳۵ع
۸- غالب نامہ ، طبع اول ، شیخ محمد اکرام ، مرکنٹائل پریس لاہور ، ۱۹۳۶ع
۹- قتیل اور غالب ، سید امداد علی انوری ، مکتبۂ جامعہ ، دہلی ، ۱۹۳۹ع
۱۰- سرگزشت غالب ، ڈاکٹر محی الدین قادری زور ، مکتبۂ ابراہیمیہ ، حیدرآباد ، ۱۹۳۹ع
۱۱- اشک و رشک غالب ، سید ظہیرالدین احمد دہلوی ، ایجوکیشنل پریس ، علی گڑھ ، ۱۹۴۱ع
۱۲- غالب ، طبع چہارم مولانا غلام رسول مہر ، شیخ مبارک علی ، لاہور ، ۱۹۴۳ع
۱۳- فرہنگ غالب ، امتیاز علی خان عرشی ، آزاد کتاب گھر ، دہلی ، ۱۹۴۷ع
۱۴- احوال غالب ، ڈاکٹر مختار الدین آرزو ، انجمن ترقی ادب ، ہند ، علی گڑھ ، ۱۹۵۲ع
۱۵- افکار غالب ، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ، مکتبۂ معین الادب ، لاہور ۱۹۵۳ع
۱۶- نقد غالب ، ڈاکٹر مختارالدین آرزو ، انجمن ، علی گڑھ ، ۱۹۵۵ع
۱۷- تلامذۂ غالب ، مرکز تصنیف و تالیف ، نکودر ، ۱۹۵۷ع
۱۸- محاسن کلام غالب ، طبع پنجم ، بجنوری ، انجمن ترقی اردو ، ہند علی گڑھ ، ۱۹۵۸ع

۱۹- غالب ، ڈاکٹر خورشیدالاسلام ، انجمن ، ہند ، علی گڑھ ، ۱۹۶۰ع
۲۰- فکر غالب ، پرتھوی چندر ، پیام وطن پریس ، دہلی ، ۱۹۶۰ع
۲۱- غالب۔۔فکر و فن ، ڈاکٹر شوکت سبزواری ، طبع جدید ، انجمن،
ترقی اردو پاکستان،کراچی ، ۱۹۶۱ع
۲۲- ذکر غالب ، طبع چہارم ، مالک رام مکتبۂ جامعہ، دہلی، ۱۹۶۴ع
۲۳- غالب شناسی (۱) ڈاکٹر ظ۔ انصاری، ساہتیہ ٹرسٹ بمبی، ۱۹۶۵ع
۲۴- غالب کے کلام میں الحاقی عناصر ، نادم سیتا پوری ،
ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ ، ۱۹۶۵ع
۲۵- مرزا غالب کی شوخیاں ، عبدالباری آسی ، مکتبۂ دین و ادب ،
۱۹۶۵ع
۲۶- جہان غالب ، کوثر چاند پوری ، مکتبۂ کائنات، لاہور، ۱۹۶۶ع
۲۷- تجزیۂ کلام غالب ، سید رفیع الدین بلخی ، اکیڈمی آف ایجوکیشنل
رسرچ ، کراچی ، ۱۹۶۶ع
۲۸- غالب شاعر امروز و فردا ، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کتابیات ،
لاہور ، ۱۹۶۹ع
۲۹- فلسفۂ کلام غالب، طبع جدید، ڈاکٹر شوکت سبزواری، انجمن ،
کراچی ، ۱۹۶۹ع
۳۰- حکیم فرزانہ شیخ محمد اکرم۔ فیروز سنز ، لاہور ، ۱۹۵۵ع
۳۱- مقام غالب، عبدالصمد صارم، ادارۂ علمیہ دھنی رام روڈ ، لاہور ،
۱۹۶۸ع

شرحیں :

۱- شوکت میرٹھی ، حل کلیات اُردو غالب ، شوکت‌المطابع ،
میرٹھ ، ۱۸۹۹ع
۲- حسرت موہانی ، شرح دیوان غالب ، مطبوعہ علی گڑھ ، ۱۹۰۶ع
۳- سہا مجددی ، مطالب‌الغالب ، شیخ مبارک علی ، لاہور، س ن
۴- بے خود دہلوی ، مراۃالغالب ، محبوب‌المطابع دہلی ، ۱۹۲۳ع
۵- عبدالباری آسی ، مکمل شرح کلام غالب ، صدیق بک ڈپو ،
لکھنؤ ، ۱۹۳۱ع
۶- آغا محمد باقر ، بیان غالب ، شیخ مبارک علی ، لاہور، ۱۹۳۹ع
۷- جوش ملسیانی ، شرح دیوان غالب ، قصر اردو ، دہلی ، ۱۹۵۰ع
۸- اثر لکھنوی ، مطالعۂ غالب ، دانش محل ، لکھنؤ ، ۱۹۵۲ع

۹- ڈاکٹر قاضی سعیدالدین ، مطالب الغالب ، پبلشرز یونائیٹڈ ،
لاہور ، ۱۹۵۲ع

۱۰- عبدالحکیم نشتر ، روح غالب ، تاج بک ڈپو ، لاہور ، ۱۹۵۸ع

۱۱- نظم طباطبائی ، شرح دیوان غالب ، طبع چہارم ، انوارالمطابع ،
لکھنئو

۱۲- یوسف سلیم چشتی ، شرح دیوان غالب ، عشرت پبلشنگ ہاؤس ،
لاہور ، ۱۹۵۹ع

۱۳- وجاہت علی سندیلوی ، نشاط غالب ، انوار بک ڈپو ، لکھنئو ،
۱۹۶۱ع

۱۴- نیاز فتح پوری ، مشکلات غالب ، ادارۂ نگار ، کراچی ، ۱۹۶۲ع

۱۵- شاداں بلگرامی ، روح المطالب ، شیخ مبارک علی ، لاہور ، ۱۹۶۷ع

۱۶- غلام رسول مہر ، نوائے سروش ، شیخ غلام علی اینڈ سنز ،
لاہور ، ۱۹۶۹ع

۱۷- صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ، روح غالب ، گاوب پبلشرز ،
لاہور ، ۱۹۶۹ع

مقالات :

۱- سر سید احمد خاں ، غالب اور ان کے معاصرین ، آثار الصنادید ،
طبع اول ، ۱۸۴۶ع

۲- مرزا قربان علی بیگ سالک ، غالب مرحوم ، اودھ اخبار لکھنئو ،
۱۶ مارچ ، ۱۸۶۹ع

۳- حسرت موہانی ، کلام غالب ، اردوئے معلیٰ ، علی گڑھ ،
یکم نومبر ، ۱۹۰۳ع

۴- مرزا یاس لکھنوی ، غالب کی شاعری پر تنقید ، خیال ، جولائی ۱۹۱۵ع

۵- ہاشمی فرید آبادی ، غالب کا فلسفہ ، اردو ، اورنگ آباد
اکتوبر ، ۱۹۲۵ع

۶- عابد علی عابد ، غالب کی فارسی شاعری ، جامعہ ، دہلی ،
ستمبر تا دسمبر ، ۱۹۳۲

۷- سید وقار عظیم ، غالب کے خطوط اور ان کی احباب پرستی ،
ساقی ، دہلی ، جنوری ، ۱۹۳۴ع

۸- صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ، غالب کا تصور حسن و عشق ،
ادبی دنیا ، لاہور ، جنوری ، ۱۹۳۶ع
۹- عبدالمالک آروی، غالب کی اخلاقی کمزوریاں، نگار، لکھنئو، مارچ، ۱۹۳۹ع
۱۰- ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ، غالب کی قدر ، ہمایوں ، لاہور ،
اکتوبر، ۱۹۳۹ع
۱۱- جاں نثار اختر ، غالب کا مسلک ، علی گڑھ میگزین ، ۰
مارچ ، ۱۹۴۱ع
۱۲- آل احمد سرور ، اردو ، دہلی ، اپریل ، ۱۹۴۱ع
۱۳- اختر اورینوی ، غالب کا فن اور اس کا نفسیاتی پس منظر ،
اردو ، دہلی ، جولائی، ۱۹۴۱ع
۱۴- حفیظ سید، غالب کی شاعری میں واقعات کا پرتو، زمانہ ، کانپور ، مارچ ، ۱۹۴۵ع
۱۵- فراق گورکھپوری ، غالب کی شاعری میں محبوب کا تصور ،
زمانہ ، کانپور ، اپریل ، ۱۹۴۵ع
۱۶- آفتاب احمد ، غالب کی عشقیہ شاعری ، دہلی، فروری، ۱۹۴۶ع
۱۷- حمید احمد خاں ، غالب کی خانگی زندگی کی ایک جھلک ،
آج کل ، دہلی ، ۱۵ فروری، ۱۹۴۷ع
۱۸- آل احمد سرور ، غالب کی عظمت ، علی گڑھ میگزین، غالب نمبر، ۱۹۴۹ع
۱۹- حمید احمد خاں ، مکاتیب غالب ، ادبی دنیا ، دسمبر، ۱۹۴۹ع
۲۰- حمید احمد خاں ، غالب کی شاعری میں حسن و عشق ، ہمایوں ،
جنوری فروری ، ۱۹۴۹ع
۲۱- ڈاکٹر شوکت سبزواری ، غالب کی شخصیت ، نگار ، لکھنئو ،
غالب نمبر ، ۱۹۴۹ع
۲۲- امتیاز علی خاں عرشی ، غالب کی شعرگوئی اور ان کے دواوین ،
علی گڑھ میگزین ، ۱۹۴۹ع
۲۳- پروفیسر عبدالقادر سرور ، غالب کی اخلاقی شاعری ، نوائے ادب،
بمبئی ، جنوری ، ۱۹۵۰ع

۲۳- حمید احمد خاں، غالب کا کلکتہ، ماہ نو، کراچی، فروری، ۱۹۵۰ء
۲۴- ارتضیٰ حسین ، غالب کی طنزیات ، نیا دور ، کراچی ، اپریل ، ۱۹۵۰ء
۲۵- احتشام حسین ، غالب کا تفکر ، اردو ادب ، علی گڑھ ، جولائی ، ۱۹۵۰ء
۲۶- دلشاد کلانچوی ، غالب کے خطوط، ہمایوں، لاہور، ستمبر ، ۱۹۵۰ء
۲۸- ممتاز حسین، غالب کا نظریۂ شعر، نقوش، لاہور، دسمبر، ۱۹۵۰ء
۲۹- مہیش پرشاد، غالب کے ایام میں نظام ڈاک، نوائے ادب، بمبئی، جنوری ، ۱۹۵۱ء
۳۰- آل احمد سرور، غالب کا ذہنی ارتقا، اردو ادب، علی گڑھ ، جولائی اگست ، ۱۹۵۲ء
۳۱- ڈاکٹر شوکت سبزواری ، غالب محقق کی حیثیت سے، اردو ادب، علی گڑھ ، جولائی اگست ، ۱۹۵۲ء
۳۲- ڈاکٹر فرمان فتح پوری ، کلام غالب میں استفہام ، نگار، لکھنئو، مئی، ۱۹۵۲ء
۳۳- پنڈت وتاتریہ کیفی ، غالب اور اردو خطوط نویسی ، آج کل ، دہلی ، ستمبر ، ۱۹۵۲ء
۳۴- نذیر احمد ، غالب اور ظہوری ، اردو ادب، علی گڑھ ، جولائی، ۱۹۵۲ء
۳۵- ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو ، مرزا غالب کی تصویریں ، احوال غالب ، علی گڑھ ، جون ، ۱۹۵۳ء
۳۶- غلام رسول مہر ، مرزا غالب نقاد کی حیثیت سے ، نگار، لکھنئو، اپریل ، ۱۹۵۳ء
۳۷- ڈاکٹر یوسف حسین خاں ، غالب کے یہاں تخیل اور جذبے کی ہم آویزی ، ماہ نو ، کراچی ، مئی ، ۱۹۵۳ء
۳۸- محمد حسن عسکری ، میر و غالب اور تاریخی حقیقتیں، اردو ادب، علی گڑھ ، اکتوبر، ۱۹۵۴ء
۳۹- ڈاکٹر مختارالدین آرزو ، غالب کی تاریخ گوئی، ادبی دنیا ، لاہور، مارچ، ۱۹۵۵ء

۴۰- ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ، نقش ہائے رنگ رنگ ، ماہ نو،کراچی، نومبر، ۱۹۵۵ء

۴۱- آل احمد سرور ، غالب اپنی شخصیت کے آئینے میں، ادب لطیف، لاہور ، جولائی ، ۱۹۵۵ء

۴۲- اسلوب احمد انصاری ، غالب کی شاعری کے بنیادی عناصر ، سالنامہ ادب لطیف ، لاہور، ۱۹۵۵ء

۴۳- رشید احمد صدیقی ، غالب صاحب طرز انشا پرداز ، فروغ اردو لکھنئو ، جون، ۱۹۵۵ء

۴۴- آفتاب زبیری علیگ، غالب ایک مطالعہ ، فروغ اردو، لکھنئو ، جون ، ۱۹۵۵ء

۴۵- ڈاکٹر نرمان فتح‌پوری ، غالب اور اقبال، نگار، لکھنئو ، دسمبر ، ۱۹۵۵ء

۴۶- حامد حسن قادری، افکار غالب، اردو، کراچی، اکتوبر، ۱۹۵۵ء

۴۷- ڈاکٹر سید عبداللہ ، غالب پیش رو اقبال ، ماہ نو ، کراچی ، اگست ، ۱۹۵۵ء

۴۸- آفتاب احمد، غالب کے اردو قصیدے ، نیا دور، لکھنئو ، جون، ۱۹۵۶ء

۴۹- احتشام حسین ، ذوق و غالب ، فروغ اردو ، لکھنئو ، جنوری فروری ، ۱۸۵۶ء

۵۰- اختر اورینوی ، غالب کی فن کاری ، نقد غالب ، علی گڑھ ، ۱۹۵۶ء

۵۱- ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی ، غالب اور عصر جدید ، نقد غالب، علی گڑھ ، ۱۹۵۶ء

۵۲- رشید احمد صدیقی ، کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا ، نقد غالب ، علی گڑھ ، ۱۹۵۶ء

۵۳- قاضی عبدالودود ، غالب بحیثیت محقق ، نقد غالب ، علی گڑھ ، ۱۹۵۶ء

۵۴- مالک رام ، مرزا غالب ، نقد غالب ، علی گڑھ ، ۱۹۵۶ء

۵۵- ڈاکٹر محمد حسن ، غالب کے چند اہم نقاد ، آج کل ، دہلی ، ۱۹۵۶ع
۵۶- ڈاکٹر سید عبداللہ ، غالب معتقد میر ، نقد غالب ، علی گڑھ ، ۱۹۵۶ع
۵۷- آل احمدؔ سرور ، غالب اور اس کے نقاد ، جامعہ ، دہلی، دسمبر، ۱۹۵۷ع
۵۸- ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کلام غالب کا طنزیہ پہلو، نگار، لکھنئو، اکتوبر، ۱۹۵۷ع
۵۹- ڈاکٹر محمد حسن ، ہندوستانی شاعری میں غالب کا مرتبہ، تحریک، دہلی ، اگست ، ۱۹۵۷ع
۶۰- علی محمد شعلہ ، غالب کی شاعری ، نقوش ، لاہور، جون، ۱۹۵۸ع
۶۱- ڈاکٹر مسیح الزمان ، غالب، آج کل، دہلی ، فروری، ۱۹۵۸ع
۶۲- ڈاکٹر عبدالستار ، غالب کا تصور غم ، علی گڑھ میگزین ، ۱۹۵۹ع
۶۳- ڈاکٹر ابو محمد سحر، غالب کا فلسفہ، نگار، لکھنئو، جون، ۱۹۵۹ع
۶۴- ڈاکٹر تاراچند ، غالب کے بیان میں تصوف اور فلسفۂ ویدانت کا امتزاج ، جالستان ، دہلی ، جون، ۱۹۶۰ع
۶۵- ڈاکٹر خلیق انجم ، غالب کی قیام گاہیں ، اردوے معلیٰ ، دہلی ، فروری ، ۱۹۶۰ع
۶۶- مالک رام ، گل رعنا ، نگار ، لکھنئو ، جولائی ، ۱۹۶۰ع
۶۷- پروفیسر سمیع اللہ قریشی ، غالب کی افسردگی ، لالۂ صحرا ، بہاول نگر، دسمبر، ۱۹۶۱ع
۶۸- نیاز فتح پوری ، غالب کی شاعرانہ خصوصیات ، نگار ، لکھنئو ، جنوری فروری، ۱۹۶۱ع
۶۹- ڈاکٹر سید معید الدین ، غالب کا نظریۂ حیات ، تحریک ، دہلی اپریل مئی ، ۱۹۶۱ع
۷۰- حمیدہ سلطان ، غالب کا تصور عشق ، ماہ نو ، کراچی، فروری، ۱۹۶۲ع

۷۱- ڈاکٹر عندلیب شادانی ، غالب کا اسلوب نگارش (پنج آہنگ) صحیفہ ، لاہور ، جنوری، ۱۹۶۳ء

۷۲- مالک رام ، غالب کے فارسی قصیدے ، نقوش ، لاہور ، مارچ ، ۱۹۶۳ء

۷۳- ڈاکٹر تنویر احمد علوی ، ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اور خطوط غالب، آئینہ ادب ، دہلی ، ۱۹۶۴ء

۷۴- عبدالمغنی ، موازنۂ اقبال و غالب ، نقطۂ نظر ، پٹنہ ، ۱۹۶۵ء

۷۵- آغا افتخار حسین ، یورپ میں غالب کا مطالعہ، افکار، غالب نمبر کراچی ، ۱۹۶۶ء

۷۶- پروفیسر احمد علی ، غالب ایک مابعد الطبیعیاتی شاعر ، افکار ، غالب نمبر کراچی ، ۱۹۶۶ء

ملک اسماعیل حسن خان ، غالب کے اردو قصائد ، نقوش ، اکتوبر، ۱۹۶۶ء

۷۸- ڈاکٹر خورشید الاسلام ، غالب کا محبوب ابتدائی دور میں مشمولہ تنقیدیں ، انجمن، ہند، ۱۹۶۶ء

۷۹- پروفیسر محمد مجیب ، مرزا غالب ، علی گڑھ میگزین، ۶۷-۱۹۶۶ء

۸۰- سجاد باقر رضوی ، غالب اور جدید ذہن ، مشمولہ تہذیب و تخلیق لاہور ، ۱۹۶۶ء

۸۱- ڈاکٹر ظ۔ انصاری ، مرزا غالب کی مثنویاں ، گفتگو ، بمبئی ، جنوری، ۱۹۶۷ء

۸۲- ڈاکٹر احسن فاروقی، حیوان ظریف۔غالب، تخلیقی تنقید ،کراچی ، ۱۹۶۸ء

۸۳- ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی ، یک عمر ناز شوخی عنوان اٹھائیے علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۱۹۶۹ء

۸۴- آل احمد سرور ، غالب اور جدید ذہن ، علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۱۹۶۹ء

۸۵- ڈاکٹر سید محمود ، مقدمہ دیوان غالب ، نظامی ایڈیشن بدایوں
۸۶- ڈاکٹر عندلیب شادانی ، غالب کا اسلوب نگارش(پنچ آہنگ)صحیفہ
لاہور ، جنوری ۱۹۶۹ع
۸۷- خواجہ فاروق ، غالب کی عظمت ، مشمولہ کلاسیکی ادب ، دہلی ،
۸۸- سید معین الرحمان ، غالب کے بعد ان پر پہلا مضمون ، نقوش ،
لاہور ، فروری ۱۹۶۹ع
۸۹- سید معین الرحمان ، غالب کی معدوم تصنیفات ، العلم ، کراچی ،
غالب نمبر ، ۱۹۶۹ع
۹۰- پروفیسر سید وقار عظیم ، غالب کا تنقیدی مزاج ، نقوش ، لاہور،
فروری، ۱۹۶۹ع
۹۱- ڈاکٹر محمد عقیل ، غالب اور مثنوی، نقوش لاہور، فروری، ۱۹۶۹ع
۹۲- ڈاکٹر سید ناظرحسن زیدی، غالب کا تہذیبی اور معاشرتی پس منظر -
پنجاب یونیورسٹی ریسرچ جرنل ، غالب نمبر ، فروری ، ۱۹۶۹ع
۹۳- سید محمد حسین رضوی، غالب کی صحیح تاریخ پیدائش، اردو، کراچی،
جنوری مارچ ، ۱۹۶۹ع
۹۴- ڈاکٹر ناظر حسن - غالب اپنے اشعار کے آئینے میں، راوی، لاہور
فروری ۱۹۶۹ع
۹۵- اختر اقبال کمال ، غالب
۹۶- محمد حسن ، غالب - نئی داخلیت کی آواز

اشاریہ

الف

آب حیات ، ۴۶۰ -
آثارالصنادید ، ۴۵۷ -
آثار غالب ، ۱۱ -
آزاد محمد حسین ، ۱۴۶ ، ۴۶۰
آزردہ مفتی صدر الدین ، ۱۱۴ ، ۱۳۴ ، ۳۷۷ -
آفاق حسین ، ۱۸۰ ، ۳۸۴ -
آل احمد سرور ، ۴۴۵ ، ۴۷۷ -
آنند رام مخلص ، ۸۱ -
ابر گوہر بار ، ۱۸۶ -
ابوالقاسم خاں ، ۱۹۵ -
ابواللیث صدیقی ، ۴۸۴ -
ابوسعید مرزا ، ۱۴۳ -
احتشام حسین ، پروفیسر ، ۴۴۷ ، ۴۷۹ -
احسن اللہ خاں حکیم ، ۹ ، ۴۶ ، ۱۳۶ ، ۴۱۴ -
احمد بخش خاں نواب ، ۵۴ ، ۲۷۴ -
احمد علی پروفیسر ، ۴۸۴ -
احمد علی مولوی ، ۴۱۰ ، ۴۱۳ -
احمد شاہ ابدالی ، ۸۱ -
احمد فاروق خواجہ ، ۴۸۲ -
احوال غالب ، ۳۲ -
اختر اورینوی ، ۴۸۳ -
ارجن سنگھ گرو ، ۸۲ -
اردو ے معلیٰ ، ۱۶۹ ، ۳/ ۴ ، ۳۸۶ -
اسپرنگر ، ڈاکٹر ، ۱۴۵ -
اسٹرلنگ ، مسٹر ، ۲۷۵ -
اسیر ، جلال ، ۶ -
اعظم خاں ، ۱۰۴ -
اعظم الدولہ سرور ، ۴۵۴ -
افسانۂ عشق ، ۱۴ -
الٰہی بخش مفتی ، ۱۱۴ -
الٰہی بخش خاں معروف ، ۶ ، ۱۴ ، ۴۲ -
القاب و آداب خطوط ، ۳۸۹ -
امام بخش صہبائی ، ۱۴۶ -
امان ، خواجہ ، ۵۴ -
امتیاز علی خاں عرشی ، ۶ ، ۴۰ ، ۴۱ ، ۹۹۲ -
امداد امام اثر ، ۴۶۷ -
امراؤ بیگم ، ۳۷۹ -
امیر النسا ، ۲۲ -
امیر خاں ، نواب ؛ ۱۱۸ -
امیر مینائی ، ۴۶۰ -
امین الدین خاں ، ۵۴ -
انتخاب غالب ، ۱۹۲ -
انتخاب یادگار ، ۴۶۰ -
انوری ، ۴۲۰ -

ب

بابر مرزا ، ۱۰۱ -
باغ دودر ، ۱۹۶ ، ۱۹۸ -
باقر علی خاں ، ۳۳ -
بتروس ، مسٹر ، ۱۳۵ -
عبدالرحمٰن بجنوری، ۳۱۷ ، ۳۲۳ -
بختاور سنگھ ، ۳ ، ۲۸ -
برہان قاطع ، ۵۱ ، ۵۳ ، ۳۱۰ ، ۳۱۱ -
بزم آخر ، ۱۰۲ -
بشیر حسین زیدی ، ۱۲۷ -
بلوان سنگھ ، ۲۹ -
بنارس ، ۳۰۲ ، ۳۰۳ -
بہادر شاہ ، ۵۰ ، ۱۰۱ ، ۱۳۶ ، ۱۳۱ -
بیداد ، میر مہدی ، ۱۳۵ -
بیدل ، ۶ -

ت

تارا چند ، ڈاکٹر ، ۸۲ -
ترسم خاں ، ۴ -
تفتہ ، ہر گوپال ، ۳۸۵ -
تیغ بہادر گرو ، ۸۲ -
تیغ تیز ، ۱۱ ، ۳۱۱ -

پ

پنج آہنگ ، ۱۸۷ -
پیارے لال آشوب ، ۱۸۴ -

ج

جاٹ قوم کا مرقع ، ۸۳ -
جارج کسنگھام ، ۱۰۰ -
جام جہاں نما ، ۱۹۵ -
جلوۂ خضر ، ۳۶۲ -
جہاندار شاہ ، ۹۲ -
جہانگیر مرزا ، ۱۰۱ -
جیون بیگ ، ۲۲ -

چ

چراغ دیر ، ۳۰۲ -
چورامن جاٹ ، ۸۴ -
چوک سعد اللہ خاں ، ۱۰۴ -
چھج مل ، ۱۸۵ -
چھوٹی خانم ، ۵
چین سکھ ، ۲۷۳ -

ح

حاجی خاں ، ۲۱ -
حالی مولانا ، ۳۳ ، ۵۱ ، ۵۲ ، ۳۶۵ -
حبیب اللہ خاں ، ۳۱۲ -
حسن علی خاں ، ۳۳ -
حکیم فرزانہ ، ۳۳۱ -
حمید احمد خاں پروفیسر ، ۲۳ ، ۱۶۳ ، ۳۳۸ ، ۳۳۹ ، ۳۲۷ -

خ

خاقانی ، ۳۲۰ -
خطوط غالب ، ۱۷۷ ، ۳۷۷ -
خطوط غالب مہر ، ۱۸۲ -
خلیق احمد نظامی ، ۸۵ -
خلیق احمد نظامی، ۸۵ -
خواجہ حاجی خاں ، ۲۱ -
خوب چند ، ۲۷۲ -

د

دانع ہذیان ، ۱۱۳ -
درفش کاویانی ، ۵۲ ، ۱۹۰ -
درگاہ قلی خاں ، ۱۰۳ -
دستنبو ، ۶۱ ، ۱۸۸ -
دعائے صباح ، ۱۹۳ -
دکنی محمد حسین ، ۳۲۲ -
دیوان غالب ، ۱۵۵ تا ۱۵۸ -

ذ

ذکا اللہ مولوی ، ۱۳۶ -
ذکر غالب ، ۱۱ -
ذوق ، ۳۶ ، ۱۱۳ -

ر

راس ڈاکٹر ، ۹ -
رام چندر ، ماسٹر ، ۱۳۶ -
رحیم بیگ ، ۴۰۹ ، ۴۱۳ -
رشید احمد ، ۳۳۳ ، ۳۷۶ -
رنجیت سنگھ ، ۸۲ -
روس ، ڈاکٹر ، ۹ -
ربیگن ، ۲۰ -

ز

زین العابدین عارف ، ۳۳ ، ۳۶ ، ۱۴۱ -

س

ساطع برہان ، ۴۱۰ -
سیدچیں ، ۱۸۶ -
سراج الدین احمد ، ۱۹۵ -
سر سید احمد خاں، ۱۲۰ ، ۱۳۷ -
سعادت علی ، ۴۱۰ -
سکھ قوم ، ۶۲ -
سلاطین قلعہ ، ۱۰۰ -
سمرقند ، ۴ -
سوالات عبدالکریم ، ۴۱۱ -
سورج مل جاٹ ، ۸۴ -
سید احمد ، ۱۵ ، ۱۱۳ ، ۱۱۸ ، ۱۲۷ ، ۳۷۷ -

ش

شاہ اسماعیل ، ۱۱۷ -
شاہ عبدالغنی ، ۱۱۷ ، ۱۳۴ -
شاہ عبدالعزیز ، ۱۱۳ -
شاہ عبدالقادر ، ۱۱۳ ، ۱۱۶ ، ۱۲۶ ، ۱۳۱ -
شاہ غلام علی ، ۱۱۴ -
شاہ رفیع الدین ، ۱۱۳ ، ۱۱۶ ، ۱۲۶ -
شاہ محمد اسحاق ، ۱۱۴ -
شاہ ولی اللہ ، ۸۱ ، ۱۰۹ -
شمشیر تیز تر ، ۱۴۱ -
شوکت بخاری ، ۶ -
شیفتہ، ۳۶ ، ۱۳۹ ، ۱۴۰ ، ۳۵۵ -
شیو دھیان سنگھ ، ۲۵ ، ۳۷۷ -
شیو نراین ، ۹ ، ۱۶۵ -

ص

صدر الدین آزردہ ، ۱۱۴ ، ۱۳۲ ، ۳۷۷ -
صفدر جنگ ، ۸۵ -
صفیر بلگرامی ، ۳۶۲ -

صلاح الدین خدا بخش ، ۳۶۸ -
صہبائی، امام بخش، ۱۳۶ ، ۳۷۷ -

ض

ضیاء الدین احمد خاں ، ۱۰ ، ۳۹ ، ۱۳۰ -
ضیاءالدین برنی ، ۳۶۸ -

ط

طور کلیم ، ۴۵۹ -

ظ

ظہیر دہلوی ، ۳۶ ، ۱۳۱ -

ع

عارف ، ۴۴ ، ۳۶ ، ۱۳۱ -
عبدالحق چودھری ، ۶ ، ۳۳ ، ۳۴ -
عبدالحکیم خلیفہ ، ۴۸۰ -
عبدالحئی ، ۱۱۴ ، ۱۶۵ -
عبدالصمد ، ۶ ، ۳۳ ، ۳۴ ، ۳۷۹ -
عبدالرحمٰن بجنوری ، ۴۳۳ ، ۴۳۶ -
عبدالکریم ، ۴۱۱ -
عبداللہ خاں ، ۴ ، ۲۳ ، ۲۶ -
عبداللطیف ڈاکٹر ، ۴۳۸ -
عبدالماجد دریا آبادی ، ۴۶۹ -
عبدالودود قاضی ، ۳۵ -
عبداللہ سید ۴۸۰ -
عجالۂ نافعہ ، ۱۳۱ -
عرشی ، امتیاز علی خاں ، ۶ ، ۴۰ ، ۱۳۱ ، ۱۹۲ -
عمدۂ منتخبہ ، ۴۵۴ -
عرفی شیرازی ، ۴۲۰ -
عظمت آدم ، ۲۰۷ -
علاءالدین ، ۳۱ ، ۲۷۶ -
عود ہندی ، ۱۶۴ ، ۳۸۴ -
عیش آغا جان ، ۱۳۱ -

غ

غالب اور :—

آفاقی شاعری ، ۲۱۵ ، ۲۱۷ ، ۲۱۸ -
آگ اور اس کے متعلقات ، ۳۵۲ ، ۳۵۴ -
اجتماعی شعور، د ۲۵ -
اجتہاد شعری ، ۴۴۹ ، ۴۷۴ -
ازدواجی زندگی، ۲۸، ۴۳ ، ۲۸۱ ، ۲۸۲ -
اسیری ، ۸ ، ۳۸۰ -
الہامی انداز، ۳۳۹ ، ۳۷۱ -
انگریزی حکومت ، ۸۷ -
اولاد ، ۴۳ -
بچپن ، ۱۳ ، ۲۹ -
بڑھاپا، ۶۶ ، ۶۷ -
پنشن ، ۶۹ ، ۵۴ ، ۳۸۱ -
پہلو داری ، ۳ ، ۳۹۴
تراکیب فارسی ، ۳۳۶
تعلیم و تربیت ، ۵ ، ۳۷ ، ۳۸ -
تصوف ، ۲۲۷ -
تصویر کاری ، ۳۴۵ ، ۳۴۶، ۳۵۷، ۳۶۲ -
تنقید ، ۴۲۲ ، ۴۲۸ ، ۴۵۳ -

تہذیبی ، و عمرانی اثرات ۲۸۹ ، ۳۴۶ -
جاگیردارانہ ماحول، ۳۰۱ ، ۳۸۲ -
جدت پسندی ، ۳۹۰ -
جمالیاتی پہلو ، ۳۳۳، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۷۳ ، ۴۰۴ -
حالات زندگی، ۲۰ ، ۲۸ -
حسن پرستی، ۲۲۱ ، ۳۰۱، ۳۰۶ ، ۳۰۷ -
خاندان، ۱۳ ، ۳۷۸، ۳۹۳ -
خانہ داری، ۲۸ ، ۴۳، ۲۸۱، ۲۸۲
خطوط، ۳۷۵، ۳۷۷، ۳۸۰ ، ۳۸۴، ۳۹۴ ، ۴۰۱ -
خوش باشی ، ۲۷۰ -
خون کا تصور، ۳۵۷ ، ۳۵۹، ۳۷۰-
دیوان اردو ، ۱۵۵ تا ۱۵۸ -
رشک کا جذبہ، ۳۲۶ -
روایت پرستی، ۳۶۲ ، ۳۶۶ -
رومانیت ، ۳۵۵ -
سوانح زندگی، ۲۰ ، ۲۸ -
سیاسی حالات ، ۷۰ ، ۷۱ ، ۷۳ ، ۸۷ -
شادی، ۴۰ ، ۳۷۹ ، ۳۹۴ -
شکست خوردگی ، ۲۶۲ -
شخصیت پہلو داری ، ۳ ، ۳۹۴ ، ۴۰۱ -
شاعرانہ عظمت ، ۱۳۹ ، ۱۹۹ ، ۲۰۱ -
شوخی و شگفتگی ، ۲۴۳ ، ۳۶۷ ، ۳۹۱ ، ۳۹۲ ، ۳۹۳ -
عشق و عاشقی، ۲۸۳ ، ۲۹۱ ، ۳۱۵ ، ۳۲۰ ، ۳۲۱ ، ۳۲۳ -
علامات و اشاریت، ۳۴۲ ، ۳۷۰ -
عمرانی نظریہ ، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱-
عیش کوشی ، ۲۷۰ -
فنون لطیفہ ، ۹۶ ، ۱۴۲ -
فارسی کا اثر، ۳۵ ، ۳۶۷ -
فلسفیانہ رجحان ، ۲۰۳ ، ۲۸۶ ، ۴۶۸ -
فنی اجتہاد، ۳۶۵ ، ۳۶۷ ، ۳۶۸ -
قلعہ کی ملازمت، ۴۹ ، ۶۰ -
قنوطیت ، ۲۷۳ ، ۲۷۵ -
کالج کی ملازمت ، ۳۸۰ -
کلکتے میں ، ۲ ، ۵۴ ، ۳۸۰ -
مزاجی خصوصیات ، ۳۸۴ -
معاشرت کے نقوش، ۹، ۹۷، ۹۸ ، ۲۱۴ ، ۲۶۲ ، ۳۸۷ ، ۳۹۸ ، ۴۰۳ ، ۴۴۹ -
معاشی حالات ، ۲۷۶ ، ۳۸۷ -
معشوق، ۳۱۱ -
نثر نگاری، ۳۹۳ ، ۳۹۶ ، ۴۰۰ -
نسب نامہ، ۲۲ -
نشاطیہ انداز، ۳۶۵ ، ۳۶۶-
نکات و رقعات ، ۱۸۳ -
نقاد ، ۴۲۵ ، ۴۳۲ -
غالب نامہ ، ۴۳۸ -
غدر ، ۱۸۵۷ع، ۶۱ ، ۶۲ -
غلام حیدر ، حکیم ، ۱۳۷ -
غلام علی ، ۱۳۳ -
غلام نجف خاں ، ۴۶ ، ۱۳۶ -
کلیات فارسی، ۱۸۵ ، ۱۸۹ -
لکھنئو، میں ۵۵ -

ف

فخر الدین ، ۱۳۳ -
فضل، ۶ ، ۴۶ ، ۴۸ ۱۱۴ ، ۱۲۹ ، ۱۳۲ ، ۳۷۷ -
فیاض الدین ، ۱۰۲ -
فیض الحسن کوتوال ، ۹ -

ق

قادر بخش صابر ، ۴۵۸ -
قادر نامہ ، ۱۸۴ -
قاطع القاطع ، ۴۱۰ -
قاطع برہان ، ۱۸۹ ، ۴۱۱ -
قطب الدین ، ۲۱ ، ۱۳۲ -
قطب الدین ، باطن ۳۶ -
قمر الدین راقم ، ۲۰ -
قوقان بیگ ۴ ، ۱۳ -

ک

کاشف‌الحقائق ، ۴۶۷ -
کالے میاں ، ۹۴ -
کانپور ، ۷ ، ۱۴ -
کرامت علی ، ۱۳۲ -
کریم الدین ، ۱۳۶ ، ۴۵۵ -
کلیم الدین احمد ، ۴۸۲ -
کلب علی خان ، ۳۹ -
کلکتہ ، ۷ ، ۵۴ ، ۳۰۲ ، ۳۸۰ -
کلیات نثر ، ۱۸۹ -
کو بروک ، ۲۶۵ -

گ

گرو ارجن سنگھ ، ۸۲ -
گرو تیغ بہادر ، ۸۲ -
گرو گوبند سنگھ ، ۸۲ -
گرو نانک ، ۸۲ -
گلدستۂ نازنیناں ، ۴۵۵ -
گل رعنا ، ۱۹۱ -
گلستان سخن ، ۴۵۸ -
گلشن بے خار ، ۴۵۵ -

ل

لال کنور ، ۹۲ -
لطائف غیبی ، ۴۱۱ ، ۴۱۶ -
لکھنؤ ، ۷ ، ۱۴ ، ۵۵ -
لیک جنرل ، ۲۰ ، ۲۵ ، ۸۷ -

م

مالک رام ، ۱۱ -
مجنوں گورکھپوری ، ۴۷۹ -
محرق قاطع ۴۱۰ -
محمد امین مولوی ، ۴۱۰ -
محمد اکرام ، ۴۴۱ ، ۴۷۳ -
محمد محسن ، ۴۸۵ -
متفرقات غالب ، ۱۹۴ -
متھرا داس ، ۲۷۹ -
محاسن کلام غالب ، ۴۳۳ -
محبوب علی میر ، ۱۱۴ -
محمد نصیر رنج ، ۱۳۳ ، ۱۳۴ -
محمد شاہ ، ۹۲ -
محمود خان ، ۴۸ -
مظہر العجائب ، ۲۰ -
معظم ، مولوی ، ۴ز ، ۳۳ ، ۳۵ -
مرزا خان کوتوال ، ۴۹ -
معین الملک میر منو ، ۴ -
مکاتیب غالب ، ۱۷۴ -
ممتاز حسین ، ۴۷۸ -
ممتاز علی خان ، ۱۵۶ ، ۱۶۵ -
مملوک العلی ، ۱۴۵ -
مومن ، ۴۶ ، ۵۱ ، ۱۱۴ ، ۱۳۰ -

مؤید برہان، ۱۰ ، ۴۱۱ ، ۴۱۳-
مہر غلام رسول ، ۴۷۷ -
مہر نیم روز ، ۹ ، ۱۸۷-
مہیش پرشاد، ۱۷۸ ، ۳۸۴ -
میاں داد خاں سیاح، ۴۳ ، ۴۱۳ ، ۴۱۵ -
میر مجدی ، ۱۳۵ -
میر مہدی، ۱۴۰ -

ن

نادرات غالب ، ۱۸۰ ، ۳۸۴ -
ناسخ ، ۱۹۵ -
ناصر نامہ فراق ، ۱۱۴ -
ناظر حسین مرزا ، ۵۰ -
نامہ غالب، ۴۱۰ -
نانک ، ۸۲ -
نبی بخش حقیر، ۳۸۴ -
نجف علی ، ۴۱۱ -
نذیر احمد مولوی ، ۱۴۶ -
نسخۂ حمیدیہ ، ۱۰۸ -
نصر اللہ بیگ ، ۵ ، ۳۱ ، ۲۰ ، ۲۶ ، ۲۸ -
نصیر شاہ ، ۴۶ -
نصیرالدین کالے ، ۴۹ ، ۱۳۳ -
نکات و رقعات غالب ، ۱۸۳ -
نور الحسن، ۱۲۹ ، ۴۵۹ -
نیر ، ۴۶ ، ۱۴۰ -

و

واجد علی ، شاہ ۲۷۵ -
ویلزلی ، ۸۸ -

ہ

ہرمزد (عبدالصمد) ۶ ، ۳۳ ، ۳۴ ، ۳۷۹ ، ۴۶۰ -
ہرگوپال ، تفتہ ۳۸۵ -
ہنگامۂ دل آشوب ، ۴۱۱ -

ی

یادگار غالب، ۱۰ ، ۴۲۸ ، ۴۳۰ ، ۴۶۰ -
یوسف بیگ خاں، ۲۳ ، ۳۸۱ -
یوسف علی خاں ، ناظم ۱۰ -

To

DEAR FRIENDS AND COLLEAGUES

★ Professor Philips

★ Professor Brough
★ Professor Wright
★ Colonel Dr. Moyse-Bartlett
★ Mr. Pearsoo
★ Miss Smith
★ Professor Clarke
★ Professor Lewis
★ Mr. Brackeo
★ Mr. Gatehouse
★ Mrs. Garland

Aod

★ **Ralph Russell**

of

The School of Oriental and African Studies

Who

With their affeetioo aod love made my stay at the School of Oriental and African Studies, University of Loodoo, the best aod haapiest period of my life.

EBADAT BRELVI